چونکا دینے والی خوفناک کہانیاں

ماہنامہ

ڈر ڈائجسٹ

کراچی

دسمبر 2012

ادارہ کا کسی بھی رائٹر کے خیالات سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ڈرڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں فرضی ہوتی ہیں کسی کی ذات یا شخصیت سے مماثلت اتفاقیہ ہوسکتی ہے
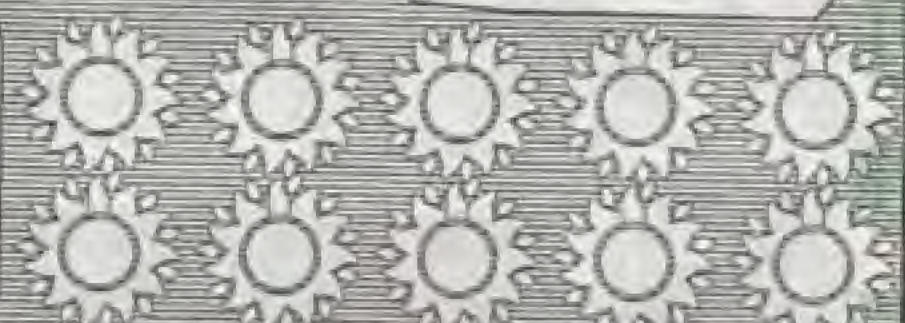
ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈرڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیوار دوبازار کراچی: 32744391

قرآن کی باتیں
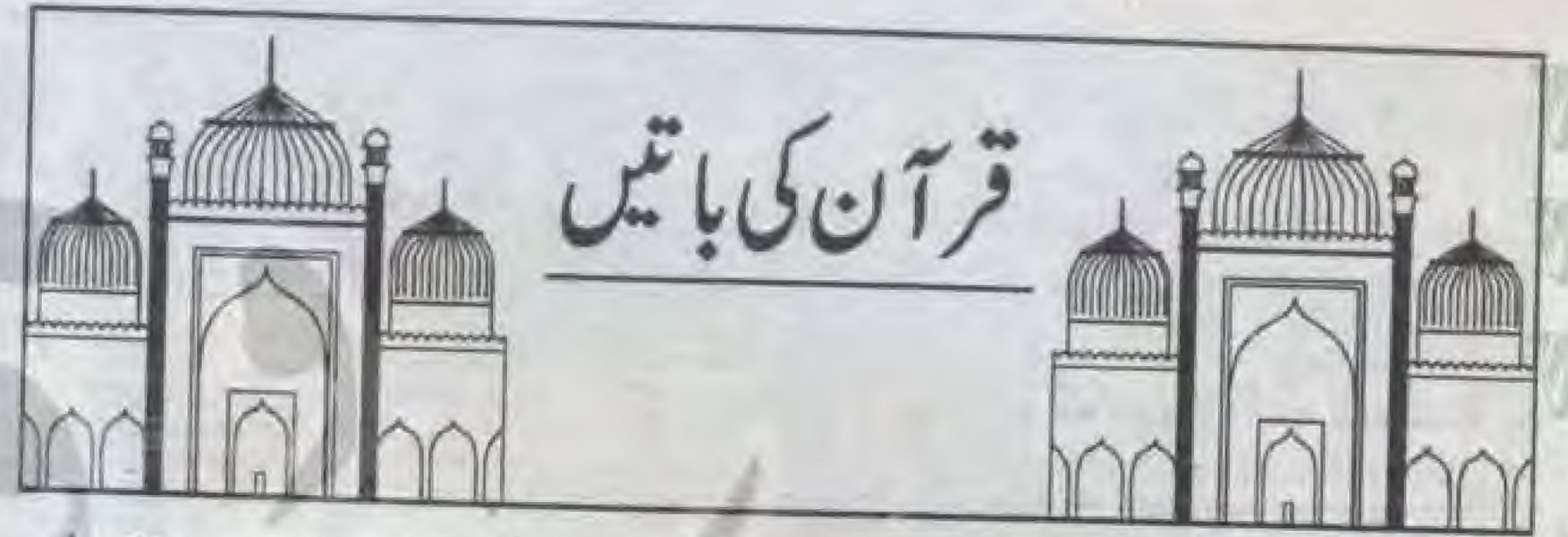
☆ اورتمہارے لئے مویشیوں میں بھی عبرت ہے کہ ان کے پیٹوں میں جو گوبر اور لہو ہے اس سے ہم تم کو خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لئے خوشگوار ہے۔ اور کھجور اور انگور کے میووں سے بھی (تم پینے کی چیزیں تیار کرتے ہو) کہ ان سے شراب بناتے اور عمدہ رزق کھاتے ہو۔ جو لوگ سمجھ رکھتے ہیں ان کے لئے ان چیزوں میں نشانی ہے اور تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو ارشاد فرمایا کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور (اونچی اونچی) چھتریوں میں جو لوگ بناتے ہیں گھر بنا۔ اور ہر قسم کے میوے کھا۔ اور اپنے رب کے صاف رستوں پر چلی جا۔ اسکے پیٹ سے پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں کے کئی امراض کی شفا ہے۔ بیشک سوچنے والوں کے لئے اس میں بھی نشانی ہے۔ (سورۃ نحل 16 آیت 66 سے 69)

☆ اور اللہ ہی نے تم میں سے تمہارے لئے عورتیں پیدا کیں اور عورتوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے پیدا کئے اور کھانے کو تمہیں پاکیزہ چیزیں دیں تو کیا بے اصل چیزوں پر اعتقاد رکھتے اور اللہ کی نعمتوں سے انکار کرتے ہیں۔ (سورۃ نحل 16 آیت 72)

☆ اور اللہ ہی نے تم کو تمہاری ماؤں کے شکم سے پیدا کیا کہ تم کچھ نہیں جانتے تھے۔ اور اس نے تم کو کان اور آنکھیں اور دل اور ان کے علاوہ اور اعضا بخشے تا کہ تم شکر کرو۔ کیا ان لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی ہوا میں گھرے ہوئے اڑتے رہتے ہیں۔ ان کو اللہ ہی تھامے رکھتا ہے ایمان والوں کے لئے اس میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور اللہ ہی نے تمہارے لئے گھروں کو رہنے کی جگہ بنایا اور اسی نے چوپایوں کی کھالوں سے تمہارے لئے ڈیرے بنائے جن کو تم سبک دیکھ کر سفر اور حضر میں کام میں لاتے ہو اور ان کی اون اور پشم اور بالوں سے تم اسباب اور برتنے کی چیزیں بناتے ہو جو مدت تک کام دیتی ہیں۔ اور اللہ ہی نے تمہارے آرام کے لئے اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں سے سائے بنائے اور پہاڑوں میں غاریں بنائیں اور کرتے بنائے جو تم کو گرمی سے بچائیں۔ اور ایسے کرتے بھی جو تم کو اسلحہ جنگ کے ضرر سے محفوظ رکھیں اسی طرح اللہ اپنا احسان تم پر پورا کرتا ہے تا کہ تم فرمانبردار بنو۔ اور اگر یہ لوگ اعتراض کریں تو (اے پیغمبر) تمہارا کام فقط کھول کر سنا دینا ہے یہ اللہ کی نعمتوں سے واقف ہیں، مگر واقف ہو کر بھی ان سے انکار کرتے ہیں اور یہ اکثر ناشکرے ہیں۔ (سورۃ نحل 16 آیت 78 سے 83)

☆ لوگو اللہ کے جو تم پر احسانات ہیں ان کو یاد کرو۔ کیا اللہ کے سوا کوئی اور خالق اور رازق ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دے؟ اس کے سوا کوئی معبود نہیں پس تم کہاں بہلے پھرتے ہو۔ (سورۃ فاطر 35 آیت 3)

☆ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے منہ برسایا تو ہم نے اس سے طرح طرح کے رنگوں کے میوے پیدا کئے۔ اور پہاڑوں میں سفید اور سرخ رنگوں کے قطعات ہیں۔ اور بعض کالے سیاہ ہیں۔ انسانوں اور جانوروں اور چارپایوں کے بھی کئی طرح کے رنگ ہیں اللہ سے تو اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو صاحب علم ہیں۔ بے شک اللہ غالب اور بخشنے والا ہے۔ (سورۃ فاطر 35 آیت 27 سے 28)

☆ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو (یعنی قواعد عدل) تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔ اور لوہا پیدا کیا اس میں اسلحہ جنگ کے لحاظ سے خطرہ بھی شدید ہے۔ اور لوگوں کے لئے فائدے بھی ہیں اور اس لئے کہ جو لوگ بن دیکھے اللہ اور اسکے پیغمبروں کی مدد کرتے ہیں اللہ ان کو معلوم کرے بیشک اللہ قوی اور غالب ہے۔ (سورۃ حدید 57 آیت 25)

☆ کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا۔ اور پہاڑوں کو اس کی میخیں نہیں ٹھہرایا؟ بیشک بنایا اور تم کو جوڑا بھی پیدا کیا اور نیند کو تمہارے لئے موجب آرام بنایا اور رات کو پردہ مقرر کیا۔ اور دن کو معاش کا وقت قرار دیا۔ اور تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے اور آفتاب کا روشن چراغ بنایا۔ اور نچڑتے بادلوں سے موسلا دھار مینہ برسایا۔ تا کہ اس سے اناج اور سبزہ پیدا کریں۔ اور گھنے گھنے باغ۔ (سورۃ نبا 78 آیت 6 سے 16)

☆ تو انسان کو چاہئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے۔ بے شک ہم ہی نے پانی برسایا پھر ہم نے ہی زمین کو چیرا پھاڑا پھر ہم ہی نے اس میں اناج اگایا اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجوریں اور گھنے گھنے باغ اور میوے اور چارا۔ یہ سب کچھ تمہارے اور تمہارے چارپایوں کے لے بنایا۔ (سورۃ عبس 80 آیت 24 سے 32)

☆ یہ اس لئے کہ جو نعمت اللہ کسی قوم کو دیا کرتا ہے جب تک وہ خود اپنے دلوں کی حالت نہ بدل ڈالیں اللہ اسے نہیں بدلا کرتا اور اس لئے کہ اللہ سنتا جانتا ہے۔ (سورۃ انفال 8 آیت 53)

☆ اور کسی مومن مرد اور مومن عورت کو حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول کوئی امر مقرر کر دیں تو وہ اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ صریح گمراہ ہو گیا۔ (سورۃ احزاب 33۔ آیت 36)

☆ سو جو چیز تم کو پیغمبر دیں وہ لے لو اور جس سے منع کریں (اس سے) باز رہو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (سورۃ حشر 59 آیت 7)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

اسمارہ نوشین فیصل آباد سے، السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ ڈر کا پورا اسٹاف خیر وعافیت سے ہوگا، تمام لکھنے والوں سے گزارش ہے کہ تنقید برائے اصلاح ہونی چاہئے، تنقید برائے تنقید سے گریز کریں، جب بھی کسی تحریر کو نقل شدہ کہا جائے تو یہ بھی بتایا جائے کہ پہلے کس نے؟ کب؟ اور کہاں وہ تحریر شائع ہوئی ہے کیونکہ تنقید کے بھی کچھ قواعد اور اصول ہوتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی، محمد اسلم جاوید، ایم اے راحت، اے وحید، اقصیٰ رباب، تمیرا رضوان، انوری رمضان، زاہد، عطا محمد، عاصمہ رمضان، سنبل، ماہین طٰہٰ، عروج، ایس حبیب خان، شگفتہ، آسٹر، صدف، کائنات بلوچ، فاریہ تبسم، افشاں رمضان، عمران قریشی، ایس امتیاز احمد، قدیر رانا، محمد وارث آصف، حبیب الرحمٰن، محمد بشیر، محمد آصف شہزاد، راجہ باسط مظہر، شرف الدین جیلانی، غلام نبی نوری، سجاد حسین نومی، ساجدہ راجا، صفدر شاہین، ناصر محمود فرہاد، عبدالحمید ساگر، عروفیہ ملک، احسان سحر، شرجیل تصور، مدثر بخاری، نظارت نصر، ایم الیاس، علی کاشف آفاقی، اذان عزیز، فوزیہ کنول، حکیم خان حکیم، سلیم بیگ ہمدانی اور آپ سب کے لئے بہت سی دعائیں، اللہ پاک آپ سب کو ہمیشہ خوش رکھیں۔ آمین۔

☆☆ اسمارہ صاحبہ: آپ کی باتیں بالکل صحیح ہیں اور امید ہے آئندہ تنقید کرنے والے مکمل حوالہ بھی دیں گے۔ خیر خلوص نامہ کا آئندہ ماہ بھی شدت سے انتظار رہے گا۔

ساجدہ راجا ہندواں سرگودھا سے، میری طرف سے تمام رائٹر اور ڈر ریڈرز کو سلام، سالگرہ کا شمارہ بہت زبردست تھا اور نومبر کا بھی مکمل پڑھا نہیں سو تبصرہ ادھار رہا۔ ویسے ہمیشہ کی طرح بزبردست ہی ہوگا، سنہری تابوت اچھی لگی، البتہ بلیک ٹائیگر بہت عجیب سی ہوگئی ہے۔ رائٹر صاحب پلیز! ذرا خیال رکھا کریں۔ رولوکا میں بھی کچھ نیا پن ہونا چاہئے۔ کافی عرصے سے ایک ہی سڑک پر چل رہی ہے۔ باقی سب کچھ پرفیکٹ ہے۔ اگلے ماہ تک کے لئے اجازت۔

☆☆ ساجدہ صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، کہانی شامل اشاعت ہے، امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا نہیں بھولیں گی۔ Thanks۔

ایس حبیب خان کراچی سے، عرض یہ ہے کہ نومبر کا ڈر ملا، مگر اس بار کا سرورق کچھ خاص نہیں لگا، رسالے کی ابتداء ''قرآن کی باتیں'' سے کی جس نے ایمان کو ایک نئی تازگی بخشی۔ خطوط میں اپنی تحریر کی تعریف وتنقید پڑھ کر اچھا لگا۔ جنہوں نے مجھے بر تھ ڈے وش کیا ان کا بھی شکریہ، کہانیوں میں ''پراسرار کنواں'' ''درندگی'' ''کمرے کا آسیب'' ''پراسرار ہوسٹل'' اور ''چھپا'' نے متاثر کیا۔ باقی ابھی پڑھی نہیں۔ آپ نے کہانیوں کے بارے میں لکھا تھا۔ کہانیوں کا یہ ہے کہ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس وجہ سے مکمل نہ ہوسکیں۔ انشاء اللہ مکمل کرکے ارسال کردوں گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو مزید ترقی عطا فرمائے اور ہمارے ملک میں امن وسکون اور خوشحالی لائے۔ (آمین)

☆☆ ایس صاحبہ: آپ کی نئی کہانی مہنگا مذاق موصول ہوچکی ہے۔ بہت بہت شکریہ، کہانی اگلے ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

زاھدہ عطا محمد کراچی سے، السلام علیکم، امید کرتی ہوں ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا اس مرتبہ ٹائٹل بس سو سو تھا لیکن ڈر کی محفل میں اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، سچ میں سب سے پہلے جو میں نے کہانی پڑھی وہ سنہری تابوت تھی جو اچھی لگی، اب دیکھتے ہیں کہ کہانی کس موڑ پر آتی ہے اور کہانیاں بھی اچھی تھیں جیسے پراسرار کنواں، خون کا اثر، جناتی گھر، باقی کہانیاں ابھی تک زیر مطالعہ ہیں اور آخر میں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)۔

☆☆ زاہدہ صاحبہ: خلوص نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی ڈر ڈائجسٹ کو یاد رکھنے کے لئے ڈھیروں شکریہ۔

کائنات بلوچ کراچی سے، السلام علیکم، 24 تاریخ کو ڈائجسٹ ملا جسے دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی جب ٹائٹل پیج پر نظر پڑی تو ٹائٹل پیج کچھ خاص نہیں لگا لیکن جب ڈائجسٹ کھولا اور اس میں اپنا خط دیکھا تو اور بھی خوشی ہوئی اور آگے آگے اپنی غزل دیکھی تو پھر تو میرا دل باغ باغ ہوگیا لیکن مجھے ایک بات کا بہت دکھ ہوا کہ آپ نے میرا خط کاٹ کر شائع کیا تھا لیکن کوئی بات نہیں اور قسط وار کہانیوں

میں سنہری تابوت اچھی لگی۔ بقیہ کہانیوں میں جو کہانیاں مجھے پسند آئیں چھپا، پراسرار کنواں، منحوس الو، صفحہ نمبر 310 زود پشیمان، جناتی گھر، خون کا اثر تھیں اور باقی کہانیاں بھی اپنی جگہ اچھی تھیں، امید کرتی ہوں ڈر کے رائٹر اسی طرح ڈر ڈائجسٹ کو پروان چڑھائیں گے۔ (آمین)

☆☆ کائنات صاحبہ: کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی ڈر ڈائجسٹ کو نہ بھولنے کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کیجئے۔

سفیان ساغر کھر سنگھ والا سے، السلام علیکم، سب سے پہلے سلام قبول ہو، بہت عرصے بعد میں دوستوں کی محفل میں شامل ہو رہا ہوں امید ہے آپ مجھ کو مایوس نہیں کریں گے ماہ نومبر کا رسالہ ماہ کی 25 تاریخ کو ملا سب سے پہلے اسلامی باتیں پڑھ کر دل روشن ہوگیا اس کے بعد کہانیاں پڑھیں قسط وار بھی اچھی جارہی ہیں باقی سب کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ غزل ارسال کر رہا ہوں امید ہے اسے شائع کرکے میرا حوصلہ بڑھائیں گے۔ آخر میں دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے آمین۔

☆☆ سفیان صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس، آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا بہت شدت سے انتظار رہے گا۔

بشیر احمد بھٹی فوجی بستی بہاولپور سے، السلام علیکم جناب، نومبر 2012ء کا ڈر پر تجسس کہانیوں سے مزین ہے۔ ٹائٹل پر بھی خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ قرآن کی باتیں اچھا معلوماتی سلسلہ ہے۔ خطوط میں آپ نے یہ خوشخبری سنادی کہ عنقریب اسلامی مضامین کا سلسلہ شروع کردیا جائے گا۔ شکریہ، پہلی کہانی آ گہی کا سفر اچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ زود پشیمان، کمرے کا آسیب، تحیر خیز رہیں۔ رولو کا 90 ماہ کی ہوگئی۔ قسط نمبر 96 پر یہ آٹھ برس کی بن جائے گی۔ آسیب زدہ چرچ، چھپا، گمشدہ، بدنیت، اچھی کہانیاں ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کی سنہری تابوت نئے انداز کی پراسرار کہانی ہے۔ منحوس الو، صفحہ نمبر 310، پراسرار ہوسٹل، جناتی گھر، انتباہ ڈر کے معیار کی کہانیاں ہیں۔ ایم الیاس کی ٹائیگر، اندیشناک، خون کا اثر، درندگی اور آخری کہانی پراسرار کنواں لاجواب کہانیاں ہیں۔ پراسرار کنواں ایک ہندو کی دبی ہڈیوں پر مبنی کہانی اچھی رہی، غزلوں نے خوب محظوظ کیا۔ سال کے آخری دسمبر کے شمارے کا انتظار ہے۔

☆☆ بشیر صاحب: خلوص نامہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ کہانیوں کی تعریف اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کے لئے ویری ویری تھینکس۔

وثیقہ زہرہ فیض پور سے، میری طرف سے ڈر ڈائجسٹ کے سارے اسٹاف کو خلوص، بھرا سلام، ڈر کی محفل میں یہ میرا پہلا خط ہے میں نے ڈر نومبر سے پڑھنا شروع کیا ہے یہ میرے دل کو بہت اچھا لگا ہے، پھر سوچا کہ خط کے ذریعے اپنی رائے آپ تک پہنچاؤں اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف سب سے پہلے رولوکا پڑھی، گوپال اور ہردیال کے خاندان کا اسلام قبول کرنا بہت اچھا لگا، کمرے کا آسیب، آسیب زدہ چرچ، پراسرار ہوسٹل، صفحہ نمبر 310 درندگی، پراسرار کنواں، بیسٹ کہانیاں تھیں، سنہری تابوت، بلیک ٹائیگر اے ون جارہی ہیں باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پیارے سے ڈائجسٹ کو بہت ترقی دے (آمین) اگر آپ نے میرا یہ خط شائع کردیا تو ہر ماہ ضرور حاضری دوں گی۔ اللہ حافظ۔

☆☆ وثیقہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ قبول کیجئے، اور امید ہے آئندہ ماہ بھی آپ ڈر ڈائجسٹ کو ضرور یاد رکھیں گی۔

بلقیس خان پشاور سے، السلام علیکم، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ ماہ نومبر اکتوبر کے 26 تاریخ کو ملا، پڑھ کر خوشی ہوئی، خطوط اس بار کافی زیادہ تھے، مگر سب میں ایک دوسرے کی حوصلہ افزائی کی گئی تھی۔ خطوط کو دیکھا تو میں نے بھی سوچا کہ خط لکھوں، اس ماہ جو کہانیاں اچھی تھیں وہ یہ ہیں گمشدہ عمران قریشی، بدنیت شہاب شیخ کی اور کمرے کا آسیب، امتیاز احمد، درندگی صفحہ نمبر 310 اور خون کا اثر۔ شاعری میں عثمان غنی کی شاعری نے متاثرہ کیا جبکہ غزلوں میں ماہین طٰہٰ، نے اچھی کوشش کی، عاصمہ، سجاد، افشاں، صباء، آپ تمام بہن بھائیوں کو خصوصی سلام اور انوری جی آپ کو بھی جبکہ شائستہ سحر از مائی فیورٹ رائٹر، ساجدہ راجا کی آ گہی کا سفر اگرچہ تھی اچھی مگر ادھوری ادھوری سی لگی۔ باقی ڈر میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ سو پلیز شائع کردیں۔ جناب یہ خط میرے دل کی ترجمانی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دگنی رات چوگنی ترقی دے۔

☆☆ بلقیس صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

آستر کراچی سے، نومبر کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، تمام کی تمام کہانیاں بہت خوب تھیں، جن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، میری گزارش ہے کہ آپ پلیز! میری کہانیاں شائع کیا کریں، اصلاح کر کے کیونکہ میں ایک اچھا رائٹر بننا چاہتی ہوں۔ ویسے بھی آپ لوگ رائٹروں کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں، اور میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ کئی نوآموز رائٹر کچھ عرصہ بعد ایک اچھا رائٹر بن چکے ہیں۔ اور یہ کمال ڈر ڈائجسٹ کا ہے۔ اس امید پر میں بھی کہانیاں ارسال کر رہی ہوں۔ پلیز! مجھے امید ہے کہ میرے ساتھ بھی تعاون ہوگا۔ ڈر ڈائجسٹ کی تمام کہانیاں دل کو چھو لینے والی ہوتی ہیں۔ میں شب و روز ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ آستر صاحبہ: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ بھی بصد شوق کہانیاں بھیجیں۔ یہ حقیقت ہے کہ نوآموز کہانیاں لکھنے والے ڈر ڈائجسٹ کے ذریعہ رائٹر بن چکے ہیں۔ آپ بھی رائٹر بن سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ڈر کے موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانیاں لکھیں۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ نومبر 2012ء کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلفریب ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے۔ اسٹوریز کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ میٹر آپ کے پاس ہے۔ پلیز دیکھئے گا۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ڈر ڈائجسٹ کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام اور عید مبارک۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: ڈر ڈائجسٹ سے آپ کی چاہت واقعی قابل دید ہے اس کے لئے شکریہ اور قوی امید ہے کہ آئندہ بھی یہ خلوص کا سلسلہ جاری و ساری رہے گا۔ کہانی شامل اشاعت ہے۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، آداب عرض! امید ہے خوش و خرم ہونگے اور حلقہ یاراں میں بھی ہر طرف امید بہار کی نوید ہوگی...... ! انشاء اللہ، ڈر ڈائجسٹ کی اعزازی کاپی موصول ہوئی، بہت شکریہ...... ! اچھا لگا۔ ڈر سے دوستی کا سفر ایک بار پھر شروع کرتے ہوئے میں بہت پرجوش بھی ہوں اور خوش بھی...... ! اداسی کا سماں بھی ارد گرد ہمہ وقت رہتا ہے، عید کی آمد آمد ہے اور گھر اداس اداس ہے، کچھ کھو جانے کا مشکل غم، دل کے نہاں خانوں میں بس سا گیا ہے، ابو کیا گئے سب کو اداس کر گئے...... ! خیر...... ! نومبر کا پرچہ زبردست رہا۔ آگہی کا سفر...... Excellent، درندگی...... Nice، سنہری تابوت...... Good، باقی لوگ بھی کوشش اور مقابلہ کی فضا میں زبردست نظر آئے، مجموعی طور پر رسالہ پسند آیا، نظموں اور غزلوں میں پروفیسر واجد نگینوی اور حکیم خان حکیم زبردست رہے۔ سونیا کا انتخاب V,Nice، کٹ پیس، Smiling کارنرز لاجواب رہے۔ "Overall Magazine Was So Beautiful In All Fields...! Good اور اب کچھ اپنی بات...... ! صفحہ نمبر 310...... کی اشاعت پر بہت خوشی ہوئی، Thanks You V. M، بہت زیادہ مصروفیت کے باعث اپنے قلمی سفر کو جاری رکھنے کی کوشش میں رہا، چند نامساعد مسائل کی وجہ سے بہت مصروف بھی رہا لیکن ڈر کو بھولا نہیں۔ ہمارا خلوص اور محبت یکساں ہے...... خدا ڈر کو مزید ترقی فرمائے...... آمین۔

☆☆ مدثر صاحب: یہی دنیا کا نظام ہے، کچھ چلے جاتے اور کچھ آ جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ کے والد صاحب کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ کہانیوں کے بارے میں آپ اپنے قلم کو دوڑاتے رہیں، باقی کام ہمارا ہے۔ Thanks۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، آداب عرض، آپ کی خیریت کا طالب ہوں، دو عدد غزلیں ارسال ہیں، کسی بھی اشاعت میں شامل کر کے مشکور فرمائیں۔ آپ کی صحت اور ادارے کی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

قدیر صاحب: ادارہ ڈر ڈائجسٹ بھی آپ کی صحت و کامیابی کے لئے دعا گو ہے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے تمام قلبی رشتوں پر اپنا فضل و کرم رکھے۔

علی کاشف آفاقی آزاد کشمیر سے، السلام علیکم: سب سے پہلے تو میں آپ کو اور پورے ڈر اسٹاف و قارئین کو عید مبارک کہنا چاہوں گا، اس دفعہ شمارہ جلد ہی مل گیا۔ اپنی کہانی دیکھ کر عید کا مزہ ہی دوبالا ہو گیا۔ ویری ویری تھینکس، انکل، جلد ہی میں مزید کہانیاں

بھی بھیجوں گا۔ رولو کا زبردست جا رہی ہے۔ روشنی کے سفیر کے کردار بہت پسند آئے۔ جنہوں نے اسلام کی سچائی اور مساوات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد ایم اے راحت صاحب کی "سنہری تابوت" پڑھی، مصریات پر لکھی ہوئی یہ کہانی بہت پرفیکٹ ہے۔ اس کے بعد دربار الیاسی میں حاضر ہوئے اور ٹائیگر کے کارنامے پڑھے، بلاشبہ ایم الیاس نے زبردست کردار تخلیق کیا ہے۔ بہت خوب، اس کے بعد چھوٹی کہانیوں کی طرف نظر کی، "درندگی" "گمشدہ" "بدنیت" "آگہی کا سفر" اور "صفحہ نمبر 310" زبردست تھیں۔ یہ ادارہ ڈر کی سخت محنت کا نتیجہ ہے کہ ہر ماہ ہمیں اتنی بیسٹ اسٹوریز پڑھنے کو ملتی ہیں۔ تعریف کے مستحق ہیں۔ میری دعا ہے کہ ادارہ ڈر مزید ترقی کرے۔ آمین۔

☆☆ علی صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ جو کہانی اچھی ہوتی ہے وہ جلدی سے شامل اشاعت ہوتی ہے۔ اب تو آپ خوش ہیں ناں کہ آپ کی کہانیاں شامل اشاعت رہتی ہیں۔

ملک ساجد بشیر ڈھوروناروعمر کوٹ سے، السلام علیکم، بلاشبہ ڈر ڈائجسٹ ایک اچھا میگزین ہے جس کے تمام سلسلے اپنی مثال آپ ہیں۔ تمام رائٹرز اچھا لکھ رہے ہیں نئے رائٹرز کو بھی موقع دیا جا رہا ہے۔ خاص طور پر رولو کا، سنہری تابوت کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ شاید ادارہ ڈر ڈائجسٹ مجھے بھول گیا ہے اور بھولنا بھی بجا ہے میری بڑی لمبی غیر حاضری ہے۔ اب ذرا وقت ملا تو ڈر ڈائجسٹ پڑھنا شروع کر دیا اور ڈھورونارو میں اسے متعارف کرایا ہے۔ اب ارادہ ہے کہ ڈر کے لئے سچے واقعات اور کچھ اسٹوریاں لکھوں، فی الحال تو ایک چھوٹا واقعہ "کون" بہن نے ایک اسٹوری لکھی تھی اس کی نوک پلک سنوار کر اسی کے نام سے بھیج رہا ہوں۔ پلیز "کون" کو جگہ دیں۔ "کون" کی حوصلہ افزائی ہوتے ہی ارسال کر دوں گا۔

☆☆ ساجد صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، جناب دو صفحے کی کہانی "کون" ہے اور یہ ڈر کے ایک صفحہ کے لئے بھی مکمل نہیں۔ اب آپ خود انصاف کریں...... چند صفحات کی کہانی ارسال کریں۔ آپ کی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔

اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم، آپ خیریت سے ہوں گے میں خداوند کریم سے آپ کی خیریت نیک چاہتا ہوں، ماہ نومبر 2012ء کا تازہ پرچہ بکسٹال پر دیکھ کر میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ یہ ایک خوبصورت پرچہ ہے جو کہ قارئین میں بہت مقبول ہے ہر ماہ کے آخر پر ڈر ڈائجسٹ کا ہمیں بڑی بے تابی سے انتظار ہوتا ہے، غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ، آپ جس خلوص اور محبت سے میرے ساتھ تعاون کرتے ہیں اس کے لئے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ اس بار ہر کہانی خوب سے خوب تر تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے تمام قلمکاروں کو میری طرف سے آداب عرض کہنا۔ جب تک آپ کو خط تحریر نہ کروں دل کو سکون نہیں ملتا۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ کا خلوص نامہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ کا محبت بھرا خط پڑھ کر بہت مزہ آتا ہے آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

محمد آصف شہزاد الہ آبادی ٹھینگ موڑ قصور سے، السلام علیکم، امید واثق ہے کہ ڈر ڈائجسٹ کی پوری ٹیم بخیریت ہوگی، ڈر کا نومبر 2012ء کا شمارہ 28 اکتوبر کو ملا۔ اس شمارے میں موجود یعنی شائع کہانیوں میں سے آگہی کا سفر، رولو کا، چھپا، سنہری تابوت، منحوس الو، صفحہ نمبر 310، پراسرار ہوسٹل، بلیک ٹائیگر، درندگی اور پراسرار کنواں اچھی لگیں جبکہ غزلوں میں سے حکیم خان حکیم، قاسم رضا، عاصمہ رمضان کے کلام اچھے لگے، سنبل ماہین طٰہٰ کے کلام کے تو کیا کہنے ایک ایک لفظ موتیے سے پرویا ہوا تھا۔ یہ تو ہو گیا ڈر میگزین پر تبصرہ اب بات ہو جائے میری اس تحریر کی جو نومبر میں آپ نے شائع کی، میں نے آپ کو ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل کلام لکھ کے بھیجا لیکن آپ نے آدھے صفحے والا شائع کیا براہ کرم میری آپ سے ریکویسٹ ہے کہ اس کلام کو دسمبر کے شمارے میں مکمل شائع کریں، مہربانی ہوگی مزید اس دفعہ خط کے ساتھ دسمبر کے موضوع کا کلام آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہے۔ میرے دونوں کلام شائع کر کے مشکور فرمائیں۔

☆☆ آصف صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے تھینکس۔ غزلوں کے لئے چند صفحات مخصوص ہیں۔ آپ پلیز! اتنی بڑی غزل ارسال نہ کیا کریں۔ امید ہے آپ ہماری مجبوری کو مدنظر رکھیں گے۔ شکریہ۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ نمبر 2012ء ایک عجیب و غریب سج دھج کے ساتھ جلوہ گر ہو کر قارئین کے ہاتھوں کی زینت بن رہا ہے۔ اس میں شائع ہونے والا مواد اپنی منفرد نوعیت کی شاہکار لاجواب خوفناک

اور ڈراؤنی کہانیاں، اعلیٰ پایہ کے شعرا کے کلام، قرآن کی باتیں، چٹکلے اور گوہر نایاب سلسلے اور سرورق رنگین کے ساتھ ساتھ حاضر خدمت ہے لیکن افسوس میری کہانی ڈاکو حسینہ ردی کی ٹوکری کی نظر ہوگئی۔

☆☆ واجد صاحب: دراصل آپ کی ڈاکو حسینہ، اس موضوع پر پہلے بھی تحریر شائع ہو چکی ہے اور اس پر فلم بھی بن چکی ہے۔ آپ کوئی اور بار ر کہانی ارسال کریں۔ اس کے لئے شکریہ قبول کیجئے۔

عامر ملک راولپنڈی سے، آداب، خدا کرے آپ بہ خیریت ہوں۔ دو تحریریں ارسال کررہا ہوں، امید ہے شائع ہوجائیں گی۔ نومبر کا ڈر ڈائجسٹ پڑھا۔ ہر تحریر نگینے کی طرح فٹ ہے اور ڈر ڈائجسٹ کو چار چاند لگا رہی ہیں۔ ڈر کے معیار کا اب کوئی بھی پرچہ مارکیٹ میں نہیں ہے اور یہ سب آپ سب لوگوں کی محنت اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ آپ ہر تحریر کو توجہ سے پڑھتے اور سنوار کر شائع کرتے ہیں۔ اور پھر اعزازی پرچہ بھی بھیجتے ہیں۔ میری تحریر تقریباً ہر ماہ ہی شائع ہوتی ہے اور آپ پرچہ بھی بھیجتے ہیں۔ آخر میں ڈر ڈائجسٹ کی ترقی کے لئے شب و روز دعا گو ہوں۔

☆☆ عامر صاحب: خلوص نامہ اور کہانیوں کے لئے ویری ویری تھینکس، دراصل ہر ادارے کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں ورنہ تو...... ماشاء اللہ آپ ویسے بھی بہت براڈ مائنڈ ہیں۔

محسن علی جٹ فرید ٹاؤن ساہیوال سے، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، آپ کے رسالے ڈر کا کافی پرانا قاری ہوں امید ہے خوش آمدید کہیں گے۔ آپ کا ڈر ڈائجسٹ میری تنہائی کا سب سے بہترین ساتھی ہے۔ آج میں نے سوچا کیوں نا خاموشی کو توڑا جائے اور اپنے پرستار ہونے کا احساس دلایا جائے۔ ڈر ڈائجسٹ کی دو کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں ایک جادوگر دوسری رولوکا جب کہ جادوگر خرید چکا ہوں۔ میری رولوکا کے رائٹر سے ایک گزارش ہے کہ وہ اپنی کہانی کا END جب بھی کریں زبردست قسم کا کریں جس کو پڑھ کر سب حیران رہ جائیں۔ اب ماہ نومبر 2012 کے شمارے پر بات کی جائے تو سب سے بیسٹ رولوکا اور درندگی رہی۔ باقی ڈائجسٹ بھی اپنے ٹائٹل کی طرح خوفناک اور ڈراد ینے والا تھا۔ اور ہاں میری طرف سے تمام ڈر کے اراکین کو ڈر کی سالگرہ مبارک۔ ڈر کے قارئین میرے لیے دعا کریں کہ میرے کان ٹھیک ہوجائیں دراصل کچھ عرصہ 22 فروری سے پہلے میری سماعت چلی گئی ہیں۔ اس لیے میں نے شروع میں کہا کہ ڈر میری تنہائی کا بہترین ساتھی ہے۔ اور مزید اجازت درکار تھی کہ اگر میں کوئی کہانی ارسال کروں تو کیا آپ اس کو شامل اشاعت کریں گے یا نہیں امید ہے آپ اپنے اس پرانے قاری کا دل نہیں توڑیں گے۔ اسی کے ساتھ اجازت دیں اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے اور اس کو کسی کی نظر نہ لگے۔ (آمین)

☆☆ محسن صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا کرم کرے تاکہ آپ کے کان ٹھیک ہو جائیں۔ دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے، آپ بھی اللہ کے آگے سجدہ کیا کریں۔

رانا حبیب الرحمٰن گوجرہ سے، السلام علیکم امید ہے ڈر ڈائجسٹ کا تمام اسٹاف بخیریت ہوگا ماہنامہ ڈر اکتوبر کا 29 تاریخ کو ملا اس دفعہ سالگرہ نمبر پر بہترین رہا اس ماہ آنے والی کہانیوں میں داری، مافوق الفطرت، رولوکا، خاموشی، جھوٹی کہانی، آتما کی خواہش، سنہری تابوت، دلہن، انوکھی کتھا، بلیک ٹائیگر، پراسرار سائے، ڈر کے عین مطابق تھیں، قوس قزح اور غزلیں بھی شاندار تھیں جناب ایڈیٹر شاہد صاحب میں نے دو کہانیاں اور اشعار کے ساتھ غزلیں بھیجی تھیں کہانیوں میں نمبر 1 کنیوں کے شیطان، نمبر 2 جنوں کا مسکن بھیجی تھی لیکن دونوں میں کوئی بھی شائع نہیں ہوئی اور رہی غزلیں یا اشعار وغیرہ شائع ہوئے ہیں اب یہ بہانا مت بنانا کہ ہمیں ملے نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے امید ہے آپ دوبارہ تلاش کرکے ضرور کہانیاں شائع کردیں گے اس خط کے ساتھ ساتھ میں اور غزل اور شعر تحریریں بھیج رہا ہوں امید ہے آئندہ شمارے میں سب چیزیں شائع ہوجائینگی۔ انتظار رہے گا۔

☆☆ حبیب صاحب: دونوں کہانیاں بہت چھوٹی اور ٹھیک نہیں، آپ کوشش کریں اور نئی کہانیاں ارسال کریں۔ لکھتے لکھتے آدمی لکھاری بنتا ہے۔ باقی باتیں آپ خود سمجھ جائیں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

احسان سحر میانوالی سے، السلام علیکم امید کرتا ہوں ڈر کا تمام اسٹاف خیریت سے ہوگا تمام لکھنے والوں پڑھنے والوں کو پیار بھرا سلام، ڈر حسب معمول 20 تاریخ کو ملا وہ بھی ڈھلتی شام کے سائے میں ٹائٹل اگر سالگرہ نمبر کے حوالے سے سجاوٹ پر مبنی ہوتا تو اچھا لگتا تھوڑی سی محنت سے سالگرہ نمبر کا ٹائٹل بنا دیتے تو چار چاند لگ جاتے۔ خیر اب تو اسی چاند پر گزارا کرنا پڑے گا۔ اسٹوریز کا انتخاب

معیاری رہا، سپر تھری اسٹوریز میں پہلے نمبر پہ "داری" رہی۔ ناصر محمود فرہاد کو میری طرف سے مبارک ہو دلچسپ اور تاریخ سے روشناس کراتی اپنی مثال آپ تھی دوسرے نمبر پہ "بھول بھلیاں" رہی۔ قاسم رضا نے اچھا پلاٹ منتخب کیا۔ تیسرے نمبر پر خونی کھیل شائستہ سحر رہی۔ معاشرتی کہانی اور ٹھوس اور تلخ حقیقت جو ہمارے معاشرے میں بکھری ہوتی تلخیوں کو روشناس کررہی تھی۔ باقی سب بھی اچھی تھیں جن میں انوکھی کتھا۔ پراسرار سائے، ادھورا سفر۔ دلہن، غلطی اعداد کا رقص اور خوشی رہی، دو عدد اسٹوریز حاضر ہیں قابل اشاعت ہوں تو شائع کردیجئے گا۔ شکریہ

☆☆ احسان صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، کہانی شامل اشاعت ہے، موضوع کو مدنظر رکھتے ہوئے کہانیاں ارسال کریں، امید ہے آئندہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

غلام نبی نوری کھڈیاں خاص سے، سب سے پہلے ڈر کے تمام اسٹاف، قارئین اور رائٹرز حضرات کو سلام اور دل کی اتھاہ گہرائیوں سے عید مبارک، نومبر 2012 کا شمارہ بہت لیٹ ملا، سرورق نہایت شاندار تھا، فہرست دیکھ کر رونا آ گیا کیونکہ ہماری کہانی شامل اشاعت نہ تھی۔ ساڈا کی قصور اے؟ اس کے بعد قرآن کی باتیں پڑھیں، دل نور سے منور ہوگیا، خطوط میں اپنا خط دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا خیر! آپ سے پرزور درخواست ہے کم از کم ہمارے خط میں جن کہانیوں کی تعریف کی ہو یا جن کا شکریہ ادا کیا ہو وہ تو شائع کیا کریں۔

☆☆ غلام نبی صاحب: خط اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ کوئی اور کہانی ارسال کریں تو زیادہ بہتر ہوگا خط اگر زیادہ طویل ہوتا ہے ایک حد سے آگے تو مجبوری ہوتی ہے۔ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

عثمان غنی پشاور سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کا تمام اسٹاف خیر خیریت سے ہوگا اور بڑی عید کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوا ہوگا، ماہ نومبر کا ڈر، ڈائجسٹ مہینے کی 24 تاریخ کو موصول ہوا۔ اور ہمیں بہت اچھا لگا۔ کیونکہ عید سے پہلے مل گیا۔ قسط وار اسٹوریز اچھی انداز میں آگے بڑھ رہی ہیں، بلیک ٹائیگر کی یہ قسط اچھی رہی۔ رولوکا بھی ٹھیک رہی۔ سنہری تابوت بھی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ تحریروں میں درندگی، انتباہ، پراسرار ہوسٹل، چھپا۔ وغیرہ اچھی تحریریں تھیں۔ جب کہ ٹاپ تھری تحریریں جو میری نظر میں رہیں وہ نمبر 1 پر، آگہی کا سفر، رہی ساجدہ راجا، مبارک ہو، نمبر 2 پر صفحہ نمبر 310 مدثر بخاری۔ اور نمبر تھری پر گمشدہ۔ عمران قریشی کی تحریر رہی۔ اس خط کے ہمراہ۔ اپنی کہانی "یادداشت" بھیج رہا ہوں۔ پلیز اگر اچھی لگے، تو اصلاح کرکے شائع کرنا مشکور رہوں گا، اور کچھ دیگر آرٹیکل وغیرہ بھی بھیج رہا ہوں، ڈر، کو خدا مزید ترقیاں عطاء فرمائیں۔

☆☆ عثمان غنی صاحب: کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوگی تو اصلاح کرکے شائع کردی جائے گی۔ ایک کہانی ارسال کرکے انتظار نہ کیا کریں، ہوسکتا ہے کہ ارسال شدہ کہانی معیار کی نہ ہو تو لہٰذا دوسری کہانی ارسال کردینی چاہئے، خیر آئندہ ماہ بھی آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

شعیب سعید کراچی سے، میں بچوں کے رسالوں کا لکھاری ہوں اور بہت سے رسالوں میں میری تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مگر کچھ دن پہلے بازار گیا تو ڈر کے ہارر ٹائٹل پر نظر پڑی نظر کیا پڑی جناب نظریں ہی جم گئیں پسند آیا اور فوراً خرید کر گھر لے آیا ایسا زبردست لگا کہ ایک ہفتے میں ہی پورا ڈائجسٹ پڑھ ڈالا۔ کیا خوبصورت ڈائجسٹ ہے۔ پڑھ کر مزہ آ گیا ہاں مگر یہ ہے کہ پوری رات نیند نہیں آئی جن، بھوت، چڑیلیں دماغ میں گھومتی رہیں میں نے اور بھی بہت سے ڈائجسٹ پڑھے ہیں ہارر نام نہیں لینا چاہتا مگر ان میں سوائے اول فول کے کچھ بھی نہیں ہوتا مگر ایسا معیاری ڈائجسٹ دیکھا تو دل خوش ہوگیا۔

☆☆ شعیب صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید جناب ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اس امید کے ساتھ کے آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری وساری رہے گا۔

قارئین: ہر تحریر الگ الگ کاغذ پر لکھا کریں، ہر تحریر پر اپنا اور اپنے شہر کا نام لکھنا نہ بھولیں۔ بار بار یاد دہانی کے باوجود ابھی تک بہت سے کہانی رائٹر حضرات نے اپنا موبائل نمبر ارسال نہیں کیا۔ پلیز! آئندہ اپنا موبائل نمبر ضرور ارسال کریں تاکہ وقت ضرورت کہانی کے متعلق بات ہوسکے۔ شکریہ۔
(ادارہ)

خونی روح

شہزادہ چاندزیب عباسی - کراچی

اچانک کمرے کی لائٹ بجھتے ہی بے شمار خونخوار چوھوں نے کمرے میں موجود نوجوان پر حمہ کردیا نوجوان کی فلک شگاف چیخوں سے کمرہ دہل گیا، چوھوں نے پلک جھپکتے ہی نوجوان کو بھنبور کر رکھ دیا تھا۔

دلوں میں خوف بٹھاتی اور لرزہ براندام کرتی ناقابل فراموش دل گرفتہ تحیر انگیز کہانی

جابر خان کی آنکھیں کھلیں تو وہ گھبرا اٹھا۔ اس کے چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے ایک دم اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھتے ہی اس کا سر اوپر کسی سخت چیز سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے کراہ نکلی وہ اپنے سر کو پکڑے ہوئے اٹھ بیٹھا، چاروں طرف گھپ اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔

اس نے دونوں ہاتھوں سے ٹٹول کر جگہ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ تب اس پر یہ بھیانک انکشاف ہوا کہ وہ ایک قبر میں موجود ہے، اس کے رگ وپے میں خوف کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اب وہ اپنے جسم کو دونوں ہاتھوں سے ٹٹول رہا تھا۔ جسم میں جہاں جہاں اس کا ہاتھ لگتا اس کے حلق سے کراہیں نکلنے لگتیں۔ اس کے جسم میں جگہ جگہ زخم موجود تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی نے اسے نہایت بے رحمی سے زخم دیا ہے۔ اس کا سر درد کی شدت سے پھٹا جارہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں اور پھر پشت سے زور لگا کر قبر کے اوپر رکھی سیمنٹ کی سلیپ ہٹانے کی کوشش کی۔ سلیپ تو نہ ہٹی پر ایک درز سے مٹی نیچے گرنے لگی۔ وہ اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔ چند لمحوں تک وہ آنکھیں مسلتا رہا۔ بالآخر آنکھیں موند کر قبر کی ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اسے لگا کہ کسی بھی لمحے وہ پسلیوں سے باہر آجائے گا۔ نہایت ہی خطرناک صورتحال تھی۔ اس اندھیری قبر سے نکلنا اس کے بس سے باہر تھا۔ ایک دم اسے اپنے سر اور چہرے پر نمی کا احساس ہوا، اس نے محسوس کیا گیلی مٹی پانی کے ساتھ اس کے سر اور چہرے پر گر رہی ہے۔

یہ ایک نئی مصیبت تھی لگتا تھا بارش ہو رہی تھی۔ بارش کا پانی سلیپ کی کسی درز سے قبر میں گر رہا تھا۔ اس نے سوچا اگر مسلسل بارش ہوتی رہی تو سلیپ اور منوں مٹی اس پر آگری تو کیا ہوگا۔ وہ لمحوں میں سچ مچ مرجائے گا۔

اس نے سوچا کوئی قرآنی آیت پڑھ کر اللہ سے مدد مانگے مگر اسے کوئی آیت یاد نہیں آرہی تھی اس نے دل ہی دل میں بچپن میں پڑھایا گیا سبق یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا اسے کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔ بھیانک اندھیرا اسے خوف زدہ کر رہا تھا۔ وہ سوچنے لگا کب تک اس اندھیری قبر میں بھوکا پیاسا زندہ رہے گا۔ اگر سانپ بچھو یا کوئی اور چیز قبر میں آگئی تو کیا ہوگا؟ اسے قبر کے بارے میں سنی گئی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہری دوڑ گئی۔

اس کا بدن ڈر سے کپکپانے لگا۔ کفن پر چھڑکی گئی کافور کی بو اس کے دماغ پر چھا رہی تھی۔ قبر میں آکسیجن برائے نام تھی۔ گھٹن کی وجہ سے اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ اسے کس نے زندہ قبر میں دفن کیا اور پھر سوچتے سوچتے اسے یاد آ گیا۔

☆......☆......☆

امیگریشن اور کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوتے ہی جابر خان چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ اسے اپنا بڑا بھائی سردار عبدالرحمٰن نظر آ گیا۔ دونوں آپس میں گلے ملے۔

''اللہ کا شکر ہے جو آج پندرہ سال بعد تمہارا چہرہ دیکھنے کو ملا۔ کیسے ہو تم اور تمہاری پڑھائی کیسی رہی؟'' لینڈ کروزر کی طرف بڑھتے ہوئے سردار عبدالرحمٰن نے پوچھا۔

اس اثنا میں ان دونوں کو آتے دیکھ کر ڈرائیور قادر خان نے پچھلا دروازہ کھولا۔ ''بس بگ برادر ٹھیک ٹھاک اور آپ کے سامنے ہوں مغربی ملک میں تمہارے بھائی نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے ہیں اب تمہارا بھائی بھی نامور سائنسدانوں کی لسٹ میں شامل ہے۔'' جابر خان لینڈ کروزر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ان دونوں کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

جابر خان تھوڑی دیر تک ارد گرد کے مناظر دیکھتا رہا۔ پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

''لگتا ہے لمبے سفر سے تھک گیا ہے۔'' عبدالرحمٰن اس کی طرف دیکھ کر پیار سے بولا۔ وہ سرحدی علاقے کے دور دراز کے گاؤں کا سردار تھا۔ سینکڑوں ایکڑ پر مشتمل ان کی زمینیں تھیں۔ جہاں پھل سبزیاں اور دوسری غذائی اجناس کاشت کی جاتی تھیں۔ گاؤں سے شہر آنے جانے کا ذریعہ بھی سردار عبدالرحمٰن کی ویگنیں تھیں۔ اس کے علاوہ شہر میں ساٹھ دکانوں پر مشتمل مارکیٹ تھی جس کا لاکھوں روپے ماہانہ کرایہ بھی ان کی آمدنی میں شامل تھا۔

سردار عبدالرحمٰن رحم دل اور انصاف پسند انسان تھا۔ وہ اپنے علاقے کے جرگے کا سربراہ بھی تھا۔ علاقے کے لوگ جو کہ ایک قسم کی اس کی رعایا یا مزارے جو بھی تھے اس کا ہر فیصلہ کھلے دل سے تسلیم کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے فیصلے انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتے تھے۔

والدین کی حادثاتی وفات کے بعد سردار عبدالرحمٰن نے اپنے سے 10 سال چھوٹے بھائی جابر خان کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ جابر خان بچپن ہی سے ذہین اور ہوشیار تھا۔ اسے پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ گاؤں سے پرائمری تک پڑھنے کے بعد اس نے قریبی اسکول کے قصبے سے میٹرک کیا۔ پھر شہر کے ایک پرائیویٹ کالج میں ایڈمیشن لے لیا۔ وہ ایک مہنگا کالج تھا۔ جہاں صرف امراء کے بچے پڑھتے تھے۔ اپنی ذہانت کے بل بوتے پر وہ کامیابی کے جھنڈے گاڑتا چلا گیا۔ پھر عبدالرحمٰن سے ضد کر کے بیرون ملک تعلیم کے لئے چلا گیا۔ عبدالرحمٰن خود صرف میٹرک پاس تھا مگر بھائی کو پڑھانے میں اس نے کوئی کوتاہی نہ کی۔

عبدالرحمٰن کے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ بڑا بیٹا سلیم اور دوسرے بیٹے کا نام وسیم، تیسرے نمبر پر بیٹی کا نام زیتون عرف زینی اور سب سے چھوٹے بیٹے کا نام سیف تھا۔

پندرہ سال بعد جابر خان پاکستان واپس آیا تھا۔ ان کی گاڑی گاؤں میں داخل ہوئی تو شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ جابر خان اپنے بھائی کے ہمراہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اس کی نظر اپنی بھابھی عائشہ 14 سالہ سلیم، 13 سالہ وسیم، گیارہ سالہ زینی اور دس سالہ سیف پر پڑی، عبدالرحمٰن نے ان کا آپس میں تعارف کروایا۔ وہ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ اس دوران کھانا لگ گیا۔ کھانا کھانے کے بعد جابر خان اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔

جابر خان کی آنکھ صبح دیر سے کھلی نہانے کے بعد فوراً ہی ایک ملازم ناشتہ لے آیا۔ عبدالرحمٰن کی حویلی میں فجر کی نماز پڑھتے ہی سب ناشتہ کر لیتے تھے۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ آج اس حویلی کے ایک کمرے میں کوئی دن

کے بارہ بجے ناشتہ کر رہا تھا۔ مغربی ملک میں رہ کر اس نے بھی انگریزی کے طور طریقے اپنا لئے تھے۔ نماز تو عرصہ ہوا اس نے پڑھی ہی نہ تھی۔ ناشتہ کرنے کے بعد اس نے ملازم سے گلاس برف اور پانی منگوایا اور اپنے بیگ سے شراب کی بوتل نکالی۔

وہ اس وقت شراب پی رہا تھا۔ جب بڑا بھائی عبدالرحمٰن اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ شراب کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھا اور بوتل میز پر رکھی تھی۔

یہ منظر دیکھتے ہی عبدالرحمٰن کا خون کھول اٹھا اس کا ہاتھ گھوما اور تھپڑ جابر خان کے گال پر پڑا۔ گلاس ہاتھوں سے چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ ''آپ کی ہمت کیسے ہوئی مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی۔'' جابر خان غصے سے لال پیلا ہوتا کھڑا ہو گیا۔

عبدالرحمٰن نے دوبارہ تھپڑ مارنا چاہا تو جابر خان نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ''بس بگ برادر بہت ہو چکا۔ اب اگر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میرا ہاتھ بھی اٹھ جائے گا۔''

''تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے۔'' عبدالرحمٰن کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میں نے شراب ہی تو پی ہے اس میں غلطی کیا ہے بڑے لوگ بس پیتے ہیں۔''

''شراب ہمارے مذہب میں حرام ہے اگر یہاں رہنا ہے تو تم اس ام الخبائث کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔'' عبدالرحمٰن نے غصے سے کہا۔

''تو ٹھیک ہے میں آج سے آپ سے الگ ہو جاتا ہوں میرا حصہ الگ کر دیں۔ میں گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع حویلی میں چلا جاتا ہوں۔'' جابر خان چلایا۔

شور شرابا سن کر اس کی بھابھی بھی کمرے میں آ گئی تھی۔ کمرے کا منظر دیکھ کر وہ حیران ہو گئی۔

جابر خان اسی دن گاؤں کے دوسرے سرے پر واقع حویلی میں چلا گیا۔ دونوں بھائیوں میں ناراضگی پیدا ہو گئی۔ اب وہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ تھے۔

جابر خان نے شہر سے 5 کاریگر بلوائے۔ اس نے حویلی میں ایک خفیہ تہہ خانہ بنوایا۔ تہہ خانے کے اوپر کمرے میں تجربہ گاہ بنائی اپنی اس تجربہ گاہ کو کمپیوٹر اور ہر قسم کی جدید سہولیات سے آراستہ کیا۔

جابر خان ایک دن ان پانچوں افراد کو بہانے سے تہہ خانے میں لے گیا۔ ''آپ ہمیں یہاں کیوں لائے ہیں؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''تاکہ تمہیں انعام دے سکوں۔'' یہ کہتے ہی جابر خان نے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ ''یہ...... کیا...... ہے؟'' ان میں سے ایک نے ہکلا کر پوچھا۔

''میں تم لوگوں کو زندہ چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا۔ تم لوگوں کے مرنے کے ساتھ ہی اس تہہ خانے کا راز پوشیدہ ہو جائے گا۔'' جابر خان نے ٹریگر دبانا شروع کر دیا۔ تہہ خانہ ان پانچوں کی آخری چیخوں اور گولیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ اس نے ان پانچوں کو حویلی میں گڑھے کھود کر دفنا دیا۔

اس واقعہ کے کچھ دن بعد جابر خان اپنی جیپ میں گاؤں میں گھوم رہا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کہ خاصی خوب صورت تھی رخسانہ نامی یہ لڑکی اپنے بھائیوں کے لئے کھانا لے کر جا رہی تھی جو کہ کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ جیپ لڑکی کے قریب روک کر وہ جیپ سے اترا۔ ''میرے ساتھ حویلی چلو۔'' وہ لڑکی کا بازو پکڑ کر اسے جیپ کی طرف کھینچنے لگا۔

''چھوڑو مجھے ورنہ شور مچا دوں گی۔'' رخسانہ نے اسے دھمکی دی۔

''جتنا شور مچا سکتی ہو مچاؤ۔'' وہ اسے گھسیٹنے لگا۔

رخسانہ چیخنے لگی رخسانہ کی چیخیں سن کر قریبی کھیتوں میں کام کرنے والے اس کے دونوں بھائی دوڑتے ہوئے آئے۔ ''چھوٹے سردار اسے چھوڑ دیں۔'' ان میں سے ایک بولا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا آج رات یہ میری ہے صبح اسے خود میں چھوڑ دوں گا۔'' جابر خان نے کہا۔ وہ دونوں نوجوان غصے سے اس کی طرف بڑھے جابر خان نے اپنے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔

''رک جاؤ۔ ورنہ گولی ماردوں گا۔'' مگر وہ نہیں رکے جابر خان نے ٹریگر دبادیا۔ فضا گولیوں کی آوازوں اور ان نوجوانوں کی چیخوں سے گونج اٹھی۔ جابر خان نے چیختی روتی رخسانہ کو اٹھایا اور جیپ میں ڈال کر اپنی حویلی لے گیا۔

سردار عبدالرحمٰن کی جیپ تیز رفتاری سے جابر خان کی حویلی کی طرف جارہی تھی جیپ میں اس کے ساتھ 4 مسلح افراد موجود تھے۔ انہیں جابر خان کے ہاتھوں دونوں نوجوانوں کے قتل اور رخسانہ کے اغوا کی خبر جیسے ہی ملی۔ عبدالرحمٰن فوراً جابر خان کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ ''تیز چلاؤ جلدی۔'' اس نے ڈرائیور کو تاکید کی، ڈرائیور نے جیپ کی رفتار بڑھادی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ان کی جیپ جابر خان کی حویلی کے باہر موجود تھی۔

عبدالرحمٰن نے جیپ سے اتر کر حویلی کا آہنی گیٹ دھکیلا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ ''تم چاروں اندر کود جاؤ اور لڑکی کو بچاؤ اگر جابر خان مزاحمت کرے تو اسے گولی مار دینا۔'' عبدالرحمٰن نے ہدایت کی ان چاروں نے رائفلیں اپنے کندھوں سے لٹکائیں اور جوتے اتار کر دیوار کے قریب پہنچے حویلی کی دیوار اونچی تھی ان میں سے ایک دیوار سے اپنے دونوں ہاتھ جما کر کھڑا ہوگیا بقایا تینوں باری باری اس کے کندھوں پر قدم جما کر دیوار پر چڑھے پھر انہوں نے نیچے والے کو بھی اوپر کھینچ لیا۔

منڈیر سے سر نکال کر احتیاط سے چھت پر دیکھا کوئی ذی نفس موجود نہ تھا اپنی گنوں کو فائرنگ پوزیشن دے کر بنا آواز نکالے دبے پاؤں چھت پر پہنچے۔ صحن کی جانب والی منڈیر پر آئے۔ ایک نے آہستگی سے جھانک کر صحن میں دیکھا صحن سنسان پڑا تھا صحن کے اختتامی حصے میں سیڑھیاں تھیں وہ سیڑھیاں اترنے لگے اسی لمحے اندر کمرے سے گولی چلنے کی آواز اور لڑکی کی چیخ سنائی دی تو وہ دوڑتے ہوئے کوریڈور میں داخل ہوگئے۔ دائیں بائیں قطار میں کمرے تھے۔ سوائے ایک کمرے کے کسی کمرے میں روشنی نہ تھی وہ بھاگتے ہوئے روشن کمرے کے دروازے پر جا پہنچے۔ دروازہ ہلکا سا کھولا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے لات مار کر دروازہ کھلا کمرے کے فرش پر رخسانہ پھٹے ہوئے کپڑوں میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کے سینے سے خون بہہ کر کمرے کے فرش پر جمع ہورہا تھا، قریب ہی جابر خان تھا۔ جس کے دائیں ہاتھ میں پستول موجود تھا۔ رائفل برداروں نے جابر خان پر رائفلیں تان لیں۔

''جابر خان پستول پھینک دو ورنہ سردار کا حکم ہے مزاحمت کی صورت میں تمہیں گولی ماردی جائے۔'' ایک رائفل بردار بولا اور جابر خان نے پستول فرش پر پھینک دی۔ ایک نے لڑکی کی لاش اٹھائی اور جابر خان کو رائفلوں کی زد میں لئے حویلی سے باہر آگئے۔ جابر خان کی حویلی کے باہر گاؤں والے سارے جمع تھے۔

''سردار مال کے بدلے مال اور جان کے بدلے جان اس گاؤں کا قانون ہے۔'' لڑکی کا باپ آگے بڑھ کر بولا اور سب گاؤں والے جابر خان پر پل پڑے۔ چاروں طرف سے لاتیں گھونسے، لاٹھیاں اس کے جسم پر پڑنے لگیں۔

سردار عبدالرحمٰن ساکت کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ گاؤں والے اس وقت تک جابر خان کو مارتے رہے جب تک جابر خان کا جسم ساکت نہ ہوگیا۔ جابر خان کے مرتے ہی وارث کے طور پر عبدالرحمٰن نے جابر خان کو گاؤں کے قبرستان میں دفنادیا۔

☆......☆......☆

دس سال بعد اٹھارہ سالہ کاشف جابر خان کی حویلی کے قریب بکریاں چرارہا تھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ اچانک اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئیں کیونکہ اس کے سامنے ایک کفن پوش مردہ کھڑا تھا۔ کفن پوش مردہ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ کاشف خوف سے کانپنے لگا، مردے نے کاشف کے منہ کی طرف ہاتھ بڑھایا ایک تیز سی خوشبو اس کے دماغ پر

چھائی اور وہ بے ہوش ہوگیا۔ مردے نے زمین پر پڑے کاشف کو اٹھایا اور کندھے پر ڈال کر ایک سمت بڑھنے لگا۔ چلتے چلتے وہ جابر خان کی حویلی تک جا پہنچا۔ مردے نے گیٹ دھکیل کر کھولا اور اندر داخل ہوگیا وہ چلتا ہوا کوریڈور میں جا پہنچا کوریڈور میں دائیں طرف بنے تیسرے کمرے میں داخل ہوا وہ ایک کشادہ کمرہ تھا۔ ایک طرف کونے میں کمپیوٹر رکھا تھا۔ کمپیوٹر کے سامنے ایک کرسی رکھی تھی کمرے کی دیواروں کے ساتھ مختلف ریک تھے۔ ریکوں میں ہر قسم کی چھوٹی بڑی بوتلیں اور مختلف جار تھے۔ بوتلوں میں محلول نما سیال موجود تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کوئی تجربہ گاہ ہو۔ ایک طرف دیوار پر ایک تصویر ٹنگی تھی۔ وہ جابر خان کی تصویر تھی۔ مردے نے تصویر کے فریم کے پیچھے ہاتھ ڈالا تو اچانک کمرے کا فرش ایک جگہ سے 4 فٹ کے قریب کھل گیا۔ وہ کھلی ہوئی جگہ 4x4 تھی نیچے سیڑھیاں جارہی تھیں۔ مردے نے کاشف کو سیڑھیوں سے لڑھکا دیا اور دوبارہ تصویر کے پیچھے ہاتھ مارا کمرے کا فرش دوبارہ اپنی جگہ پر آگیا۔ تھوڑی دیر بعد کاشف ہوش میں آگیا ہوش میں آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے بے ہوش ہونے سے پیشتر کا واقعہ گھومنے لگا یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ ایک طرف سیڑھیاں اوپر کی طرف جارہی تھیں سیڑھیوں کے اختتام پر چھت تھی، کمرے سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حیرت انگیز بات یہ بھی تھی کہ کمرے کا فرش نہ تھا۔ جگہ جگہ سے زمین میں لاتعداد سوراخ تھے یوں لگ رہا تھا یہ کسی چیز کے بل ہوں۔ کمرے سے عجیب سی بساند آرہی تھی۔ کمرے کے مشرقی دیوار پر دو بلب روشن تھے۔

اچانک بلب آف ہوگئے کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ چند منٹ بعد ہی کمرے سے سرسراہٹ اور عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ کاشف کی ڈر کے مارے چیخیں نکل گئیں اس کے چیختے ہی کمرے کی زمین پر بھگدڑ سی مچ گئی۔ اسی لمحے کاشف کو اپنی پنڈلی میں شدید تکلیف کا احساس یوں محسوس ہورہا تھا کسی نے اس کی پنڈلی سے گوشت نوچ لیا ہو۔ کاشف نے چیختے ہوئے اپنی پنڈلی سے چپکی چیز کو پکڑا تو خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ ایک موٹا تازہ چوہا تھا۔ چوہے نے اب اس کے ہاتھ پر دانت گاڑھ دیئے اچانک کاشف کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے لباس میں ڈھیر سارے چوہے گھس گئے ہوں۔ کاشف نے اپنے ہاتھ سے چپکے چوہے کو جھٹک کر پھینکا اور چیختے ہوئے کمرے میں چاروں طرف بھاگنے لگا۔ کمرہ اب چوہوں کی مکروہ آوازوں اور کاشف کی خوفزدہ چیخوں سے گونج رہا تھا۔ چوہے اس کے پاؤں تلے آکر کچلے جارہے تھے۔ مگر چوہے یہاں وافر مقدار میں تھے رفتہ رفتہ کمرے میں چوہے بھرتے جارہے تھے کاشف کے جسم کے ہر حصے سے چوہے چپکے ہوئے تھے اس کا جسم جگہ جگہ سے زخمی ہورہا تھا۔ اس کے زخموں سے بہنے والے خون کی بو سے چوہے وحشی ہوچکے تھے بالآخر کاشف لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اب چوہے کاشف کے جسم پر چھا چکے تھے۔ کاشف کی قوت مدافعت رفتہ رفتہ کم پڑتی جارہی تھی۔ اچانک اسے اپنی بائیں آنکھ میں شدید تکلیف محسوس ہوئی ایک چوہے نے اس کی بائیں آنکھ میں دانت گاڑھ دیئے تھے۔ اس کی گردن سے چپکے چوہوں نے جیسے ہی اس کی شہہ رگ میں دانت پیوست کئے اس کا سانس اکھڑنے لگا۔ چوہے اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھارہے تھے۔ اب کمرے میں صرف چوہوں کی مکروہ آوازیں تھیں چند گھنٹوں بعد بلب روشن ہوگئے۔ روشن ہوتے ہی چوہے اپنے بلوں کی طرف بھاگنے لگے۔ وہ تقریباً بلی کے سائز کے چوہے تھے کچھ منٹ بعد تہہ خانہ خالی ہوگیا۔ اب زمین پر کاشف کا ڈھانچہ پڑا تھا۔ وہ منظر نہایت ہی خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔

☆......☆......☆

مرحوم جابر خان کی حویلی سے نصف کلومیٹر کے فاصلے پر جھنڈے شاہ کا سنگ مرمر سے بنا ہوا مزار سورج کی کرنوں سے جگمگا رہا تھا۔ مزار کے اطراف میں

پھولوں اور چادروں کی دکانیں تھیں۔ جہاں سے عقیدت مند پھول اور چادریں خرید کر جھنڈے شاہ کی قبر پر چڑھاتے تھے۔ وہ مزار چونکہ بلندی پر تھا اس لئے مزار کے مشرق و مغرب دونوں اطراف میں مزار پر جانے کے لئے سنگ مرمر کی سیڑھیاں بنی تھیں 12 سال قبل سائیں خدا بخش اور جھنڈے شاہ کہیں سے گھومتے گھماتے اس گاؤں میں آن پہنچے تھے یہاں آ کر انہوں نے گاؤں والوں کے تعاون سے جھونپڑی بنالی، نام اس کا کسی کو پتہ نہیں تھا۔ سائیں خدا بخش کے دیکھا دیکھی سب اس کو جھنڈے شاہ کہنے لگے تھے۔ جھنڈے شاہ گاؤں کے حاجت مندوں کو تعویذ بھی دیتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ بھی نہیں مانگتا تھا۔ جو کوئی بھی کچھ دیتا لے لیتا جو نہ دیتا اس سے مانگتا ہی نہ تھا۔ تین سال بعد جھنڈے شاہ کا انتقال ہوگیا۔ ایک رات وہ ایسا سویا کہ اٹھ ہی نہ سکا۔ اس کے ساتھی خدا بخش نے لوگوں کو تعویذ دینا شروع کردیئے۔ پہلے اس نے جھنڈے شاہ والی روٹین رکھی رفتہ رفتہ اس نے لوگوں سے معاوضہ لینا شروع کردیا جو پہلے کم تھا پھر رفتہ رفتہ وہ اپنے معاوضے میں اضافہ کرتا چلا گیا۔

اس دوران اس نے مزار کے نام سے چندا مہم شروع کردی عبدالرحمٰن اور کچھ دوسرے بااختیار پیسے والے لوگوں کے تعاون سے اس نے جھنڈا شاہ کی قبر پر مزار بنوالیا اب ہر ہفتہ یہاں قوالیاں ہوتی تھیں اور لنگر تقسیم ہوتا تھا۔ خدا بخش نے اپنے گرد نصف درجن ہٹے کٹے چیلے بھی رکھ لئے تھے اس وقت مزار پر خاصی رونق تھی مزار کے ایک کمرے میں عبدالرحمٰن اپنے بیٹوں 29 سالہ سلیم اور 28 سالہ وسیم اور گاؤں کے چند بزرگوں کے ہمراہ موجود تھا۔ سامنے سائیں خدا بخش بیٹھا تھا۔

"سائیں کئی سالوں سے ہمارے گاؤں سے کوئی نہ کوئی نوجوان بچہ یا عورت غائب ہوجاتی ہے۔ دوسرے دن اس کا گوشت سے محروم ڈھانچہ ملتا ہے۔ پہلے یہ سلسلہ بہت دنوں بعد ہوتا تھا، اب یہ سلسلہ جلدی جلدی ہورہا ہے۔ میں نے جگہ جگہ مسلح افراد کا پہرہ بٹھایا۔ مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کئی بار آپ سے بھی رابطہ کیا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ گاؤں کے کئی لوگوں نے ایک کفن پوش مردہ بھی دیکھا ہے جو ایک دم غائب ہوجاتا ہے۔ ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ کچھ کریں ورنہ یہ نامعلوم عفریت پورے گاؤں کو نگل لے گا۔" عبدالرحمٰن درد بھرے لہجے میں بولا۔

"سردار آپ فکر نہ کریں، میں نے پہلے بھی بہت کوششیں کیں اب بھی اپنے علم کا پورا زور لگاؤں گا اب میں ایک خاص چلہ کاٹوں گا امید ہے کچھ نہ کچھ کرلوں گا۔ سائیں خدا بخش نے کہا اور وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے سلام کرکے کمرے سے نکلے اور سیڑھیاں اتر کر مزار کی حدود سے باہر آگئے۔

"ابا جان آپ نے عقیدت میں آ کر اس پیر سے بے جا امیدیں وابسطہ کرلی ہیں مجھے تو یہ کوئی جعلی پیر لگتا ہے جو لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا ہے۔" گریجویٹ وسیم ناگوار لہجے میں بولا۔

"خبردار وسیم تم پیر سائیں کے بارے میں کچھ برا بھلا نہ کہو گے تم پیر صاحب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، ان کی دعاؤں اور تعویذوں سے اس گاؤں اور آس پاس کے دوسرے گاؤں دیہاتوں کے لوگوں کی دلی مرادیں پوری ہوئی ہیں۔" عبدالرحمٰن کے لہجے میں عقیدت تھی۔

"ابا جان اس قسم کے پیر بہت ہوشیار ہوتے ہیں یہ لوگوں کو تعویذ دیتے ہیں۔ اللہ اپنے ہر بندے کی سنتا ہے جو سچے دل سے اللہ سے مانگتا ہے اللہ اسے ضرور عطا کرتا ہے۔ اس قسم کے جعلی پیر گاؤں والوں کی سادہ لوحی سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔" وسیم لینڈ کروزر میں بیٹھتے ہوئے بولا۔

ان کی لینڈ کروزر اب گاؤں کی کچی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔ اسی لمحے عبدالرحمٰن کے موبائل فون کی بیل بجی۔ انہوں نے جیب سے موبائل فون نکالا۔ اسکرین پر کال کرنے والے کا نمبر دیکھا اور کال ریسیو کی۔

"السلام علیکم کیسی ہو زینی بیٹا۔"

"پاپا میں اور سیف دونوں ٹھیک ہیں۔ اگلے سال انشاء اللہ ہم تعلیم مکمل کرکے اپنے پیارے ملک پاکستان میں ہوں گے۔" دوسری طرف سے بیٹی زیتون عرف زینی کی چہکتی ہوئی آواز ابھری۔ دونوں بھائی کیسے ہیں" زینی نے پوچھا۔

"وہ دونوں بھی ٹھیک ہیں اور تم دونوں کو یاد کرتے ہیں۔" چند لمحے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد زینی نے خدا حافظ کہہ کر موبائل آف کردیا۔

زیتون عرف زینی اور سیف دونوں تعلیم کے سلسلے میں لندن گئے تھے سیف انجینئرنگ اور زینی سائنسی تعلیم حاصل کررہی تھیں اپنی ذہانت کے بل بوتے پر زینی نے تعلیمی میدان میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں۔ اور بیرون ملک پاکستان کا نام روشن کیا تھا۔" ابا جان آپ نے زینی کو یہاں کے حالات سے باخبر نہیں کیا۔" وسیم بولا۔

"نہیں تم لوگ بھی اسے کچھ نہیں بتاؤ گے تاکہ وہ اور سیف دونوں بے فکری سے اپنی تعلیم مکمل کرسکیں ایک سال کی تو بات ہے پھر وہ دونوں یہاں ہوں گے۔" عبدالرحمٰن نے اپنے بیٹوں کو ہدایت کی اس دوران ان کی لینڈ کروزر حویلی کے گیٹ پر پہنچ گئی۔

☆......☆......☆

رات کے 10 بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کے چند نوجوان گاؤں کے گرد پہرہ دے رہے تھے ان نوجوانوں میں سردار عبدالرحمٰن کا بیٹا وسیم بھی شامل تھا۔ کاشف والے واقعہ کو ایک مہینہ بیت چکا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک امن تھا۔ اس کے باوجود گاؤں والے چوکنا تھے یار میں تھوڑا کھیتوں میں جارہا ہوں۔ وسیم اپنے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی نمایاں کرتے ہوئے بولا اور قریبی درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھا وہ جیسے ہی درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوا اس کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ایک کفن پوش مردہ جس کا چہرہ بھی کفن سے ڈھکا ہوا تھا اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وسیم نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھا کر ریوالور نکالنا چاہا اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اسے یوں لگا پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر کوئی ٹھوس چیز ماری ہو وہ لہرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ اس کے عقب میں ایک سوا چھ فٹ کا صحت مند شخص نقاب پہنے کھڑا تھا۔ وسیم کے بے ہوش ہوتے ہی نقاب پوش نے وسیم کو اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

نقاب پوش اور کفن پوش مردہ دونوں جابر خان کی حویلی کی طرف بڑھنے لگے۔ وسیم کو ہوش آیا تو وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا یہ ایک ہال نما کمرہ تھا۔ فرش کے بجائے یہاں کچی زمین تھی جس میں جگہ جگہ بل نما چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے۔ تفصیل سے جائزہ لینے پر اس پر انکشاف ہوا کہ وہ ایک ایسے تہہ خانے میں قید تھا۔ جس کا کوئی دروازہ نہ تھا کمرے کی دیوار پر بلب روشن تھے۔ "کون ہو تم اور مجھے کیوں اغوا کیا ہے؟" وسیم بلند آواز میں چلایا۔

"میں جابر خان کی روح ہوں جب تک اس گاؤں کا ایک مرد بھی زندہ ہے چین سے نہیں بیٹھوں گا۔" میں سب کو بھیانک موت ماروں گا۔ یہ جو زمین میں سوراخ ہیں یہ آدم خور چوہوں کے بل ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں جیسے ہی اندھیرا ہوگا چوہے تمہیں نوچ نوچ کر کھا جائیں گے۔" تہہ خانے میں ایک کھرکھراتی ہوئی آواز گونجی۔

"مگر جابر خان تو میرے انکل تھے اگر تم ان کی روح ہو تو اپنے بھتیجے سے ایسا سلوک کیوں کررہے ہو؟"

"میرے قتل میں تمہارا باپ بھی شریک تھا۔" آواز دوبارہ ابھری۔ "تم نے تین معصوم انسانوں کا قتل کیا تھا جس کی سزا کے طور پر گاؤں والوں نے تمہیں مارا مجھے ابا جان نے سب کہانی بتائی تھی وسیم نے کہا۔ لڑکے کلمہ پڑھ لو جابر خان کی روح نے کہا اس کے ساتھ ہی تہہ خانے میں اندھیرا چھا گیا۔ وسیم نے اپنی جیبیں ٹٹولیں۔ اس کی جیبوں سے موبائل فون سمیت ہر چیز نکال لی گئی تھی ہولسٹر سے ریوالور بھی غائب تھا۔ اچانک کمرے میں چوہوں کی مکروہ آوازیں گونجنے لگیں۔ وسیم چوکنا ہوگیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اسے اپنی

ٹانگوں پر کسی چیز کے رینگنے کا احساس ہوا یہ موٹے تازے چوہے تھے وسیم ایک چوہے کو پھینکتا تو 10 چوہے مزید اس پر چڑھ جاتے وسیم نے اندھیرے کمرے میں ادھر ادھر دوڑنا شروع کردیا بھاگتے بھاگتے اسے اپنی گردن کی پچھلی سائیڈ میں سخت تکلیف کا احساس ہوا ایک چوہے نے وہاں دانت گاڑ دیئے تھے۔ وہ چیخا، چوہے کو کھینچ کر ایک طرف پھینکا۔ اچانک اندھیرے میں بھاگتے ہوئے وہ کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور گر پڑا۔ چوہوں کے لئے یہ لمحہ کافی تھا وہ اس کے جسم پر چھا گئے۔ وسیم حلق کے بل تکلیف سے چیخ اور چلا رہا تھا۔

آدم خور چوہے اسے جگہ جگہ سے کاٹ رہے تھے۔ وسیم نیچے گرا لاتیں جھٹک رہا تھا اور ہاتھوں سے اپنے جسم سے چپکے چوہوں کو پھینکنے کی ناکام کوشش کررہا تھا۔ چوہے اب اس پر حاوی ہوچکے تھے، وسیم کے جسم کے ہر حصے سے خون بہہ رہا تھا۔ اسی لمحے ایک چوہے نے اس کی شہہ رگ میں دانت گھسیڑ دیئے دوسرے چوہے نے اس کی آنکھ میں دانت گھسیڑ دیئے وسیم کی آخری چیخیں بہت دردناک تھیں۔ اب چوہے سکون سے اس کا گوشت کھا رہے تھے۔ ان کا شکار مر چکا تھا۔ چند گھنٹوں بعد جب روشنی ہوئی تو تہہ خانے میں وسیم کا گوشت سے محروم ڈھانچہ پڑا تھا روشنی ہوتے ہی چوہے وسیم کے ڈھانچہ سے نکل کر اپنے بلوں کی طرف بھاگنے لگے۔ یہ منظر اگر کوئی آنکھ دیکھ لیتی تو خوف و دہشت سے اس کا سانس رک جاتا یہ ایک بھیانک موت تھی جو وسیم کا مقدر بنی تھی۔

گاؤں میں ہر طرف خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔ بہت سے لوگ ڈر کے مارے گاؤں سے دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ بے شک موت کا ایک وقت مقرر ہے لیکن ایسی بھیانک موت سے ہر ایک ڈرتا ہے۔ اچھا بھلا انسان غائب ہوجاتا تھا دوسرے دن اس کا ڈھانچہ ملتا تھا۔ عبدالرحمٰن کے گھر پر قیامت برپا تھی ان کا جوان بیٹا وسیم نامعلوم عفریت کا شکار ہوچکا تھا۔ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا جیسے جیسے وقت گزرتا ہے۔ غم کم ہونے لگتا ہے۔ لیکن عبدالرحمٰن ہنوز صدمے کا شکار تھا۔ وہ رات دن بیٹے کو یاد کرکے روتا رہتا۔ زینی اور سیف کو عبدالرحمٰن کے کہنے پر اطلاع نہیں دی گئی کہ کہیں وہ دونوں اپنی پڑھائی ادھوری چھوڑ کر آجائیں ویسے بھی ان کی تعلیم مکمل ہونے میں چند ماہ باقی تھے ایک ماہ تک امن رہا۔ مہینے بعد گاؤں کا ایک اور جوان غائب ہوگیا۔ دوسرے دن اس کا گوشت سے محروم ڈھانچہ گاؤں کے ایک کسان کے کھیت سے ملا، چاروں طرف خوف و ہراس چھایا ہوا تھا لوگ شام سے پہلے پہلے گھروں میں دبک جاتے تھے۔ کوئی فرد کسی بھی حال میں شام کے بعد گھر سے نہیں نکلتا تھا۔

عبدالرحمٰن کا بیٹا سلیم ان دنوں اسلام آباد گیا ہوا تھا پیر کا دن تھا۔ شام کے سات بجے سلیم اپنی جیپ میں جیسے ہی گاؤں کی حدود میں داخل ہوا کچی سڑک پر کھڑے دراز قد شخص نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ سلیم نے جیپ اس کے قریب روکی۔ وہ سائیں خدا بخش تھا۔ ''بیٹا مجھے مزار تک چھوڑ دینا۔'' سلیم کے جواب کا انتظار کئے بغیر خدا بخش جیپ میں سوار ہوگیا۔ ''سائیں آپ نے کہا تھا آپ چلہ کاٹیں گے تو پراسرار اموات کا سلسلہ رک جائے گا۔'' سلیم جیپ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''بیٹا میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کررہا ہوں۔ آگے اللہ کی مرضی۔ سائیں ہمارے لئے دعا کرو۔ اللہ ہمیں صبر عطا کرے۔'' سلیم بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''سردار صاحب بہت دکھی ہیں ہر وقت روتے رہتے ہیں اب تو انہوں نے حویلی سے نکلنا بھی بند کردیا ہے۔'' خدا بخش نے کہا۔

اچانک سلیم کو جیپ روکنا پڑی، سڑک پر بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ راستہ مکمل طور پر بند تھا۔ وہ جیپ سے اترنے لگا اچانک ایک طرف سے کفن پوش مردہ نکلتا دکھائی دیا جس کا چہرہ کفن سے ڈھکا ہوا تھا۔ سلیم نے اپنے ہولسٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس کے سر پر

کسی چیز سے زور دار ضرب لگی وہ چکرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ ہوش میں آتے ہی سلیم نے آنکھیں کھول کر اٹھنا چاہا مگر کراہ کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں شدید قسم کی تکلیف ہورہی تھی۔ اس نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا تو خوف زدہ ہوگیا۔ لمبی لمبی کیلوں کو اس کے ہاتھوں اور ٹخنوں کے قریب ٹانگوں میں ٹھونک کر زمین میں گاڑ دیا تھا۔ کسی نے بڑی بے رحمی سے اسے چت لٹا کر زمین میں کیلوں کی مدد سے گاڑ دیا تھا۔ ہال نما تہہ خانے میں دو بلب روشن تھے۔

اچانک کمرے میں ایک کھرکھراتی ہوئی آواز گونجی۔ ''سلیم میں تمہارے چچا جابر خان کی روح ہوں تمہارے باپ اور گاؤں والوں نے مل کر مجھے مارا تھا، اب تم بھی مرو گے گاؤں کا ہر فرد مرے گا۔ اس کمرے میں آدم خور چوہے موجود ہیں جو اندھیرا ہوتے ہی تمہیں نوچ نوچ کر کھائیں گے۔'' آواز کے خاموش ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ کمرے نما تہہ خانے میں ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک کمرہ چوہوں کی مکروہ آوازوں سے گونج اٹھا۔ سلیم کو اپنے بدن پر بہت سے چوہوں کے رینگنے کا احساس ہوا پھر وہ اذیت سے چیختا چلا گیا۔ آدم خور چوہوں نے اس کے بدن میں جگہ جگہ اپنے دانت گاڑ دیئے تھے۔ چوہے سلیم کو نوچ نوچ کر کھانے لگے وہ درد کی شدت سے چیختا چلاتا رہا مگر اس تہہ خانے میں اس کی چیخیں سننے والا کوئی نہ تھا پھر کچھ دیر بعد خاموشی چھا گئی سلیم زندگی کی قید سے آزاد ہوچکا تھا۔ اب چوہے اس کے جسم کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے کچھ دیر بعد یہ بھیانک کھیل ختم ہوگیا۔ سینکڑوں کی تعداد میں موجود چوہوں کے لئے سلیم کا جسم تر نوالہ ثابت ہوا اب تہہ خانے میں سلیم کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

☆......☆......☆

آج دونوں کا اپنے تعلیمی ادارے میں آخری دن تھا۔ زیتون عرف زینی اور سیف اپنی تعلیم مکمل کرچکے تھے۔ تعلیمی میدان میں کامیاب ہوکر رخصت ہونے والے طالب علموں کے اعزاز میں الوداعی پارٹی ہورہی تھی۔ اس وقت زینی لندن کی ایک یونیورسٹی کے وسیع وعریض گراؤنڈ میں کرسی پر بیٹھی تھی۔ چاروں طرف تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ گراؤنڈ کے عین وسط میں رسیوں کی مدد سے اکھاڑہ سا بنا ہوا تھا۔ اکھاڑے میں کراٹے کا مخصوص یونیفارم پہنے دو نوجوان ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ ان نوجوانوں میں ایک 25 سالہ سیف اور دوسرا 28 سالہ ورزشی جسم کا مالک رچرڈ تھا۔ زینی کا بھائی سیف چھریرے جسم کا مالک قد ساڑھے 5 فٹ اور رنگت گندمی تھی۔ غیر نصابی سرگرمیوں میں دلچسپی کے باوجود سیف اور زینی نے لندن کی اس یونیورسٹی سے اچھی پوزیشن حاصل کی تھی زینی اور سیف دونوں مارشل آرٹ سے دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ اکثر یہاں ہونے والے کراٹے کے مقابلوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ زینی کرائے کے ساتھ ساتھ جمناسٹک کی بھی کھلاڑی تھی۔ آج سیف کا اپنے حریف سے آخری مقابلہ تھا کل کی فلائٹ سے انہوں نے پاکستان چلے جانا تھا۔

دونوں کھلاڑیوں کو ضروری ہدایات کرکے ریفری درمیان سے ہٹ گیا۔ گھنٹی بجتے ہی دونوں کھلاڑی چوکنا ہوگئے۔ انہوں نے ذرا سا جھک کر ایک دوسرے کو کراٹے کا مخصوص سلام کیا اب دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہے تھے۔ پاکستانی چوزے لگتا ہے آج اپنے ملک جانے سے پہلے میرے ہاتھوں شکست کھانا تمہاری قسمت میں لکھا ہے رچرڈ رواں انگلش میں بولا۔ سیف نے رچرڈ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ سمجھ گیا کہ رچرڈ اسے غصہ دلانا چاہتا ہے سیف جانتا تھا کہ مارشل آرٹ کے کھلاڑی کا غصہ میں آنا اس کے حق میں نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ سیف نے پینترا بدلتے ہوئے گھوم کر رچرڈ کے منہ پر لات مارنے کی کوشش کی رچرڈ نے بلاک کرکے اس کا وار روکا اور گھوم کر بیک کک سیف کے سینے پر رسید کی سیف ہلکا سا لڑکھڑا کر سنبھلا اور اسٹانس بنا کر کھڑا ہوگیا۔

اچانک رچرڈ نے اسپین کک ماری سیف نے جھکائی دے کر خود کو بچایا اور رچرڈ کے سینے پر سائیڈ کک رسید کی رچرڈ لڑکھڑا کر دائیں طرف رسیوں سے ٹکرایا رسیوں سے ٹکراتے ہی رچرڈ نے فضا میں قلابازی کھائی، اس کے دونوں پاؤں سیف کے سینے سے ٹکرائے وہ الٹ کر گرا مگر گرتے ہی قلابازی کھا کر اٹھا۔ رچرڈ اٹھتے ہوئے سیف کی طرف جھپٹا۔ رچرڈ نے سیف کے چہرے پر پنچ مارنے کی کوشش کی سیف نے ایک طرف جھکائی دے کر خود کو بچایا اور ساتھ ہی فرنٹ کک رچرڈ کے سینے پر رسید کی رچرڈ لڑکھڑایا اسی لمحے اچھل کر سیف نے جمپ سائیڈ کک رچرڈ کے سینے پر ماری رچرڈ الٹ کر گرا مگر گرتے ہی پھرتی سے اٹھا۔ رچرڈ کے اٹھتے ہی اس کے منہ پر گھوم کر سیف نے کک ماری ابھی وہ سنبھلا بھی نہ تھا کہ جمپ فرنٹ کک رچرڈ کی تھوڑی پر لگی وہ اچھل کر دوبارہ گرا۔ اب کی بار اس کے اٹھنے میں پھرتی نہ تھی۔ سیف کے حملوں سے زخمی ہونے والے رچرڈ کو غصہ آچکا تھا اب وہ پینترے بدل بدل کر سیف پر اٹیک کر رہا تھا۔ سیف کامیابی سے ہر وار اپنی کلائیوں پر بلاک کر کے روک رہا تھا۔ زینی رنگ کے قریب اگلی نشستوں پر موجود یہ دلچسپ مقابلہ دیکھ رہی تھی۔

اچانک اس کے موبائل کی بیل بجنے لگی۔

''ہیلو۔'' زینی نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے ان کے منشی اقبال کی آواز سنائی دی۔ ''بیٹا ایک بری خبر ہے ذرا حوصلے سے سننا۔''

''خیریت تو ہے چچا کیا ہوا؟'' زینی کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''زینی بیٹا وسیم میاں اور سلیم میاں کا انتقال ہو چکا ہے۔ سردار صاحب اور بیگم صاحب کی صدمے سے حالت خراب ہے۔ ڈاکٹروں نے انہیں کسی سے بھی بات کرنے سے منع کیا ہے۔'' منشی اقبال روتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔'' روتی ہوئی زینی چیختے ہوئے اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ کال کٹ گئی، زینی نے دوبارہ منشی اقبال کا نمبر ملانا چاہا مگر ناکام رہی۔ شاید نیٹ ورک پرابلم تھا۔

ادھر رنگ میں زینی کی چیخ سن کر سیف نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی توجہ ہٹتے ہی رچرڈ نے فائدہ اٹھایا اس کی لات سیف کی ٹانگوں کے بیچ لگی یہ فاؤل تھا۔ سیف درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ رچرڈ نے فوراً ہی فرنٹ کک رسید کی۔ سیف الٹ کر گرا سیف کے گرتے ہی رچرڈ نے سیف پر چھلانگ لگائی اس کی کہنی سیف کے سینے سے ٹکرائی۔ سیف کا سانس رکنے لگا رچرڈ اب سیف کے سینے پر بیٹھا اس کے سر پر ٹکریں مار رہا تھا سیف کا سر چکرانے لگا۔ کراٹے کے کھیل میں یہ بھی فاؤل تھا ریفری ان کے قریب کھڑا رچرڈ کو بار بار وارننگ دے رہا تھا۔ مگر غصے سے بپھرے رچرڈ کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی سیف نے چکراتے ہوئے ذہن سے سوچا اگر رچرڈ کی خطرناک ٹکریں اس طرح اس کے دماغ سے ٹکراتی رہیں تو وہ یا تو بے ہوش ہو جائے گا یا مر جائے گا سیف نے لگاتار چار پانچ پنچ پوری قوت سے رچرڈ کی پسلیوں کے نیچے مارے، رچرڈ کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھرے سیف نے اسے دونوں ٹانگوں سے زور دے کر اچھالا رچرڈ اس کے اوپر سے ہوتا ہوا نیچے گرا سیف ڈگمگاتے ہوئے اٹھا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ رچرڈ جیسے ہی اٹھا سیف نے گھوم کر لگاتار کئی ککس رچرڈ کی کنپٹی پر رسید کی۔

رچرڈ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر چکرانے لگا اسی لمحے سیف کا زوردار مکہ رچرڈ کی کنپٹی سے ٹکرایا رچرڈ لہرا کر گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ ریفری آگے بڑھ کر گنتی گننے لگا۔ مگر رچرڈ نہ اٹھ سکا۔ ریفری نے سیف کا ہاتھ تھام کر فضا میں بلند کیا۔ تالیاں اسٹیڈیم میں گونج اٹھیں سیف مقابلہ ختم ہوتے ہی رنگ سے باہر نکلا اور ایک طرف کھڑی ہوئی روتی زینی کی طرف بڑھا کیا ہوا آپی زینی اس سے لپٹ گئی سیف ہمارے دونوں بھائی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے زینی کی بات سنتے ہی سیف کو یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پر آ گرا ہو۔

☆......☆......☆

رات کے بارہ بجے کا وقت تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ رات کے اس اندھیرے میں کفن پوش مردہ عبدالرحمٰن کی حویلی کی عقبی دیوار پر چڑھا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ دیوار پر بیٹھا رہا ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کفن پوش قاتل مردہ چھت پر چڑھا اور چلتا ہوا۔ چھت کی پچھلی سائیڈ پر واقع سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی قطار میں آمنے سامنے کمرے بنے ہوئے تھے۔ کوریڈور میں خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا۔ قاتل مردہ چلتا ہوا سردار عبدالرحمٰن کے کمرے کے دروازے تک جا پہنچا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ دھکیلا دروازہ کھلتا چلا گیا۔ بدقسمتی سے دروازہ اندر سے لاک نہ تھا۔ یہ بدقسمتی عبدالرحمٰن کی تھی۔

قاتل مردہ کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے دروازے کو چٹخنی لگائی۔ یہ ایک 12x15 کا خوبصورت کمرہ تھا۔ فرش پر خوبصورت قالین بچھا تھا۔ کمرے کی دیواروں کے ساتھ دیدہ زیب پردے لٹک رہے تھے۔ بائیں طرف جہازی سائز کا خوبصورت بیڈ تھا۔ جس پر سردار عبدالرحمٰن اور اس کی بیگم دواؤں کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ موت ان کے سر پر آن پہنچی ہے۔

کفن پوش مردہ بیڈ کی طرف بڑھا اس نے عبدالرحمٰن کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے جھنجھوڑا اٹھو میں تمہیں اوپر پہنچانے آ گیا ہوں۔ عبدالرحمٰن نے کسمسا کر کروٹ بدل لی۔ اب کے مردے نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ عبدالرحمٰن کی آنکھیں کھل گئیں وہ اٹھ بیٹھا کچھ دیر تک آنکھیں ملتا رہا۔ کفن پوش مردے کو دیکھتے ہی اس کی سٹی گم ہوگئی۔ ”کک......کون ہو......تم؟“

مردے نے اپنے چہرے سے کفن ہٹا دیا۔

”میں جابر خان کی روح ہوں مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔“ مردہ کھرکھراتی ہوئی آواز میں بولا۔

جابر خان کو دیکھتے ہی عبدالرحمٰن کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہوگئے۔ اسی لمحے اس کی بیوی کی آنکھ بھی کھل گئی۔ مردہ جابر خان دونوں ہاتھ پھیلائے عبدالرحمٰن کی طرف بڑھا۔ کفن پوش مردے کو دیکھتے ہی عائشہ بیگم نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اس کے جسم کو جھٹکا لگا اور وہ ساکت ہوگئی۔ خوف و دہشت سے اس کے کمزور دل نے دھڑکنا چھوڑ دیا۔

”پہچانا تم نے مجھے، تم نے اور گاؤں والوں نے مل کر مجھے مارا تھا، میں چن چن کر تم سب کو مار دوں گا۔“

مردے نے سردار عبدالرحمٰن کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ عبدالرحمٰن نے چیخنا چاہا مگر ڈر اور خوف سے اس کی آواز گلے میں گھٹ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں چند لمحوں میں ہی اس کا دم نکل گیا۔ کفن پوش مردہ اب کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

زینی اور سیف پاکستان جانے والی فلائٹ میں موجود تھے۔ انہیں الگ الگ سیٹیں ملی تھیں زینی کے ساتھ والی سیٹ پر ایک معمر خاتون موجود تھیں جبکہ سیف کے برابر والی سیٹ پر ایک 30 سالہ صحت مند شخص بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ وہ اس وقت میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ سیف اور زینی کو ان کے والدین کی موت کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ دونوں اس وقت بہت افسردہ تھے۔ زینی کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سیف کے برابر بیٹھا شخص کچھ دیر میگزین پڑھتا رہا پھر میگزین گود میں رکھ کر سیف کی طرف متوجہ ہوا۔ ”میرا نام جمشید ہے اور میں پاکستان جا رہا ہوں۔ کیا آپ اپنا تعارف کروانا پسند فرمائیں گے۔“ جمشید نے رواں انگلش میں سیف کو مخاطب کیا۔

”آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔“ اداس سیف جو کہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا چونکا۔

”میں پوچھ رہا ہوں آپ اپنا تعارف کروانا پسند فرمائیں گے اپنا دوبارہ تعارف کروا دیتا ہوں میرا نام جمشید ہے دراصل سفر لمبا ہے اتنی طویل فلائٹ میں آپس کی بات چیت سے وقت اچھا گزر جاتا ہے۔“

”میرا نام سیف ہے اور میں اپنی بہن کے ساتھ اسلام آباد جا رہا ہوں۔“ سیف نے اردو میں جواب دیا۔ آپ اتنے اداس کیوں ہیں۔ جمشید نے پوچھا میرے والدین اور دونوں بھائی ایک حادثے میں فوت ہوگئے ہیں۔ سیف کے لہجے میں دکھ تھا اوہ ویری بیڈ کچھ دیر کی گپ شپ کے بعد سیف باتھ روم جانے کے لئے اٹھا باتھ روم سے آ کر اس نے اپنی سیٹ کھولی اور نیم دراز ہوگیا پھر اس کی آنکھ لگ گئی وہ کافی دیر سویا رہا اس کی آنکھ کھلی تو اعلان ہو رہا تھا طیارہ چند منٹ بعد اسلام آباد ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والا ہے۔

چند منٹ بعد جہاز کے پہیے زمین کو چھو چکے تھے۔ جہاز کے رکتے ہی مسافر نیچے اترنے لگے۔ سیف نے اپنا اور زینی کا بیگ اٹھایا اور امیگریشن اور کسٹم لاؤنج میں زینی کے ہمراہ پہنچا جمشید ان سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ کسٹم افسر نے ان کے سامان کا جائزہ لیا اور اسے کلیئر کر دیا وہ دونوں چلتے ہوئے باہر آئے۔ باہر سردار عبدالرحمٰن کا ڈرائیور گل خان لینڈ کروزر سمیت موجود تھا۔ وہ دونوں خاموشی سے لینڈ کروزر میں بیٹھ گئے، ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی سیف نے آنکھیں موند لیں اور زینی اداسی سے باہر دیکھنے لگی۔ اس طرح 2 گھنٹے گزر گئے، اس وقت ان کی گاڑی ایک سنسان سڑک پر تھی اچانک پیچھے سے آنے والی تیز رفتار سفید ہنڈا اکارڈ نے ان کے برابر سے نکل کر لینڈ کروزر کا راستہ روک لیا۔ ہنڈا اکارڈ سڑک کے درمیان آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ ان کے ڈرائیور نے پھرتی سے بریک لگا کر لینڈ کروزر روک دی۔

اچانک بریک لگنے سے جھٹکا لگا اور سیف کی آنکھ کھل گئی۔ سیف نے حیرت سے وائٹ ہنڈا اکارڈ کو دیکھا اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کو سمجھتا دو مسلح افراد ہنڈا اکارڈ سے نکل کر ان کی گاڑی کے پاس آ گئے ان کے ہاتھوں میں سائلنسر لگے پستول موجود تھے تم تینوں ہاتھ اوپر اٹھا کر باہر آ جاؤ سانولے رنگ کا تنومند شخص ان کی طرف پستول تان کر بولا۔ وہ تینوں باہر آ گئے۔

”کون ہو تم اور ہم سے کیا چاہتے ہو؟“ سیف ان دونوں کو گھورتے ہوئے بولا اچانک وہ چونک پڑا ہنڈا اکارڈ سے ایک تیسرا شخص باہر نکل رہا تھا۔ یہ ان کا ہمسفر جمشید تھا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ ”مسٹر جمشید تم لوگوں کی اس حرکت کا کیا مطلب ہے۔“

”دھیرج مسٹر سیف سکون سے کھڑے رہو ہماری تم سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہم انٹرنیشنل کلر ہیں ہمیں تمہیں جان سے مارنے کا آرڈر ہے، آیا کچھ سمجھ شریف میں۔“ جمشید مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہمیں کون مروانا چاہتا ہے۔“ سیف نے حیرت سے پوچھا۔

”یہ ہم نہیں جانتے جس نے تم دونوں کو قتل کرنے کے لئے ہمیں بھاری رقم دی ہے وہ ہمارے لئے اجنبی تھا۔ اگر ہم اسے جانتے بھی تو تمہیں نہیں بتاتے یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔“ جمشید نے کہا اس کے ساتھی خاموش کھڑے تھے۔

زینی کے لڑکی ہونے کی وجہ سے وہ تینوں اس کی طرف سے بےفکر تھے۔ اچانک بجلی سی کوندی زینی نے سمرسالٹ قلابازی کھائی ہپ ہپ کی آوازیں سنائی دیں اور ان دونوں کے ہاتھوں سے سائلنسر لگے پستول نکل گئے۔ جمشید نے ہولسٹر میں ہاتھ ڈالنا چاہا مگر سیف نے اس کا گریبان پکڑ کر اس کے منہ پر زوردار گھونسہ مارا جمشید کے منہ سے خون بہنے لگا فوراً ہی اس نے اسی طرح گریبان پکڑے ہوئے جمشید کے پیٹ میں گھٹنہ مارا جمشید اوغ کی آواز نکالتا ہوا جھکا سیف نے اچھل کر اپنی کہنی کا زوردار وار اس کی کمر پر کیا۔ جمشید منہ کے بل سڑک پر گرا اب وہ فٹبال کی طرح سیف کی ٹھوکروں پر تھا چند لمحوں بعد ہی وہ سڑک پر بےہوش پڑا تھا۔ ادھر زینی اس وقت بجلی بنی ہوئی تھی۔ دونوں غنڈے اس پر قابو پانے کے چکر میں بری طرح پٹ رہے تھے۔ زینی پر نظر ہی نہیں ٹک رہی تھی۔ انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ لڑکی کہاں سے اور کیسے ان پر وار کر رہی ہے۔ سیف نے سڑک پر پڑا ایک سائلنسر لگا پستول اٹھایا اور خاموشی سے یہ مقابلہ دیکھ رہا تھا۔ مار کھاتے کھاتے ان میں سے ایک بےہوش ہوگیا زینی دوبارہ فضا میں اچھلی وہ پھر کی

کی طرح گھومی اس کی لاتیں لگاتار اس غنڈے کے چہرے سے ٹکرائیں وہ لہراتا ہوا گرا۔ اسی لمحے سیف نے گولیاں چلا کر سڑک پر پڑے بدمعاشوں کو جہنم واصل کردیا۔ ''یہ تم نے کیا کیا۔'' زینی ناگوار لہجے میں بولی۔

''ڈیئر آپی تم جمناسٹک اور کراٹے کے کرتب دکھا سکتی ہو تو کیا میں گولی بھی نہ چلاؤں ویسے یہ پیشہ ور قاتل ہیں اگر میں انہیں نہ مارتا تو یہ ہوش میں آنے کے بعد دوبارہ ہمیں ڈھونڈنے لگ جاتے۔''

وہ لینڈ کروزر میں سوار ہوگئے۔ وہ رات کو دیر سے اپنی حویلی میں پہنچے۔ حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا ان کے والدین کی میتیں دفنائی جاچکی تھیں۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر دیر تک روتے رہے۔ منشی اقبال چچا نے انہیں گاؤں میں گزرنے والی قیامت سے آگاہ کیا۔ ''وہ کوئی عفریت ہے جو کفن پوش مردے کے روپ میں اس گاؤں کے افراد کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے۔ مرنے والے کی لاش گوشت سے محروم ہوتی ہے مجھے تو یہ کوئی ایسی لاش لگتی ہے جو زندہ ہوگئی ہو۔'' چچا اقبال نے کہا۔

''زینی اور سیف کو گاؤں آئے مہینہ ہوچکا تھا۔ اس دوران قاتل مردے نے کوئی واردات نہیں کی تھی۔ لیکن پھر بھی گاؤں میں خوف و ہراس تھا۔ زینی نے حویلی کے ایک کمرے میں اپنی تجربہ گاہ بنالی تھی۔ جہاں وہ آئے دن نت نئے تجربات کرتی رہتی تھی۔ اس وقت چچا اقبال اور سیف گاؤں کے کھیتوں میں چلتے ہوئے باتیں کررہے تھے۔'' چچا اس دور میں بھوتوں اور چڑیلوں کی باتیں عجیب سی لگتی ہیں یہ سائنسی دور ہے لگتا ہے کوئی اور ہی چکر ہے۔'' سیف نے تبصرہ کیا وہ چلتے ہوئے جھنڈے شاہ کے مزار تک جاپہنچے۔

''یہ کس کا مزار ہے؟'' سیف نے پوچھا۔

''بابا جھنڈے شاہ کا، یہاں ان کا جانشین پیر سائیں خدا بخش بیٹھتا ہے جو کہ بہت پہنچا ہوا ہے وہ اپنی دعاؤں اور تعویذوں سے گاؤں والوں کے مسائل حل کرتا ہے۔'' منشی اقبال نے جواب دیا۔

''اگر وہ اتنا پہنچا ہوا ہے تو ان پراسرار اموات کا سراغ کیوں نہیں لگاتا۔'' سیف نے کہا اس اثنا میں وہ مزار کی سیڑھیوں تک جاپہنچے۔ ''آئیں مزار کا بھی جائزہ لیں اور آپ کے سائیں خدا بخش کے بھی دیدار کرلیں۔'' وہ سیڑھیاں چڑھنے لگے مزار کے صحن میں عورتیں اور مرد چل پھر رہے تھے سیف نے منشی اقبال کے اشارے پر جوتے اتارے۔ وہ جھنڈے شاہ کی قبر تک جاپہنچے۔ قبر مختلف چادروں اور پھولوں سے ڈھکی تھی۔ قبر کے چاروں اطراف خوبصورت ریلنگ نصب تھی۔ مزار کی بلند چھت پر لٹکا ہوا فانوس بہت خوب صورت تھا۔ انہوں نے فاتحہ پڑھی سیف ادھر ادھر نظریں دوڑا رہا تھا۔ دو عورتیں اپنی پیشانی ریلنگ کے بالائی پائپ پر ٹیکے ہوئے تھیں ان کی سسکیاں مقبرے میں گونج رہی تھیں۔ شاید اس طرح وہ اپنے اندرونی کرب کو صاحب قبر پر آشکارہ کررہی تھیں۔ کچھ دیر رولینے کے بعد وہ عورتیں اٹھیں اور الٹے قدموں سے مزار سے نکلنے لگیں۔ سیف منشی اقبال کے ساتھ مقبرے سے باہر نکلا۔ دونوں عورتیں ہال کے قریب ایک کمرے میں داخل ہورہی تھیں۔ وہ دونوں بھی کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ وہاں قالین پر درجن کے قریب عورتیں اور سات آٹھ مرد موجود تھے۔ سائیں خدا بخش دیوار کے ساتھ رکھے تکیہ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک چھوٹی سی لکڑی کی پیٹی رکھی تھی۔ جس کے اوپر چند موٹی موٹی کتابیں رکھی تھیں کمرے میں موجود تمام خواتین و حضرات کے سر جھکے ہوئے تھے۔

سائیں خدا بخش آنکھیں بند کئے ہوئے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ وہ خاصا قوی ہیکل اور دراز قد تھا۔ اس کے چہرے پر لمبی سیاہ اور چمکدار داڑھی موجود تھی جو کہ کلف زدہ تھی۔ خدا بخش کے سامنے بیٹھی ایک بوڑھی عورت اپنا کوئی مسئلہ بیان کررہی تھی عورت کی آواز بہت دھیمی تھی۔ خدا بخش نے ایک دم اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ ''تمہارے بھائی

کی بیوی نے تمہارے اوپر جادو کروایا ہے اسی جادو کے زیر اثر تم بیمار رہتی ہو اور تمہاری بہو پر بھی اس نے بندش کروا رکھی ہے اسی لئے اس کی اولاد نہیں ہوتی۔'' خدا بخش نے کہا۔

''سائیں میری مدد کرو، ورنہ میں بے موت مرجاؤں گی۔'' بڑی بی رونے لگیں۔

''غم نہ کر اللہ کرم کرے گا۔ یہ تعویذ لے جاؤ خود بھی پیو اور اپنی بہو کو بھی پلاؤ یہ دوسرا تعویذ اپنی بھابھی کے مکان کے داخلی دروازے میں دفن کردینا۔'' اس نے اپنے سامنے رکھے ڈبے سے دو کاغذ نکالے اور تعویذ بنا کر بڑی بی کو دے دیئے۔ بڑی بی نے عقیدت سے تعویذ تھامے اور خدا بخش کے قریب رکھے۔ چھوٹے سے بکس کے اوپر بنے سوراخ سے سو روپے کا ایک نوٹ موڑ کر اندر ڈال دیا۔ اس طرح ایک ایک کرکے تمام خواتین و حضرات اس سے تعویذ لیتے رہے اور پیسے بکس میں ڈال کر جاتے رہے۔ سیف حیرت زدہ سا یہ منظر دیکھتا رہا۔ اب کمرے میں صرف سیف منشی اقبال خدا بخش کے سامنے بیٹھے تھے۔

''سائیں اس کے لئے دعا کرو یہ مرحوم سردار کا بیٹا سیف ہے چچا اقبال نے کہا۔ اور خدا بخش نے کچھ پڑھ کر سیف پر پھونک ماری بیٹا صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

''صبر تو ضرور کروں گا لیکن اس کھیل کو اس کے انجام تک پہنچا کر دم لوں گا جو اس گاؤں میں کھیلا جارہا ہے۔'' سیف خدا بخش کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا عجیب لہجے میں بولا اور اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ وہ دونوں خدا بخش سے رخصت ہوکر حویلی آگئے۔

اب سیف سارا دن ادھر دھر گھومتا اور اس عفریت کو ڈھونڈتا جس نے اس کے بھائیوں اور والدین کو قتل کیا تھا اور گاؤں کا سکھ چین برباد کرڈالا تھا بعض اوقات وہ زینی کو بھی دیر تک منشی اقبال کے منع کرنے کے باوجود گھومتا رہتا۔ ایک رات 8 بجے وہ زینی کی تجربہ گاہ میں کھڑا تھا زینی اپنے تجربات میں مصروف تھی۔ ایک کونے میں کمپیوٹر بھی رکھا تھا۔ ''آپی میں ذرا گاؤں کا چکر لگا کر آتا ہوں۔''

''ایک منٹ رکو پہلے یہ پہن لو۔'' زینی نے ایک خوب صورت چین اس کے گلے میں پہنادی۔ چین کے ساتھ لاکٹ بھی تھا جو دل کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ دل پر لفظ اللہ لکھا تھا۔

''یہ کیا ہے آپی؟''

''یہ میرے پیارے سے بھیا کے لئے اس کی آپی کا گفٹ ہے مجھ سے وعدہ کرو اسے اتارو گے نہیں۔''

''اچھا بابا نہیں اتاروں گا۔'' وہ حویلی سے باہر چلا گیا۔ سیف اس وقت جینز کی پینٹ اور بلیک شرٹ کے ساتھ بہت پیارا لگ رہا تھا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے گھوم رہا تھا چاروں طرف اندھیرا تھا کچھ دیر چلنے کے بعد سیف نے کوٹ کی جیب سے ٹارچ نکال کر روشن کرلی۔ ایک طرف سے اچانک کھٹکا ہوا وہ پھرتی سے پلٹا۔ درختوں کے جھنڈ سے کسی کے بھاگنے کی آواز آرہی تھی۔ سیف نے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکالا اور درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگا۔ درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوتے ہی وہ مسکرا اٹھا۔ بھاگنے والا ایک لکڑ بگا تھا۔ سیف درختوں کے جھنڈ سے نکلنے لگا۔

اچانک ایک طرف سے پتھر آیا اور اس کے ریوالور والے ہاتھ سے ٹکرایا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا وہ چوکنا ہوکر ریوالور کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ٹھٹک کر رک گیا۔ ایک کفن پوش مردہ اس کے سامنے کھڑا تھا جس کا چہرہ کفن سے ڈھکا تھا۔ واہ بھئی مردے صاحب مرنے کے بعد بھی تمہارا نشانہ غضب کا ہے سیف نے اپنی ٹارچ کا رخ مردے کی طرف کردیا، اس کے چہرے پر ذرا بھی ڈر یا خوف نہ تھا۔ ''میں ایک روح ہوں آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے۔'' مردے کے منہ سے کھرکھراتی ہوئی آواز نکلی۔

''میں گاؤں کا سیدھا سادہ لوح انسان نہیں جسے تم ڈرا سکو۔'' سیف مسکرایا۔

"موت کا منہ دیکھ کر اچھے اچھوں کا حوصلہ پانی ہو جاتا ہے۔ تم بھی ڈرو گے ضرور ڈرو گے مجھ سے زندگی کی بھیک مانگو گے۔" مردے نے کہا۔

اچانک سیف کو اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی سیف پھرتی سے جھکا یہی جھکنا اسے بچا گیا اس کے پیچھے کھڑے دراز قد نقاب پوش نے اپنے ریوالور کا دستہ اس کے سر پر مارنا چاہا تھا، اس سے پہلے کہ نقاب پوش مزید کچھ کرتا، سیف نے زوردار بیک کک اس کے سینے پر ماری نقاب پوش الٹ کر گرا۔ سیف نے نقاب پوش پر چھلانگ لگا دی اب وہ نقاب پوش کے سینے پر سوار تھا۔ ریوالور نقاب پوش کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ سیف نے جھپٹ کر اس کے چہرے سے نقاب نوچ لیا۔ اگلا لمحہ حیرت انگیز تھا۔ اس کے پیچھے لیٹا مردے کا ساتھی سائیں خدا بخش تھا۔

"خدا بخش تم بھی اس ظلم و ستم کے کھیل میں اس شیطان کے ساتھی ہو۔" سیف کے منہ سے بے اختیار یہ جملے نکلے اسی لمحے فائر کی آواز گونجی۔

"کھڑا ہو جا بچہ وقت تیرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے۔" سیف نے مڑ کر دیکھا۔ اس کا ریوالور مردے کے ہاتھ میں تھا۔ خدا بخش نے سیف کو اپنے اوپر سے دھکیلا۔ سیف الٹ کر گرا۔ خدا بخش کھڑا ہو گیا۔ سیف جیسے ہی اٹھا اس کی طرف دو ریوالور مردے کے ہاتھ میں تھا جبکہ دوسرا خدا بخش کے ہاتھ میں۔ "چلو آگے بڑھو جابر خان کی حویلی کی طرف۔" خدا بخش نے اسے حکم دیا۔

"وہاں کیا ہے اور تمہاری حقیقت کیا ہے اس درندگی سے تمہیں کیا ملا۔" سیف نے پوچھا۔

"وہ سب وہاں چل کر پتہ چلے گا۔ چلو آگے بڑھو ورنہ گولی چلا دوں گا۔" کفن پوش مردے نے اسے دھمکی دی اور سیف ان دونوں کے آگے چلنے لگا۔

"اب میں ویسے بھی تمہارے اور خدا بخش کے ریوالور کے نشانے پر ہوں اور تم دونوں کے ساتھ جابر خان کی حویلی کی طرف جا رہا ہوں، اب تو تم بتا دو تم آخر کون ہو؟ اور بے گناہوں کا خون کیوں کر رہے ہو؟" سیف نے چلتے چلتے مردے سے پوچھا۔

"مرنے والے کی آخری خواہش جان کر بتا دیتا ہوں۔ اسی طرح پیچھے مڑے بغیر چلتے رہو، پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہیں گولی مار دوں گا۔ میں جابر خان ہوں تمہارا چچا جابر خان اور مرحوم سردار عبدالرحمٰن کا چھوٹا بھائی میرے ظالم بھائی اور اس گاؤں کے لوگوں نے مل کر مجھے مارا اور مردہ سمجھ کر قبر میں دفنا دیا۔ مگر میں زندہ بچ نکلا میں نے زور آزمائی کر کے کسی نہ کسی طرح قبر کی ایک سلیب ہٹائی اور قبر سے باہر آ کر قبر کی مٹی برابر کی۔ رات کے اندھیرے میں گاؤں سنسان تھا سب اپنے گھروں میں سو رہے تھے لہٰذا کسی نے مجھے نہ دیکھا۔ میں اپنی حویلی کے تہہ خانے میں چلا گیا۔

دو دن وہیں رہا پھر ایک روز رات کے اندھیرے میں گاؤں سے نکل کر اسلام آباد چلا گیا۔ وہیں کچھ ماہ ایک دوست کے ساتھ رہا اپنے ساتھی جمع کئے اور ایک روز رات کے اندھیرے میں خاموشی سے اپنی حویلی میں آ گیا۔ یہاں میں نے خاص قسم کے چند چوہے پنجرے میں پالے انہیں مختلف محلول اور دوائیاں کھلاتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ میں انہیں انسانی گوشت بھی کھلاتا رہا تھا۔ چوہوں کی نسل بڑھتی رہی۔ میں نے چوہے تہہ خانے میں شفٹ کر دیئے۔ خاص دواؤں کی وجہ سے ان چوہوں کی جسامت بلی کے برابر ہے۔ اب تہہ خانے میں سیکڑوں ہو سکتا ہے ہزاروں کی تعداد میں آدم خور چوہے ہوں۔ تمہارے دونوں بھائی اور اس گاؤں کے بہت سے نوجوان ان چوہوں نے نوچ کھائے ہیں۔ سائیں بخدا بخش اور اس کے ساتھی بھی میرے ساتھی ہیں۔ میرے ہی کہنے سے خدا بخش اس علاقے میں جھنڈے شاہ کے ساتھ آیا تھا۔ جھنڈے شاہ نے ہمارا ساتھ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ واقعی اللہ والا نیک لوگ تھا۔ اس لئے ایک رات ہم نے اس کے منہ پر تکیہ رکھ کر اسے مار ڈالا۔

تمہارے والدین کا قتل بھی میں نے کیا ہے۔

پہلے میں نے بھاری معاوضہ دے کر غنڈوں کے ذریعے تمہیں ختم کروانا چاہا مگر تم دونوں بہن بھائی بچ نکلے اب ہم تم دونوں بہن بھائی کو مارنے کے بعد اس گاؤں پر قابض ہو جائیں گے یہاں کے لوگ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تمہارے بعد تمہاری بہن کا نمبر آئے گا وہ ویسے بھی لڑکی ہے جب بڑے بڑے سورما ہم نے مار ڈالے تو وہ بیچاری معمولی لڑکی کیسے بچ پائے گی۔"

جابر خان نے اپنی بات ختم کی اچانک جابر خان کو ٹھوکر لگی وہ لڑکھڑا کر گرا۔ خدا بخش کی توجہ لمحہ بھر کے لئے جابر خان کی طرف ہوئی سیف کے لئے یہ ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ اس نے ایک طرف دوڑ لگا دی۔ "رک جاؤ سیف۔" جابر خان نے اٹھتے ہی فائر کیا۔ اب وہ دونوں سیف کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ سیف زگ زیگ انداز میں بھاگ رہا تھا۔

موت جب سر پر ہو تو بندے کی رفتار ویسے ہی بھی بڑھ جاتی ہے۔ سیف اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ جابر خان اور خدا بخش بھی ریوالور ہاتھوں میں تھامے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں تیز رفتاری سے بھاگنا بھی کافی مشکل کام تھا۔ کہیں بھی اندھیرے کی وجہ سے وہ ٹھوکر کھا کر گر جاتا اور ان لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتا پھر اسے اذیت ناک موت سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا۔ یہی اندھیرا سیف کو بچا بھی رہا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ سیف کا نشانہ نہیں لے پا رہے تھے ان کی چلائی ہوئی گولیاں ادھر ادھر ضائع ہو رہی تھیں۔ اچانک بھاگتے بھاگتے سیف ٹھوکر کھا کر گرا گر کر اٹھنے کے دوران ان دونوں کا سیف سے فاصلہ کم ہو گیا۔ سیف اٹھا اور ایک بار پھر دوڑ لگا دی۔

جابر خان نے گولی چلائی سیف کے حلق سے چیخ نکلی اسے یوں لگا جیسے اس کے بازو میں جلتا ہوا انگارہ پیوست ہو گیا ہے۔ گولی لگنے کے باوجود وہ رکا نہیں بھاگتا رہا وہ دونوں بھی وحشی جانوروں کی طرح اس کے تعاقب میں تھے۔ سیف کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح ان سے پیچھا چھڑا لے ان کے ہاتھ آنے کا مطلب اذیت ناک موت تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ان سے دور جا نکلا۔ اس کے بازو سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ اب کمزوری سے اسے چکر آنے لگے تھے۔ اس کی رفتار کم ہونے لگی۔ ایک طرف بہت سی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ وہ جھاڑیوں میں گھس کر دبک کر بیٹھ گیا۔ اب ان دونوں کے بھاگنے کی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ "وہ کہاں غائب ہو گیا؟" خدا بخش بولا۔

"اگر وہ ہمارے ہاتھوں بچ نکلا تو ہم مارے جائیں گے ہمارا راز کھل جائے گا۔"

جابر خان نے کہا۔ "چلو آگے جا کر اسے دیکھتے ہیں۔" وہ دونوں آگے بڑھنے لگے۔ اسی لمحے کوئی چیز اس کے پاؤں سے ہوتی ہوئی اس کی ٹانگوں پر رینگنے لگی۔ یہ ایک بڑا سا چیونٹا تھا۔ چیونٹے نے اسے بڑے زور سے کاٹا سیف کے منہ سے سسکی نکلی اور اسی لمحے کمزوری سے اسے چکر آیا وہ لڑکھڑایا یہ آوازیں پلٹنے والے جابر خان اور خدا بخش نے سن لیں۔ وہ جھاڑیوں کی طرف بڑھے۔ وہ ان جھاڑیوں میں چھپا بیٹھا ہے اس کی سماعت سے خدا بخش کی آواز ٹکرائی اس نے اٹھنا چاہا مگر نقاہت سے گر پڑا۔ اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا بے ہوش ہوتے ہوتے اس نے سوچا موت اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اور اس کی طرف بڑھ رہی ہے پھر اسے ہوش نہ رہا۔

جابر خان جھاڑیوں میں گھس گیا اس نے بے ہوش پڑے سیف کو اٹھا کر کندھے پر لاد لیا۔ "بازو میں لگنے والی گولی سے یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔" وہ باہر آ کر بولا اور خدا بخش کے ہمراہ اپنی حویلی کی طرف بڑھنے لگا۔ "اب ہم اسے بھی آدم خور چوہوں کو کھلا دیں گے پھر اس کی بہن کو مار کر اس گاؤں پر قابض ہو جائیں گے۔" جابر خان کے لہجے میں درندگی تھی۔

ان کا سفر آدھے گھنٹے تک جاری رہا نصف گھنٹے بعد وہ حویلی کے گیٹ پر تھے۔ گیٹ کھول کر وہ جیسے ہی

اندر گھسے خدا بخش کے چیلے اس کے سامنے آ گئے۔

"ایک بندہ باہر گیٹ پر رہو بقایا پانچ حویلی کے صحن میں پھیل جاؤ۔ جب تک ہم اسے تہہ خانے میں موجود چوہوں کی خوراک بناتے ہیں۔" جابر خان نے سفاک لہجے میں کہا اور خدا بخش کے ہمراہ اپنی تجربہ گاہ میں داخل ہو گیا۔ "خدا بخش اس تصویر کے پیچھے موجود بٹن دبا کر تہہ خانے کا دروازہ کھولو۔ خدا بخش نے آگے بڑھ کر تصویر کے پیچھے بٹن دبایا تو کمرے کا فرش کھل گیا۔ جابر خان سیف کو لے کر تہہ خانے میں اتر گیا۔ سیف کو تہہ خانے میں پھینک کر وہ باہر نکلا اور بٹن دبا کر فرش برابر کر دیا اب وہ کمپیوٹر کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ کر کمپیوٹر آن کرنے لگا۔ کمپیوٹر کے آن ہوتے ہی جابر خان مختلف بٹن دبانے لگا۔ خدا بخش اس کے قریب ہی کھڑا تھا دونوں کی نظریں کمپیوٹر اسکرین پر تھیں۔ چند لمحوں بعد کمپیوٹر اسکرین پر تہہ خانے کا منظر ابھرنے لگا۔ سیف بے ہوش پڑا تھا۔

"کیا کر رہے ہو کھیل ختم کرو۔" خدا بخش جھنجھلا کر بولا۔

"میں اس کے چہرے پر موت کا ڈر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یہ بڑا بہادر بنتا تھا کہتا تھا مجھے ڈر نہیں لگتا لیکن آدم خور چوہوں کو دیکھ کر خود ڈرے گا اور پندرہ منٹ بعد ہی سیف ہوش میں آ کر اٹھ بیٹھا۔ "کیسے ہو بیٹا یہ چوہوں کا ٹھکانہ ہے یہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں جیسے ہی اس کمرے میں اندھیرا ہوگا کمرہ چوہوں سے بھر جائے گا جو تمہیں نوچ کھائیں گے پھر دیکھوں گا تم کیسے نہیں ڈرتے۔" جابر خان سفاک لہجے میں بولا۔ تہہ خانے میں جابر خان کی آواز سن کر سیف ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی نظر چھت پر لگے خفیہ کیمرے پر پڑی۔

"جابر خان ہمت ہے تو سامنے آ کر مردوں کی طرح مقابلہ کرو۔" وہ چلایا۔

"ہاہاہا۔ اب مرنے کا انتظار کرو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں اس کمرے میں، میں نے تمہارے دونوں بھائیوں کو چوہوں کی خوراک بنایا تھا۔ سو جواب تمہارا کیا ہوگا اندر سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں باہر آنے کے لئے تجربہ گاہ میں موجود میری تصویر کے فریم کے پیچھے دیوار میں موجود بٹن دبانا ضروری ہے اب سوچو سیف اندھیرا ہوتے ہی کمرہ چوہوں سے بھر جائے گا اور تم زخمی بھی ہو۔" سیف کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اسی لمحے جابر خان نے تہہ خانے میں روشن بلب آف کر دیئے۔ اندھیرا ہوتے ہی چوہوں کی مکروہ آوازیں آنے لگیں۔ سیف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا مگر اندھیرے کی وجہ سے اسے کچھ دکھائی نہ دیا رفتہ رفتہ کمرہ چوہوں سے بھرنے لگا۔ بلی کے سائز کے موٹے موٹے چوہے بھاگ بھاگ کر سیف کی طرف بڑھنے لگے۔ سیف بھاگتا رہا۔ اسی لمحے ایک چوہے نے اسے زخمی بازو پر دانت گاڑھے سیف کے منہ سے چیخیں نکل گئیں موت بھیانک روپ میں اس کے سر پر آ پہنچی تھی۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔ وہ چیخیں جابر خان کو خوش کر رہی تھیں۔ آج اس کے راستے کی آخری رکاوٹ بھی ہٹنے والی تھی۔

☆......☆......☆

زینی اپنی تجربہ گاہ میں کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی زینی کے کان میں ہینڈ فری جیسا آلہ لگا ہوا تھا۔ دراصل زینی نے جو لاکٹ سیف کو پہنچایا تھا اس لاکٹ میں جو کہ دل کی شکل کا تھا۔ حساس مائیکروفون تھا۔ یہ ایک ایسی جدید ترین حساس ڈیوائس تھی جس کی رینج لامحدود تھی سیف کہیں بھی جاتا۔ وہ اس ہینڈ فری جیسے آلہ سے جو کہ اس کے کان سے لگا تھا اس کی آواز صاف سن سکتی تھی۔ اچانک اسے کسی کے بھاگنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ دیر بعد اسے سیف کی آواز سنائی دی مردے صاحب مرنے کے بعد بھی تمہارا نشانہ غضب کا ہے۔ میں ایک روح ہوں آج تمہاری زندگی کا آخری دن ہے کھر کھراتی ہوئی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ان دونوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے لگی۔ کچھ دیر بعد اسے کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی پھر اس کے کانوں سے سیف کی آواز ٹکرائی خدا بخش تم بھی اس ظلم و ستم کے کھیل میں اس شیطان کے ساتھی ہو۔ پھر فائر کی آواز گونجی کھڑا ہو جا بچہ وقت تیرے ہاتھوں سے نکل چکا ہے وہی کھر کھراتی ہوئی آواز سنائی دی چلو جابر خان کی حویلی کی طرف جابر خان کی آواز آئی۔ پھر ان کے چلنے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ اس دوران سیف کے پوچھنے پر جابر خان اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ توجہ سے سننے لگی۔ کہانی سنتے ہی غصے سے اس کا خون کھولنے لگا۔ کہانی کے ختم ہوتے ہی کسی کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ پھر جابر خان کی وارننگ اور فائر کی آواز آئی وہ سمجھ گئی سیف بھاگ نکلا ہے بھاگنے کی آوازوں کے دوران وقفے وقفے سے گولی چلنے کی آوازیں بھی سنائی دیتی رہیں۔ اسی دوران کسی کے گرنے کی آواز پھر گولی چلنے کی آواز کے ساتھ سیف کی چیخ سنائی دی وہ مضطرب ہو کر اٹھی تجربہ گاہ کی الماری سے ایک سائلنسر لگا پستول نکال کر گولیاں چیک کیں پستول لوڈ تھا یہ وہی پستول تھا جو سیف نے ٹارگٹ کلر کا اٹھایا تھا۔ ایک طرف رکھا کوٹ پہنا پستول کوٹ کی جیب میں ڈالا اور بھاگتی ہوئی حویلی کے صحن میں آ گئی۔ صحن میں لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ خوش قسمتی سے چابیاں گاڑی میں ہی تھیں۔ زینی نے لینڈ کروزر اسٹارٹ کی اور حویلی کے گیٹ تک جا پہنچی۔ چوکیدار نے گاڑی کی آواز سن کر گیٹ کھول دیا زینی لینڈ کروزر بندوق سے نکلی گولی کی طرح گیٹ سے نکلی اور سڑک پر بھاگنے لگی۔ اس کے کانوں میں ہینڈ فری جیسے آلہ میں بدستور آوازیں آ رہی تھیں وہ ڈرائیونگ کے دوران آوازیں سنتی جا رہی تھیں۔ ان آوازوں سے اسے پتہ چلا سیف زخمی اور بے ہوش ہے۔ اور وہ اسے جابر خان کی حویلی کی طرف لے جا رہے ہیں کچھ دیر بعد اسے حویلی کا گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ ایک گیٹ پر رہو اور باقی پانچ حویلی میں پھیل جاؤ اس طرح زینی کو معلوم ہوا کہ جابر خان کی حویلی میں اس وقت جابر خان سمیت 8 افراد موجود ہیں اور وہ اسے اپنی تجربہ گاہ کے تہہ خانے میں لے جا رہا ہے۔ اس دوران اس کی گاڑی حویلی کے قریب پہنچنے لگی۔

زینی نے حویلی سے کچھ فاصلے پر گاڑی روکی اور محتاط انداز میں تیزی سے چلتی ہوئی حویلی کے گیٹ کے قریب جا پہنچی۔ ایک شخص کندھے پر رائفل لٹکائے گیٹ پر بے فکری سے کھڑا تھا۔ زینی نے سائلنسر لگا پستول نکالا اور نشانہ لیا اس کے سائلنسر لگے پستول سے فائر ہوا اور گولی اس شخص کی پیشانی میں لگی۔ وہ بنا آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔

زینی آہستگی سے گیٹ کھول کر حویلی میں داخل ہو گئی اب وہ اوندھی ہو کر لیٹ گئی اور کرالنگ کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے کان میں لگے ہینڈ فری جیسے آلہ سے بدستور آواز سنائی دے رہی تھیں۔ صحن میں ایک کیاری کے پاس ایک شخص کھڑا تھا زینی کی طرف اس کی پشت تھی زینی کرالنگ کرتی ہوئی اس کے پیچھے جا پہنچی وہ بجلی کی طرح تڑپ کر اس پر جھپٹی آہٹ سن کر اس شخص نے مڑنا چاہا اسی لمحے زینی نے کراٹے چاپ کا بھرپور وار اس کی گردن پر کیا۔ گردن کی ہڈی ٹوٹنے کی ہلکی سی آواز سنائی دی اور وہ دھپ سے نیچے جا گرا۔ اس کے گرنے کی آواز سن کر ایک ستون کی آڑ سے دو افراد کندھوں پر گنیں لٹکائے نکلے کیا ہوا را جو ان میں سے ایک نے پوچھا اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے کیاری کے پیچھے چھپی زینی نے دو فائر کئے ایک گولی ایک کے سینے میں دل کے مقام میں لگی اور دوسری گولی دوسرے کے سر میں جا گھسی وہ دونوں بھی بنا چیخے جہنم واصل ہو گئے۔ ان کے گرنے کی آواز سن کر صحن میں چھپا ایک شخص ریوالور تانے اس کے سامنے آ گیا زینی پر نظر پڑتے ہی اس نے فائر کیا حویلی گولی کی آواز سے گونج اٹھی۔ اس کے فائر کرتے ہی زینی نے ایک طرف چھلانگ لگائی نیچے گرتے گرتے زینی نے فائر کئے دونوں گولیاں اسکے سینے میں پیوست ہو گئیں وہ چیختا ہوا گرا اپنے کانوں میں ابھرنے والی آوازوں سے زینی کو معلوم ہو چکا تھا کہ جابر خان تہہ خانے کی لائٹ آف کر چکا ہے اور سیف کی زندگی خطرے میں ہے۔

سیف کی چیخیں سنتے ہی وہ پاگلوں کی طرح کوریڈور میں بھاگی سامنے سے آنے والے غنڈے نے فائر کیا اس کا نشانہ خطا ہو گیا۔ زینی نے پے در پے

دو فائر کئے ایک گولی غنڈے کی گردن میں لگی وہ چیختا ہوا جہنم واصل ہو گیا اسی لمحے تجربہ گاہ کا دروازہ کھلا خدا بخش ریوالور تھامے تیزی سے باہر نکلا زینی نے گولی چلائی۔ زینی کی گولی خدا بخش کی ٹانگ کے ٹخنے میں لگی تو وہ چیختا ہوا گر گیا۔ دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی وقت جابر خان نے باہر نکلنا چاہا زینی نے اس کے سینے پر فرنٹ کک رسید کی وہ اڑتا ہوا کمرے میں جا گرا۔ اندر جاتے ہی زینی نے اٹھتے ہوئے جابر خان پر فائر کرنا چاہا مگر ٹرچ کی آواز ابھری گولیاں ختم ہو چکی تھیں، زینی نے پستول کھینچ کر اس کے سر پر دے مارا۔ جابر خان سر پر پستول لگتے ہی چیختا ہوا گرا اس کے سر سے خون بہنے لگا۔

زینی کمپیوٹر کی طرف لپکی ایک طرف لگے بٹن دباتے ہی تہہ خانے میں روشنی ہو گئی۔ سامنے اسکرین پر بھیانک منظر تھا۔ سیف کمرے میں بھاگ رہا تھا اور لاتعداد موٹے موٹے چوہے اس پر چھلانگ لگا رہے تھے۔ سیف کے جسم سے خون جگہ جگہ سے بہہ رہا تھا۔ زینی پھرتی سے تصویر کی طرف لپکی ہینڈ فری جیسے آلہ کی مدد سے اس بٹن کا پتہ چل چکا تھا۔ اس نے پھرتی سے بٹن دبایا تہہ خانے کا دروازہ کھل گیا۔ سیف میں نے دروازہ کھول دیا ہے باہر آ جاؤ۔'' وہ چلائی۔

اس دوران جابر خان اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جابر خان نے اٹھتے ہی زینی پر چھلانگ لگائی وہ اسے کوئی عام سی لڑکی سمجھ رہا تھا زینی فضا میں اچھلی اس کی سائیڈ کک جابر خان کے سینے پر لگی تو وہ دوبارہ چیختا ہوا فرش پر گرا اس دوران سیف لڑکھڑاتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکلا۔ اس کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا سیف کے باہر آتے ہی زینی نے بٹن دبا کر تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

جابر خان اب کی بار بڑی مشکل سے اٹھا زینی نے اس پر حملہ کر دیا اس کی لاتیں اور گھونسے جابر خان کے جسم پر پڑنے لگے چند لمحوں بعد وہ فرش پر نڈھال پڑا تھا اب اس میں اتنی سکت نہ تھی کہ اٹھ سکتا سیف ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔

زینی کمرے سے نکلی، دروازے کے قریب خدا بخش بے ہوش پڑا تھا زینی اسے گھسیٹ کر تجربہ گاہ میں لے آئی زینی نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور گھسیٹ کر خدا بخش کو تہہ خانے میں دھکیل دیا، اس کے بعد وہ جابر خان کی طرف لپکی وہ اسے گھسیٹتے ہوئے تہہ خانے کے دروازے پر لے جانے لگی۔ ''مجھے معاف کر دو۔'' جابر خان اس کے آگے گڑگڑایا۔ زینی اسے گھسیٹتے ہوئے تہہ خانے کی سیڑھیوں تک لے آئی۔ جابر خان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ سکتا۔ زینی نے دھکیل کر اسے تہہ خانے میں پھینکا تو وہ چیختا ہوا سیڑھیوں سے گرنے لگے۔ زینی نے تہہ خانے کا دروازہ بند کیا اور کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ گئی۔

جابر خان چلا چلا کر زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و وحشت نمایاں تھی۔ زینی نے تہہ خانے کے بلب آف کر دیئے۔ اندھیرا ہوتے ہی تہہ خانہ جابر خان اور خدا بخش کی چیخوں اور چوہوں کی آوازوں سے گونج اٹھا۔

چند منٹ بعد خاموشی چھا گئی۔ ظالم جابر خان اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔

سیف کو کسی طرح زینی بڑی مشکل سے لینڈ کروزر تک لائی، آدھے گھنٹے بعد وہ گاؤں کے اسپتال میں تھی۔ سیف کی زندگی باقی تھی کہ وہ بچ نکلا۔ اسے مکمل صحت یاب ہونے میں کافی دن لگ گئے۔ صحت یاب ہوتے ہی اس نے پوچھا۔ ''آپی آدم خور چوہوں کا کیا ہوگا؟''

''میں نے ایک ماہ کے دوران ایک کیمیکل تیار کر کے تہہ خانے میں پھینک دیا تھا یہ نہایت خطرناک کیمیکل ہے۔ تہہ خانے میں موجود تمام چوہوں کا خاتمہ ہو چکا ہوگا۔

اب مجھے تمہاری شادی کروانی ہے تاکہ تم سدھر جاؤ۔'' زینی مسکراتے ہوئے بولی۔ اور کمرہ سیف کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

سپر مارکیٹ

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

وہ سپر مارکیٹ میں داخل ہوئی گاہک بے شمار تھے مگر اچانک پورے اسٹور میں ویرانی چھاگئی، اس حالت میں وہ گھبراتے ہوئے ادھر ادھر بھاگنے لگی، راستہ مل کے نہیں دے رہا تھا کہ پھر اچانک ایک دلخراش منظر سامنے آیا۔

عقل کو حیران اور تجسس کے سمندر میں غوطہ زن ایک اچھوتی انوکھی دل فگار حیرتناک کہانی

سارا دن دفتر میں کام کر کے ریکھا بری طرح تھک چکی تھی، اس کے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی تھی مگر کل اتوار کا دن تھا، چھٹی کا دن......کل کا تصور کر کے ہی اس کی تھکن کم ہونے لگی تھی۔ اب اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی تا کہ وہ اپنے پتی اور بچوں کے لئے رات کا کھانا تیار کر سکے۔ وہ اپنی فائلیں سمیٹ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی جہاں چند بچے کھیل رہے تھے۔ ''مکیش تو دس بجے سے پہلے گھر واپس آنے والا نہیں، مگر بچے تو ٹیوشن سے جلدی واپس آ جائیں گے۔'' وہ گھر کے متعلق سوچنے لگی۔

ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے سڑکوں پر ٹریفک کا رش معمول سے زیادہ تھا ہر کسی کو گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اگلے چوک پر ٹریفک جام تھا۔ اس کی کار بھی ٹریفک میں پھنس گئی۔ باہر دسمبر کی ایک کہر آلود اور ٹھنڈی شام تھی۔

آہستہ آہستہ اندھیرا چھا رہا تھا اور وہ کانپ رہی تھی کیونکہ اس کی کار کا ہیٹر درست کام نہیں کررہا تھا۔

جب کاروں نے ذرا زیادہ تیز رینگنا شروع کیا تو ریکھا نے سکھ کا سانس لیا۔ اسی وقت اس کو یاد آیا کہ ابھی تو اس نے کچن کے لئے کچھ سامان بھی خریدنا تھا ورنہ رات کا کھانا تیار کرنا مشکل ہوجاتا۔ وہ عموماً جس شاپنگ مال سے خریداری کیا کرتی تھی وہ اس کے روٹ سے ہٹ کر تھا اور اب اس کے پاس اتنی ہمت تھی اور نہ اتنا وقت کہ وہ وہاں پہنچ کر خریداری کرسکے۔ لہٰذا اس نے چند ضروری چیزیں راستے سے ہی کسی شاپنگ مال سے خریدنے کا فیصلہ کرلیا۔

''گائلز'' اس کے راستے میں واحد سپر مارکیٹ تھی جہاں سے وہ اپنی مطلوبہ چیزوں کی خریداری کرسکتی تھی مگر ریکھا اس سپر مارکیٹ میں آج سے پہلے کبھی نہیں گئی تھی۔ کسی نئی جگہ شاپنگ کرنے میں اس کو ہمیشہ ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اور پھر اس سپر مارکیٹ ''گائلز'' کا طرز تعمیر بھی بہت عجیب اور نادر تھا۔ پوری عمارت کالے رنگ کے پتھر سے تعمیر کی گئی تھی اور اس کی ترچھی، ڈھلوان دیواریں دیکھ کر فوراً اہرام مصر یاد آجاتے تھے۔

مگر مجبوری تھی، تھکاوٹ سے چور اور وقت بچانے کی خاطر ریکھا نے اسی سپر مارکیٹ سے شاپنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ جب اس نے اپنی کار ''گائلز'' کے پارکنگ لاٹ میں موڑی تو سامنے ہی خون کی مانند سرخ نیون سائن اس کے سامنے چمک رہا تھا۔ دھند میں اس کی چمک عجیب تاثر دے رہی تھی۔

باہر سے جیسا بھی ہو اندر سے ''گائلز'' عام سپر مارکیٹ کی مانند ہی تھا۔ ویسا ہی وسیع، پرہجوم اور پرشور اور پس منظر میں گونجتی ہلکی موسیقی۔ اندر داخل ہوتے ہی ریکھا نے تیزی دکھائی اور آخری خالی میسر کارٹ کو ایک بوڑھی عورت کے ہاتھ سے تقریباً چھین ہی لیا اور اس کو لے کر تیزی سے ایک طرف بڑھی۔ اسے بسکٹ، نمکو، کچھ مصالحے اور مشروب کی چند بوتلوں کی ضرورت تھی۔

ریکھا نے اس نامانوس جگہ پر اپنے آس پاس دیکھا۔ اس کو اشیاء تلاش کرنے میں دقت ہورہی تھی اس لئے اس نے ریک کے اوپر لکھے نام پڑھنا شروع کردیئے وہ چونکہ اوپر دیکھتے ہوئے چل رہی تھی اس لئے آگے بڑھتے ہوئے بے خیالی میں اس کا ٹخنہ ایک بھورے بالوں والے نوجوان کی کارٹ سے ٹکرا گیا۔

''اے...... دیکھ کے چلو......'' وہ درد کی شدت سے چلائی۔ ''...... تم آس پاس دیکھ کر کیوں نہیں چلتے......''

ریکھا کے اس طرح چلانے پر وہ نوجوان سہم گیا اور دبے لہجے میں معذرت کرنے لگا۔ مگر اس کے اس عمل سے ریکھا کے درد کی شدت کم نہ ہوئی۔ اس نے بے تابی سے جھٹک کر اس نوجوان کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا، اس کے انداز میں ناراضگی تھی۔ وہ دوبارہ اپنی مطلوبہ چیزیں تلاش کرنے لگی۔ آگے بڑھتے ہی اچانک اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے ایک سیاہ پردہ سا لہراتا محسوس ہوا...... صرف ایک لمحے کے لئے...... اس نے سہارا لینے کی غرض سے اپنی کارٹ کا ہینڈل مضبوطی سے تھام لیا مگر کارٹ دھکا لگنے کے سبب آگے کی طرف لڑھک گئی اور ریکھا منہ کے بل فرش پر گر پڑی۔

''اوہ میرے بھگوان......'' وہ کراہ اٹھی۔

فوراً ہی اس کے آس پاس کافی لوگ جمع ہوگئے۔ وہ فرش پر بے حس و حرکت پڑی تھی، اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ پھر اس کو اپنا آپ سنبھلتا محسوس ہوا۔ اٹھنے کی کوشش کی تو زرد رنگ کا کوٹ پہنے ایک شاپ اسسٹنٹ نے اس کو سہارا دے کر اس کی مدد کرنے کی کوشش اور اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ انیس بیس سال کی ایک اوسط شکل و صورت والی لڑکی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں نا میڈم!......'' اس نے ریکھا سے پوچھا۔

ریکھا نے دھیرے سے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔ مگر اپنے آس پاس کھڑے متجسس چہروں کو دیکھ کر اسے شرمندگی اور غصے کے احساس نے گھیر لیا۔

''ہاں...... ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔ میں تو...... بس لڑکھڑا گئی تھی اور یہ بے وقوف کارٹ آگے ہی لڑھک گئی، کچھ نہیں ہوا...... سب ٹھیک ہے۔''

''بہتر ہے کہ آپ کسی جگہ تھوڑی دیر بیٹھ کر آرام کرلیں۔'' لڑکی نے مشورہ دیا۔ بھیڑ چھٹنے لگی، تمام لوگ واپس اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔

''کوئی ضرورت نہیں ہے......'' ریکھا نے کہنا چاہا مگر اسی وقت دوبارہ ایک سیاہ پردہ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا۔ لہٰذا اس نے نوجوان لڑکی کی تجویز ماننے کو ہی مناسب خیال کیا۔

وہ لڑکی ریکھا کو سپر مارکیٹ کے ایک کونے میں بنے دروازے کے پیچھے تنگ سی سیڑھیاں چڑھ کر بالائی منزل کے دفتر میں لے گئی۔ ایک کرسی گھسیٹی، ریکھا کو اس پر بیٹھایا اور پانی کے لئے پوچھا تو اس نے فوراً ہاں کردی۔

''جونہی اس لڑکی نے باہر نکل کر دروازہ بند کیا، تیسری دفعہ پھر ریکھا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا یہ دورہ پہلے دونوں وقفوں سے زیادہ طویل تھا۔ کچھ وقت کے لئے ہر چیز اندھیرے میں کھوگئی۔ آوازیں بھی مدھم ہورہی تھیں مگر پھر پہلے کی طرح ہر چیز ٹھیک ہوگئی۔ ریکھا نے پریشانی کے عالم میں اپنے سر کو جھٹکا۔ وہ ہمیشہ آسانی سے بے ہوش ہوجایا کرتی تھی۔ خصوصاً اپنی جوانی کے دنوں میں۔ ماضی کو یاد کرکے وہ مسکرادی۔ وہ ابھی تک اسی طرح دلکش و حسین تھی۔ متناسب جسم، کندھوں سے اوپر تک کٹے ہوئے گھنے سنہری بال، اس کا آفس اسسٹنٹ گوتم تو اس کو دیکھ کر چپکے چپکے آہیں بھرتا تھا۔ ریکھا نے بھی اس کو ستانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ گوتم اس کے لئے مرنے تک کو تیار تھا۔ ریکھا نے اس سے وعدہ کیا کہ جونہی اس کو موقع ملا وہ اپنے پتی مکیش کو قتل کرکے اس کے ساتھ شادی کرلے گی، مگر دونوں جانتے تھے کہ یہ سب مذاق ہے۔

ریکھا نے ادھر ادھر دیکھا۔ یہ دفتر مربع کی شکل کا یہ چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں دو دروازے تھے۔ فرنیچر کے نام پر اس کی کرسی کے علاوہ جس پر وہ اس وقت بیٹھی ہوئی تھی اس کمرے میں ایک الماری اور ایک چھوٹا سا دھاتی میز تھا جس پر سرخ رنگ کا فون، اسی رنگ کا ایک فائل ٹرے اور چند کاغذات پڑے تھے۔ کمرے کی دیواریں کھردری تھیں جن پر پیلا رنگ کیا گیا تھا۔

ریکھا نے اپنے کپڑوں کو غور سے دیکھا کہ کہیں گرنے کی وجہ سے ان کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا مگر سب ٹھیک تھا۔ وہ لڑکی پانی لے کر ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ کیا وہ اسے بھول تو نہیں گئی...... اب وہ واپس جانا چاہتی تھی۔ گھڑی کی طرف دیکھا جو ساڑھے پانچ کا وقت بتارہی تھی۔ اس کو چھ بجے تک گھر پہنچ جانا چاہئے تھا تاکہ رات کا کھانا بروقت تیار ہوسکے۔ کچھ وقت مزید انتظار کیا مگر جب اگلے پانچ منٹ تک بھی وہ لڑکی نہیں لوٹی تو اس سے انتظار کرنا مشکل ہوگیا وہ کرسی سے اٹھی اور اس دروازے تک گئی جس سے وہ یہاں آئی تھی، اس کو کھولنے کی کوشش کی مگر وہ باہر سے بند تھا۔ کچھ دور اسی طرح کا ایک اور دروازہ تھا اس نے سوچا شاید وہ اسی دروازے سے اس لڑکی کے ساتھ اس دفتر میں آئی تھی۔ اس خیال سے اس نے اس دوسرے دروازے کو آزمایا تو وہ ایک دم کھل گیا۔ شاید یہی درست دروازہ تھا، سیڑھیاں بھی ویسی ہی تھیں مگر کچھ طویل محسوس ہورہی تھی مگر ریکھا نیچے اترنے لگی۔

سیڑھیوں کے نچلے سرے پر لگے دروازے کو کھولا۔ ریکھا کے خیال اور اندازے کے مطابق اس دروازے سے نکلتے ہی اسے سپر مارکیٹ کے اندر ہونا چاہئے تھا مگر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ یہاں سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی۔ اس کو احساس ہوا کہ ہر طرف گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے نہ کوئی موسیقی، نہ گاہکوں کا شور، نہ ان کے قدموں کی آہٹ۔ نہ کارٹ کے پہیوں کی آوازیں، کوئی ذی روح بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ سب بہت عجیب تھا۔ پانچ منٹ کے اندر ہی سب کچھ بدل گیا تھا۔ اس کو اپنے سامنے ریکوں کی ایک

لمبی قطار نظر آ رہی تھی جس میں ایک طرف ولایتی شراب کی بوتلوں کی قطار تھی تو دوسری طرف کپڑے دھونے کا پاؤڈر پڑا تھا۔ ہر طرف عجیب خاموشی تھی۔ دوبارہ گھڑی چیک کی چھ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ وقت درست تھا کیونکہ وہ پانچ بجے اپنے دفتر سے گھر جانے کے لئے نکلی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے آگے بڑھنا شروع کردیا۔ گہری خاموشی میں اس کے جوتے فرش سے ٹکرا کر عجیب سی آواز پیدا کررہے تھے جو کانوں میں چبھ رہی تھی۔ ریکھا پریشان ہوگئی سب لوگ کہاں گئے......؟ کیا کوئی حادثہ ہوگیا ہے......؟ مگر بظاہر ہر چیز اور ماحول، سب درست تھا۔

وہ ریکوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک چوراہے تک پہنچ گئی۔ چاروں طرف ریک کھڑے تھے۔ ہر طرف گہری خاموشی تھی، سب لوگ کہاں گئے......وہ سوچنے لگی، ابھی تو شام شروع ہوئی ہے۔ مگر رکو...... یہ کس نے کہا یہ شام ہے۔ کیا یہ صبح کے چھ نہیں ہوسکتے...... ہاں یہ تو ممکن تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اس سے زیادہ عرصہ بے ہوش رہی ہو جتنا اس نے محسوس کیا۔ ہوسکتا ہے نوجوان لڑکی اسے دفتر میں بٹھا کر بھول گئی ہو اور اس عرصے میں کوئی دوسرا بھی اس دفتر میں نہ آیا ہو، وہ ساری رات بے ہوش رہی ہو اور سپر مارکیٹ کی انتظامیہ نے اس کی موجودگی کو محسوس کئے بغیر دکان بند کردی ہو......مگر انہوں نے ساری روشنیاں کیوں جلتی چھوڑ دیں۔ یہ تو معمول کی بات نہیں تھی۔

وہ باہر جانے کا راستہ تلاش کرنے کے لئے ریکوں کے بیچ چلتی رہی مگر اس کو باہر جانے کا راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ وہ رات بھر اس اسٹور میں بند ہوگئی تھی، مگر حیرت ہے اتنا وقت گزرنے کے بعد، پوری رات گزرنے کے بعد بھی اس کو بھوک محسوس نہیں ہورہی تھی۔ یہ سوچ کر وہ مسکرانے لگی۔ وہ بھوکا رہنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس جگہ تو وہ اپنی دعوت خود کرسکتی تھی۔ آس پاس پورا اسٹور بھرا پڑا تھا وہ کچھ بھی استعمال کرسکتی تھی، کچھ بھی کھا پی سکتی تھی، لیکن مفت نہیں......وہ بعد میں اس کی رقم اسٹور کو ادا کرسکتی تھی۔ وہ اتنے بڑے اسٹور میں راستے کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکتی رہی، مگر اس کو بھوک بالکل بھی محسوس نہیں ہورہی تھی، یہ نارمل بات نہیں تھی، اس کے ذہن میں الجھن پیدا ہونے لگی، اسے یہ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اگر اس نے کل دوپہر سے اب تک کچھ نہیں کھایا تو اس کو بھوک محسوس کیوں نہیں ہورہی؟ حالانکہ صبح آنکھ کھلتے ہی اس کے پیٹ میں چوہے دوڑنا شروع کردیتے تھے۔

اب اس کی بے چینی پریشانی میں تبدیل ہونے لگی تھی۔ کچھ تو یہاں غلط تھا......وہ اس جگہ سے جلد از جلد باہر نکلنا چاہتی تھی۔ مکیش اور بچے اس کی غیر موجودگی اور اس کے غائب ہونے کے سبب پریشان ہوں گے۔ اسٹور کی خاموشی اور سکوت اس کے لئے عذاب اور سزا بنتی جارہی تھی۔ اس کو باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔ مگر وہ تھا کس طرف......اس کے چاروں طرف سامان سے بھرے ریک تھے۔ ریکھا کو اپنے پورے جسم پر چیونٹیاں رینگتی محسوس ہورہی تھیں۔ خوف دبے پاؤں اس کے اعصاب پر حاوی ہورہا تھا۔ اس خالی پن اور خاموشی میں اس کے اپنے بھاری سانسوں کے زیر و بم کی آوازیں بہت اونچی سنائی دے رہی تھیں۔

''ہمت کرو......'' وہ اپنے آپ کو حوصلہ دیتی ہوئی بڑبڑائی اور سوچنے لگی۔ ''رات کا چوکیدار کہاں ہے؟ ہوسکتا ہے وہ اس کے چیخنے کی آواز سن لے۔''

''ہیلو......کوئی ہے......؟'' وہ پوری قوت سے چلائی۔ ''یہاں کوئی ہے......؟''

اس کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی مگر اس سناٹے میں اس کو اپنی اتنی آواز بھی خوف بھری چیخ محسوس ہوئی۔ وہ چند لمحے پکارتی رہی، مگر بے سود...... ہر طرف سناٹا اور خالی پن تھا۔ وہ غصے سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگی۔ اچانک یاد آیا کہ اوپر دفتر میں ایک فون پڑا تھا وہ چونک پڑی۔ مگر اب مسئلہ دفتر تک پہنچنے کا تھا۔ آس پاس دیکھا اس کو کچھ سمجھ نہ آرہی تھی کہ دفتر کس طرف ہے۔ مگر اتنا ضرور یاد تھا کہ جہاں دفتر تک جانے والی

سیڑھیوں کا دروازہ تھا وہاں قریب ہی کپڑے دھونے کے پاؤڈر اور شراب کے ڈبوں کے ریک تھے۔ وہ تیزی سے لپک کر ایک طرف آگے بڑھی مگر دفتر کا دروازہ کہیں نظر نہ آیا۔ گھوم پھر کر دوبارہ وہیں آگئی۔ یہ جگہ بھول بھلیاں بن گئی تھی۔ وہ پریشان ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔

ریکھا بڑبڑائی۔ ''اب کیا ہوگا......؟ شاید کچھ نہیں ہوسکتا۔ انتظار کرو اور دیکھو میرے پاس اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔'' ایک گہری سانس لے کر اس نے ہتھیار پھینک دیئے وہ اپنی ہر ممکن کوشش کرچکی تھی۔ اس کا حلق خشک ہورہا تھا۔ پیاس لگ رہی تھی۔ اس کو یاد آیا کہ وہ کہیں دودھ والے حصے سے بھی گزری تھی جہاں اس نے دودھ کے ڈبے رکھے دیکھے تھے۔ وہ اس وقت مسالے والے حصے میں کھڑی تھی۔ اتفاقاً اس کی نظر ایک جار پر ٹک گئی۔ اس پر کچھ ناقابل فہم عبارت لکھی تھی ''کوبرا کے کانٹے'' نام پڑھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گئی۔ دوبارہ پڑھا...... ''کوبرا کے کانٹے۔''

''وہ ریک کے قریب گئی اور جار کو اٹھالیا۔ غور سے دیکھا...... لیبل پر کوبرا کے کانٹے ہی لکھا تھا۔ شیشے کے جار کے اندر اس کو لمبے لمبے کانٹے نما کچھ نظر آیا جس کا ایک سرا چپٹا تھا۔ کراہت آمیز ابکائی لیتے ہوئے اس نے وہ جار واپس اپنی جگہ پر رکھ دیا۔ پھر دوسری بوتلوں پر نظر ڈالی۔ ایک اور لیبل پر ''بکری کا پتہ'' لکھا ہوا تھا۔ ریکھا کے چہرے پر انجانی حیرت چھا رہی تھی۔ کون اس قسم کی خوفناک چیزیں خریدتا ہوگا۔ اس نے پھر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ چھپکلی کی آنکھ...... کتے کی زبان...... چھپکلی کی ٹانگ۔

''اوہ......'' وہ پریشان ہوچکی تھی۔ ''یہ سب حقیقت نہیں ہے۔ یہ مذاق ہی ہوسکتا ہے۔'' اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں اپنے کندھے اچکائے۔

ریکھا کو پیاس محسوس ہورہی تھی، وہ دودھ والے حصے کی طرف لپکی، خوش قسمتی سے جلد ہی اس کو وہ حصہ مل گیا۔ اس نے دودھ کا ایک ڈبہ اٹھایا اور اس کو ایک طرف سے کھولا۔ اس دوران میں وہ دوسرے ڈبوں کو دیکھتی رہی۔ بٹر ملک...... دہی...... بھیڑیوں کا دودھ......آخری لیبل پر نظر پڑتے ہی وہ بوکھلا گئی۔ اسی قطار میں دوسرے ڈبوں پر لکھا تھا۔ ''لنگوروں کا خون...... حنوط شدہ ممی کا جوس......'' وہ کانپ اٹھی۔ دودھ کا ڈبہ اس کے ہاتھ سے پھسل گیا اور زمین پر گر کر پھٹ گیا زوردار آواز کے ساتھ ہر طرف دودھ پھیل گیا۔ مگر اس کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔ وہ خوف کے عالم ایک ٹک ریک کو گھورے جارہی تھی۔ ممی کے جوس والے ڈبے کے پہلو میں پڑی ایک اور چیز اس کی توجہ کا مرکز تھی۔ وہاں چار مختلف قسم کے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ ان پر لکھا تھا۔ ''خالص انسانی خون......'' یہ سب ڈبے کالے رنگ کے تھے مگر ان پر نمایاں انداز میں لکھا تھا۔ A.B,AB ریکھا نے بے یقینی کے عالم میں اپنے سر کو جھٹکا...... یہ مذاق نہیں ہوسکتا......ایسا سنگین مذاق کون کرسکتا ہے؟ ریکھا کی ٹانگوں میں اینٹھن ہونے لگی۔ وہ بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھی اور لرزتے ہاتھوں سے انسانی خون کا ایک ڈبہ جھپٹ کر اٹھالیا اور جلدی سے اس کو پھاڑ کر کھول دیا۔

گاڑھا، گاڑھا......سرخ سیال اچھل کر باہر نکلا اور اس کے ہاتھوں پر گرا۔ چاروں طرف تازہ خون کی بو پھیل گئی۔ ریکھا نے خوفزدہ ہوکر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب تھی۔ تقریباً پھینکنے کے انداز میں ڈبے کو واپس ریک میں رکھا اور الٹے پاؤں بھاگی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ سینے میں درد بھی محسوس ہورہا تھا۔ وہ کسی بھی طریقے سے یہاں سے باہر نکلنا چاہتی تھی...... یہاں جو کچھ ہورہا تھا اور جو کچھ یہاں موجود تھا...... وہ اس کا مطلب نہیں سمجھ پارہی تھی۔ مگر یہ سب انتہائی خوفناک تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی، تقریباً بھاگنے والے انداز میں ریکوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔ بار بار وہ کسی نہ کسی عجیب ہولناک، خوفناک کراہت آمیز چیزوں والے اسٹینڈ کے پاس سے گزرتی۔ باغبانی کے اوزار والے سیکشن

میں بھی اوزاروں کی جگہ اذیت ناک ہتھیار پڑے تھے جو چمک رہے تھے۔ ایک جگہ اس کو چمگادڑ کی کھال، گدھ کے پر، آدم خور پودے کی جڑیں بھی نظر آئیں۔ اخبارات، رسائل، میگزین کے سیکشن میں دل دہلا دینے والے میگزین تھے جن کے سرورق پر عفریت رینگتے نظر آرہے تھے۔ ان پر زندہ لاشیں، چڑیلیں، خون آشام بھیڑیے اور ادھ جلی لاشیں نظر آرہی تھیں۔

خوف نے ریکھا کے قدم جکڑ لئے۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی اچھلے گا اور سینہ پھاڑ کر آگرے گا۔ خوف اس کو بری طرح جکڑ چکا تھا۔ یہ کس قسم کی دکان تھی۔ کس قسم کے لوگ، کس تہذیب اور مزاج کے لوگ یہاں خریداری کرتے تھے اور ان کا تعلق کہاں سے تھا؟

''یہ سب جیسا نظر آرہا ہے، ویسا نہیں ہے۔ مجھے پرسکون رہنا چاہئے...... ان بھول بھلیوں سے نکلنے کا کوئی تو راستہ ہوگا...... کوئی تو طریقہ ہوگا۔'' وہ بڑبڑانے لگی۔

اس نے قریبی شیلف پر رکھا چاولوں کا پیکٹ دیکھا تو اچانک ایک خیال ذہن میں ابھرا، بچپن میں سنی ایک کہانی یاد آگئی جس میں ایک شہزادی جنگل میں کھو جاتی ہے تو وہ راستہ یاد رکھنے کے لئے روٹی کے ٹکڑوں سے مدد لیتی ہے۔ ریکھا نے بھی وہی ترکیب آزمانے کی سوچی اور اس نے جھپٹ کر چاولوں کا پیکٹ اٹھا لیا۔ اس کو نوچ کر کھولا اور چاولوں کے دانوں کو اپنے پیچھے گراتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ اس طرح وہ اس راستے پر نشانی لگا رہی تھی، جس پر سے وہ گزرتی جارہی تھی۔

ریکھا کا راستہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا اس کو دفتر کا دروازہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دانستہ اپنے آس پاس کی چیزوں سے نظریں چرا رہی تھی، بس سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کو باہر نکلنے کے راستے کی تلاش تھی۔ بھٹکتے ہوئے وہ گوشت والے حصے میں پہنچ گئی۔ یہاں مختلف قسم کا گوشت شیشے کے ریفریجریٹروں میں محفوظ کیا گیا تھا جن میں سے گوشت بالکل واضح نظر آرہا تھا اسی لئے کسی چیز نے برفیلے بکسوں میں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ اس کو یہاں پڑا گوشت کچھ مختلف محسوس ہورہا تھا۔ ریکھا نے کوشش کی کہ اس گوشت کی طرف نہ دیکھے کہ کہیں یہاں بھی کچھ خوف ناک نہ ہو...... مگر وہ رہ نہ سکی۔ لاشعوری طور پر وہ اس فریزر کے قریب چلی گئی۔ ایک نگاہ ہی بس کافی تھی۔ بکس میں نہایت صفائی سے شفاف کاغذ میں مرغی کی ٹانگیں لپٹی ہوئی تھیں مگر نہیں...... وہ تو انسانی ہاتھ تھے...... وہ وہاں زیادہ رک نہ سکی، گھبرا کر واپس مڑی اور بھاگی۔ کچھ دور جا کر وہ رک گئی اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ اس نے دوبارہ اپنی ہمت مجتمع کی اور پھر آگے چلنا شروع کردیا۔ نشانات کے سہارے چلتے ہوئے آخر کار اس کو کیش رجسٹر نظر آگیا۔

ریکھا کو محسوس ہوا کہ وہ بچ گئی ہے...... وہاں سے اس کو شیشے کا بیرونی دروازہ بالکل قریب نظر آرہا تھا۔ چاول کا بچا ہوا پیکٹ وہیں پھینک کر وہ دروازے کی طرف لپکی مگر جونہی وہ دروازے تک پہنچی اس کو رک جانا پڑا۔ دروازہ مقفل تھا اور باہر گہرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ شیشے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی اور باہر جھانکنے لگی۔ شیشے کے باہر ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس سے پتہ چلتا کہ باہر رات کا کون سا پہر ہے۔ وہاں تو بس گہرا کالا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ریکھا کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی گہری اندھی کالی سرنگ کے اندر ہو۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا تو قریب ہی اس کو اسٹور کھلنے اور بند ہونے کے اوقات ایک بورڈ پر لکھے نظر آئے۔

''اسٹور سورج غروب ہونے کے ایک گھنٹے بعد کھلے گا اور سورج طلوع ہونے سے ایک گھنٹہ قبل بند ہوجائے گا۔''

ریکھا کا منہ حیرت کے مارے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بے یقینی کے عالم میں وہ اس بورڈ کو کئی بار پڑھتی چلی گئی۔ یہ کیا واہیات اوقات تھے۔ مگر...... یہ اسٹور تو اس وقت واقعی بند تھا۔ اگر یہ واقعات درست لکھے تھے

تو اس کا مطلب ہے ابھی صبح کے چھ نہیں بجے تھے۔ یہ دسمبر کا مہینہ ہے اور اس موسم میں سورج صبح تقریباً ساڑھے سات بجے طلوع ہوتا تھا۔ اگر اس وقت صبح کے چھ بجے ہوتے تو اسٹور کھلا ہوا ہوتا۔ اس کا مطلب ہے ابھی تک شام تھی اور سردیوں میں سورج تقریباً ساڑھے پانچ بجے غروب ہوجایا کرتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس بورڈ کے مطابق اسٹور کھلنے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ آخر کار وہ سب سمجھ گئی کہ وہ غلط جگہ پھنس گئی تھی۔ اس کو سیڑھیوں کی لمبائی سے سمجھ جانا چاہئے تھا۔ وہ شاید تہہ خانے میں تھی...... خوف ناک تہہ خانہ...... جہاں مافوق الفطرت اور خون آشام گاہک رات کے اندھیرے میں اپنی حیوانی جبلت کی تسکین کے لئے خریداری کرنے آیا کرتے تھے۔

ریکھا کو دھیرے دھیرے سب سمجھ آنے لگی کہ اس کے پاس وقت بہت کم ہے۔ اسٹور کھلنے سے پہلے اس کو یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ وہ اچھلی اور پھر تقریباً بھاگنا شروع کردیا۔ وہ اس نرک سے فوراً نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شدید خطرے میں ہے۔ اس کے آس پاس دہشت کا راج تھا۔ اس کو لگا کہ وہ دوبارہ اپنے خاوند اور بچوں سے نہیں مل سکے گی اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کو اس بات کا یقین ہوتا جارہا تھا۔

وہ پھر بھٹک چکی تھی۔ وقت گزرتا رہا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ابھی اور کتنا وقت لگے گا اور ایسا اس کے ساتھ کیوں ہورہا تھا۔ زندگی تو اس پر بہت مہربان تھی۔ وہ صحت مند تھی۔ خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہی تھی، بھگوان نے پیارے بچے عطا کئے تھے، اچھی ملازمت ملی تھی۔ اگلے ماہ اس کی شادی کی سالگرہ تھی۔ مکیش نے اس موقع پر دعوت کرنے کے لئے شہر کے بہترین ہوٹل میں ہال بک کروایا تھا۔ وہ اس کو بھی ہنی مون کہا کرتا تھا۔ ریکھا اس کے اس بچکانہ اظہار خوشی پر ہمیشہ ہنس دیتی۔ مکیش محبت کرنے والا نہایت شاندار مرد تھا...... اور وہ اس کی رفاقت میں بہت خوش تھی۔

''اوہ میرے بھگوان!......'' وہ بے بسی کے عالم میں چلا اٹھی۔ اس کی آواز اس کے گلے میں پھنس رہی تھی۔

وہ اپنے آپ کو گھسیٹتی ہوئی انجانے راستوں سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ بار بار وہی پرانی چیزیں اس کے سامنے آجاتیں۔ اس کی سوچوں کی گاڑی بھاگے جارہی تھی۔ مگر پھر اچانک اس گاڑی اور ریکھا کے قدموں کو بریک لگ گئی۔ ہال کی روشنیاں بجھنا شروع ہوگئی تھیں۔ کچھ مدھم ہوگئیں۔ ریکھا کے دماغ میں خطرے کا الارم گونج اٹھا۔ ہال میں دھند کا پھیلنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اسٹور کھلنے کا وقت ہورہا تھا۔ وہ یہاں سے نکل بھاگنا چاہتی تھی۔ وہ زندگی کی تلاش میں تھی، اس کو زندگی چاہئے تھی۔

روشنی دھند لکے میں بدل چکی تھی۔ اب ریکھا کو کچھ آوازیں بھی آنا شروع ہوگئیں۔ یہ ہلکی ہلکی کھرونچوں کی آوازیں تھیں جیسے گراموفون کے ریکارڈ پر سوئی رگڑی جارہی ہو۔ کوئی ریکارڈ چلنے والا ہو...... پھر وائلن پر ماتمی دھن کی آواز بلند ہوئی۔ ایک دفعہ پھر ریکھا کے جبڑے بھینچ گئے۔ وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کررہی تھی مگر چاروں طرف پھیلتی تاریکی میں اور ماتمی دھن اس کے اعصاب پر حاوی ہوتی جارہی تھی۔ ریکھا کو شیشے کے دروازے کے پیچھے وہ سیاہ خلاء یاد آیا جہاں سے اس ہیبت ناک اسٹور میں خون آشام گاہک اندر آتے ہوں گے...... وہ ان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کہ ممی کا جوس اور انسانی خون پینے والے یہ گاہک آخر کس قسم کے ہوں گے۔

اس کا دل الٹنے لگا...... وہ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ وہ اندازے سے واپس دفتر کی طرف بھاگی، وہی اب اس کی آخری امید تھا۔ مگر اب یہ کام اس کو نہایت خاموشی سے کرنا تھا کیونکہ اب وہ اس آسیبی اور خوف ناک سپر اسٹور میں اکیلی نہیں تھی کوئی اور شخص بھی ضرور تھا جس نے ہال کی روشنیاں گل کی تھیں اور ماتمی دھن والا ریکارڈ چلایا تھا۔ ریکھا اس شخص سے بچنا چاہتی

تھی اس کے سامنے نہیں آنا چاہتی تھی اس لئے اس نے اپنے جوتے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لئے تاکہ چلنے سے کوئی آہٹ پیدا نہ ہو۔ چاولوں کا پیکٹ دوبارہ اٹھایا اور اندھیری راہداریوں میں چلنا شروع کردیا۔ آخرکار وہ ایک جانی پہچانی جگہ پہنچ گئی۔ وہاں مشروب کے کافی سارے کین اس کے سامنے فرش پر پڑے تھے۔ دھندلی روشنی میں بھی اس کو ان پر لکھی عبارت واضح نظر آرہی تھی۔ اس پر لکھا تھا۔ ''بچے کا جگر......''

وہ دہشت سے اپنی جگہ منجمد ہوگئی، پھر اس سے پہلے کہ وہ کوئی ردعمل دکھاتی، کین کے ڈھیر کے دوسری طرف سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وہ مزید گھبرا گئی اور الٹے پاؤں پیچھے ہٹی۔ وہ کبڑی پشت والا ٹھگنے قد کا ایک شخص تھا۔ اس کے بازو بہت لمبے اور زمین تک لٹکے ہوئے تھے۔ وہ عجیب سی ہولناک آواز نکالتا ہوا، بندر کی طرح ریکھا پر جھپٹا جو خوف کے عالم میں اپنی جگہ بے حس وحرکت کھڑی تھی۔

کبڑے کے اس طرح جھپٹنے پر وہ ایک دم حرکت میں آئی اور چیختی ہوئی ایک طرف کو بھاگی۔ وہ کبڑا بدصورت اس کے پیچھے تھا اور اس کے حلق سے عجیب بے ہنگم اور دل دہلا دینے والی آواز برآمد ہورہی تھی۔ خوش قسمتی سے وہ اس تک نہیں پہنچ پارہا تھا۔ مگر وہ کہاں تک بچے گی۔ وہ کہاں جائے...... کیا شیشے کے دروازے کے پیچھے اسی تاریک خلاء میں...... مگر اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔

وہ پوری قوت سے بھاگتی رہی۔ پھسلتی، گرتی پڑتی وہ دوبارہ کیش رجسٹر تک پہنچ گئی۔ وہ بمشکل اپنا سانس قابو کرپارہی تھی۔ شیشے کے دروازے کو دھکیل کر باہر نکلنے کی کوشش کی، اس کا ہینڈل کھینچا مگر وہ تو اپنی جگہ جام تھا۔ بالکل بند تھا۔ اب اس کا شیشہ توڑنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ریکھا ادھر ادھر دیکھتے ہوئے دروازے کا شیشہ توڑنے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنے لگی۔ آس پاس اس کو ایک ہی موزوں چیز نظر آئی اور وہ تھی، شاپنگ کارٹ...... جو ایک قطار میں کچھ دور پڑی ہوئی تھی ریکھا ان کی قطار کی طرف لپکی۔ پہلی کارٹ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو پتہ چلا کہ وہ ایک زنجیر سے بندھی ہوئی تھیں۔ اپنے عقب میں اس کو پھر سے اس کبڑے کے قدموں کی چاپ سنائی دینا شروع ہوگئی تھی۔ ریکھا کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور پرسکون ہونے کی کوشش کی اور دوبارہ کارٹ کو اپنی طرف کھینچا اس کوشش میں وہ چند قدم پیچھے ہٹی۔ ایک گہری سانس لی...... مگر پھر اپنی جگہ جم کے رہ گئی۔ سامنے شیشے کے پار اندھیرے میں اس کو کچھ حرکت نظر آئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پھیل گئی۔ اندھیرے سے جسم برآمد ہونا شروع ہوگئے تھے۔ انسانی خون اور ممی کا جوس پینے والے گاہک چلے آرہے تھے۔ یہ راستہ بھی مسدود ہوگیا تھا۔

''اوہ نہیں......'' وہ بے بسی کے عالم میں کراہ اٹھی۔

''اوہ ہاں......'' عقب سے ایک مکروہ سرسراتی آواز بلند ہوئی۔

ریکھا نے مڑ کر دیکھا تو وہ خبیث صورت کبڑا کیش رجسٹر کے سامنے کھڑا تھا۔ اس عفریت کا سینہ ضرورت سے زیادہ چوڑا تھا۔ چہرہ کیا تھا...... کھال سے عاری بس ایک کھوپڑی۔ وہ ایک بن مانس کی طرح کھڑا تھا اور اس کے لمبے بالوں والے بازو دائیں بائیں لہرا رہے تھے۔

ردعمل میں ریکھا ایک دم مڑی اور اس پر حملہ کردیا۔ وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ ریکھا نے سامنے سے اس پر حملہ کردیا تھا۔ وہ کچھ قدم پیچھے ہٹا اور پھر پیچھے جاگرا۔ ریکھا نے موقع غنیمت جانا ایک جست لگائی، عفریت کو پھلانگا اور اسٹور کے اندھیروں میں گم ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی اب کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔ یہ سب لوگ اندر آجائیں گے پھر کہیں بھاگنے بچنے کی بھی جگہ نہیں بچے گی۔ شدید خوف کے عالم میں وہ ریکوں کے درمیان بری طرح بھاگی چلی جارہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اسٹور کا آج کا پہلا گاہک اندر آچکا ہوگا۔ ریکھا نے اپنے

پیچھے دوبارہ آہٹ سنی۔ ایک لمحے میں وہ پہچان گئی کہ یہ اس کبڑے بن مانس کے سانسوں کی خرخراہٹ تھی۔ بھاگنے کے دوران اس کے کانوں میں ایک لفظ پڑا۔ ''کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ ''دن کا گاہک''......

اور پھر جلد ہی ریکھا کو اپنے چاروں طرف بھاگتے قدموں کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ آہٹوں سے اس کو اندازہ ہورہا تھا کہ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ ریکھا کا دم گھٹنے لگا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دوبارہ آخری ریک تک پہنچ گئی کیونکہ آگے راستہ بند تھا۔ وہاں پر مشروبات کے کین جس پر بچے کا جگر لکھا ہوا تھا۔ ایک ڈھیر کی صورت میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ رک گئی، مڑ کر دیکھا پیچھے سارے راستے پر لوگ ہی لوگ تھے وہ اسی کی طرف آرہے تھے۔

''وہ یہاں ہے......'' ان میں سے ایک نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسروں کو متوجہ کیا۔

ریکھا اپنی جگہ سمٹ کر رہ گئی۔ وہ خون آشام اسی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ایسی چیزیں اس نے خوابوں میں بھی نہ دیکھی تھیں۔ وہ لوگ اندھیرے میں سے ابھر رہے تھے۔ ریکھا بری طرح پھنس چکی تھی پیچھے راستہ بند تھا اور سامنے سے لوگوں کی بھیڑ اس کی طرف لپک رہی تھی۔ کوئی راستہ نہ پاکر اچانک وہ جیسے پھٹ سی پڑی۔ بری طرح چیختے ہوئے وہ اپنے پیچھے پڑے ہوئے کینوں کے ڈھیر پر پل پڑی اور ان کو اٹھا اٹھا کر آگے بڑھنے والے عفریتوں پر برسانا شروع کردیا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے چیخے جارہی تھی اور کینوں کو ہٹا کر راستہ بھی بناتی جارہی تھی تاکہ کسی طرف سے باہر نکل سکے ان لوگوں سے بچ سکے۔ ہر لمحے اس کو خوف تھا کہ وہ لوگ آکر اس کو دبوچ لیں گے اور چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔ اپنی اسی کوشش میں وہ کین کے ڈھیر کی دوسری طرف پہنچ گئی۔

دوسری طرف کا منظر دیکھ کر اس کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ دوسری طرف کپڑے دھونے والے پاؤڈر اور شراب کی بوتلوں کا ریک تھا اور سب سے زیادہ خوشی کی بات کہ وہاں ایک دروازہ بھی تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں وہ سب سے پہلے سیڑھیاں اتر کر پہنچی تھی۔ وہ دروازہ پر جھپٹی اور اسے بے تابی سے کھولنے لگی۔ دروازہ ایک جھٹکے سے کھل گیا اور وہ اوپر جاتی سیڑھیوں پر جاگری۔ اٹھی اور بھاگتی ہوئی اوپر چڑھنے لگی۔ اوپر اس دفتر میں وہی پرانی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ ریکھا نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور بمشکل کرسی تک پہنچی اور اس پر ڈھے گئی۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔

جب دوبارہ اسے ہوش آیا تو پیلے کوٹ والی نوجوان لڑکی اس کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی تھی اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔

''میڈم...... میڈم......'' لڑکی نے اسے پکارا۔

مدہوشی اور حواس باختگی کے عالم میں ریکھا نے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کہاں ہوں......'' ریکھا بڑبڑائی۔ اس کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ صرف اتنا احساس تھا کہ جو کچھ ہوا تھا وہ انتہائی خوف ناک تھا۔ مگر کب ہوا......؟ لڑکی مسکرانے لگی۔

''آپ سپر مارکیٹ کے آفس میں ہیں۔ آپ بے ہوش ہوگئی تھیں اور میں آپ کے لئے پانی لینے گئی تھی۔ معافی چاہتی ہوں مجھے کچھ دیر لگ گئی۔ ایک افسر نے راستے میں روک لیا تھا۔''

ریکھا نے پانی کا گلاس تھامنا چاہا مگر ہاتھ بری طرح کپکپا رہے تھے...... سپر مارکیٹ...... وہ خوفناک چیزیں...... وہ بن مانس کبڑا...... ممی کا جوس اور انسانی خون پینے والے گاہک...... کیا یہ سب خواب تھا...... ناممکن...... یہ سب تو حقیقی تھا۔ اس نے سوچا اور پھر چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دل میں ایک ڈر تھا کہ ابھی ایک دم دروازہ کھلے گا اور خونی عفریت نکل کر اس پر دھاوا بول دیں گے۔ پھر اس کی نگاہیں لڑکی کے چہرے پر آن رکیں۔ وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ اس لڑکی کے چہرے پر معصومیت تھی...... کیا خواب اتنے حقیقی بھی ہوسکتے ہیں۔

''کیا میں آپ کے لئے ٹیکسی منگوادوں......؟''

لڑکی نے پوچھا۔
''نہیں...... شکریہ...... باہر میری کار موجود ہے۔'' ریکھا نے جواب دیا۔
پھر ہمت کرکے ریکھا اٹھی اور...... دروازے کی طرف بڑھی۔ ابھی تک خوفناک سوچیں اور خیالات اس کے دماغ پر سوار تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھولتی۔ لڑکی نے اسے ٹوک دیا۔
''راستہ اس طرف ہے میڈم......'' لڑکی ایک دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی اور آگے بڑھ کر اس کے لئے دروازہ کھول دیا۔ اس کے چہرے پر حیرت کے آثار تھے۔ ریکھا رکی، جھجکی، کندھے اچکائے اور سیڑھیاں اترنا شروع ہوگئی۔ اب یہ سیڑھیاں قدرے مختصر محسوس ہوئیں۔ اس کا کیا مطلب تھا۔ وہ زیادہ نہ سوچ سکی۔ نوجوان لڑکی اس کے عقب میں تھی۔ اوپر دفتر میں کچھ نامعلوم سا شور اٹھا۔ سیڑھیوں کے نیچے کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کے ہاتھ کپکپا اٹھے۔ مگر یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ دروازہ کھلتے ہی اب اس کے سامنے سپر مارکیٹ کی روشنیوں کی چکا چوند اور گاہکوں کی چہل پہل اور شور تھا۔ اس نے سکون کی ایک گہری سانس لی، مگر خطرہ اب بھی محسوس ہورہا تھا۔ اب اسے خریداری میں کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی اور اپنے گھر پہنچنا چاہتی تھی۔
اچانک عقب سے لڑکی نے جو ابھی تک سیڑھیوں میں ہی تھی اس نے چیخ کر اسے رکنے کو کہا، ریکھا گھبرا گئی اور کسی نامعلوم خدشے کے تحت اس نے باہر نکلتے ہی اپنے پیچھے دروازہ باہر سے بند کردیا اور جتنی تیز ممکن ہوسکتا تھا بھاگتی ہوئی اسٹور سے باہر آ گئی۔ کیش رجسٹر کے سامنے ادائیگی کے لئے لگی لمبی قطار کو کہنیوں کی مدد سے ہٹاتی وہ باہر پارکنگ لاٹ میں آ گئی۔
یہاں اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ شام ٹھنڈی ہورہی تھی۔ موسم خنک تھا۔ وہ ایک لیمپ پوسٹ کا سہارا لے کر رک گئی۔ کیا خوف ناک خواب تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے رومال نکال کر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔
''میرا دماغ تھک گیا ہے شاید......'' ریکھا نے سوچا۔ ''...... دفتر میں کام بھی تو بہت ہوتا ہے۔ مکیش ٹھیک کہتا ہے مجھے کبھی کبھی آرام بھی کرنا چاہئے۔''
رومال واپس جیب میں رکھتے ہوئے اچانک اسے اپنے کوٹ کی جیب میں کوئی وزنی چیز محسوس ہوئی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا اور باہر نکال کر دیکھا تو وہ ایک کین تھا جس پر لکھا تھا۔ ''بچے کا جگر......'' یہ کین دیکھتے ہی ریکھا کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔
''اوہ میرے بھگوان!...... کیا...... جو میرے ساتھ ہوا، یہ سب سچ تھا...... اگر ایسا ہے تو مجھے پولیس کو اس کی اطلاع دینی چاہئے، یہی درست ہوگا۔''
عین اسی وقت ایک ہاتھ نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے جکڑ لیا۔ وہ چیخ اٹھی۔ وہی پیلے کوٹ والی نوجوان لڑکی اس کے پاس کھڑی تھی۔ اب اس کے چہرے پر معصومیت کی جگہ دھمکی کے تاثرات تھے اور اس کے ہونٹوں پر مکروہ ہنسی کھیل رہی تھی۔
''اسٹور میں شاپنگ کرتے ہیں، چوری نہیں کیونکہ چوری کرنا جرم ہے میڈم!......'' وہ بلند آواز میں بولی۔
اسی وقت دو مرد اسسٹنٹ اندھیرے سے نکل کر سامنے آ گئے اور انہوں نے ریکھا کے دونوں بازو جکڑ لئے اور اس کو ایک طرف کھینچنے لگے۔ ریکھا چیخنے اور بل کھانے، ایڑیاں رگڑنے لگی۔ وہ مچل مچل کر ان کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کررہی تھی۔ راہگیر رک رک کر اس منظر کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں پر ترحم آمیز مسکراہٹ تھی۔ دونوں نوجوان ریکھا کو گھسیٹتے ہوئے عمارت کے ایک پہلو میں لے گئے۔ وہاں اندھیرے میں ایک ٹرک کھڑا تھا۔ اس کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور اس پر ایک طرف بالکل خون کی طرح سرخ رنگ سے الفاظ لکھے تھے A, B, AB, & O

لاحاصل تمنا

ساجدہ راجا- ہنڈواں سرگودھا

اب مرنے کے لئے تیار ہوجائو، یہ کہتے ہی لڑکی نے نوجوان کے بازو پر تیز دھار خنجر سے چیرا لگاتا تو بھل بھل خون نیچے گرنے لگا، لڑکی بہت رغبت سے خون اپنے حلق سے نیچے اتارنے لگی اور پھر اچانک......

حرص ولالچ کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک عجیب وغریب عبرتناک انوکھی اچھوتی کہانی

ساکت سے کھڑے ہوئے وہ دونوں حیران کن نظروں سے اردگرد دیکھ رہے تھے آگے بڑھنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا، اردگرد اونچے پہاڑیوں سپاٹ تھے کہ قدم جمانا ناممکن تھا، وہ پیچھے بھی کسی صورت نہیں پلٹ سکتے تھے کیونکہ پیچھے صرف موت تھی جس سے وہ بال بال بچ کے آئے تھے اور اب وہ ایسی جگہ آ کے پھنس گئے تھے جہاں وہ نہ آگے بڑھ سکتے تھے اور نہ پیچھے۔ اونچے نیچے پتھریلے راستوں پر چلتے چلتے ان کی ٹانگیں شل ہوچکی تھیں لیکن انہیں موت سے ہر صورت بھاگنا تھا جو کسی خطرناک اژدھے کی صورت انہیں نگلنے کو بے تاب تھی اور زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی......؟
لیکن وہ دونوں تو کچھ زیادہ ہی زندگی کی خواہش رکھتے تھے۔ زیادہ جینے کی آرزو نے انہیں موت کی وادی میں لا پھینکا تھا۔ سرسبز موت کی وادی...... جو بظاہر

دیکھنے میں جنت سے کم نہیں دکھتی تھی لیکن اس کی حقیقت دوزخ سے بھی بدتر تھی وہاں پیٹ بھرنے کو بہت کچھ تھا لیکن اس میں بھی احتیاط نہ کی جائے تو آدمی ایک لمحے میں موت کی آغوش میں چلا جاتا، ہر قدم پر پھلدار درختوں کی بہتات تھی لیکن زیادہ تر زہریلے۔ جن کا زہر سانپ کے زہر سے بھی زیادہ مہلک تھا وہ دونوں جب اس وادی میں داخل ہوئے تھے تو بھوک سے نڈھال تھے۔

جیسے ہی مائیکل کی نظر پھلدار درختوں پر پڑی تو وہ دوڑ کر درخت کے قریب گئے، پھلوں کو دیکھ کر ان کے تن مردہ میں جان آ گئی تھی مائیکل نے پھل توڑے، اس سے پہلے کہ وہ انہیں منہ میں رکھتا جوزف نے چیخ کر اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔ تو مائیکل نے حیرت سے جوزف کی طرف دیکھا کہ وہ اسے کیوں پھل کھانے سے منع کر رہا ہے؟ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں جوزف نے درخت کے پاس پڑے کئی مردہ پرندوں کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔

''مائیکل...... یہ پھل زہریلے ہیں انہیں مت کھا۔ دیکھ! ان پرندوں کو یہ مردہ پڑے ہیں یقیناً انہوں نے پھل کھانے کی کوشش کی ہوگی اور یہ پھل ان کے لئے موت کا سبب ثابت ہوئے۔

''لیکن جوزف تمہیں کیسے پتہ کہ یہ پھل کھانے کی وجہ سے ہی مرے ہیں، ہوسکتا ہے ان کے مرنے کی کوئی اور وجہ ہو۔'' مائیکل نے اس کے اعتراض کے جواب میں کہا تو جوزف بولا۔

''نہیں مائیکل...... تو نے شاید غور نہیں کیا کہ اس درخت پر کوئی پرندہ نظر نہیں آ رہا جبکہ دوسرے درختوں پر ایسا نہیں ہے۔ یہ بے چارے پرندے جو مردہ پڑے ہیں یہ بھی غلطی سے پھل کھا بیٹھے ہوں گے جس کے نتیجے میں یہ مر گئے، اور دوسرے پرندے اس درخت کے قریب بھی نہیں آ رہے۔ اس سے بڑھ کر اس کے زہریلا ہونے کی اور کیا علامت ہوگی......؟''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن بھوک سے برا حال ہے مزید ایک قدم چلنا بھی محال ہو گیا ہے، مجھے لگتا ہے ہم زندگی کی تلاش میں بھٹکتے رہیں گے اور موت کا پنجہ ہمیں آ دبوچے گا۔''

مائیکل کے لہجے میں پہلی بار ہلکی سی اداسی کا عنصر آیا لیکن جوزف نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور بولا...... ''ایسا مت سوچ۔''

ہم نے چلتے وقت عہد کیا تھا کہ جیسے بھی حالات ہوں چاہے جو بھی مشکل پیش آئے ہم ہر حال میں ہمت نہیں ہاریں گے اور جس کام کے لئے نکلے ہیں وہ پورا کر کے رہیں گے۔'' جوزف کی تسلی آمیز باتوں نے مائیکل کے اندر اک نئی ہمت پیدا کر دی۔

''اب کسی ایسے پھلدار درخت کی تلاش میں چلتے ہیں جس پر پرندے موجود ہوں۔'' اور خوش قسمتی سے انہیں جلد ہی ایک ایسا پھل دار درخت مل گیا تو انہوں نے خوب جی بھر کے پھل کھائے اور کچھ اپنے ساتھ لے لئے تاکہ آگے کوئی مشکل نہ ہو......

مائیکل اور جوزف بہت گہرے دوست تھے ان کا زیادہ تر وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا تھا۔ نہایت امیر کبیر خاندانوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انہیں روزگار کی کوئی پریشانی نہیں تھی، ان کے ذاتی اکاؤنٹ میں رقم اتنی تھی کہ وہ ساری زندگی بیٹھ کر کھاتے تب بھی ختم نہ ہوتی، معاشی بے فکری اور ہر طرح کی آزادی نے انہیں من موجی انسان بنا دیا تھا۔

جب وہ کسی کی موت کا سنتے تو انہیں عجیب سی بے چینی اپنے لپیٹ میں لے لیتی۔ وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔ ہمیشہ یا پھر بہت لمبی زندگی جینا چاہتے تھے۔ اب ان کے درمیان زیادہ تر اسی موضوع پر بات چیت ہوتی تھی انہوں نے اپنے طور پر بہت سے ڈاکٹروں، سائنسدانوں اور ایسے لوگوں سے رابطہ کرنا شروع کر دیا جو سفلی علم کے ماہر تھے۔ ان دونوں نے سب سے اس موضوع پر بات کی لیکن انہیں کوئی تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

وہ بہت پریشان رہنے لگے انہیں کچھ سمجھ نہیں

آ رہا تھا کہ وہ لمبی زندگی کے لئے کیا کریں؟ اپنے طور پر انہوں نے ہر ممکن کوشش کر لی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔

ایک دن وہ ساحل سمندر پر اسی موضوع کو چھیڑے بیٹھے تھے وہ باتوں میں اتنے محو تھے کہ انہیں اس شخص کی آمد کا ذرا بھی احساس نہ ہوا جب اس نے ان دونوں کو مخاطب کیا تو وہ چونکے۔

''تم لوگوں کے مسئلے کا حل میرے پاس ہے لیکن ہے بہت کٹھن۔'' اس شخص نے پراسرار لہجے میں ان کو بتایا تو ان کو اپنی سماعتوں پر یقین نہ آیا۔

''کیا کہہ رہے ہیں آپ......؟ کس مسئلے کا حل......؟ اور آپ ہیں کون......؟' مائیکل نے تیزی سے پوچھا۔

جواباً اس آدمی کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بولا۔

''میں جو بھی ہوں اسے چھوڑو تم لوگوں کی تمام باتیں میں نے سن لی ہیں تم لوگ جس بات کے لئے پریشان ہو اس کا حل ہے میرے پاس لیکن۔''

''لیکن ویکن کو چھوڑو۔'' جوزف جلدی سے بولا۔ اگر تم نے واقعی ہماری باتیں سن لی ہیں تو پلیز! ہمیں بتاؤ تمہارے پاس کیا حل ہے؟ ہم اپنی اس خواہش کی خاطر ہر مشکل سے گزرنے کو تیار ہیں۔''

''چاہے اس میں موت ہی آ جائے۔'' وہ آدمی طنزیہ لہجے میں بولا تو ان دونوں کے چہروں پر ناگواری پھیل گئی۔ ''ہم موت سے بچنے کے لئے ہی تو ہر مشکل سے گزرنا چاہتے ہیں اور تم پھر موت کی باتیں کر رہے ہو۔ اگر نہیں بتانا تو نہ بتاؤ لیکن موت کی باتیں مت کرو۔'' جوزف ناگواری سے بولا تو وہ آدمی مسکرانے لگا۔

''لگتا ہے واقعی تم لوگ سنجیدہ ہو تو ٹھیک ہے تم لوگ آؤ میرے ساتھ...... میں تمہیں وہ چیز دکھاتا ہوں جس میں تمہارے مسئلے کا حل موجود ہے۔'' وہ آدمی اٹھتے ہوئے بولا تو ان دونوں نے مشکوک نظروں سے اس کی طرف دیکھا وہ آدمی ان کا مطلب سمجھ گیا اور بولا۔

''گھبراؤ نہیں۔ میرا ارادہ ہرگز تم لوگوں کو نقصان پہنچانے کا نہیں اور نہ میں تم لوگوں کو جانتا ہوں اگر پھر بھی تمہیں یقین نہیں تو پھر تم لوگوں کی مرضی اور میری نہ مانو۔''

اس کے مضبوط لہجے نے ان کے شکوک دور کر دیئے اور وہ اس کے پیچھے ہو لئے۔ اس آدمی کے پاس گاڑی موجود تھی وہ دونوں اس کے ساتھ سوار ہو گئے کچھ دیر کے بعد وہ اس کے اپارٹمنٹ میں تھے جو کہ کافی خوبصورت اور قیمتی ساز و سامان سے آراستہ تھا...... لیکن کچھ عجیب و غریب بھی، کیسے......؟ یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا بہرحال اس آدمی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔

کچھ دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اک بوسیدہ سی کتاب کی موجود تھی ان دونوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ''اک کتاب ان کے مسئلے کا حل کیسے ہوسکتی ہے؟''

وہ آدمی ان کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''اس کتاب میں تمہارے مسئلے کا حل موجود ہے لیکن خبردار...... اس کتاب کے بارے میں کبھی بھول کر بھی کسی سے ذکر نہیں کرنا ورنہ میرے ساتھ تم لوگ بھی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ یہ کتاب صدیوں سے ہمارے خاندان میں چلی آ رہی ہے، اس میں بہت اہم راز اور ایسے ایسے نسخے موجود ہیں کہ آدمی پتہ نہیں کہاں سے کہاں پہنچ جائے میرے پردادا کے دادا بہت بڑے جادوگر تھے انہوں نے یہ کتاب لکھی تھی جو اور کسی کے پاس موجود نہیں ایک بار کسی جادوگر کو اس کتاب کے بارے پتہ چل گیا اس نے یہ کتاب بذریعہ جادو میرے دادا سے ہتھیا لی اور اس کا غلط استعمال شروع کر دیا۔

میرے دادا نے بہت مشکل عمل کر کے اس کتاب کو واپس حاصل کیا بعد میں اس جادوگر نے میرے دادا اور میرے باپ کو بھی مار دیا لیکن کتاب پر چونکہ ایک خاص عمل کیا گیا تھا اس لئے یہ ابھی تک اس

جادوگر کی نظروں میں نہیں آئی میرے گھر کے باہر اگر تم لوگوں نے اس کتاب کا ذکر کیا تو اس جادوگر کو خبر ہوجائے گی اور وہ ہر صورت کتاب حاصل کرلے گا اور تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دے گا۔"

"اس کی اتنی تفصیل سننے کے بعد وہ دونوں مطمئن ہوگئے چونکہ وہ کتاب کو کہیں لے جا نہیں سکتے تھے اس لئے اس آدمی نے ان کو وہیں ٹھہرنے اور مطالعہ کرنے کا کہا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ اس کے علاوہ اور کسی چیز کا مطالعہ نہیں کریں گے اگر انہوں نے ایسا کیا تو ان سے کتاب واپس لے لی جائے گی۔" انہوں نے بھی وعدہ کیا اور پورے انہماک سے اس صفحے کے مطالعے میں مصروف ہوگئے جس کا اس آدمی نے انہیں بتایا تھا۔

جوں جوں کتاب کو وہ پڑھتے گئے ان کے تجسس اور جوش وخروش میں اضافہ ہوتا گیا۔

"اس کتاب میں لکھے گئے طریقے کے مطابق افریقہ کے دوردراز جنگلات میں ایک ایسی جڑی بوٹی موجود تھی جو انسانی عمر کو بڑھانے کے کام آتی تھی ساتھ ساتھ انسانی طاقت میں بے پناہ اضافہ کرتی تھی اس کے ساتھ ہی ساری تفصیل درج تھی جس کے مطابق وہ جڑی بوٹی ایسے علاقے میں واقع تھی جہاں اس سے پہلے شاذ و نادر ہی کوئی انسان پہنچا ہو اور ساتھ ہی اس کے بارے مکمل آگاہی اور اس علاقے کا نقشہ موجود تھا انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی کہ وہاں کس طرح کے حالات پیش آئیں گے انہیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا......؟

انہیں تو بس اس بات کی فکر تھی کہ وہ کتنی جلدی ادھر روانہ ہوسکتے ہیں زیادہ جینے کی خواہش نے انہیں ہر خوف سے جیسے آزاد کردیا تھا انسان بھی عجیب مخلوق ہے اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود کبھی کبھی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوجاتا ہے یا جان بوجھ کر سوچنے کی زحمت نہیں کرتا وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ قوانین قدرت کے خلاف کام کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے اس کے باوجود جو قدرت کے رازوں کو چھیڑنے سے باز نہیں آتا، وہ دونوں بھی کچھ ایسا ہی کرنے کی کوشش میں تھے لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا نتیجہ کتنا بھیانک ہوسکتا ہے۔

انہوں نے اس کتاب کے مطابق نقشہ تیار کیا اور اپنے کام کی باتیں ذہن نشین کرلیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی اندر آیا اور ان سے تفصیلات پوچھیں...... جواباً انہوں نے تمام باتیں اسے بتائیں آخر میں انہوں نے اس سے پوچھا کہ اس نے خود افریقہ جاکر اس جڑی بوٹی کو حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی......؟

تو وہ تھوڑی دیر خاموش رہا اور پھر بولا...... "شاید میں بھی ایسا ہی کرتا لیکن کسی وجہ سے میں ایسا نہیں کرسکا یا پھر شاید مجھ میں زیادہ جینے کی اتنی خواہش نہیں جتنی تم لوگوں میں ہے۔"

"کیا آپ ہمیں وہ وجہ بتائیں گے جس کی وجہ سے آپ نے اس جڑی بوٹی کو حاصل نہیں کیا۔" جوزف کے سوال نے اس کے چہرے پر سوچ وبچار کی لکیریں پیدا کردیں پھر وہ بولا۔

"یہ آج سے تقریباً دس سال پہلے کی بات ہے مجھے بھی اس جڑی بوٹی کو حاصل کرکے استعمال کرنے کا جنون سوار ہوا تھا اور میں تقریباً اس کو حاصل بھی کرچکا ہوتا اگر مجھے وہ بوڑھا نہ ملتا۔

میں افریقہ کے جنگلات میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جارہا تھا کہ مجھے ایک جنگلی زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا۔ مجھ پر غنودگی چھانے لگی اور میں دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوگیا، جانے میں کب تک بے ہوش رہا جب ہوش آیا تو میں ایک جھونپڑی میں موجود تھا اور میرے پاس ایک عجیب الخلقت بوڑھا بیٹھا تھا۔ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کے جسم پر گوشت نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ بالکل ہڈیوں کا پنجر...... چلنے پھرنے میں نہایت مشکل پیش آتی تھی اسے پتہ نہیں وہ کیسا انسان تھا جب میں نے اس سے اس کے بارے پوچھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے بولا۔

"اپنے ایک شوق کی تکمیل کی سزا بھگت رہا ہوں بیٹا۔"

"کیسی سزا بابا......؟" میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

زندہ رہنے کی سزا......" میں اس کے جواب پر مزید حیران ہوا تب وہ بولا۔ "جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو مجھے عجیب وغریب چیزوں کے بارے میں جاننے کا شوق تھا ایک بار مجھے ایک ایسی جڑی بوٹی کے بارے میں علم ہوا جو کم کم کہلاتی تھی اس کی خاصیت یہ تھی کہ اس کا استعمال کرنے والا لمبی عمر کے ساتھ بے پناہ طاقت کا مالک بن جاتا ہے میں نے بڑی مشکل سے وہ جڑی بوٹی حاصل کی اور اس کو استعمال کرلیا اس کے بعد مجھ میں بے پناہ طاقت آگئی۔ میں بہت خوش تھا لیکن کب تک......؟ جوانی کب تک رہی ہے؟ وقت گزرتا رہا وقت کے ساتھ ساتھ میں بوڑھا ہوگیا اور اس دوران کئی بار موت مجھے چھوکر گزری میں شدید تکلیف میں موت موت پکارتا۔ لیکن موت کیسے آتی؟ کئی بار میں اتنا بیمار رہا کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگیا دس دس دن مجھے بھوکا رہنا پڑا لیکن موت میرے قریب بھی نہ آئی میں روز مرنے کی آرزو کرتا ہوں لیکن......؟ لوگ اتنا زندگی کی خواہش نہیں رکھتے ہوں گے جتنا میں موت کی آرزو کرتا ہوں۔

لیکن موت ہر بار دبے پاؤں گزر جاتی ہے اور میں بے بسی سے اسے جاتا دیکھتا رہتا ہوں۔ جانے کب موت آئے یا آئے بھی نا...... میں قدرت کے قانون سے کھیلنے کی سزا بھگت رہا ہوں۔

کاش میں اس جڑی بوٹی کو استعمال نہ کرتا اور اپنی طبعی عمر پوری کرکے مرجاتا...... کاش اے کاش......!!

اس بوڑھے کے دردناک واقعہ نے مجھے اندر سے خوف زدہ کردیا اور میں انہی قدموں واپس لوٹ آیا۔ میں تم لوگوں کو کبھی اس جڑی بوٹی کے بارے نہ بتاتا اگر میں مجبور نہ ہوتا۔ اس کتاب کے میرے پاس ہونے کی وجہ سے میری مجبوری ہے کہ اگر میں کہیں کوئی مسئلہ دیکھ یا سن لوں جس کا حل اس کتاب میں موجود ہو تو پھر مجھ پر لازم ہوجاتا ہے کہ میں اس آدمی کو اس کا حل بتاؤں۔ تم لوگوں کی باتیں اتفاقیہ میرے کانوں میں پڑگئیں اور مجھے بتانا پڑگیا لیکن میں اب بھی تم لوگوں کو باز رکھتا ہوں کہ تم لوگ اپنی اس انوکھی خواہش کو ترک کردو یہ نہ ہو کہ تم لوگوں کا انجام بہت بھیانک ہو......" یہ کہہ کر وہ آدمی خاموش ہوگیا۔

جبکہ جوزف اور مائیکل سنی ان سنی کرکے وہاں سے اٹھ آئے...... اور اس کے تیسرے روز وہ دونوں، افریقہ کے لئے فلائی کرگئے...... وہ جگہ جہاں وہ آکر پھنسے تھے نہایت خطرناک تھی لیکن انہیں ہر صورت وہاں سے نکلنا تھا کیونکہ پیچھے ہٹنے کا رسک وہ کسی صورت نہیں لے سکتے تھے کیونکہ وہ بڑی مشکلوں سے وہاں سے نکل کے آئے تھے اس راستے کے علاوہ انہیں اور کوئی راستہ معلوم نہیں تھا انہیں ہر صورت آگے جانا تھا۔ جس جگہ وہ تھے اس سے آگے اونچی چٹان تھی جس پر چڑھنے کے بعد وہ دوسری طرف اتر سکتے تھے لیکن انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر دوسری طرف اترنے کا کوئی راستہ نہ ہوا تو......؟ اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہیں سکتے تھے رسک تو بہرحال لینا تھا انہوں نے آہستہ آہستہ چٹان پر چڑھنا شروع کردیا اس میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی ذرا سا پیر پھسلنے کی صورت میں......!

ان کے پاس صرف ایک ایک بیگ تھا جن میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی اسلحہ سمیت...... جو کسی بھی مشکل میں ان کے کام آسکتا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل موجود تھے مارچ کے اوائل تھے اس لئے گرمی نہیں تھی اور انہیں موسم کی کوئی خاص پریشانی نہیں تھی لیکن بارش کی صورت میں انہیں مشکل پیش آسکتی تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے جگہ جگہ نالے بہنا شروع ہوجاتے ہیں اور سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوسکتا تھا ان کے کپڑے موسم کے لحاظ سے مناسب تھے لیکن شدید موسم کا بہرحال وہ مقابلہ نہیں کرپاتے۔

اس جگہ آنے سے پہلے وہ اک ایسے علاقے سے گزرے تھے جہاں قدم قدم پر موت دلدلوں کی صورت میں موجود تھی انہوں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی جانوروں کو ان دلدلوں میں زندہ دفن ہوتے دیکھا تھا۔ جوزف بھی بال بال بچا تھا۔

ہوا یوں کہ جنگل کو عبور کر کے وہ اک ایسی جگہ آ گئے تھے جو درختوں سے کافی حد تک خالی تھی جھاڑیاں تھیں بھی تو بہت کم وہ لوگ جنگل کے گھنے تاریک اور پرہول رستوں سے گزرے تھے جہاں جھاڑیاں اپنے اندر موت کو چھپائے ہوئے ہوتی تھیں۔ سانپ اور زہریلے کیڑے مکوڑے اچانک جھاڑیوں سے نکل کر آدمی کو ڈس لیتے تھے اور آدمی منٹوں میں موت کا شکار ہو جاتا تھا نیچے بے حد نیچے اور گھنے درخت اور خودرو پودوں سے لگے کانٹے ان کے جسم کو چھیل لیتے تھے جب ان خطرناک راستوں سے وہ زندہ سلامت نکل کر نسبتاً کھلے علاقے میں آئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ لیکن یہ سکون عارضی ثابت ہوا جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ وہ تاریکی سے نکل کر گہری تاریکی میں آ گئے ہیں تو ان کے ہوش اڑ گئے وہ دلدلی علاقہ تھا جہاں سے وہ واپس نہیں پلٹ سکتے تھے کیونکہ ان کے سامنے ہی ہاتھی جیسا ایک بڑا جانور 5 منٹ سے بھی کم وقفے میں دلدل میں زندہ اتر گیا تھا اس کی چنگھاڑیں ان کے دل دہلائے دے رہی تھیں لیکن وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے انہیں تو اب اپنی زندگی کی فکر لگ گئی تھی انہیں نہایت احتیاط سے یہ علاقہ عبور کرنا تھا ذرا سی بے احتیاطی انہیں زندہ درگور کر سکتی تھی پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے اور سخت زمین پر آرام سے چلتے وہ کسی نہ کسی طرح وہ علاقہ عبور کر آئے تھے لیکن اس دوران جوزف نے موت کو نہایت قریب سے دیکھ لیا تھا۔

وہ دلدل میں اترتے اترتے بچا تھا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی کہ مائیکل نے بروقت اسے نکال لیا ورنہ......

وہ آدھی سے زیادہ چٹان چڑھ چکے تھے جب مائیکل کی چیخ قرب وجوار میں گونج کر رہ گئی۔ جوزف نے دھڑکتے دل سے مائیکل کی طرف دیکھا اور اس کے ہوش اڑ گئے۔ مائیکل کا شاید پاؤں پھسلا تھا اور اب وہ نیچے کی طرف لٹک رہا تھا اگر اس نے آگے نکلے ہوئے بڑے پتھر کو تھام نہ لیا ہوتا تو اب تک پتھریلی زمین پر گرنے کی وجہ سے اس کی ہڈیوں کا سرمہ بن چکا ہوتا۔ وہ چیخ چیخ کر جوزف کو اپنی مدد کے لئے آوازیں دے رہا تھا۔ جوزف نے اسے شانت رہنے کی تلقین کی اور تھوڑا سا نیچے اتر آیا۔ اس نے دیکھا کہ جس جگہ مائیکل لٹکا ہوا تھا اس کے ساتھ ہی اک پتھر اس طرح باہر نکلا ہوا تھا کہ اگر مائیکل تھوڑی سے ہمت کرتا اور اس پر پیر رکھتا تو وہ آسانی سے بچ سکتا تھا۔

''مائیکل۔ تھوڑی سی ہمت کر اپنے پیر کو دائیں جانب سرکا وہاں ایک بڑا سا پتھر ہے اس پر اپنا پیر ٹکا کر اپنا توازن قائم کر جلدی کر۔'' جوزف جانتا تھا کہ مائیکل نے ذرا بھی دیر کی تو وہ پتھر جس کو وہ پکڑے ہوئے تھا اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا اس نے مائیکل کو جلدی کرنے کو کہا۔ مائیکل نے اس کے کہنے پر عمل کیا اور اپنا توازن قائم کرتے ہوئے احتیاط سے اپنا داہنا پیر اس پتھر پر ٹکا دیا۔ کچھ دیر خود کو نارمل کرنے کے بعد وہ دوبارہ اپنے سفر پر شروع ہوئے کچھ دیر بعد وہ چوٹی پر پہنچنے میں کامیاب ہو گئے لیکن دوسری طرف اک اور مشکل ان کی منتظر تھی جس چٹان پر وہ تھے اس کے درمیان سے اک چشمہ پھوٹ رہا تھا پانی تیزی سے نیچے گر رہا تھا اس کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ نیچے اتر سکتے۔ وہ خاموشی سے نیچے دیکھنے لگے جہاں ایک کے بعد ایک مشکل انکی منتظر تھی۔

چٹان سے گرنے والا پانی نیچے ایک آبشار میں جمع ہو رہا تھا۔ پانی کے بہاؤ سے لگ رہا تھا کہ وہ آبشار یقیناً گہری ہوگی وہ دونوں اچھی طرح تیرنا جانتے تھے لیکن اتنے تیز پانی میں جانے کا انہیں اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا تھا یہی سوچ کر وہ نیچے اترنے لگے چڑھائی سے زیادہ اترنا دشوار تھا اور بیگوں کی موجودگی کی وجہ سے انہیں بہت زیادہ مشکل پیش آ رہی تھی کسی نہ کسی طرح وہ اس آبشار کے دہانے پر پہنچ گئے پانی پورے زور و شور سے نیچے بہہ رہا تھا انہوں نے آس پاس نظر دوڑائی لیکن اس کے علاوہ انہیں نیچے اترنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔

''اب ہمارے پاس ایک ہی راستہ ہے کہ اپنے بیگوں کو نیچے پھینک کر خود بھی چھلانگ لگا دیں بیگ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں جس کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو اور دوسرا بیگز واٹر پروف ہیں پانی میں گرنے کی صورت میں چیزوں کے بھیگنے کا کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ جوزف نے مائیکل کی طرف تائید طلب نظروں سے دیکھا اور مائیکل نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا اور پھر انہوں نے اپنے بیگز نیچے پھینک دیئے وہ چشمے کے قریب ہی ایک زوردار آواز سے خشک جگہ پر گر پڑے بیگوں کی طرف سے اطمینان کے بعد وہ خود بھی نیچے جانے کی تیاری کرنے لگے۔

چھپاک...... کی آواز سے پہلے جوزف پانی میں گرا پھر اس نے مائیکل کو بھی نیچے آنے کا کہا...... مائیکل پانی میں گرا لیکن کافی دیر بعد بھی وہ اوپر نہ آیا تو جوزف کو تشویش نے گھیر لیا اس نے زور زور سے مائیکل کو آوازیں دیں لیکن جواب ندارد۔ جوزف نے سانس روکی اور پانی کے اندر چلا گیا۔ پانی صاف شفاف تھا اس لئے ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی لیکن مائیکل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ پانی کی تیزی کی وجہ سے چٹانوں کے نیچے بہت چوڑا پاٹ بن گیا تھا اور پانی زور زور سے ان چٹانوں سے ٹکرا رہا تھا۔

جوزف ان چٹانوں کے نیچے چلا گیا پانی اور مائیکل چٹان کا اتنا فاصلہ تھا کہ آدمی سر نکال کر سانس لے سکے۔ اس نے بھی جلدی سے سر پانی سے نکالا اور گہرے گہرے سانس لئے اور آہستہ آہستہ اس چٹان کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا اسے یقین تھا کہ مائیکل ضرور ادھر موجود ہوگا کیونکہ اس نے چٹان سے پانی میں چھلانگ لگائی تھی تو وہ اسی سائیڈ پر گرا تھا اور پھر پانی کا بہاؤ اس طرف ہونے کی وجہ سے وہ ادھر آ گیا ہوگا۔ چٹان بل کھاتی ہوئی ٹیڑھی ہو گئی اور تھوڑا آگے ہی مائیکل موجود تھا جوزف نے اسے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی اور پھر وہ آہستہ آہستہ پانی سے باہر نکل آئے......

اچانک ان کی نظر دائیں طرف پڑی تو وہ حیران رہ گئے کیونکہ ایک حسینہ نیم عریاں حالت میں پانی میں کھڑی تھی اس کے گیلے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے جو اس کے برہنہ جسم پر گر کے اس کی خوبصورتی کو مزید بڑھا رہے تھے وہ دونوں حیرت سے ساکت کھڑے تھے انہیں یوں اس ویرانے میں اتنی خوبصورت دوشیزہ کے ملنے کی امید نہیں تھی جبکہ وہ لڑکی انہیں دیکھ کر نہایت دلربا انداز میں مسکرائی اور نہایت دلنشین چال سے ان کی طرف آئی، اس کے جسم سے پوٹھنے والی ایک

لمبا خواب

ایک مرتبہ کرمان کے بادشاہ ملک محمد سے خزانے کے ایک پہریدار نے عرض کیا۔ ''حضور! رات کو میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ اگر اجازت ہو تو عرض کروں!''

بادشاہ نے اجازت دے دی۔ پہریدار نے ایک لمبا چوڑا خواب سنایا اور بادشاہ خاموشی سے سنتا رہا۔ جب وہ اپنا خواب سنا چکا تو بادشاہ نے حکم دیا۔ ''اس شخص کو خزانے کی نوکری سے برطرف کر دیا جائے۔''

ایک صاحب نے وجہ دریافت کی تو بادشاہ نے کہا۔ ''جو شخص اتنا لمبا خواب دیکھتا ہے وہ یقیناً بہت ہی زیادہ سوتا ہے۔ ایسا شخص خزانے کی حفاظت کس طرح کر سکتا ہے!''

(ایس امتیاز احمد - کراچی)

عجیب طرح کی دلکش خوشبو نے انہیں مدہوش کردیا تھا خاص کر مائیکل تو کچھ زیادہ ہی مدہوش لگ رہا تھا شہر میں اس نے ایسا حسن کہاں دیکھا تھا۔؟

حیرت انگیز طور پر اس لڑکی نے بھی مائیکل پر زیادہ توجہ دی۔ ''ہمارے علاقے میں خوش آمدید اجنبیوں!''

اس لڑکی کے منہ سے اپنی زبان سن کر وہ بہت حیران ہوئے۔ ''تم کون ہو اور ہماری زبان کیسے جانتی ہو!'' بولنے والا مائیکل تھا۔ لڑکی اس کی بات سن کر مسکرائی اور بولی۔

''میرے بارے میں بہت جلد جان لوگے۔ یہاں قریب ہی ہمارا قبیلہ آباد ہے ہمارا آئے دن ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اس لئے ہمیں بہت سی زبانیں آتی ہیں تم لوگ تھکے ہوئے لگتے ہو آجاؤ، میرے ساتھ، ساتھ۔ یہ کہہ کر وہ ایک طرف چلنے لگی تو ان دونوں نے بھی اس کی تقلید میں قدم آگے بڑھادیئے۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ڈھلی تھی لیکن گہرے کالے بادلوں کی وجہ سے شام کا سماں لگ رہا تھا۔ پہلے ان دونوں کو یہ فکر تھی کہ بارش آنے کی صورت میں وہ کہاں پناہ لیں گے؟ لیکن اس لڑکی کے ملنے کی وجہ سے انہیں یہ امید بندھ گئی تھی کہ یقیناً انہیں پناہ مل جائے گی کیونکہ لڑکی کا تعلق کسی قبیلے سے تھا اور اس قبیلے میں وہ رات اور بارش کا سے گزار سکتے تھے۔

چلتے چلتے لڑکی اک ایسی سائیڈ کی طرف بڑھ گئی جہاں درخت بہت گھنے تھے اور دور سے بہت وحشت ناک لگ رہے تھے درختوں کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے لڑکی نے شاید ان کے رکنے کو بھانپ لیا تھا وہ پیچھے مڑ کر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

''کیا ہوا...... تم دونوں رک کیوں گئے......؟''

''یہ تم ہمیں کہاں لے کے جارہی ہو......؟ آگے اتنا اندھیرا ہے اور گھنے درخت ......؟ ہمیں خوف محسوس ہورہا ہے۔''

جوزف نے جواب دیا۔

''ڈرو مت ان درختوں سے آگے ہی میرا قبیلہ آباد ہے وہاں اندھیرا نہیں ہوگا اور تمہیں ہر طرح کا تحفظ اور عیش وآرام بھی حاصل ہوگا۔'' عیش وآرام کا ذکر کرتے ہوئے لڑکی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ رینگنے لگی جبکہ مائیکل کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اس نے بلاخوف وخطر قدم آگے بڑھادیئے۔

جوزف نے اسے اشاروں کناروں میں سمجھانے کی کوشش کی لیکن مائیکل پر اس لڑکی کے حسن کا جادو طاری تھا وہ ہرگز رکنے والا نہیں تھا مجبوراً جوزف کو بھی اس کا ساتھ دینا پڑا۔

جیسے ہی انہوں نے درختوں کی حد میں قدم رکھا بادل اتنی زور سے گرجے کہ ان دونوں کے دل دہل گئے جبکہ وہ لڑکی نہایت اطمینان سے چلتی جارہی تھی۔ ان دونوں نے بھی اپنے قدموں کی رفتار بڑھادی۔ بادل بار بار زور سے گرج رہے تھے اور بجلی اتنے زور سے کڑکتی کہ ان کے دل حلق میں آجاتے اچانک انہوں نے خود کو اک قبیلے کی حدود میں پایا درخت اچانک ہی ختم ہوگئے تھے اور آگے جابجا جھونپڑیوں کی موجودگی نے انہیں یقین دلادیا تھا کہ وہ لڑکی اسی قبیلے کی رہنے والی ہے بار بار چمکتی بجلی اردگرد کے مناظر کو خوب واضح کررہی تھی۔ اس لڑکی کا رخ ایک بڑے خیمے کی طرف تھا وہ دونوں بھی اس طرف بڑھ رہے تھے کہ اچانک لڑکی خیمے کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی اس نے زور سے تالی بجائی۔ ذرا ہی دیر میں دو قوی الجثہ آدمی نمودار ہوئے ان کے ہاتھوں میں نیزے تھے جو بہت خوفناک لگ رہے تھے۔

لڑکی نے اپنی زبان سے ان سے کچھ بات کی جسے سن کر وہ لوگ جوزف کی طرف بڑھے اور اسے ایک طرف چلنے کا کہا۔ جوزف نے حیران ہوکر لڑکی سے پوچھا کہ یہ لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہیں تو جواباً اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ بولی۔

''ہم اپنے اس معزز مہمان کے ساتھ کچھ اچھا

وقت گزارنا چاہتے ہیں۔'' اس نے مائیکل کی طرف اشارہ کیا تو مائیکل اس کی بات سمجھ کر مسکرادیا۔

''تم دوسرے خیمے میں جاکر آرام کرو۔'' یہ کہہ کر وہ لڑکی خیمے کے اندر داخل ہوگئی۔

جوزف نے مائیکل کو روکنا چاہا لیکن مائیکل نے بس کندھے اچکانے پر اکتفا کیا اور جلدی سے اندر خیمہ کے داخل ہوگیا اور خیمے کا پردہ گر گیا۔ جوزف نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور ان آدمیوں کے ساتھ چل پڑا۔

خیمے میں لیٹنے کے بعد جوزف کا ذہن مائیکل کی طرف ہی رہا نہ جانے کیوں اسے کچھ عجیب سا لگ رہا تھا جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھا تھوڑی دیر بعد خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک آدمی کھانا لے کر اندر داخل ہوا بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو نے اس کی بھوک میں یکدم اضافہ کردیا تھا اس کے ساتھ کچھ جنگلی پھل بھی تھے جوزف نے خوب سیر ہوکے کھایا اور سونے کے لئے لیٹ گیا بارش ابھی تک نہیں ہوئی تھی جبکہ بادل پورے زور شور سے گرج رہے تھے نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔

مائیکل اس لڑکی کے ساتھ خیمے میں داخل ہوا تو بہت حیران ہوا وہ خیمہ اندر سے بہت بڑا خوبصورت اور روشن تھا اور اس روشنی میں اس لڑکی کا حسن اس پر بجلیاں گرا رہا تھا وہ مدہوش سا ہورہا تھا اس لڑکی نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اسے بیٹھنے کا کہا اور اپنے جسم پر موجود وہ نامناسب لباس اتار دیا مائیکل کی آنکھیں پھیل گئیں وہ بت بنا اس کو تک رہا تھا جو نہایت حسین تھی۔

اتنے میں خیمے میں ایک آدمی کھانا لے کر داخل ہوا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے لڑکی کی برہنگی کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور کھانا رکھ کر چپ چاپ لوٹ گیا۔ مائیکل کی توجہ کھانے سے زیادہ اس لڑکی کی طرف تھی وہ پلکیں جھپکائے اسے ہی دیکھ رہا تھا تب لڑکی نے اس کی توجہ کھانے کی طرف دلائی تو وہ چونک کر سیدھا ہوا اور پھر دونوں نے کھانا شروع کردیا کھانے کے دوران اچانک مائیکل کو خیال آیا کہ اس نے تو اس لڑکی کا نام بھی نہیں پوچھا۔ اس نے اس خیال کا اظہار اس لڑکی سے بھی کردیا تو وہ مسکرانے لگی اور بولی۔

''میرا نام شوما ہے'' اس کے بعد وہ مکمل طور پر کھانے میں مشغول ہوگئے کھانے کے بعد شوما نے مائیکل سے تمام تفصیلات پوچھیں کہ وہ یہاں کیسے اور کیوں آئے۔؟ جواباً مائیکل نے تمام باتیں بتادیں۔

''اچھا تو تم لوگ اس خاص جڑی بوٹی جسے عموماً ''کم کم'' کہہ کر پکارا جاتا ہے حاصل کرنے کے لئے آئے ہو۔'' لڑکی پرسوچ انداز میں بولی تو مائیکل نے سر ہلاتے ہوئے حیرانگی سے اسے دیکھا اور پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا تم اس جڑی بوٹی کے بارے میں جانتی ہو۔؟''

''ہاں۔ بہت اچھی طرح...... بلکہ ہمارے قبیلے کے کئی لوگ اسے استعمال کرچکے ہیں اور بھرپور زندگی گزار رہے ہیں میرا ارادہ بھی اسے استعمال کرنے کا ہے لیکن اس سے پہلے مجھے ایک عمل کرنا ہے تاکہ میں بوڑھی نہ ہوسکوں اور یونہی جوانی کی بہاروں سے لطف اندوز ہوتی رہوں۔'' پھر اس نے ایک دلنشین مسکراہٹ سے مائیکل کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

''اجنبی۔ کیا تم تمام زندگی میرا ساتھ دے سکتے ہو، ہم دونوں ہمیشہ جوان رہنے والا عمل کرنے کے بعد اس بوٹی کو استعمال کرلیں گے مجھے تم جیسے توانا آدمی کی ہی ضرورت تھی جو میری ہر خواہش کو پورا کرسکے اور مجھے لگتا ہے تم میری پیاس بجھا سکوگے۔ کیا تم میرا ساتھ دوگے......؟''

مائیکل جو اس کی سحرانگیز آواز سن کے مسحور ہوگیا تھا اچانک چونک گیا اور بنا سوچے سمجھے اثبات میں سرہلادیا۔ لڑکی کے لبوں پر عجیب پراسرار مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ بے تابی سے مائیکل کے قریب ہوگئی اور اس کے بعد ان دونوں کو کوئی ہوش نہ رہا......

ادھر خیمہ جوزف کی آنکھ کسی کے جھنجھوڑنے سے کھل گئی اس نے حیران نظروں سے آس پاس دیکھا اور بزرگ آدمی کو اپنے پاس بیٹھے ہوئے دیکھا وہ جلدی

سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور سوالیہ نظروں سے اس آدمی کی طرف دیکھا، اس آدمی نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور خود آہستہ آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے میں جو کچھ تمہیں بتا رہا ہوں اسے غور سے سنو اور اس پر عمل بھی......! رات کا بس یہی پہر ہے جب سب گہری نیند میں ہیں اور مجھے تمہیں خبردار کرنے کا وقت مل گیا ورنہ تم بے خبری میں مارے جاتے۔ تمہارا دوست......! افسوس اب وہ تمہارے کام کا نہیں رہا وہ لڑکی جو تمہیں یہاں لائی ہے، درحقیقت اس قبیلے کی سردار ہے، جو کئی صدیوں سے بالکل جوان اور نوعمر لگتی ہے اس کی جواں عمری اور خوبصورتی کا راز تم جیسے نوجوان ہیں جنہیں وہ اپنے حسن اور اداؤں سے بہلا کر یہاں لاتی ہے ان کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے بعد ان کے خون سے غسل کرتی ہے اور ان کے جواں گوشت سے لطف اندوز ہوتی ہے اسی وجہ سے آج تک اس کا حسن خیرہ کن ہے تمہارے دوست کو وہ خوش کر چکی ہے، اب کسی صورت وہ اس کے شکار سے نہیں بچ سکتا اس کے بعد وہ تمہاری طرف متوجہ ہوگی اور تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک کرتی۔

میں نہ جانے کب سے اس ظلم کو دیکھتا آ رہا ہوں لیکن کچھ نہ کر سکا لیکن آج نہ جانے کیوں مجھ میں اتنی ہمت آ گئی ہے جو میں تمہیں بتا رہا ہوں ابھی کچھ دیر میں وہ بیدار ہونے والے ہیں اس کے بعد تمہارے دوست کی بھینٹ ہوگی، اس کے خون سے اشنان کے بعد وہ تمہاری طرف متوجہ ہوگی لیکن تم اس سے پہلے اس علاقے سے نکل جاؤ میں تمہیں راستہ دکھاتا ہوں آگے تمہارا کام ہے کہ تم کیسے یہاں سے نکلتے ہو اس علاقے کی سرحد اس جھیل تک ہے جہاں سے شومانہ یعنی اس قبیلے کی سردار تم لوگوں کو لائی تھی۔ اس کے بعد تم اس کے سحر سے نکل جاؤ گے۔ اٹھو جلدی کرو۔ وہ کسی بھی وقت بیدار ہو سکتے ہیں۔

''لیکن...... میرا دوست۔'' میں اس کو ساتھ لئے بنا ہرگز نہیں جاؤں گا۔''

''پاگل پن کی باتیں مت کرو، اسے بھول جاؤ اگر کچھ ممکن ہوتا تو میں اس کے لئے جان کی بازی لگا دیتا لیکن اب وقت گزر چکا ہے اپنی زندگی پر رحم کھاؤ اور چلو میرے ساتھ اس سے پہلے کہ مائیکل کی بابت جوزف کچھ اور کہتا اس آدمی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور جھونپڑے سے باہر لے جانے لگا۔ آسمان پر بادل ابھی تک موجود تھے لیکن گرجنے کی شدت میں کمی آ گئی تھی کبھی کبھی بجلی کی چمک ماحول کو روشن کرتی اور پھر وہی مہیب اندھیرا۔ وہ آدمی اس لئے ان درختوں کی طرف بڑھ گیا جدھر سے وہ حسینہ انہیں لائی تھی۔

مائیکل کی آنکھ کھلی تو وہ کچھ دیر خوابیدہ عالم میں رہا پھر اسے سب کچھ یاد آتا گیا۔ گزری رات کی حسین یاد نے اس کے لبوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ دوڑا دی اس نے اپنے پہلو کی طرف دیکھا لیکن شوما اپنی جگہ سے غائب تھی مائیکل نے کوئی خاص توجہ نہ کی اس نے یہی سمجھا کہ وہ اپنی کسی حاجت کے لئے باہر گئی ہوگی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پھر اس نے اٹھ کر باہر دیکھنے کا سوچا لیکن اس سے پہلے ہی ایک آدمی اندر داخل ہوا اور اسے اپنے ساتھ آنے کا کہا۔

مائیکل نے سوچا کہ ضرور شوما نے بلایا ہوگا، اس لئے وہ بلا جھجک اس کے ساتھ روانہ ہو گیا وہ آدمی اسے لئے ہوئے اک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں لکڑی کے دو بڑے بڑے ستون لگے تھے اور ان کے اوپر لوہے کی زنجیریں لگی ہوئی تھیں اور نیچے اک چوکور سی جگہ بنی ہوئی تھی جہاں اک آدمی باآسانی لیٹ سکتا تھا مائیکل نے حیرانی سے اس جگہ کو دیکھا کہ اسے یہاں لانے کا کیا مقصد؟

ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ دو آدمی اور آ گئے انہوں نے پھرتی سے مائیکل کو اٹھایا اور لکڑی کے ساتھ لٹکی ہوئی زنجیروں سے باندھ دیا۔ یہ کام انہوں نے اتنی تیزی سے کیا تھا کہ اس کو سوچنے کی مہلت بھی نہ مل سکی جب اس کے حواس ٹھکانے پہ آئے تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا لیکن وہ آدمی اسے باندھ کر جا چکے تھے اب وہ لکڑی کے دو ستونوں کے درمیان زنجیروں سے بندھا لٹک رہا تھا اس کا سارا خون سمٹ کر چہرے پر آ گیا کیونکہ وہ الٹا لٹکا ہوا تھا اسے اب حالات کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔

اچانک اسے جوزف کا خیال آیا کہ پتہ نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہوگا اس نے زور زور سے جوزف کو بھی پکارا لیکن بے سود۔

اچانک ایک طرف سے وہی لڑکی شوما نمودار ہوئی وہ بالکل برہنہ حالت میں تھی اس کے ہاتھ میں ایک تیز دھار خنجر دبا ہوا تھا اور ہونٹوں پر وحشیانہ مسکراہٹ، آنکھوں میں سفاک لئے وہ اس جگہ آئی جہاں مائیکل لٹک رہا تھا۔

مائیکل حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا پھر جیسے اسے ہوش آ گیا اس نے لڑکی سے مدد کا کہا تو جواباً اس کا درندگی سے بھرپور قہقہہ فضا میں گونج گیا اس نے خنجر مائیکل کے سامنے کیا اور اس کی تیز چمک دار دھار پر اپنی انگلی پھیرنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں ناچتی وحشت نے مائیکل کو منجمد کر دیا۔

انگلی خنجر پر پھیرتے ہوئے بے دھیانی میں اس کی انگلی پر کٹ لگ گیا اور خون تیزی سے بہنا شروع ہو گیا۔ تو لڑکی کے چہرے پر وحشت کے آثار نمودار ہوئے اس نے زخمی انگلی اپنے منہ میں ڈال لی اور بہتا ہوا خون اپنے حلق میں اتارنے لگی جب خون رکا تو اس نے اوپر نگاہ کی......اوہ......اس کی آنکھوں کی لالی یوں لگ رہا تھا جیسے خون سے بھرا پیالہ کسی نے اس کی آنکھوں میں انڈیل دیا ہو۔ مائیکل پہلے ہی خوف سے ساکت تھا اس منظر نے تو اس کی رہی سہی کسر پوری کر دی اس نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔

ادھر رات کے اندھیرے میں جوزف اس آدمی کے ساتھ ان درختوں کے قریب پہنچ گیا۔ رات کی نسبت اس وقت وہ درخت اتنے پرہیبت نہیں لگ رہے تھے وہ دونوں ان درختوں کے بیچوں بیچ گزر رہے تھے دن کا اجالا ہر سو پھیلتا جا رہا تھا جوزف تمام راستوں کو اچھی طرح ذہن نشین کرتا جا رہا تھا کیونکہ وہ کسی صورت مائیکل کو تنہا چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا درختوں سے باہر کھلی جگہ پر آ کر وہ آدمی رک گیا اور جوزف کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اب تم ان کی دسترس سے دور ہو۔ دن کو شوما کے علاوہ کوئی بھی اس حدود سے نہیں نکل سکتا شوما کو بھی سہ پہر سے پہلے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، یہ ہمارے قبیلے کے اپنے اصول ہیں جن کو توڑنے کی سزا موت کے علاوہ کچھ نہیں، میں بھی اگر اس حدود سے آگے گیا تو مارا جاؤں گا، اب میں واپس چلتا ہوں، تم اس جھیل کے عین پاس سے شمال کی طرف چلتے جاؤ کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جاؤ گے۔ اور ہاں۔'' اس نے انگلی اٹھا کر وارننگ دینے والے انداز میں جوزف کی طرف دیکھا اور بولا۔'' واپس اس قبیلے کی حدود میں آنے کی غلطی کبھی نہ کرنا ورنہ بے رحم موت کے شکنجے تمہیں جکڑ لیں گے تمہارا دوست اب سے کچھ دیر بعد شوما کی بھینٹ چڑھ جائے گا اس لئے اس کا خیال دل سے نکال دو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم لوگ کس وجہ سے ان جنگلوں میں بھٹکتے پھر رہے ہو......!

''وہ جڑی بوٹی ہر کسی کو نہیں ملتی اور جس کو مل جائے اس کی زندگی موت سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اس لئے تم اپنی بقیہ زندگی بچاؤ اور واپس چلے جاؤ، ایسی جگہوں پر سوائے موت کے اور کچھ نہیں رکھا۔ اب جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ آدمی واپس اس قبیلے کی طرف روانہ ہو گیا جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو جوزف نے واپس اسی راستے کی طرف قدم بڑھا دیئے جو اس قبیلے کی طرف جاتا تھا۔

لیکن اس نے عین اس کے راستے کی بجائے تھوڑا ہٹ کے راستہ اختیار کیا اور نہایت احتیاط سے آگے بڑھنے لگا۔

جب درختوں کے جھنڈ ختم ہوئے تو اسے اس قبیلے کے خیمے نظر آئے لیکن وہ تھوڑے دور تھے۔

اچانک فضا میں کسی مردانہ آواز کی بازگشت گونجی۔ جوزف نے غور سے سنا۔ وہ مائیکل کی آواز تھی

زور زور سے کسی کو مدد کے لئے پکار رہا تھا۔

جوزف کا دل زور سے دھڑکا۔ ”یقیناً مائیکل کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہے، مجھے ہر حال میں اسے بچانا ہے۔“ یہ سوچ کر اس نے اردگرد نظر دوڑائی اور قریب ہی اسے لکڑی کی موٹی شاخ پڑی دکھائی دی جوزف نے اسے ہاتھ میں اٹھایا وہ اس طرح تراشی ہوئی تھی کہ آگے سے خنجر کی مانند ایک نوک تھی جو سینے یا جسم کے کسی بھی حصے میں پیوست ہوکر کسی کو موت کے گھاٹ اتار سکتی تھی وہ اس کو اٹھا کر آگے بڑھا اور اک موڑ مڑتے ہی اسے وہ دہشت ناک منظر نظر آیا جہاں مائیکل لکڑی کے ستونوں میں زنجیروں سے بندھا لٹک رہا تھا اور اسے وہ لڑکی بھی نظر آئی جو انہیں بہلا کر اپنے ساتھ لائی تھی وہ بالکل برہنہ حالت میں تھی اور اس کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا۔ جب وہ خنجر اس کی انگلی زخمی کر گیا زخمی انگلی منہ میں ڈال کر وہ خون چوسنے لگی۔

جب لڑکی نے غصب بھری نگاہوں سے مائیکل کو گھورا تو جوزف جو اس لڑکی کے عین سامنے آڑ میں چھپا ہوا تھا ایک لمحے کو اس کا دل بھی کانپ گیا۔

اچانک اس لڑکی کی غضب بھری آواز گونجی۔ ”میں نہیں مر سکتی۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ میں ہر حال میں تمہاری بھینٹ لوں گی...... کیونکہ مجھے ابھی جوان اور خوبصورت رہنا ہے، اس کے بعد میں وہ جڑی بوٹی استعمال کرلوں گی جس سے کبھی موت نہیں آتی اور مجھے اس سخت عمل سے بھی نجات مل جائے گی جو میں ہر سال زندہ رہنے کے لئے کرتی ہوں، جو ہوتا تو دشوار ترین ہے لیکن اس سے زندگی صرف ایک سال ہی بڑھتی ہے اس لئے مجھے ہر سال وہ عمل باقاعدگی سے کرنا پڑتا ہے تاکہ میں زندہ رہوں اور خوبصورتی اور جوانی کے لئے مجھے تم جیسے نوجوانوں کے خون اور گوشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

تمہاری بھینٹ کے بعد میں وہ جڑی بوٹی استعمال کرلوں گی جو مجھے ہمیشہ زندہ رکھے گی اس کے بعد میں تمہارے دوست کی بھینٹ لوں گی اور میرا حسن وجوانی مزید دس سال یونہی برقرار رہے گا۔ وہ قہقہہ لگانے لگی اس لڑکی کے وحشیانہ قہقہے جسم میں سنسنی دوڑا رہے تھے جوزف کے جسم نے جھرجھری لی۔ مائیکل کی حالت بھی اس سے مختلف نہیں تھی۔

اچانک اس لڑکی کی آواز پھر گونجی اس نے عجیب سا انکشاف کیا جسے سنتے ہی جوزف کے خون کی روانی تیز ہوگئی اور اسے لگا کہ اگر اس نے ذرا بھی دیر کی تو وہ لڑکی مائیکل کو مار دے گی۔

اس نے خنجر کی نوک مائیکل کے نرخرے پر رکھی اور بولی۔ ”جب میں کسی کی بھینٹ لینے لگوں اور اس خنجر سے میری انگلی زخمی ہوجائے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ کوئی بھی باہر کا انسان مجھے آسانی سے مار سکتا ہے لیکن تم تو اس وقت اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہے ہو۔ تم مجھے کیا نقصان پہنچاؤ گے اور رہا تمہارا دوست تو وہ تو اس وقت خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہوگا اس لئے مجھے اس چیز کا کوئی خطرہ نہیں۔ اب مرنے کے لئے تیار ہوجاؤ۔“

یہ کہتے ہی اس لڑکی نے مائیکل کے بازو پر چیرا لگایا۔ مائیکل کے منہ سے اذیت بھری سسکاری نکل گئی اور بازون سے خون کی دھار نیچے گرنے لگی جسے وہ لڑکی منہ کھول کر پینے لگی اور بقیہ خون اپنے برہنہ جسم پر ملنے لگی۔

جوزف وہ سب دیکھ کر تڑپ گیا وہ احتیاط سے اس آڑ سے نکلا جہاں وہ چھپا ہوا تھا اس نے نوکیلی لکڑی اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑ لی اور آہستہ سے چلتا ہوا لڑکی کے عقب میں پہنچ گیا وہ لڑکی خون پینے اور خون کو اپنے جسم پر ملنے میں اتنی محو تھی کہ اسے جوزف کا اپنے پیچھے آنا اور مائیکل کا چونکنا بھی نظر نہ آیا۔

اس سے پہلے کہ مائیکل کچھ کہتا جوزف نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور لڑکی کی طرف بڑھ گیا جو ایک بار پھر مائیکل کے نزدیک جاکر خنجر سے اس کو زخمی کرنے کی کوشش کررہی تھی جوزف یکدم سے اس کے سامنے پہنچ گیا وہ ایکدم ساکت ہوگیا لڑکی نے حیرانگی سے جوزف کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ میں موجود نوکدار لکڑی دیکھ کر اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئی شاید اسے جوزف کو اپنے سامنے

دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کرتی جوزف نے اپنے ہاتھ میں موجود نوک دار لڑکی سے اس کا نشانہ لیا اور پھر چشم زدن میں لکڑی کی نوک سے سرخ رنگ کی شعائیں نکلنے لگیں جسے دیکھ کر جوزف گھبرا گیا اور اس نے لکڑی کو فوراً لڑکی کے سینے میں گھسیڑ دی۔

شوما کے منہ سے بھیانک چیخ نکلی اور ہوا میں دیر تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ اچانک مائیکل زور سے چیخا۔

”جوزف جلدی سے مجھے نیچے اتارو ورنہ دوسرے لوگ آکر ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”مائیکل کی آواز سن کر جوزف جلدی سے اس کی طرف متوجہ ہوا اس نے جلدی سے زنجیر سے بندھا ہک کھولا اور مائیکل کو آہستہ سے نیچے اتارا خون کے بہاؤ کی وجہ سے مائیکل بہت کمزوری محسوس کررہا تھا اس سے چلنا بھی محال تھا لیکن جوزف کے سہارے وہ کسی نہ کسی طرح چل رہا تھا تاکہ جلد از جلد وہاں سے نکل جائیں۔

ابھی وہ تھوڑا ہی چلے ہوں گے کہ بادلوں کی زوردار گڑگڑاہٹ نے انہیں چونکنے پر مجبور کردیا، انہوں نے آسمان کی طرف دیکھا شمال کی طرف سے گہرے سیاہ بادل اٹھ رہے تھے اور بہت تیزی سے آسمان پر پھیلتے جارہے تھے وہ دونوں تشویش میں پہلے تو آسمان کی طرف دیکھتے رہے پھر مائیکل کو لے کر جوزف تیزی سے آگے کی طرف بڑھ گیا۔

”ہمیں بارش سے پہلے اس حدود سے نکلنا ہے ورنہ بھیانک موت ہمارا مقدر ہوگی۔“ جوزف کی آواز نے مائیکل کے زخمی وجود میں توانائی بھر دی تو وہ تیزی کے ساتھ ان درختوں کے قریب پہنچے جہاں دوسری طرف اک نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔

ابھی وہ درختوں کے پاس پہنچے ہی تھے کہ انہیں اپنے پیچھے شور سنائی دیا انہوں نے مڑ کر دیکھا تو بہت سے آدمی انہیں اپنی طرف آتے دکھائی دیئے جوزف نے مضبوطی سے مائیکل کا ہاتھ پکڑا اور اسے بھاگنے کا کہا۔ مائیکل کو بھاگنے میں شدید دشواری ہورہی تھی لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ کے مصداق اسے اپنی زندگی کے لئے جدوجہد کرنا تھی۔

بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک میں شدید اضافہ ہوچکا تھا اس خوفناک ماحول میں بادلوں کی مہیب گڑگڑاہٹ اور بجلی کی کڑک ماحول کو بہت خوفناک بنارہی تھی بادلوں کی وجہ سے درختوں کے درمیان تاریکی سی چھارہی تھی اس وجہ سے انہیں بھاگنے میں بے حد دشواری ہورہی تھی کئی بار تو وہ درختوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

آخر کار وہ ان حدود سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے جس کا اس آدمی نے جوزف کو بتایا تھا، جیسے ہی وہ اس قبیلے کی حدود سے نکلے بادل زور سے گرجے اور زبردست بارش ہونے لگی بارش اتنی تیز تھی کہ آگے سے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ گو سردی بہت زیادہ نہیں تھی لیکن ناکافی کپڑوں اور بارش کی وجہ سے انہیں کچھ زیادہ ہی محسوس ہورہی تھی خاص کر مائیکل کو لیکن بارش کا اک فائدہ بہرحال ہوا کہ مائیکل کا بہتا ہوا خون رک گیا تھا وہ بہت کمزوری محسوس کررہا تھا لیکن اسے پتہ تھا کہ اس جگہ سے کچھ دور ایک ایسا پودا موجود تھا جس کے پتوں کو مروڑ کر لیپ کرکے زخموں پر لگا دیا جائے اور اس پودے کے پھل کھا لئے جائیں تو نہ صرف زخم مندمل ہوجاتے ہیں بلکہ کمزوری بھی رفع ہوجاتی ہے۔

اب انہیں موت کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ مائیکل سوچ رہا تھا کہ اگر ان کے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا تو یقیناً وہ اس جڑی بوٹی کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں اپنی جان بھی گنوا سکتے تھے واقعی ٹھیک کہتے ہیں کہ کچھ حادثے انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔

اچانک جوزف کی آواز پر مائیکل اپنی سوچوں سے باہر نکل آیا۔ ”کیا تو بھی وہی سوچ رہا ہے جو میں سوچ رہا ہوں......؟“

جوزف نے زیرلب تبسم سے پوچھا تو جواب میں مائیکل نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 91

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

گوپال اور ہردیال ہندو مذہب کے چھوٹی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ گوپال کے والد نے اپنے دماغ میں یہ بات بیٹھالی تھی کہ جب تک میرے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کریں گے اس وقت تک ہم اچھوت کی اندھیری کوٹھری سے نہیں نکل پائیں گے۔ خیر دونوں بھائیوں نے رات دن کی محنت سے تعلیم حاصل کرلی اور ایک بھائی گوپال جو بڑا تھا، وہ کمشنر بن گیا جبکہ چھوٹا ہردیال سرجن بن گیا۔ اب تو لوگ ان کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ پیٹھ پیچھے لوگ برا بھلا کہتے مگر منہ پر یس سر! جی سر! اور سر جھکا کر پرنام کرتے۔ ان دونوں کی شادیاں بھی برہمن ذات میں ہوگئیں جبکہ برہمن ذات ہندو مذہب میں بہت اعلیٰ ذات ہے، دونوں بھائی بہت ہمدرد اور رحم دل تھے، ضرورتمندوں کی ضرورت پوری کرتے، دونوں کی اولادیں ہوئیں اور انہوں نے بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی۔ گوپال کے آفس میں ایک سالار احمد تھے، ان کی باتوں سے گوپال بہت متاثر ہوتا تھا۔ سالار احمد مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، سالار احمد کا ایک بیٹا امریکہ میں زیر تعلیم تھا جبکہ ہردیال کی ایک بیٹی بھی امریکہ میں تعلیم حاصل کررہی تھی دونوں ایک ہی یونیورسٹی میں تھے، یہ بھی اتفاق ہے کہ ان دونوں میں محبت ہوگئی، ہردیال کی لڑکی چاندنی راضی ہوگئی تھی کہ میں مسلمان ہوکر تم سے شادی کرلوں گی، وہ امریکہ سے ہندوستان آئی اور اپنی مرضی وخواہش کا اظہار کیا اور اس طرح پتہ لگ گیا کہ امریکہ میں انوار جو ہے وہ سالار احمد کا بیٹا ہے اور چاندنی اسی سے شادی کی خواہش مند ہے۔ گوپال اور ہردیال ایک طویل عرصہ سے اسلام کا مشاہدہ کررہے تھے، ان دونوں کو معلوم تھا کہ اسلام ہی دنیا کا وہ واحد مذہب ہے، جس میں کوئی چھوٹائی بڑائی اور ذات پات کی کوئی قید نہیں، ہر آدمی اپنے فعل کی بنسبت اللہ کی نظر میں برگزیدہ ہے۔ وہ دونوں بھائی اور ان کے گھرانے اسلام سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے سالار احمد سے کہا کہ آپ ہمیں مسلمان کردیں، اور اس طرح ان کا پورا گھرانہ مسلمان ہوگیا، سالار احمد کے دونوں لڑکوں سے ہردیال کی دونوں لڑکیوں کی شادی ہوگئی۔ دونوں بھائیوں کے لئے اسلام سے زیادہ اچھا کوئی اور مذہب نہیں تھا۔ ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ عبادت کے لئے جس کو جہاں جگہ ملتی ہے بیٹھ جاتا ہے اور سب مل کر ایک ہستی کو سجدہ کرتے ہیں۔

(اب آگے پڑھیں)

اسلام سے زیادہ منظم اور مستحکم کوئی اور مذہب نہیں، اس مذہب کے سارے اصول اپنی جگہ اٹل ہیں اس میں ذرا بھی شک نہیں۔

میں نے یہ بھی تجزیہ کیا ہے کہ اس میں کسی فرد کی شخصیت امیری کے لحاظ سے بڑی نہیں، کوئی بھی دولت اور شہرت کے بل بوتے پر اپنی بڑائی نہیں کرسکتا۔ دنیا کا یہ واحد مذہب ہے جس میں صرف اور صرف فعل کے لحاظ سے بڑائی ہوتی ہے۔

مساجد میں کسی امیر اور دولت مند آدمی کے لئے کوئی خاص جگہ متعین نہیں ہوتی۔ وقت کے حساب سے جو پہلے آتا ہے وہ آگے بیٹھ جاتا ہے اور پھر اس کے بعد جیسے جیسے لوگ آتے جاتے ہیں اور جہاں بھی جگہ ملتی ہے وہیں بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں مگر اور مذاہب میں یہ بات نہیں، بڑوں کے لئے خاص جگہ ہوتی ہے، جیسے مندر میں بڑوں کو خاص طور پر سب سے آگے جگہ دی جاتی ہے۔

میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ خدا ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ قلب کو دیکھتا ہے، ظاہری رکھ رکھاؤ خدا کو بالکل بھی پسند نہیں۔ اسلام میں خاص طور سے تاکید کی گئی ہے کہ ضرورت مندوں کے کام آؤ، پڑوسی پر پڑوسی کا بہت زیادہ حق ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اگر کسی امیر آدمی کا پڑوسی پریشانی اور دکھ میں ہے تو اس پڑوسی پر فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے پڑوسی کے کام آئے، اگر کسی کا پڑوسی بھوکا سو گیا تو امیر پڑوسی کا کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور پھر سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اگر کسی کی مدد کرو تو شور شرابہ اور دکھاوا کر کے نہ کرو بلکہ اس طرح کرو کہ ایک ہاتھ سے کرو تو دوسرے ہاتھ کو پتہ نہ چلے۔

مرنے کے بعد ہر آدمی اپنے فعل کے حساب سے انعام کا حقدار ہوگا۔ یعنی جس کا جیسا فعل ہوگا اسی کے حساب سے اسے اجر ملے گا۔

اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ انسان کے لئے توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے، اگر کوئی اچھے من سے توبہ کر لیتا ہے، اپنی کوتاہیوں کو چھوڑ دیتا ہے، غلط کاموں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور احکام خدا پر چلنے لگتا ہے تو اس کی توبہ قبول ہو جاتی ہے اور پھر ایسا شخص یعنی توبہ کرنے والا شخص خدا کی نظر میں نیک بن جاتا ہے۔

میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ اس شخص کی توبہ جلدی قبول ہوتی ہے جو طاقتور و توانا ہو اپنے قول و فعل پر عبور رکھتا ہو، اپنے عمل کو آگے بڑھا سکتا ہو، اس صورت میں خدا اسے موقع دیتا ہے کہ چل توبہ کے بعد اب تو کیا کرتا ہے اور پھر جب ایسا شخص خدا کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے لگتا ہے تو خدا اس سے بہت زیادہ خوش ہوتا ہے۔

خدا جو کہ بہت بڑا رحیم و کریم ہے، ہر شے پر قادر ہے، وہ جب چاہے کسی کو معاف کر سکتا ہے، اب آپ لوگ بتائیں کہ کیا اس سے اچھا کوئی اور مذہب ہو سکتا ہے۔" ہردیال نے کہا۔

ہردیال کی باتیں سن کر سالار احمد نے کہا۔ "ہردیال تمہاری معلومات تو بہت وسیع ہیں۔ تم نے جتنی بھی باتیں کی ہیں بالکل حقیقت ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسلام بہت ہی اچھا دین ہے، اس مذہب میں بہت آسانیاں ہیں، بہت وسعت ہے، توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ خدا انسان کو بار بار موقع دیتا ہے کہ اپنے گناہوں پر نادم ہو کر توبہ کرے اور توبہ کے بعد تمام غلط کاموں سے کنارہ کشی حاصل کرے۔

خدا ظاہر کو نہیں دیکھتا بلکہ وہ قادر مطلق ہے، ہر شے پر قادر ہے، وہ بہت ہی رحمٰن و رحیم ہے اسلام کے بنیادی پانچ ارکان ہیں اور ان پانچوں ارکان پر صدق دل سے یقین کرنا ضروری ہے اور انہی پانچ ارکان پر یقین رکھنے والا سچا مسلمان ہوتا ہے۔"

"سالار احمد، وہ پانچ ارکان کیا ہیں بتاؤ تو۔" گوپال جو خاموشی سے ساری باتیں سن رہا تھا بولا۔

"سر وہ پانچ ارکان ہیں۔ نمبر ایک کلمہ توحید پر یقین کرنا، نمبر دو نماز، نمبر تین روزہ، نمبر چار زکوٰۃ اور نمبر پانچ حج۔

نماز کسی بھی حال میں معاف نہیں۔ اگر کوئی پاگل ہے، دماغی توازن ٹھیک نہیں ایسی صورت میں اس پر نماز معاف ہے، مگر ذی شعور، عاقل و بالغ پر ہر صورت میں نماز فرض ہے، اور جو جان بوجھ کر نماز سے غافل ہے وہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

کلمہ پر بھی اپنا ایمان کامل رکھنا چاہئے، یعنی اللہ ایک ہے اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اسی طرح ہر بالغ پر روزہ فرض ہے۔ بغیر کسی عذر یعنی بیماری کے روزہ ترک کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ جان بوجھ کر ایک صحت مند انسان اگر روزہ نہیں رکھتا تو ایک روزہ کے بدلے اس پر ساٹھ روزے جرمانے کے عائد ہوتے ہیں، زکوٰۃ بھی صاحب حیثیت پر فرض ہے کہ وہ اپنے مال و متاع پر احکام خداوندی کے حساب سے زکوٰۃ نکال کر مستحق لوگوں کو دے اور پھر حج بھی صاحب حیثیت پر فرض ہے، یعنی حلال کمائی سے انسان حج کرے، کسی کا گلا دبا کر پیسہ جمع کر کے حج کرنا میری نظر میں ٹھیک نہیں، اللہ تعالیٰ ہر ظاہر و باطن کو دیکھتا ہے اس سے کوئی شے کوئی بھید اور کوئی ارادہ چھپا ہوا نہیں، بلکہ انسان کو ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں اسے "اللہ دیکھ رہا ہے۔"

"سالار احمد ہمارے حق میں تم دعا کرتے رہنا کہ ہم خدا کے احکام پر مضبوطی سے کاربند رہیں اور ہماری

اولاد بھی خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلے۔" گوپال نے کہا تو سالار احمد نے "آمین" کہا۔

اور کتاب روشنی کے سفیر اپنے اختتام کو پہنچی۔

رولوکا بولا۔ "مصنف نے کتاب لکھنے میں کمال کر دیا ہے، تمام باتیں حقیقی ہیں۔ اس میں بیان کردہ ہر ایک لفظ حقیقت پر مبنی ہے، جو حقیقت ہے مصنف نے بہت ہی سیاق و سباق کے ساتھ پیش کیا ہے۔"

رولوکا کی بات سن کر حکیم وقار بولے۔ "آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے، واقعی مصنف نے کمال کر دیا ہے۔ ہندو مذہب اور اسلام کی تمام حقیقی باتیں اس کتاب میں درج ہیں۔ کوئی باشعور آدمی بھی اس پر تنقید نہیں کر سکتا۔

"جناب" مجھے تو یہ کتاب بہت اچھی لگی تمام باتیں پر اثر ہیں۔ اس طرح کئی اور بھی کتابیں آپ کی نظر میں ہوں تو مجھے سنایئے گا۔ رولوکا نے کہا۔

"چلئے میں کوشش کروں گا کہ کوئی اور اچھی کتاب پڑھ کر آپ کو سناؤں۔" حکیم وقار نے کہا۔ حکیم وقار کی بات سن کر رولوکا مسکرایا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

☆......☆......☆

کئی دن سے رولوکا کسی مسئلے کے تحت حکیم وقار کے مطب میں حاضر نہیں تھا۔ حکیم وقار اپنے مطب میں بیٹھے تھے، صبح کا وقت تھا، حکیم وقار کا یہ روز کا معمول تھا کہ مریضوں کے آنے سے ایک گھنٹہ پہلے آ کر مطب میں بیٹھ جایا کرتے تھے۔ دواؤں کی فہرست کا مطالعہ کرتے یا پھر بڑے بڑے استادوں کے دواؤں کے قلمی نسخوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ وہ اپنے کام میں منہمک تھے کہ رولوکا ان کے کمرے میں داخل ہوا، رولوکا کو دیکھ کر حکیم وقار مسکرائے اور مصافحہ کے لئے اپنا دایاں ہاتھ آگے کو بڑھا دیا۔

رولوکا نے بھی مسکراتے ہوئے حکیم وقار سے مصافحہ کیا اور کرسی کھینچ کر حکیم وقار کے سامنے بیٹھ گیا تو حکیم وقار بولے۔ "اور سنایئے چند دن آپ زیادہ مصروف رہے یقیناً کسی الجھے ہوئے مسئلے کو سلجھانے میں مصروف ہوں گے۔ میں نے کئی مرتبہ ملازم سے آپ کے مطابق دریافت کیا تو اس نے جواب دیا کہ آپ کا کمرہ بند پڑا ہے تو میں سمجھ گیا کہ آپ اپنے کمرے میں موجود نہیں ہیں۔"

"جی! میں واقعی ایک بہت پیچیدہ مسئلے میں تھا، اسے سلجھانے میں کئی دن لگ گئے، آپ کو تو معلوم ہے کہ کبھی کبھار کسی ضدی اور ہٹ دھرم ماورائی مخلوق سے واسطہ پڑ جاتا ہے۔ ضد کرنے والے اپنی ضد پر اڑ جاتے ہیں اور کسی صورت صلح صفائی پر راضی نہیں ہوتے تو بحالت مجبوری ان کے ساتھ سختی کرنی پڑتی ہے۔ ان پر سختی کرنے کی میری اپنی مرضی قطعی نہیں ہوتی مگر مریض کی جان عزیز ہوتی ہے۔ لہٰذا انہیں انجام تک پہنچانا پڑتا ہے۔

حکیم صاحب! کسی کی مدد کر کے مجھے بہت قلبی سکون محسوس ہوتا ہے اور اپنے اندر میں ایک انجانی خوشی پاتا ہوں اور اکثر مجھے اپنے استاد کی باتیں یاد آتی ہیں، ان کا کہنا تھا کہ "بیٹا! کسی کو دکھ تکلیف اور اذیت میں دیکھ کر اس کی طرف سے آنکھیں نہیں پھیرنا، بلکہ اس کے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنا اور یہ احساس کرنا کہ اگر اس وقت تم خود اس پریشانی سے دوچار ہو تو کیا محسوس کرتے۔

یہ اوپر والے مالک کی کرم نوازی اور مہربانی ہے کہ اس نے تمہیں ایسی طاقت سے نوازا ہے اگر وہ نہیں چاہتا تو تم اتنی صلاحیت کے مالک کبھی بھی نہ بنتے۔ دوسروں کے کام آنا بھی اصل میں انسانیت ہے۔ خود غرضی کی زندگی تو جانور بھی نہیں گزارتے۔ جنگل میں جانور بھی مل جل کر زندگی گزارتے ہیں۔ جب ایک درندہ شکار کرتا ہے تو سارے مل جل کر کھاتے ہیں۔ انسان کو جانوروں سے سبق سیکھنا چاہئے۔ تم کبھی بھی کسی کی مدد کرتے وقت یا مدد کرنے سے پہلے خود پر بار محسوس نہیں کرنا۔ جو سچے دل سے کسی مصیبت زدہ کی مدد کرتا ہے تو اوپر والا، مددگار کی مدد کرتا ہے اور جب کسی کی مصیبت اور پریشانی دور ہو جاتی ہے تو اس کے دل سے حقیقی دعا ہی نکلتی ہے۔ اور جو دعا دل سے نکلے وہی...

انسان کے کام آتی ہے۔"

حکیم صاحب انہی باتوں کو میں اکثر اپنے دماغ میں رکھتا ہوں۔ میری نظر میں استاد کا رتبہ باپ سے کہیں بڑھ کر ہے، کیونکہ باپ اولاد کو دنیا میں لانے کا ذریعہ ہوتا ہے اور استاد شاگرد کو دین و دنیا دونوں سے روشناس کراتا ہے، علم دیتا ہے، سبق دیتا ہے، ظاہر و باطنی باتیں بتاتا ہے، زندگی میں کامیابی اور مرنے کے بعد بھی کامیابی کے لئے راستے بتاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ میرے دل میں اپنے استاد کے لئے بہت عزت ہے اور مرتے دم تک میں استاد کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرتا رہوں گا۔" رولوکا نے کہا۔

حکیم وقار بولے۔ "میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، میں اکثر نماز میں آپ کی کامیابی کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حوصلہ بہت دے تاکہ آپ ضرورت مندوں اور پریشان حال لوگوں کی مدد کر کے انہیں مصیبت و پریشانی سے نجات دلائیں۔

میری نظر میں یہی انسانیت اور عبادت ہے کہ دوسروں کے کام آنا۔ جب کسی کی مدد اور کوشش سے کسی کی پریشانی دور ہو جاتی ہے تو اس کے دل سے دعا نکلتی ہے۔"

"ارے ہاں! مجھے یاد آیا۔ کل ایک صاحب آئے تھے، بے چارے بہت زیادہ پریشان تھے، باتیں کرتے کرتے ان کی آنکھوں سے آنسو نکلنے لگے تھے۔ دیکھنے میں بہت زیادہ سرخ و سپید اور لحیم شحیم تھے مگر میں نے اندازہ لگایا کہ اندرونی طور پر وہ بہت زیادہ کھوکھلے ہو چکے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ اب تو صرف اور صرف مرنے کی خواہش ہے مگر ایشور، اس معاملے میں میری پرارتھنا نہیں سن رہا ہے۔ میں جس اذیت سے گزر رہا ہوں، شاید ہی ایسا کوئی اور ہو۔"

بقول ان کے اس وقت ان کی عمر اسی سال ہے لیکن دیکھنے میں وہ بہ مشکل ساٹھ کے لگتے ہیں۔

پہلے تو میں نے سمجھا کہ کوئی جسمانی بیماری ہے مگر انہوں نے بتایا کہ وہ ایک طویل عرصہ سے کسی ہوائی مخلوق کے چنگل میں پھنسے پڑے ہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس ہوائی مخلوق سے جان چھوٹ کے نہیں دے رہی ہے، اور اب اس شے کا دائرہ کار دن بدن بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر میری ذات تک اس شے کی اذیت محدود ہوتی تو میں سہتا رہتا، اس کی اذیت ایک طویل عرصہ سے برداشت کر رہا ہوں مگر اب اس کا نشانہ میرے پیارے دل کے ٹکڑے بن رہے ہیں۔"

آپ سے ملنے کا انہیں بہت اشتیاق تھا مگر آپ حاضر نہیں تھے۔ یہ ایک بہت خود نویست کتاب دی ہے اور یہ ایک لفافہ بھی ہے، کتاب بلکہ ڈائری کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ اس میں ان کی داستان زندگی ہے اور لفافے میں دیگر باتیں۔ اب آپ اسے سنبھالیں، اسے پڑھ کر آپ کوئی بھی حتمی فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ان کی پریشانی دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ ان کی پریشانی کے باعث میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ جتنی بھی جلدی ہو سکے ان کی مدد کر دیں۔ یقیناً اللہ تعالیٰ اس کا اجر آپ کو دے گا۔" حکیم وقار نے کہا۔

رولوکا بولا۔ "حکیم صاحب! آپ فکر نہ کریں میں اس ڈائری کو تفصیل سے پڑھنے کے بعد، ان کی مدد ضرور کروں گا، دکھی لوگوں کے کام آنا ہی انسانیت ہے۔ میری نظر میں مصیبت زدوں کے کام آنا سب سے بڑھ کر عبادت ہے۔ ڈائری پڑھتے ہی ان کی مدد کے لئے قدم اٹھاؤں گا۔"

"اور ہاں! یاد آیا، وہ کہہ رہے تھے کہ لفافے میں ان کے گھر اور گاؤں کا پتہ درج ہے۔" وقار نے کہا۔ اور پھر حکیم وقار نے گھنٹی بجائی تو ایک ملازم حاضر ہوا تو حکیم وقار بولے۔ "ارے بھئی، فوراً دو چائے لے آؤ۔"

یہ سنتے ہی ملازم چلا گیا اور چند منٹ میں کپ چائے لے آیا۔ رولوکا اور حکیم وقار چائے پینے لگے اور پھر چائے کے دوران گپ شپ بھی کرتے رہے۔ چائے پیتے پیتے مریضوں کے دیکھنے کا وقت ہو گیا۔ رولوکا اٹھا اور حکیم وقار سے مصافحہ کرنے کے بعد

کمرے میں چلا گیا۔

حکیم وقار کے کمرے کے برابر میں رولوکا کا بھی ایک کمرہ تھا جس میں اکثر اوقات رولوکا مطب کے وقت تک بیٹھا کرتا تھا۔ رولوکا کمرے میں پہنچ کر کرسی پر بیٹھا اور سب سے پہلے لفافے کو کھولا۔ لفافے میں چند کاغذ الگ سے تھے۔ رولوکا نے بغور ان کاغذوں کو دیکھا اور پھر پڑھنا شروع کیا۔ اس میں لکھا تھا۔

"حکیم صاحب! میرا نام پرتاب سنگھ ہے۔ میرا تعلق ایک ٹھاکر خاندان سے ہے، پرکھوں کی جائیدادیں اتنی ہیں کہ کوئی معاشی فکر نہیں۔ میرے گاؤں کا نام شانتی نگر ہے اور یہ حقیقت ہے کہ میرا گاؤں واقعی شانتی کا گہوارہ ہے۔ میرے پرکھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ اپنے کھیتوں میں کام کرنے والوں کا ہر طرح کا خیال رکھا جائے، ان کی ضرورتوں کو پورا کیا جائے تو کام کرنے والے دل سے کام کرتے ہیں اور اگر کوئی دل سے کام کرے تو کام پر اس کا اچھا اثر پڑتا ہے اور یہی کچھ سوچ کر میرے پرکھوں نے کامیابی کے اس اصول کو اپنایا تو ہمارے کھیت زیادہ سے زیادہ اناج دینے لگے۔

میں چھوٹا تھا، وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا، اور پھر جوانی کی دہلیز پر پہنچ گیا۔ میری اپنی خواہش اور پتا کی خواہش کے پیش نظر مدرسہ، اسکول اور پھر کالج میں جانا شروع کیا۔ جوں جوں میں آگے بڑھتا رہا۔ بڑے بوڑھوں اور پرکھوں کے فرسودہ خیالات سے دور ہوتا رہا۔ قدیم خیالات کو یکسر دماغ سے نکال پھینکا اور جدید خیالات کا حامی ہوتا گیا۔

میں بڑوں کی باتیں سنتا ضرور تھا مگر اس پر عمل نہیں کرتا تھا۔ پوجا پاٹ اور دھرم سے بھی میں دور رہتا تھا۔ ماتا پتا اور گھر والے مندر جاتے مگر میں کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے مندر جانے سے بچ جاتا۔ پتا نے میرے خیالات کو اچھی طرح پڑھ لیا تھا اور وہ سمجھ گئے تھے کہ یہ لڑکا جدید خیالات کا حامی ہو گیا ہے، لہٰذا وہ مذہبی رسم و رواج کی پابندی کے لئے مجھ پر زیادہ دباؤ نہیں ڈالتے تھے، مگر مجھے مذہبی رسم و رواج کے معاملے میں سمجھاتے ضرور تھے، ان کا یہ بھی خیال تھا کہ وقت کے ساتھ اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جائے گا۔

میں نے ذہنی طور پر کبھی بھی مذہبی رسم و رواج سے بغاوت نہیں کی۔ میں یہ بھی اکثر سوچا کرتا کہ ان رسم و رواج میں کوئی نہ کوئی حقیقت تو ضرور ہے، اسی وجہ سے ہمارے گھر والے اور گاؤں کے دیگر لوگ ان رسموں کے بندھن میں بندھے ہوئے ہیں۔ میں اکثر یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ ہر آدمی اپنی مرضی میں آزاد ہے اچھائی کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنی زندگی بخوشی گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ کسی پر ظلم و زیادتی کے میں ہمیشہ خلاف رہا۔ میں اکثر اپنے پتا سے کہا کرتا۔ "پتا جی! کام کاج کے معاملے پر آپ کسی پر ظلم و زیادتی مت کیا کریں، اگر کوئی غلطی کر بیٹھے تو اسے درگزر کر دیا کریں، کیونکہ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ "ایشور کی نظر میں وہ اچھا منش ہے جو دوسروں پر ظلم نہ کرے، کسی کا گلا نہ کاٹے، اپنی خوشی کے لئے دوسروں کی خوشیاں نشٹ نہ کرے، دوسروں کا خون نچوڑ کر اپنی تجوری نہ بھرے، پوری زندگی میں ایسا کام کرے کہ مرتیو کے بعد جانے والے کو لوگ اچھے نام سے یاد کریں، ظلم کرنے والوں کو لوگ پاپی اور دشٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں، پیٹھ پیچھے ایسے لوگوں کو لوگ شراپ دیتے ہیں، ظالم کی بربادی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے ہیں۔"

اس طرح کی میری باتیں سن کر میرے پتا مسکرانے لگتے اور بولتے۔ "ارے او پرتاب کی ماں، اپنے پرتاب کو دیکھ کتنی اچھی باتیں کر رہا ہے، اس نے میرا من خوش کر دیا۔ پڑھ لکھ کر یہ تو یہ فائدہ ہوا کہ اپنے پتا کو سمجھا سکے۔ میں نے تو اسکول کا منہ نہیں دیکھا، کاش! کہ میں بھی پڑھا لکھا ہوتا۔

مگر میرا من خوش ہے کہ میرا پتر پڑھا لکھا اور سمجھ دار ہے۔ اپنے پتا کو زمانے اور زندگی کی اونچ نیچ سے بے خبر نہ رہنے دے۔

پتر کیا تم نے کبھی یہ دیکھا کہ میں نے اپنے کمیوں پر ظلم کیا ہو، کسی کا حق مارا ہو، کسی کا خون بہایا ہو، گاؤں کی

کسی غیر ناری پر بری نظر ڈالی ہو، یہ مجھے پتہ ہے کہ دنیا کی ہر چیز وقت کے ساتھ ساتھ پرانی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح انسان بھی پرانا ہوتا چلا جاتا ہے۔ یعنی انسان بوڑھا ہو جاتا ہے۔

"پتر جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے، ہر بچے کو لوگ اٹھائے اٹھائے پھرتے ہیں، اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں، خوشی خوشی اس کی سیوا کرتے ہیں۔

پتر تم نے کبھی سوچا ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے یعنی بچہ کی سیوا لوگ اس لئے کرتے ہیں کہ اس بچے کا سمے چڑھتا ہوا ہوتا ہے، ایک نہ ایک دن اس بچے نے ایک تناور درخت بننا ہے۔ اور اس کا الٹ ایک بوڑھا ہوتا ہے۔ یعنی جب منش بوڑھا ہوتا ہے تو اس کا سمے گرتا ہوا ہوتا ہے۔ لوگ جانتے ہیں کہ یہ بوڑھا اب وقت کے ساتھ دن بدن کمزور ہوتا جائے گا اور بہت جلد پرلوک سدھار جائے گا۔ لہٰذا کمزور، مفلوج، بیمار، جو دوسروں کے سہارے کا محتاج ہے اور بہت جلد سب کا ساتھ چھوڑ جائے گا، اس کی سیوا کرنے سے کیا فائدہ۔ سیوا تو لوگ کرتے ہیں مگر ایک بڑھتا ہوا بچہ اور ایک بوڑھے کی سیوا میں من کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔

پتر تم بھی اپنی زندگی کو خوش و خرم رکھنا، دوسروں کی خوشی میں خوش رہنے والوں کو بہت زیادہ من کی شانتی ملتی ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی اپنے مذہب کے رسم و رواج کے ساتھ ساتھ چلے، مذہب سے بغاوت ٹھیک نہیں۔ دنیا کا ہر مذہب اچھا کام کرنے کے لئے کہتا ہے۔ دوسروں کے ساتھ انیائے سے روکتا ہے۔ منش کو ایسا کام کرنا چاہئے کہ پرلوگ سدھارنے کے بعد لوگ اسے اچھے نام سے یاد کریں۔"

میں اکثر ماتا پتا کی باتوں کو سر جھکائے سنتا رہتا تھا۔ ماتا پتا ہی کیا بلکہ میں گاؤں کے ہر بڑے کی بات کو شانتی سے سنتا تھا مگر ہمیشہ کرتا اپنی تھا۔

ویسے تو اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ میں گاؤں میں زیادہ سمے گزاروں کیونکہ میں کالج کے ہوسٹل میں رہتا تھا۔ کالج کے ہوسٹل میں بہت اچھا وقت گزرتا رہتا تھا۔ ہر ذات پات اور مذہب کے لڑکے ہوتے تھے۔ ہر کسی کے اپنے اپنے خیالات ہوتے تھے مگر مجموعی طور پر سب آزادانہ خیالات کے مالک ہوتے تھے۔ کالج کی نسبت گاؤں میں وقت کٹتا نہیں تھا کیونکہ گاؤں میں دوست یار نہیں تھے، ایک تو گاؤں میں یہ پابندی کہ ٹھاکر لوگ ہیں، اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ زیادہ رسم میل جول نہیں رکھتے، خاندان میں زیادہ تو جوان تھے جن کے ساتھ رہ کر میرا وقت کٹے۔ میرے چچیرے بھائی تھے انہی کے ساتھ تھوڑا بہت وقت کٹ جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ہم تینوں جنگل کی طرف شکار کے لئے نکل پڑتے تھے۔ ہمارے گھر کئی گھوڑے تھے لہٰذا ہم تینوں الگ الگ گھوڑے پر سوار ہو کر سیر و تفریح اور چھوٹے موٹے شکار کرتے تھے۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم تینوں دوپہر کے بعد شکار کے لئے نکل پڑے۔ ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتے رہے مگر اس دن کوئی بھی شکار نظر نہیں آ کے دے رہا تھا۔ شکار ڈھونڈتے ڈھونڈتے شام کے سمے ہونے لگا۔ ہمارے دماغ میں ایک بات تھی کہ آج اگر ہم بغیر شکار کے گھر گئے تو لوگ ہمارا مذاق اڑائیں گے۔ لہٰذا کسی نہ کسی طرح ایک آدھ شکار مل جائے۔ اس تگ و دو میں شام کا ہلکا اندھیرا چاروں اور چھانے لگا۔

اندھیرے کو زیادہ گہرا ہوتے دیکھ کر ہم نے پروگرام بنایا تھا کہ آج بغیر شکار کے ہی واپس ہونا پڑے گا اور ہم نے واپسی کے لئے اپنے گھوڑے موڑ لئے۔ تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا [illegible] میرے سر پر جھپٹا اور میرے سر کے بال اس کے [illegible] میں آ کر جھٹکا کھا گئے اور یہی نہیں اس پرندے نے اس قدر زوردار کریہہ چیخ ماری کہ پورا جنگل دہل گیا اور میرا حال نہ پوچھو۔ میرے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے، سارے جسم میں جھرجھری سی آ گئی اور پھر میرا وجود کپکپانے لگا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

میرے دونوں بھائی جو مجھ سے آگے تھے فوراً پلٹ کر میرے قریب آ گئے۔ ایک بولا۔ "پرتاب کیا ہوا تو سہما ہوا کیوں ہے۔" اس سمے مجھ میں اتنی شکتی نہیں تھی کہ اسے اپنی کیفیت بتاتا۔ ایک بھائی بولا۔ "ارے تو ڈر کیوں رہا ہے، یہ الو تھا۔ جو کہ تجھ پر جھپٹا۔"

دوسرا بولا۔ "بھائی سنا ہے کہ یہ الو بہت منحوس ہوتے ہیں اور مصیبت و پریشانی کا ذریعہ بھی ہوتے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ پرتاب اس میں ڈرنے والی کوئی بات نہیں۔ چلو اب جلدی سے گھر چلتے ہیں۔" اس نے یہ بات کی تو ہم نے اپنے اپنے گھوڑے آگے بڑھا دیئے۔ لیکن میرا خوف ابھی بھی مجھ پر حاوی تھا۔

ابھی ہم چند قدم ہی آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ایک ہرن ہمیں نظر آ گیا۔ ہرن کو دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ہم دونوں سے جو بڑا بھائی تھا اس نے فوراً بندوق تانی اور ہرن کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ گولی ہرن کے پاؤں میں لگی اور ہرن زمین پر گر پڑا۔ ہرن کو زمین پر گرتا دیکھ کر وہ فوراً اپنے گھوڑے سے نیچے کود پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ہم دونوں بھی اپنے اپنے گھوڑوں سے نیچے کود پڑے تھے مگر بھائی نے ہرن کی طرف دوڑ لگا دی۔

بھائی ہرن کے قریب پہنچا اور ہرن کو دبوچ لیتا کہ ہرن لنگڑاتے ہوئے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہرن کو بھاگتا دیکھ کر بھائی نے اپنے دوڑنے کی رفتار تیز کر دی۔ اور ہرن کے پیچھے درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا۔ ہم دونوں اسے آوازیں دینے لگے۔ اور آوازیں دیتے ہوئے اسی سمت ہم نے بھی دوڑ لگا دی۔ جس طرف ہرن اور بھائی گئے تھے۔

ہماری آوازیں جنگل میں گونجنے لگیں۔ اندھیرا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔ صرف ہماری آوازیں تھیں بھائی کی کوئی بھی آواز ہم تک نہیں پہنچ رہی تھی، حالانکہ زیادہ جھاڑیاں نہیں تھیں۔ ابھی بھی سارا علاقہ واضح طور پر ہمیں نظر آ رہا تھا۔

بس یوں سمجھ لیں کہ ہم دونوں بھائی گلا پھاڑ کر چیخ رہے تھے۔ "سنیل بھیا، سنیل بھیا۔" مگر بھیا کی آواز ندارد، ہم اس شش و پنج میں سہمے ہوئے آگے ہی آگے بڑھتے رہے، ہم نے تینوں گھوڑوں کو ایک درخت سے باندھ دیا تھا۔

جب ہم دونوں اور آگے بڑھے تو وہاں کا خوفناک منظر دیکھ کر ہم پر جیسے کپکپی طاری ہو گئی۔ چھوٹا بھائی امیت فوراً زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اندرونی طور پر تو میں بھی کپکپا رہا تھا مگر مجھ میں ابھی ہمت باقی تھی۔ ویسے بھی میں شروع ہی سے بہت ہمت والا ہوں۔ نڈر، بے خوف و خطر، رات کے سمے کھیتوں میں نکل جاتا تھا۔ گھنٹوں آموں کے باغ میں بیٹھا بانسری بجاتا رہتا تھا۔ مجموعی طور پر میں بہت نڈر ہوں۔

سنیل بھائی بے ہوش چاروں شانے چت پڑے تھے اور ان کے قریب ہی ایک کٹا ہوا سر موجود تھا جس سے تازہ تازہ خون نکل کر زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ دھڑ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ سر ایک عجیب الخلقت انسان نما بلا کا تھا۔ بڑے بڑے دانت جو کہ ہونٹوں سے باہر کو نکلے پڑے تھے۔ تقریباً دو انچ چوڑائی کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان آنکھوں کا رنگ جیسے وہ آنکھیں نہ ہوں بلکہ ان میں کسی نے گاڑھا گاڑھا خون انڈیل دیا ہو، سر کے بال بالکل اکڑے ہوئے جیسے کہ لمبے لمبے تنکے ہوں اس کے علاوہ اس کے چہرے پر بھی لمبے لمبے بال نمایاں تھے۔

بہرحال میں نے بڑی مشکل سے امیت کو جھنجھوڑنے لگا تو اچانک جیسے وہ چونک پڑا اور آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ "امیت ہوش کرو۔ جلدی اٹھو، سمے ضائع نہ کرو، چلو جلدی سے سنیل بھائی کو اٹھاتے ہیں اور اب یہاں سے بھاگنے کی کوشش کریں۔"

یہ بول کر میں نے ایک مرتبہ پھر امیت کو جھنجھوڑ دیا تو وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا اس کے بعد ہم دونوں نے سنیل بھیا کو اٹھا کر اس جگہ لانے جہاں کہ ہمارے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ ہم نے سنیل بھیا کو اپنے گھوڑے پر اوندھا کر کے لٹا دیا، اس کے بعد میں گھوڑے پر بیٹھ گیا۔ پھر

امیت سے بولا۔ ''امیت اب تم اپنے گھوڑے پر بیٹھ کر دوسرے گھوڑے کی لگام تھام لو، اور فوراً گھر کی طرف بڑھو۔''

سنیل بھیا کو اس طرح گھوڑے پر لاد کر ہم گھر لائے۔ گھر پہنچتے پہنچتے کافی اندھیرا ہوچکا تھا۔ مگر پہنچتے ہی سنیل بھیا کو دیکھ کر ایک کہرام مچ گیا۔ گھر میں عورتوں کی آنکھیں آنسو بہانے لگیں۔ کئی نے تو اپنا کلیجہ پکڑلیا۔ ''ارے جلدی سے بتاؤ تو سہی، سنیل کو ہوا کیا؟'' ہر منہ میں یہی سوال تھا۔ خیر انہیں گھوڑے پر سے اتار کر کمرے میں بستر پر لٹادیا گیا۔

ہم دونوں بھائیوں کی حالت ناگفتہ تھی۔ خیر پانی پینے کے بعد میں نے شروع سے لے کر آخر تک پتا جی کو ساری کتھا سنادی۔ باتیں سن کر پتا جی کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑنے لگیں۔

پتا جی! ایک ملازم سے بولے۔ ''ارے فوراً جا اور پنڈت جی کو بلالا۔ میرا نام لینا کہ پنڈت جی آپ کو ترنت بلایا ہے۔''

وہ ملازم دوڑتا ہوا گیا اور فوراً ہی مندر کے پنڈت جی کو بلا لایا۔ پنڈت جی کو دیکھتے ہی پتا جی بولے۔ ''پنڈت جی! لگتا ہے یہ کسی ہوائی چیز کے چکر میں آگیا ہے۔ آپ ترنت اسے دیکھیں۔''

پنڈت جی نے کٹورے میں تھوڑا سا پانی منگایا۔ جب پانی آ گیا تو کٹورا ہاتھ میں لے کر منہ ہی منہ میں کوئی منتر یا پھر کوئی اشلوک پڑھنا شروع کیا۔ وہ بار بار پانی پر پھونک مارتے، تین بار پانی پر پھونک مارنے کے بعد انہوں نے تھوڑا سا پانی اپنے چلو میں لیا اور بھیا کے منہ پر زور سے چھینٹا مارا ایک بار، دو بار، اور پھر جب پنڈت جی نے تیسرا چھینٹا مارا تو بھیا نے آنکھیں کھول دیں۔

''اوہ! بھگوان۔ ایسا لگتا تھا کہ بھیا کی اپنی آنکھیں نہ تھیں بلکہ آنکھوں کی جگہ دو خون کے ڈھیلے ہوں، انہوں نے گھور کر پنڈت جی کو دیکھا اور پھر بہت واضح طور پر مسکرانے لگے۔ پھر ان کے منہ سے بہت بھاری آواز نکلی۔ ''پنڈت میری بات سن۔'' اور پھر دایاں ہاتھ بڑھا کر ترنت پنڈت جی کی گردن پکڑ لی۔ پنڈت جی جھکتے چلے گئے، جب پنڈت جی کافی جھک گئے تو پھر دوبارہ بھیا کے منہ سے آواز نکلی۔ ''پنڈت! اگر خیر چاہتا ہے تو ترنت بھاگ جا، یہ تو نے کیا الاپ شلاپ کرنا شروع کردیا۔ پتہ نہیں میں تجھے کیوں چھوڑ رہا ہوں، ورنہ ابھی تک تیرا پران نکل چکا ہوتا۔

پنڈت تجھے میری شکتی کا پتہ نہیں تو سن، میرا نام ماندرا ہے، تو اس نام سے ضرور جانکاری رکھتا ہوگا۔ اب تو سمجھ گیا ناں۔''

پنڈت جی فوراً بولے۔ ''جی ماندرا مہاراج، میں سمجھ گیا، ''ماندرا خونی آتما''۔

پھر آواز سنائی دی۔ پنڈت تو بھی یہ جانتا ہوگا کہ میں کسی پر انیائے نہیں کرتا، میں بلاوجہ اور بغیر ظلم وزیادتی کے کسی کو چھیڑتا نہیں۔ میں اچھوں کا اچھا ساتھی ہوں اور ظالموں کے لئے غضب، جب تک کوئی مجھ پر ظلم نہ کرے، اور ایسا انیائے جو میرے برداشت سے باہر ہو تو پھر میں اس منش کو اپنے خونی شکنجے میں جکڑ لیتا ہوں اور جب کوئی اس طرح میرے خونی پنجوں میں آجاتا ہے تو اس کا انجام......؟'' اور پھر آواز بند ہوگئی۔

پنڈت جی کی گردن آزاد ہوگئی، پنڈت جی اپنی گردن سہلانے لگے اور پتا جی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''ٹھاکر صاحب۔ یہ میرے بس سے باہر ہے۔ مجھے معاف کردیں۔ میں جاتا ہوں۔'' اور یہ بول کر پنڈت جی فوراً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے۔

''پنڈت جی کے جاتے ہی پتا جی! ہاتھ جوڑ کر بھیا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور بولے۔

''ماندرا جی! میں مانتا ہوں کہ ضرور سنیل نے کوئی بہت بڑی غلطی کی ہوگی جس سے کہ آپ کو کشٹ پہنچا۔ آپ ہمیں بتائیں کہ آپ کو کشٹ کیسے پہنچا۔''

''اس مورکھ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس نے ترنت مجھ پر گولی چلادی، میں اس سمے ایک ہرن کے روپ میں تھا جبکہ اس سے پہلے کہ اندھیرا زیادہ ہوجائے۔ میں نے اپنے ایک بیر کو حکم دیا کہ تو الو کے بھیس میں ان کو ڈرا دھمکا کر اس سمے اس جنگل سے نکال دے۔ اس نے ایسا کیا بھی، اس نے ایک پر جھپٹا مارا اور ایسی آواز نکالی کہ پورا جنگل دہل گیا۔

لیکن یہ جوانی کے جوش میں شکار تلاش کرتے رہے۔ انہیں شکار چاہئے تھا جبکہ مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ ٹھاکر خاندان والے کسی جاندار کا گوشت نہیں کھاتے لیکن نئی نسل ایسا کررہی ہے۔

نشچیت اب یہ اپنی جان سے جائے گا۔ اس کی گولی نے مجھے زخمی کردیا تھا، میں زمین پر گر پڑا، اس کے بعد میں اٹھا اور ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا، مگر اس نے مجھے نہیں چھوڑا، میرے پیچھے بھاگا اور کچھ دور جا کر مجھے دبوچ کر زمین پر گرادیا، اور میری گردن پر چھری پھیرنے والا تھا کہ پھر مجھے اپنی شکتی دکھلانی پڑی۔''

یہ سننا تھا کہ میری ماتا، چاچی اور گھر کی دیگر عورتیں روتی پیٹتی اس جگہ آ گئیں۔ انہوں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی، زار و قطار رونے لگیں، چاچی اور ماتا بولیں۔ ''ماندرا جی! ہمارے بچے سے بھول ہوگئی، اسے کیا پتہ تھا کہ ہرن کے روپ میں آپ ہیں، اس کی طرف سے ہم سارے پریوار آپ کے آگے چرنوں میں جھکے پڑے ہیں، آپ ہمارے بچے کا جیون دان کردیں۔

ماندرا جی! آپ کو ایشور کا واسطہ، تمام دیوی دیوتاؤں کا واسطہ، آپ کو دنیا میں جو بھی عزیز ہے اس کا واسطہ آپ کی اچھا کے مطابق ہم اس بھول پر آپ جتنے بھی چاہیں بکروں کی بھینٹ دینے پر تیار ہیں، آپ حکم کریں۔ ہمارے بڑھاپے پر رحم کھائیں۔'' میری ماتا نے اپنے سر سے آنچل اتار دیا اور بولیں۔ ''ماندرا جی! ایک ایسی ماتا کی بنتی ہے جس کے سر کے بال سفید ہوچکے ہیں، آپ میرے سفید بالوں پر ترس کھائیں۔''

آپ کو کالی ماتا، لکشمی ماتا، شیر والی ماتا کا واسطہ، آپ کو آپ کی ماتا کا واسطہ، ہم پر رحم کھائیں۔'' اور پھر عورتیں دھاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔

پھر بھیا نے ترنت بہت لمبا سانس کھینچا اور ان کے منہ سے آواز نکلی۔ ''دیوی تو نے دیوی ماتاؤں اور پھر میری ماتا کا واسطہ دے کر میرا کلیجہ موم کردیا۔ تو بھی ایک ماتا ہے، تیرے واسطوں کی خاطر میں اس بالک کا جیون دان کرتا ہوں۔ لیکن ایک شرط پر۔''

''آپ حکم کریں مہاراج!'' ماتا جی نے کہا۔

''ترنت بیس بکروں کی بھینٹ چاہئے۔ جلدی سے بکروں کا انتظام کرادے اور ان بکروں کو لاکر سامنے والے کمرے میں چھوڑ کر بتی بجھا دینا اور ساتھ ہی دروازہ بھی باہر سے بند کردینا۔ چل جلدی کر۔''

یہ سننا تھا کہ پتا جی! ترنت باہر نکلے اور پھر چند منٹ میں ہی پورے گاؤں سے بیس بکرے لائے گئے اور جیسا کہا گیا تھا ویسا ہی کیا گیا۔ بکروں کو کمرے میں چھوڑ کر باہر سے دروازے کی کنڈی لگادی گئی۔ بھیا اپنے بستر پر خاموش بیٹھے تھے۔

ماتا بولیں۔ ''مہاراج آپ کے حکم کے مطابق سارے بکرے کمرے میں موجود ہیں۔'' یہ سن کر بھیا کے منہ سے آواز نکلی۔ ''ٹھیک ہے، اور جب کمرے کا دروازہ خود بخود کھل جائے تو اندر جا کر کمرے کی صفائی کردینا اور بکروں کو کسی ویران جگہ پر لے جا کر ڈال دینا اور اپنے پتر کو بول دینا کہ آئندہ دیکھ بھال کر قدم اٹھانا اور خاص طور پر دن کے بارہ بجے اور شام اندھیرا پھیلتے ہی ویران جگہ اور جنگلوں، باغوں اور پھول پھلواریوں میں احتیاط برتا کرے صرف اسے ہی نہیں تمام منش کو ان سے احتیاط کرنی چاہئے۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔'' اور پھر آواز آنا بند ہوگئی۔ بھیا بستر پر خاموشی سے آنکھیں بند کرکے لیٹ گئے۔

چند منٹ ہی گزرے تھے کہ اچانک کمرے سے بکروں کے ڈکرانے کی آوازیں آنے لگیں ایسا لگتا تھا کہ جیسے ان کی گردن پر چھری چلائی جارہی ہو، پھر چند سیکنڈ بعد ہی بکروں کی آوازیں آنا بند ہوگئیں اور پھر کنڈی لگا بند دروازہ دھڑام سے کھل گیا۔

دروازہ کے کھلتے ہی بھیا بھی اپنی جگہ بستر پر اٹھ

کر بیٹھ گئے اور اچنبھے کی حالت میں سب کو دیکھنے لگے اور پھر بولے۔ ''کیا ہوا؟''

دروازہ کے کھلنے کے بعد جب ہم لوگ کمرے میں گئے تو یہ دیکھ کر دنگ اور حیران رہ گئے کہ سارے بکرے زمین پر ڈھیر تھے۔ ان کی گردنیں کٹی ہوئی تھیں۔ جیسے کہ کسی نے تیز دھار چھری سے سب کی گردنیں کاٹ ڈالی ہوں اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ کسی بھی بکرے کی گردن سے ایک بوند بھی خون کمرے کے فرش پر ٹپکا نہیں تھا۔ سارے بکروں کا خون بوند بوند غائب ہو چکا تھا۔

بہر حال ہم نے جلدی سے بیل گاڑی منگوا کر اس پر سارے بکرے لادے اور دو گاڑیوں کے ساتھ ہمارے چار ملازم بکروں کو لے کر چلے گئے تا کہ رات کے اندھیرے میں ان بکروں کو کسی ویران جگہ پر ڈال دیں۔ سارے بکرے ویران جگہ پر ڈال دیئے گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے سنیل بھیا بالکل بھلے چنگے ہو گئے۔

صبح ہوئی تو سارے گھر والوں نے سکھ کا سانس لیا اور پھر گھر والے بھیا کو لے کر مندر گئے، اس دن میں بھی گھر والوں کے ساتھ مندر گیا، جوان ہونے کے بعد وہ دن میرا پہلا دن تھا جب میں نے مندر میں قدم رکھا اور پھر گھر والوں کے دیکھا دیکھی میں نے بھی وہی کچھ کیا جس طرح میرے پتا اور دیگر گھر والوں نے جو کچھ بھی کیا۔''

''حکیم صاحب میں جھوٹ کا قائل نہیں۔ میں جھوٹ کو بہت برا سمجھتا ہوں، اس دن سے پہلے میں ماورائی اور ان دیکھی مخلوق پر یقین نہیں رکھتا تھا۔ جب میں سنتا تھا کہ کسی پر بھوت، چڑیل یا پھر کسی بھٹکی ہوئی آتما نے بسیرا کر لیا ہے تو میں اسے مذاق اور من گھڑت سمجھتا تھا مگر میں نے جب سنیل بھیا کے ساتھ ہونے والے واقعے کو دیکھا تو میرا ذہن بالکل پکا ہو گیا کہ بھگوان نے ہم انسان کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں پیدا کر رکھی ہیں جو کہ ہمیں نظر نہیں آتی ہیں اور ان ان دیکھی مخلوق میں جو شکتیاں ہیں وہ شکتی بھگوان کی دی ہوئی ہیں۔''

اس واقعہ کے چند دن بعد میں دوبارہ گاؤں سے شہر کالج کے ہوسٹل میں چلا گیا اور بیتے ہوئے حالات اور واقعات کو فراموش کر بیٹھا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک وقت ایسا بھی آئے گا۔ کہ میری ہنستی بستی زندگی اذیت کا شکار ہو جائے گی۔ میں دکھوں اور مصیبت کا ڈھیر بن جاؤں گا۔ اب تو میں اس مقام پر پہنچ چکا ہوں کہ مجھے اپنا جیون بوجھ لگنے لگا ہے۔ کاش! کہ میں اب سے چالیس سال پہلے مر جاتا تو میری آتما کو بھی شانتی ملتی۔

حکیم صاحب میں پل پل جیتا ہوں اور پل پل مرتا ہوں۔''

رولوکا نے پرتاب سنگھ کے لکھے ہوئے حالات یہیں تک پڑھے تھے۔

☆......☆......☆

''حکیم صاحب! آپ کو حکیم وقار یاد کر رہے ہیں۔'' ایک ملازم رولوکا کے کمرے میں آیا اور بولا۔

ملازم کی بات سن کر رولوکا فوراً کرسی سے کھڑا ہو گیا۔ اور فوراً حکیم وقار کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک باریش صاحب حکیم وقار کے سامنے بیٹھے ہیں اور برابر میں ایک خاتون نقاب میں بیٹھی ہیں۔

رولوکا کو دیکھ کر حکیم وقار بولے۔ ''محترم یہ حکیم کامل ہیں اور یہی روحانی علاج کرتے ہیں، میں جسمانی علاج کرتا ہوں۔''

باریش بزرگ نے مصافحہ کے لئے رولوکا کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رولوکا نے خندہ پیشانی سے ان بزرگ سے مصافحہ کیا۔

''حکیم کامل یہ محترم بہت دور سے آئے ہیں، اپنے علاقے کے یہ بہت امیر و کبیر اور رئیس ہیں۔ پریشانی انہیں یہاں کھینچ لائی ہے۔ یہ ان کی صاحبزادی ہیں جن کے ساتھ کچھ پیچیدہ مسائل درپیش ہیں، اگر آپ بہتر سمجھیں تو اپنے کمرے میں لے جا کر ان سے باتیں کر لیں۔

''میں معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو پریشان کیا۔'' حکیم وقار نے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں، اور معذرت کی کوئی ضرورت نہیں، اس مطب میں آپ اور ہم صرف پریشان حال لوگوں کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے ہی بیٹھے ہیں۔ اگر ہماری کوشش سے کسی کی پریشانی ختم ہو جاتی ہے تو اس سے بڑھ کر ہمیں اور کیا خوشی مل سکتی ہے۔

محترم بزرگ آپ برائے مہربانی میرے کمرے میں تشریف لے چلیں، وہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

بیٹی آپ بھی چلیں کیونکہ چند سوالات میں آپ ہی سے کروں گا۔'' رولوکا نے کہا۔

''دونوں باپ بیٹی اپنی کرسی سے اٹھے اور رولوکا کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئے، رولوکا نے انہیں آرام سے بیٹھا دیا اور پھر ملازم کو آواز دے کر ٹھنڈا پانی منگایا اور انہیں پلایا۔

رولوکا بولا۔ ''محترم میں آپ کی صاحبزادی سے چند سوالات کروں گا، یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ چاہیں تو یہیں بیٹھے رہیں یا پھر باہر جا کر بیٹھ سکتے ہیں۔''

رولوکا کی باتیں سن کر ان بزرگ کی صاحبزادی فوراً بولی۔ ''محترم حکیم صاحب، ابا حضور کو ساری باتوں کا علم ہے اور ان سے کوئی چھپی ہوئی بات نہیں۔ آپ جو بھی سوال کریں گے میں اس کا مفصل جواب دوں گی، اس لئے کہ اب میں بھی اپنی اذیت ناک زندگی اور اپنے گھر والوں کی عزت و خوشی کے لئے سب کچھ کرنے بلکہ مرنے تک کے لئے راضی ہوں، ایسی زندگی سے کیا فائدہ جس میں میں اپنی خوشیوں کا خون ہوتا دیکھوں، اور ایسی میری خوشی کس کام کی جس سے میرے اپنے خاموش پتھر کے بت بن کر رہ جائیں۔ میں یہ کہنے میں بالکل بھی عار نہیں محسوس کرتی۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ طویل عرصہ سے ایک جن نے مجھے پریشان کر رکھا ہے اب آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ میں کس قدر اذیت ناک زندگی گزار رہی ہوں، اور میرے گھر والے کس کرب سے دوچار ہیں۔

ہر جمعہ کے دن میں اس جن کی مرضی اور منشاء سے آزاد ہوتی ہوں، اور یہی وجہ ہے کہ آج میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ جمعہ کے علاوہ روز بلاناغہ وہ رات بارہ بجے کے قریب چھت پر بنے ہوئے میرے کمرے میں آتا ہے۔ اور اپنا وقت گزارتا ہے۔

ہم تمام گھر والوں کو اس نے خوف کے شکنجے میں جکڑ دیا ہے، شروع سے اس کا کہنا ہے کہ اگر کسی عامل کے پاس گئے تو تمام گھر والوں کو ہلاک کر کے رکھ دوں گا۔ اب آپ خود بتائیں کہ ہم کیا کریں۔ مجھ سے مزید میری تین بہنیں ہیں۔ میری ذات کی وجہ سے ان کا مستقبل تاریک ہے، ان کی عمریں بھی بڑھ رہی ہیں، ان کا کوئی رشتہ نہیں آتا، اور اگر جو بھی آتا ہے میری خوبصورتی کی بنا پر اس کی نظر مجھ پر ٹک جاتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ بات لوگوں تک پہنچ چکی ہے کہ ہمارے گھر پر کسی جن کا قبضہ ہے اور اگر کسی نے اس گھر میں کسی سے شادی کی تو اس کی خیر نہیں۔''

یہاں تک کہنے کے بعد وہ لڑکی سسک پڑی اور پھر اس کی آواز ہچکیوں میں دب گئی۔

رولوکا نے اسے ایک گلاس پانی پلایا۔ پانی پینے کے بعد وہ کچھ نارمل ہوئی تو رولوکا بولا۔ ''بیٹی گھبرائیں نہیں، اوپر والے نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے، انسان بھی اشرف ہے، انسان تمام مخلوقات پر قابض ہو جاتا ہے، اوپر والا کسی ظالم کو ایک حد تک چھوٹ دیتا ہے، اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ ظالم شکنجے میں کس دیا جاتا ہے۔

اوپر والے پر مجھے قوی امید ہے کہ وہ بہت جلد اپنے انجام کو پہنچے گا کہ تم بتا سکتی ہو کہ یہ سلسلہ شروع کیسے ہوا؟''

''حکیم صاحب! جب میں جوانی کی دہلیز پر پہنچی تو ایک دن اچانک بلی کا ایک بچہ نظر آیا۔ وہ بہت خوب صورت تھا، اس کی سفید رنگت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا۔ نہ جانے وہ کہاں سے اور کیسے میرے کمرے میں گھس آیا تھا۔ میاؤں...... میاؤں...... کی اس کی آواز جب سنائی دی تو میں نے بغور اسے دیکھا اور پھر اس کی خوبصورتی اور کشش نے مجھے اسے اٹھانے پر مجبور کر دیا۔

میں نے اسے اٹھا کر اپنے بستر پر بٹھا لیا اور اس پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ مزے سے میرے پاس بیٹھا

رہا اور میں جیسے اس کی خوب صورتی میں کھو گئی۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک مجھے کوئی اور ہوش نہ رہا۔ یہاں تک کہ میری آنکھ لگ گئی اور وہ میرے پہلو میں دبکا بیٹھا رہا۔

اچانک میری آنکھ اس کے آواز دینے پر کھلی تو میں نے دیکھا کہ وہ مجھے ٹکر ٹکر دیکھ رہا ہے۔ پھر میں اسے دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی۔ ''اچھا اب تم آرام سے بیٹھو، میں تمہارے لئے دودھ لے کر آتی ہوں، تمہیں بھوک لگی ہوگی۔''

میں نیچے آئی اور ایک کٹورے میں تھوڑا سا دودھ لے کر دوبارہ اوپر آ گئی۔ دودھ اس کے سامنے رکھا تو رغبت سے اس نے دودھ پینا شروع کر دیا۔ جب میں دودھ لے کر اوپر آئی تو امی نے پوچھا تھا کہ ''دودھ کس کے لئے لے جا رہی ہو؟''

میں نے جواب دیا بلی کا ایک بچہ نہ جانے کہاں سے آ گیا ہے، اور اتنا خوب صورت ہے کہ میں نے آج تک اتنا خوب صورت بچہ کبھی نہیں دیکھا۔ میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ میں اسے گھر میں رکھ لوں۔''

میری بات سن کر امی بولیں۔ ''بیٹا یہ نہ کرنا، اگر اسے زیادہ لاڈ دکھاؤ گی تو یہاں سے ہلے گا نہیں اور پھر ایسے جانوروں سے مزید پریشانیاں بھی آتی ہیں، چلو اگر تم چاہتی ہو تو دودھ پلا کر اسے چلتا کر دینا، اسے زیادہ منہ نہیں لگانا۔''

''امی آپ پریشان نہ ہوں، اسے آپ دیکھیں گی تو آپ کا دل بھی اس پر آ جائے گا، خیر میں دودھ پلا کر ابھی آئی۔''

جب اس نے دودھ پی لیا تو میں نے اس کے جسم پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولی۔ ''اچھا اب تم جاؤ، تم نے دودھ پی لیا۔'' میرا یہ بولنا تھا کہ جیسے وہ میری بات سمجھ گیا تھا، خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔ میں اسے بغور دیکھتی رہ گئی۔

کمرے سے نکلتے ہی جیسے مجھے ہوش آ گیا، میں فوراً باہر کو لپکی کہ دیکھوں تو وہ گیا کہاں؟'' مگر جب میں کمرے سے باہر نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ پلک جھپکتے ہی وہ غائب تھا۔ پوری چھت خالی پڑی تھی، اور پھر سیڑھیوں سے وہ نیچے بھی نہیں گیا تھا۔ میں اچنبھے میں پڑ گئی کہ اتنی جلدی، آخر وہ کہاں جا سکتا ہے۔''

میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گئی اور اس کے متعلق سوچنے لگی۔ کافی سوچنے کے بعد بھی میں یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ وہ بچہ گیا تو کہاں گیا کہ اتنے میں امی نے آواز دی تو میں جھٹ بستر سے اٹھی اور نیچے امی کے پاس پہنچ گئی۔ مجھے دیکھ کر امی بولیں۔ ''تم نے اس بچے کو دودھ پلا دیا۔''

''جی امی، اسے دودھ پلا دیا۔'' میں نے جواب دیا۔

امی مجھ سے مخاطب ہوئیں۔ ''خوشبو! تم اسے زیادہ اپنے سے نہ ہلا لینا، نہیں تو وہ تمہاری جان نہیں چھوڑے گا۔ بلیوں کو زیادہ منہ لگانے سے یہ عذاب زندگی بن جاتی ہیں، اور پھر گند الگ کرتی ہیں۔ میں نے بڑے بوڑھوں سے سن رکھا ہے کہ بلی پالنے سے اچھا ہے کہ آدمی کتا پال لے، کیونکہ کتا اپنے مالک کی زیادہ رکھوالی کرتا ہے اور میں نے یہ بھی سن رکھا ہے کہ بلی کے بال مضر صحت ہوتے ہیں، اگر ان کے بال کسی کھانے میں مل کر پیٹ میں پہنچ جائیں تو اس سے دمہ کا مرض لاحق ہو جاتا ہے۔ میں نے تمہیں سمجھا دیا، اب تم احتیاط کرنا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''امی آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں، میرا اندازہ ہے کہ وہ زیادہ ہمارے پاس نہیں آئے گا، وہ مجھے عام بلیوں سے بالکل الگ لگا ہے اور میں نے یہ بھی اندازہ کیا ہے کہ وہ نیچے کے کمروں میں نہیں آئے گا۔''

''ارے بیٹا! ابھی ایک دن تو وہ آیا ہے، اگر اس طرح متواتر آتا رہا تو آہستہ آہستہ اس گھر اور گھر والوں سے مانوس ہو جائے گا تو پھر اس سے جان چھڑانی مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہو جائے گا۔''

''امی آپ فکر نہ کریں اگر دوبارہ آیا تو میں دیکھ لوں گی۔'' میں نے جواب دیا۔

حکیم صاحب! دراصل میں شروع ہی سے چھت پر کمرے میں سونے کی عادی تھی، وجہ یہ تھی کہ میں نے چھت پر پھولوں کے پودے لگا رکھے تھے اور پھولوں کی

بھینی بھینی خوشبو مجھے بہت پسند ہے، امی اور بہنیں رات میں کافی وقت تک میرے کمرے میں یا چھت پر موجود رہتی تھیں اور پھر جب انہیں یا پھر مجھے نیند ستانے لگتی تو وہ چھت سے نیچے چلی جاتی تھیں۔

دو دن کے بعد اچانک رات کے وقت وہ نہ جانے کس طرح کمرے میں آ گیا جبکہ میں نے دروازہ بند کیا ہوا تھا۔ میں اس وقت سوئی نہیں تھی بلکہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے آنے والے وقت کے لئے سوچوں میں مصروف تھی۔ میاؤں...... میاؤں...... کی آواز سن کر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور دیکھا تو وہ فرش پر بیٹھا ہوا یک ٹک مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

''ارے اس وقت رات کے ساڑھے گیارہ بجے تم کیسے اور کہاں سے آ گئے، دروازہ تو بند ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ پہلے سے تم کمرے میں آ گئے تھے۔'' اچانک وہ اچھلا اور بستر پر آ کر میرے قریب بیٹھ گیا۔

''بھئی! امی کی نظر اگر تم پر پڑ گئی تو میری شامت آ جائے گی، آواز بالکل نہ نکالنا، اگر تمہاری آواز امی نے سن لی تو ابھی آ کر تم پر برس پڑیں گی اور پھر میرے ساتھ جو ہوگا وہ تو ہوگا ہی۔'' میں نے کہا۔

''اور اس وقت تو دودھ بھی نہیں مل سکتا، کہیں تمہیں بھوک تو نہیں لگتی۔''

اس وقت اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے میری ساری باتیں وہ سمجھ رہا ہو، وہ تقریباً دس پندرہ منٹ بیٹھا صرف مجھے ہی گھورتا رہا، پھر وہ چھلانگ مار کر بستر سے نیچے فرش پر کود گیا اور دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کہہ رہا ہو کہ ''دروازہ کھول دو تا کہ میں کمرے سے باہر چلا جاؤں۔''

اس کا انداز صاف اور واضح تھا کہ اب دروازہ کھول دو، میں فوراً بستر سے نیچے اتری اور دروازے کے پاس جا کر اس پر ہاتھ پھیرنے لگی، اس کا رخ دروازے کی طرف ہی تھا، میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا تو اس نے مجھ پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور خاموشی کے ساتھ دروازے سے باہر نکل گیا۔ اور چھت کے ایک کونے کی طرف چلا گیا۔

اس کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور مسکراتی ہوئی بستر پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی۔ ''عجیب بچہ ہے، یہ اندر آیا تو کیسے آیا؟ اور پھر میری باتیں سن کر سمجھ گیا کہ اگر امی نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا، اور پھر اسی وجہ سے فوراً چلا گیا۔ اس طرح کی باتیں سوچتے سوچتے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی اور میں نیند کی وادی میں پہنچ گئی۔

دو دن پھر وہ نہیں آیا۔ تیسری رات آئی، میں کچی پکی نیند میں تھی کہ اچانک میاؤں...... میاؤں کی آواز سنائی دی اور پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، وہ فرش پر بیٹھا میری طرف ہی دیکھ رہا تھا اور میری نظر دروازے پر پڑی تو میں چونک گئی کیونکہ ہلکا سا دروازہ کھلا پڑا تھا۔ ''میں نے دروازے کی کنڈی لگا دی تھی اور اب کھل کیسے گیا؟'' میں یہ سوچنے لگی۔ پھر میرے دماغ میں آیا کہ ہو سکتا ہے میں کنڈی لگانا بھول گئی ہوں گی۔ میں یہ سوچنے لگی تھی کہ وہ چھلانگ لگا کر بستر پر چڑھ گیا اور میرے سامنے بیٹھ کر ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے لگا۔

''اس وقت رات کے بارہ بجنے والے ہیں، تم آئے کیسے؟ لگتا ہے تم مجھے پاگل کر دو گے، بھئی یہ سونے کا وقت ہے، خیر تھوڑی دیر تم سے باتیں کر لیتی ہوں، پھر تم چلے جانا۔'' میں نے کہا۔

وہ کوئی پندرہ منٹ تک بیٹھا یک ٹک گھورتا رہا۔ پھر وہ بستر سے نیچے کود گیا اور خاموشی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کا انداز دیکھ کر میں حیران ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ ''عجیب بچہ ہے، یہ تو انسان سے بھی زیادہ سمجھدار ہے، میری باتیں غور سے سنتا ہے اور چند منٹ گزار کر بغیر چوں چراں کئے چلا جاتا ہے۔''

اس طرح کوئی پندرہ دن گزر گئے۔ پھر دوسرے اور تیسرے دن وہ رات بارہ کے قریب آتا، پندرہ منٹ مجھے یک ٹک دیکھتا رہتا اور پھر خاموشی سے چلا جاتا۔ اب میں اس کی وجہ سے دروازے کی کنڈی نہیں لگاتی تھی۔

سولہویں دن میں نے امی سے کہا۔ ''امی میں چاہتی ہوں کہ میں رات میں ایک گلاس دودھ پی لیا

کروں۔"

"ارے بیٹا!" میں تو ایک طویل عرصہ سے بول رہی ہوں کہ رات میں ایک گلاس دودھ پی لیا کرو، مگر تم ہو کہ میری بات پر کوئی دھیان ہی نہیں دیتی تھی، خیر یہ اللہ کا شکر ہے کہ میری بات تمہارے دماغ میں آ گئی۔ آج سے تم دودھ پینا شروع کر دو۔

"امی میرے حصے کا دودھ آپ کٹورے میں ڈال دینا، میں اپنے کمرے میں لے جا کر پی لیا کروں گی۔"

"چلو ایسا ہی ہوگا۔" امی نے کہا۔

"اس رات کٹورے میں دودھ ڈال کر میں کمرے میں لے گئی، کہ آج رات وہ آئے گا تو اسے دودھ ضرور پلاؤں گی، بے چارہ آتا ہے اور چلا جاتا ہے، ہوسکتا ہے کہ اسے بھوک لگی ہو۔

ٹھیک رات کے پونے بارہ بجے وہ کمرے میں آ گیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "میں تمہارے لئے آج دودھ لائی ہوں، یہ سارا دودھ تم پی لو اور دیکھو اب روزانہ آیا کرو، کیونکہ اب میں روزانہ تمہارے لئے دودھ رکھوں گی۔ دیکھو ناغہ نہ کرنا، ورنہ امی کی ڈانٹ مجھ پر پڑے گی کہ میں نے دودھ کیوں نہیں پیا اور مجھے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے میں نے کہا اور دودھ والا کٹورا اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور کٹورے میں اپنا منہ ڈال دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا دودھ پی گیا۔

اسے دیکھ کر ایک بات مجھے عجیب لگی۔ میں نے دیکھا تھا کہ بلیاں دودھ یا پانی پیتے وقت اپنی زبان استعمال کرتی ہیں، مگر وہ تو الگ طریقے سے دودھ پی رہا تھا۔ وہ زبان کے بجائے اپنا منہ دودھ میں ڈال کر دودھ پی گیا۔ پھر اچانک ایک خیال میرے دماغ میں آیا۔ "ہوسکتا ہے کچھ بلیاں اس طرح بھی دودھ پیتی ہوں۔" اور میں نے اپنے سر کو جھٹک دیا۔

دودھ پینے کے بعد پہلے کی طرح چھلانگ لگا کر بستر پر چڑھ آیا اور میرے سامنے بیٹھ کر مجھے بغور دیکھنے لگا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے سے اور قریب کر لیا اور اس کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ میں اس سے ہلکی آواز میں عجیب طرح کی باتیں بھی کرتی رہی، جیسے کہ وہ انسان ہو اور میری ساری باتیں سمجھ رہا ہو۔

خوشبو یہ باتیں کر رہی تھی کہ اس کے ابا حضور بولے۔ "حکیم وقار صاحب معاف کرنا، میں ذرا سامنے کی دکان سے سگریٹ لے کر آتا ہوں، آپ خوشبو بیٹی سے باتیں کریں۔" وہ پھر اپنی کرسی سے اٹھ کر باہر چلے گئے۔

خوشبو پھر دوبارہ گویا ہوئی۔ "اس رات بھی وہ پندرہ منٹ تک رہا اور پھر چھلانگ لگا کر بستر سے نیچے اترا اور خاموشی سے دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد میں اس کے متعلق سوچتی ہوئی، بستر پر لیٹ گئی اور تھوڑی دیر بعد میں سو گئی۔

اسی رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ وہی بچہ میرے کمرے میں آیا، میرے بستر پر چڑھ کر بیٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اچانک ایک بہت ہی خوب صورت نوجوان میں تبدیل ہو گیا، وہ اس قدر خوب صورت وجیہ تھا کہ میں اس کی وجاہت میں کھو گئی، مجھے اپنے ارد گرد کا کوئی ہوش نہ رہا، مجھے اس حالت میں دیکھ کر مسکرانے لگا اور پھر میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت ہی شیریں آواز میں گویا ہوا، خوشبو میں تم سے پیار کر بیٹھا ہوں، میرا ایک ایک پل تمہاری یادوں میں گزرنے لگا ہے، ایک نہ ایک دن میں تمہیں اپنی دنیا میں ضرور لے جاؤں گا۔ تمہاری خوبصورتی اور تمہارے حسن نے مجھے دیوانہ کر رکھ دیا ہے اور ہاں ایک بات اب میں روزانہ نہیں آؤں گا بلکہ ہر دوسری رات میں آؤں گا کیونکہ میری اپنی کچھ مجبوریاں ہیں، ویسے میرا دل تو چاہتا ہے کہ میں ایک لمحہ کے لئے بھی تم سے دور نہ جاؤں اور میں تمہیں بھی بتا دوں کہ جو بھی ہم دونوں کے ملاپ میں رکاوٹ بنے گا، میں اسے عبرت کا نشان بنا کے رکھ دوں گا، چاہے تمہارا کوئی قلبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ میں تمہاری چاہت میں قربان ہو سکتا ہوں تو کسی دوسرے کی جان بھی لے سکتا ہوں۔ اس کے بعد اس نے مجھے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا کہ اتنے میں میری آنکھ کھل گئی۔

بدحواسی کے عالم میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھی۔ "یا اللہ خیر کرنا، میں نے کیسا خواب دیکھا ہے۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں اٹھی اور فوراً پانی سے بھرا جگ منہ سے لگا لیا، میں اس قدر سہمی ہوئی اور گھبراہٹ میں تھی کہ مجھے یہ بھی ہوش نہ تھا کہ جگ سے گلاس میں پانی ڈال کر پیوں۔

میں لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ میری حالت بڑی غیر تھی۔ میں خاصی دیر تک گھبراہٹ کے عالم میں بستر پر بیٹھی رہی اور پھر دوبارہ لیٹ گئی۔ لیکن میرے دل و دماغ پر اس نوجوان کی خوبصورتی چھا چکی تھی۔ میں نے سوچا۔ "کیا کوئی اتنا خوبصورت بھی ہو سکتا ہے۔"

صبح کے وقت میں بیدار ہوئی تو میری حالت اندرونی طور پر ٹھیک نہیں تھی۔ میں رات میں دیکھے ہوئے خواب میں الجھی رہی۔ بار بار میرے دماغ میں یہی بات گھومتی رہی کہ "میں تم پر قربان ہو سکتا ہوں تو کسی اور نے رکاوٹ ڈالی تو اس کی جان بھی لے سکتا ہوں۔"

رات آئی میں دودھ لے کر اوپر اپنے کمرے میں آ گئی اور پھر اس بچے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی۔ کافی انتظار کے باوجود بھی نہیں آیا۔ میں سوچوں میں ڈوبنے لگی اور خواب والی باتیں یاد آنے لگیں، ایک تو اس بچے کا انسان بننا اور پھر یہ کہنا کہ "میں روزانہ نہیں آ سکتا۔ میری کچھ مجبوریاں ہیں۔" اس رات مجھے نیند نہیں آ کے دے رہی تھی، خواب کی تمام باتیں دماغ پر ہتھوڑے برساتی رہیں، اور پھر نہ جانے میں کب نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

صبح کے وقت امی نے مجھے دروازہ کھٹکھٹا کر اٹھایا میں نے دروازہ کھولا تو میری شکل دیکھ کر امی فوراً بولیں۔ "خوشبو خیریت تو ہے؟ آج تم اس وقت تک سوتی رہیں، طبیعت تو ٹھیک ہے ناں، اور یہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا، یہ تو بہت سرخ ہو رہی ہیں۔ اور کٹورے میں یہ دودھ پڑا ہوا ہے۔ تمہیں دودھ پینا بھی یاد نہ رہا۔"

"امی، میرے سر میں بہت درد ہو رہا تھا، اسی وجہ سے کافی دیر تک نیند نہیں آئی، ابھی نہا لوں گی۔ تو طبیعت فریش ہو جائے گی، اسی وجہ سے مجھے دودھ پینا بھی یاد نہ رہا۔

میں امی کے ساتھ نیچے آ گئی اور غسل خانے میں گھس گئی، ٹھنڈے ٹھنڈے پانی نے بہت اچھا اثر ڈالا، میں کافی دیر تک نہاتی رہی۔ جب میں غسل خانے سے نکلی تو میری طبیعت بہت بہتر ہو چکی تھی۔ میں نے ناشتہ کیا اور گھر کے کاموں میں لگ گئی۔

رات ہوئی تو میں نے کٹورے میں دودھ لیا اور کمرے میں آ گئی۔ ٹھیک رات کے بارہ بجے وہ بلی کا بچہ اچانک کمرے میں آیا۔ میاؤں...... میاؤں...... بولا تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور فوراً...... دودھ کا کٹورا اس کے سامنے کر دیا۔ جلدی سے اس نے دودھ پی لیا اور میں اسے بغور دیکھ ہی رہی تھی کہ چھلانگ لگا کر بستر پر چڑھ گیا۔

اور پھر تقریباً دو ہفتے تک اس کا اس طرح ایک رات آنا اور دوسری رات نہ آنا رہا...... مجھے خواب کی بات یاد آئی کہ "میں روزانہ نہیں آ سکتا۔"

جس رات اس کے نہ آنے کا ہوتا، اس رات میں دودھ نیچے ہی پی لیا کرتی تھی، کئی دفعہ امی نے ٹوکا بھی کہ "خوشبو یہ تم نے کیا بنا رکھا ہے، ایک رات دودھ اوپر لے جاتی اور پھر ایک رات نیچے ہی پی لیتی ہو۔"

"ارے امی! ایسی کوئی خاص بات نہیں، بس یاد آ جاتا ہے تو پی لیتی ہوں، اور جب زیادہ دیر سے پینے کا دل کرتا ہے تو اوپر لے کر چلی جاتی ہوں۔

ایک رات میری طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ وہ رات اس کے آنے والی نہیں تھی۔ درد کی وجہ سے میرا سر پھٹتا جا رہا تھا، میں بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہی، کمرے میں روشنی نہیں تھی۔ میں غنودگی کی حالت میں تھی۔ لیکن میرے منہ سے نکلا۔ "اوہ! یہ درد تو میری جان لے کر رہے گا۔" اتنے میں، میں نے محسوس کیا کہ ایک ہاتھ میرے ماتھے پر آ کر ٹک گیا۔ اس ہاتھ کا لمس اتنا سکون بخش تھا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ ہولے ہولے اور آہستہ آہستہ میرا سر دبایا جائے گا۔ اس سے مجھے بہت

سکون ملے گا۔ لیکن میری آنکھیں بدستور بند ہی رہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی میں اپنی آنکھیں نہ کھول سکی۔ سر دبانے والا کب تک میرا سر دباتا رہا۔ مجھے یاد نہیں، مجھے اتنا سکون ملا تھا کہ میری آنکھ لگ گئی اور میں آرام و سکون سے سوگئی۔

میں گہری نیند میں تھی میں نے خواب دیکھا کہ وہی نوجوان میرا سر دبا رہا ہے، سر دباتے دباتے گویا ہوا۔ ''خوشبو تمہارے سر میں درد ہے اور میری حالت ایسی ہورہی ہے کہ جیسے پانی کے بغیر مچھلی۔ میرا اب تم سے جدا رہنا ممکن نہیں۔''

میرے منہ سے نکلا۔ ''آپ ہیں کون، میں نے تو کبھی آپ کو دیکھا نہیں، اور اچانک مجھ سے یہ اپنائیت کیا معنی رکھتی ہے، اگر آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں تو ہمارے گھر اپنے گھر والوں کو بھیج دیں۔''

میری بات سن کر اس کے چہرے پر ایک لمحہ کے لئے اداسی چھا گئی پھر وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''خوشبو تمہارے گھر والے ہماری بات کسی صورت نہیں مانیں گے۔ خیر میں کوشش ضرور کروں گا اور ہاں یاد آیا۔ کل تم سارے گھر والے اپنے ماموں کے گھر جارہے ہو اور تین دن تک وہیں رہو گے لہٰذا میں تین دن نہیں آؤں گا۔ تمہاری جدائی مجھے بے چین رکھے گی، خیر برداشت تو کرنی ہے۔ اب تمہارے سر کا درد ٹھیک ہوگیا ہے۔ اب تم آرام سے سوتی رہو، میں چلتا ہوں، اب میرا وقت باہر رہنے کا نہیں رہا۔'' یہ بول کر وہ اٹھا اور پھر اچانک نہ جانے کیسے غائب ہوگیا۔

صبح ساڑھے آٹھ بجے میری آنکھ کھلی امی کی آواز پر، میں نے گھڑی میں وقت دیکھا تو ہڑبڑا کر نیچے کی جانب بھاگی۔ امی کی مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بولیں۔ ''خوشبو میں آج کل تمہیں بغور دیکھ رہی ہوں کہ تم وقت کی پابندی سے جی چرا رہی ہو، اور یہ کیوں ہورہا ہے میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ صبح کے وقت تم نے وقت پر اٹھنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ آئے دن تمہارے سر کو کیا ہوگیا ہے کہ جب دیکھو سر میں درد لئے بیٹھی ہو، کیا تم نے سوچوں کے ساتھ سمجھوتا کرلیا ہے، جب آدمی کچھ زیادہ سوچنے لگتا ہے تو سر درد اس کے پاس منڈلانے لگتا ہے۔ میں حکیم صاحب کو بلا لیتی ہوں۔ تم ان سے مشورہ کرو۔

خیر یہ تو ہوگا واپسی پر۔ تمہارے ماموں کا فون آیا تھا۔ گاڑی بھیج رہے ہیں، تم اپنی تیاری کرلو، ماموں کے گھر جانا ہے اور تین دن کے لئے کپڑے بھی ساتھ لے لینا۔ تین دن وہیں رہنا ہے، بول رہے تھے کہ باجی کئی ماہ ہوگئے آپ آئیں نہیں۔ میں گاڑی بھیج رہا ہوں، آج ہر صورت آپ نے بچوں سمیت آنا ہے اور دولہا بھائی کو ضرور لے آیئے گا، تمہارے ابا راضی ہوگئے ہیں، یہ بھی اللہ کا شکر ہے، تم منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کرو اور پھر تیاری۔'' امی نے یہ کہا اور میں منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں جا گھسی۔

میں حیران تھی کہ ماموں کے گھر جانے کی خبر تو مجھے خواب میں نظر آگئی تھی۔ اور وہ ہے کون جس نے خواب میں مجھے اس بات کی خبر دی۔ میں نے اس بات پر بہت سوچا۔ خیر اپنے سر کو جھٹکا اور خود سے بولی۔

''جو ہوگا دیکھا جائے گا۔''

ہم سارے گھر والے ماموں کے گھر پہنچ گئے، ماموں اور ان کے بچے ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے، ممانی نے پہلے ہی سے پلاؤ کا اہتمام کر رکھا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہم نے کھایا۔ گپ شپ کرتے کرتے رات ہوئی، رات کا کھانا کھایا اور سب اپنے اپنے بستروں پر جاکر لیٹ گئے۔

بستر پر لیٹتے ہی مجھے بلی کے بچے کا خیال آیا۔ ''اگر وہ آئے گا تو......'' پھر مجھے اچانک اس نوجوان جو کہ اکثر میرے خواب میں آتا تھا بلی کے بچے سے اچانک آدمی بن جانا، اور پھر اس کی باتیں، مجھے ہلاک کرنے لگیں...... خیر کروٹیں بدلتے بدلتے مجھے نیند آہی گئی۔

ہم تین دن ماموں کے گھر رہے اور چوتھے روز ہم اپنے گھر آگئے، ان تین راتوں میں بھی وہ متواتر میرے خواب میں آتا رہا، چوتھے دن ہمیں گھر آکر

سکون ملا کیونکہ جو آرام سکون اپنے گھر میں ملتا ہے، وہ کسی اور غیر جگہ نہیں۔

اس رات بھی وہ خواب میں آیا۔ وہ میرے بہت قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ آج وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہورہا تھا بولا۔ ''خوشبو، میں تمہیں ہر حال میں اپنی دنیا میں لے جاؤں گا، چاہے مجھے آگ کے دریا سے گزرنا ہی کیوں نہ پڑے۔'' کافی دیر تک وہ بیٹھا اسی قسم کی باتیں کرتا رہا۔

اب میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ ذہنی طور پر خواب میں اس سے کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہونے لگی تھی کہ کاش وہ مجسم میرے قریب آجائے اور مجھ سے دل لگی کی باتیں کرے۔ اس سلسلے کو چلتے ہوئے تقریباً چھ ماہ ہوچکے تھے۔ وہ متواتر ہر روز بلاناغہ خواب میں آتا۔ وہ اتنا بے تکلف ہوچکا تھا کہ مجھ سے چھیڑ چھاڑ بھی کرنے لگا تھا۔

میں دن بھر اس کے خیالوں میں مگن رہنے لگی تھی، اس کی خوب صورتی، مردانہ وجاہت نے مجھے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ کبھی کبھی تو میں ان خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کرتی مگر میں کہیں اس سے زیادہ ان خیالات میں جکڑتی چلی گئی۔

پھر ایک وقت آیا کہ میں اس کی قربت کے لئے بے چین رہنے لگی۔ دن بڑی بے چینی میں کٹتا اور رات ہوتے ہی میں کوشش کرنے لگتی کہ مجھے جلدی سے نیند آجائے تاکہ وہ مجھے خواب میں نظر آئے۔ میں جیسے اس کی جدائی میں حال سے بے حال رہنے لگی۔ ہر وقت دل چاہتا کہ کاش! وہ حقیقت میں میرے سامنے آجائے۔ کافی دنوں سے اب وہ بلی کا بچہ بھی غائب تھا۔

ایک دن میں صبح ہی سے بے چین تھی، مجھے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا، تمام باتوں کو سوچتے سوچتے میرے سر میں شدید درد ہونے لگا، اسی حالت میں رات ہوگئی، کھانا کھانے کو دل نہیں چاہتا تھا مگر پھر امی کی باتوں سے بچنے کے لئے دو چار لقمے زبردستی کھانا پڑا۔ میں خود کو بہلانے کے لئے نیچے امی اور بہنوں کے پاس گپ شپ میں لگی رہی اور اس طرح رات کے ساڑھے دس بج گئے۔ تو میں نے امی سے کہا۔ ''اچھا اب میں سونے کے لئے جارہی ہوں۔'' میں نے شب بخیر کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر کمرے میں آگئی۔

کمرے میں آکر میں بستر پر لیٹ گئی، لیکن چین کہاں تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گئی اور پھر اس طرح اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہوئے رات کے بارہ بج گئے۔ بستر پر بیٹھی میں اپنی سوچوں میں جیسے مدہوش تھی کہ اچانک آواز سنی۔ ''خوشبو۔''

بستر کے سامنے جو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہی نوجوان مجسم کھڑا تھا۔ میں اس قدر بدحواس تھی کہ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ جھٹ بستر سے اٹھی اور آناً فاناً اس کے گلے سے لگ گئی، میں بالکل دیوانی ہورہی تھی، میں جیسے اپنے حواس میں نہیں تھی۔ اس نے بھی مجھے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

چند منٹ تک میں اسی طرح اس کے گلے سے لگی رہی کہ پھر جیسے اچانک مجھے ہوش آگیا اور میں جھٹ سے اس سے الگ ہوکر کھڑی ہوگئی۔

میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں، میرے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں، بدحواسی کے عالم میں، میں اسے یک ٹک دیکھے جارہی تھی، میرے حلق میں کانٹے سے چبھنے لگے تھے، میں سہمی ہوئی تھی اور مجھ پر کپکپی طاری ہوچکی تھی، میری زبان گنگ تھی اور کوشش کے باوجود بھی میرے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی، میری اندرونی اور بیرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تو میں جیسے چونک گئی اور لرزتے قدموں سے پیچھے کی جانب ہٹنے لگی اور پھر دھڑام سے بستر پر جیسے گر گئی۔

وہ آگے بڑھا اور پھر سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا تو میں نے جھٹ سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور میں جیسے ہوش میں آگئی۔ ''آپ! کون ہیں، اور میرے کمرے میں کیسے آئے؟''

''خوشبو! گھبراؤ نہیں، میری بات سنو! میں وہ

ہوں جسے تم خواب میں دیکھتی رہی ہو۔"

"آپ آئے کیسے، اگر کسی کی نظر پڑگئی تو میں زندہ درگور ہوجاؤں گی اور یہ دروازہ بھی تو بند ہے، پھر آپ......؟"

"ارے میری بات تو سنو! میں بتا تو رہا ہوں۔ دراصل میں ایک عمل پڑھتا ہوں تو، غائب ہوکر جہاں چاہوں جاسکتا ہوں بلا روک ٹوک اور مجھ پر کسی کی نظر نہیں پڑسکتی۔ لیکن میں صرف اسے ہی نظر آسکتا ہوں جو میرے دل دماغ میں ہو، اس کے علاوہ کوئی دوسرا مجھے بالکل بھی نہیں دیکھ سکتا۔ تم گھبراؤ نہیں، تمہارے علاوہ میں کسی......" اور اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کیونکہ میں درمیان میں بول پڑی۔

"لیکن یہ تو سراسر غلط ہے کہ میں کسی نامحرم کے ساتھ وقت گزاری کروں۔ کوئی تنہائی میں مجھ سے باتیں کرے، میں تو اسے اچھا نہیں سمجھتی، آپ برائے مہربانی چلے جائیں۔ میری خوشی اور میری عزت کی خاطر۔"

میری باتیں سن کر وہ چند لمحہ کچھ سوچتا رہا کہ پھر اچانک اس کی آنکھوں سے کچھ شعاعیں نکلیں اور میری آنکھوں کے ذریعے میرے دماغ میں سماتی چلی گئیں۔ اس کے بعد میرا دماغ میرے قابو میں نہ رہا۔ میرا تمام ڈر وخوف بالکل ختم ہوگیا، اور میں اس کے ساتھ گھل مل کر باتیں کرتی رہی۔ میں کب سوئی یہ بھی مجھے یاد نہ رہا۔

صبح کے وقت میں نو بجے سو کر اٹھی تو امی کا پارہ بہت چڑھا ہوا تھا۔ ان کی زبان نہ جانے کیا کیا اگلتی رہی لیکن میں نے ان کی سنی ان سنی کردی۔ ابا حضور درمیان میں آگئے اور بولے۔ "بیگم تم خواہ مخواہ اسے ڈانٹ رہی ہو، مجھے لگتا ہے اس کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں، یہ میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں، میں حکیم صاحب کو بلوا لیتا ہوں، حکیم صاحب دوا دیں گے، یہ ٹھیک ہوجائے گی۔"

اماحضور کی باتیں سن کر میں خاموش ہوگئیں۔

کچھ سوچتی رہی پھر بولیں۔ "خوشبو! پھر بھی میرا یہ کہنا ہے کہ تم اپنے دل ودماغ کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرو! لگتا ہے کہ آج کل تم رات میں مسلسل جاگتی رہتی ہو، بہرحال حکیم صاحب آجائیں تو ان سے اپنی تکلیف بیان کرنا، اب جاؤ اور جاکر منہ ہاتھ دھولو اور ناشتہ کرو۔"

خیر دو گھنٹے بعد حکیم صاحب آگئے۔ انہوں نے حال احوال پوچھا، تو میں نے انہیں بتایا کہ "آج کل مجھے رات میں نیند بہت کم آرہی ہے۔"

حکیم صاحب نے آرام سکون کی دوا دی اور چلے گئے۔ ابا حضور سے کہا کہ "ویسے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چند دن میں ٹھیک ہوجائیں گی، میں نے دوا دے دی ہے۔"

اس کے بعد یہ معمول بن گیا ہے کہ وہ روزانہ بلا ناغہ رات میں آنے لگا اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ ہم دونوں بے تکلف ہوتے چلے گئے۔ اس کی چھیڑ چھاڑ بڑھتی ہی رہی۔

میرا دن کا وقت اسی کی جدائی میں پہاڑ معلوم ہونے لگا۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایک پل کے لئے بھی وہ میری نظروں سے اوجھل ہو۔

اسی طرح مزید تین ماہ گزر گئے اور پھر ایک رات اس نے اپنی حقیقت مجھ پر عیاں کردی۔

"خوشبو! میرا تعلق دراصل قوم جنات سے ہے۔ میرا نام روشاک ہے۔" میں نے پہلی مرتبہ تمہیں چھت پر دیکھا اور تمہارا دیوانہ ہوگیا۔ یہ سن کر میں اندرونی طور پر سہم گئی۔ لیکن میں اس کی چاہت میں بہت دور تک نکل چکی تھی۔ میں اس کی جدائی کسی صورت برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

لیکن وہ جمعہ کی رات میں نہیں آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ "دراصل جمعہ کے دن اور رات میں میں اپنے قبیلہ سے باہر نہیں نکلتا، یہ میرے والد کی مجھ پر پابندی ہے کیونکہ جمعہ کی رات میں ہمارے قبیلہ میں کسی نہ کسی تقریب کا اہتمام ہوتا ہے، ہمارا تعلق مسلمان جنات سے ہے۔ زیادہ تر جمعہ کی رات ہمارے قبیلہ میں محفل منعقد ہوتی ہے، جس میں دین کے متعلق باتیں ہوتی ہیں اور پھر جب رات میں آتا ہوں تو وہ بھی چھپ چھپا کر، ایک وقت مقررہ پر میں اپنے کمرے میں جاکر لیٹ جاتا ہوں اندر سے دروازہ بند کرلیتا ہوں، گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ میں سو رہا ہوں مگر میں ان کی نظر بچا کر تمہارے پاس آجاتا ہوں۔"

ایک دن وہ کہنے لگا۔ "خوشبو! میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد تمہیں میں اپنی دنیا میں لے جاؤں، لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ یہ ممکن نہیں۔ میرے والد صاحب قبیلہ کے سردار ہیں، ان کا اصول بہت پکا ہے، اگر کوئی اصول توڑتا ہے تو اسے بہت سخت سزا ملتی ہے، لیکن میں تمہاری چاہت میں ہر سزا کو بھگت لوں گا۔ اگر میری جان بھی چلی جائے تو کوئی پرواہ نہیں۔

لیکن تمہارے کسی گھر والے نے راہ میں رکاوٹ ڈالی تو میں اس کی جان لینے میں بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اور اگر مجھے تمہارے تمام گھر والوں کی جان بھی لینی پڑی تو میں بالکل بھی نہیں ہچکچاؤں گا، میں تمام رکاوٹیں گرادوں گا، اگر تم میری نہیں ہوگی تو میں تمہیں کسی اور کی بھی نہیں ہونے دوں گی۔ یہ میرا آخری اور اٹل فیصلہ ہے۔

اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم اپنے گھر والوں کے لئے کیا قدم اٹھاسکتی ہو۔ تمہارے بھائی بہن والد اور والدہ تمہاری مٹھی میں ہیں یعنی تم چاہو گی تو وہ زندہ رہیں گے۔ تم میری باتوں پر عمل کرتی رہو گی تو ان سب کی زندگی باقی رہے گی، ورنہ......" اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اس مسئلے کو کوئی دو سال کا عرصہ ہوچکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ راز میرے گھر والوں پر بھی عیاں ہوگیا کہ میں ایک جن زادے کے چنگل میں پھنس چکی ہوں۔

کئی مرتبہ ابا حضور نے خفیہ طریقے سے کئی عامل حضرات سے مل کر کچھ کرانے کی کوشش کی، کئی عامل نے تو اس مسئلے میں ہاتھ ڈالنے سے معذرت کرلی۔

دو عامل حضرات کی پر اسرار طور پر موت واقع ہوگئی۔ یہ دیکھتے ہوئے ایک دن اس نے ابا حضور کے سامنے ظاہر ہوکر وارننگ دے دی کہ "اب اگر آئندہ کسی عامل سے رابطہ کیا تو میں تمہاری گردن مروڑ دوں گا اور ساتھ ہی سارے گھر والے بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

حکیم صاحب! بس یہ سمجھ لیں کہ اگر میں اب زندہ ہوں تو صرف اور صرف اپنے گھر والوں کی خاطر، میں کئی مرتبہ خودکشی کے متعلق بھی سوچ چکی ہوں، مگر میرے گھر والوں کا چہرہ میرے سامنے گھومنے لگتا ہے۔ میرے چکر میں میری بہنوں کی عمریں بھی زیادہ ہورہی ہیں۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا رشتہ کے لئے آ بھی جاتا ہے تو پھر دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔

اب تو ہمارے حالات کا علم دوسروں کو بھی ہوچکا ہے۔ ضروریات زندگی کے لئے جتنی رقم کی ضرورت ہوتی ہے وہ لاکر دیتا ہے، اور یہ بھی حکم کرتا ہے کہ یہ رقم رکھیں ورنہ......"

لہٰذا عزت آبرو اور گھر والوں کی زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے ابا حضور وہ رقم لے لیتے ہیں۔ یہ سوچ کر کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غصہ میں کوئی انتہائی قدم اٹھا بیٹھے۔

خوشبو کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

رولوکا نے اسے تسلی دی۔ "بیٹی تم گھبراؤ نہیں، اوپر والے نے چاہا تو بہت جلد تم لوگوں کی جان اس سے چھوٹ جائے گی۔ جو ہونا تھا وہ تو اب تک ہوچکا۔ اس سے تم لوگوں کی جان چھڑانے کی میں بھرپور کوشش کروں گا۔ خاص کر تم بالکل نہ گھبراؤ، ویسے میں یہاں تک کردوں گا کہ تمہاری میرے پاس آمد کے بارے میں اسے قطعی خبر نہ ہونے پائے۔ تم آرام سکون سے گھر جاؤ۔

اور یہ لو تمہارے ابا حضور بھی آگئے۔ رولوکا بولا۔

"ارے جناب! آپ کہاں چلے گئے تھے سگریٹ لینے کے لئے!"

"حکیم صاحب! زیادہ دور تو نہیں گیا تھا بلکہ باہر بیٹھا ہوا سگریٹ کا کش لیتے ہوئے حالات وواقعات کی گتھیوں میں الجھ گیا تھا۔ بس آپ یہ سمجھ لیں کہ میں اندرونی طور پر ایک زندہ لاش بن کر رہ گیا ہوں، اس سے زیادہ میرے پاس الفاظ نہیں۔

میں بہت امید اور آس لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کی شہرت کوئی چھپی ہوئی نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حوصلہ دے، ہمت دے اور آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے تاکہ آپ دکھی لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ امید ہے خوشبو بیٹی نے ساری پریشانیوں کا تذکرہ کردیا ہوگا۔"

"جی انہوں نے ساری بات بتادی ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اپنے گھر والوں کا پتہ اس کاغذ پر لکھ دیں۔ بس آپ کا کام ختم، آپ بالکل بے فکر ہوکر جائیں، رہا مسئلہ تو اسے میں دیکھ لوں گا۔ بہت جلد آپ لوگوں کو خوشخبری ملے گی۔" رولوکا نے کہا۔

خوشبو کے والد بولے۔ "حکیم صاحب! آپ کی بہت بہت مہربانی، اس میں جو بھی خرچ ہوگا، میں دینے کے لئے تیار ہوں، آپ بلا جھجک حکم کریں۔ ویسے میں تاحیات آپ کے حق میں دعا گو رہوں گا اور میں اپنی آنے والی نسلوں کو بھی ہدایت کر جاؤں گا کہ وہ آپ کے لئے دعا کرتے رہیں۔"

"جناب کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں اور نہ ہی کوئی خرچ وغیرہ ہوگا، بس آپ لوگ دعاؤں میں یاد کرلیا کیجئے گا، یہی میری خوشی ہے۔" رولوکا بولا۔

"حکیم صاحب! اب ہم چلتے ہیں، میں آپ کی آمد کا شدت سے انتظار کروں گا، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس جن کو پتہ لگ جائے کہ ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔" خوشبو کے والد بولے۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں! اس کم بخت کو اس کی ہوا تک نہیں لگے گی، آپ کسی قسم کی فکر نہ کریں، اپنے دل و دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہ رکھیں، آپ خوشی خوشی جائیں۔" رولوکا نے کہا۔

خوشبو اور خوشبو کے ابا حضور تانگے میں بیٹھے اور اپنے گاؤں روانہ ہوگئے۔

ہفتے کا دن گزر گیا۔ رات آئی، رولوکا اپنے کمرے میں موجود تھا۔ رات کے ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے رولوکا نے خوشبو کے گاؤں کا تصور کیا اور غائبانہ طریقے سے خوشبو کے کمرے میں پہنچ گیا، وہ غائب حالت میں کمرے میں موجود تھا۔

رات پونے بارہ کا وقت ہوگا کہ اچانک کمرے میں وہ جن نمودار ہوا۔ خوشبو اپنے بستر پر بیٹھی اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی وہ بولی۔ "آپ آگئے۔"

"ارے بڑی مشکل سے آیا ہوں، آج والد صاحب نے مجھے اپنے پاس بیٹھا رکھا تھا اور باتوں میں مصروف تھے کہ میں نے نیند کا بہانہ کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا اور پھر اب تمہارے سامنے موجود ہوں۔

لیکن پتہ نہیں آج مجھے تمہارے کمرے میں کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے علاوہ بھی کوئی تیسرا فرد اس کمرے میں موجود ہے۔" اور اس نے اپنی نظریں کمرے کے چاروں طرف دوڑانی شروع کردیں۔ وہ چاروں طرف دیکھتا رہا، پھر اچانک اس کی آنکھوں سے شعاعیں نکلنے لگیں اور وہ شعاعیں کمرے میں چاروں طرف گردش کرنے لگیں، چند لمحے بعد ہی وہ شعاعیں ختم ہوگئیں۔

شعاعوں کو دیکھ کر خوشبو بولی۔ "یہ آپ نے کیا کیا اور یہ شعاعیں کیسی تھیں؟" دراصل خوشبو اندرونی طور پر سہم گئی تھی کیونکہ وہ اور اس کے ابا حضور کل دن میں رولوکا سے مل کر آئے تھے، اس کے دل میں آیا کہ کہیں یہ معلوم تو نہیں کر رہا تھا اور اگر اسے معلوم ہوگیا تو نہ جانے یہ کیا کر بیٹھے۔"

"دراصل میں اپنی تسلی کر رہا تھا کہ کوئی غائبانہ طور پر اس کمرے میں موجود تو نہیں۔ مگر مجھے شک تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو یہ شعاعیں اسے جلا کر خاکستر کردیتیں۔ یہ شعاعیں ایسی طاقتور ہیں کہ خفیہ اور مخفی چیزوں پر بھی حاوی ہوکر اسے نیست و نابود کردیتی ہیں مگر ابھی بھی میرا شک دور نہیں ہوا، مجھے لگ رہا ہے کہ کوئی موجود ہے اور میری نگرانی کر رہا ہے۔" وہ جن بولا۔

(جاری ہے)

ہولناک رات

عصمت پروین۔ کراچی

گھٹاٹوپ اندھیرا پورے قبرستان پر مسلط تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا کہ اچانک روشنی نظر آئی، کئی عورتیں طباق میں مٹھائی لئے ایک طرف کو جارہی تھیں کہ پھر اچانک ایک دلخراش اور دل گرفتہ منظر ابھرا۔

خوف اور ڈر کے لبادے میں پوشیدہ اچنبھے میں ڈالتی حقیقت پر مبنی ناقابل فراموش داستان

یہ کوئی فرضی کہانی یا من گھڑت داستان نہیں ہے بلکہ میری خوش دامن صاحبہ پر بیتا ہوا سچا واقعہ ہے۔ اللہ بخشے وہ بہت عبادت گزار خاتون تھیں۔ عربی اور فارسی پر عبور رکھتی تھیں۔ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کر چکی تھیں گو انہیں دنیا سے کنارہ کشی کئے ہوئے کئی سال گزر چکے ہیں لیکن ان کی زبان سے بارہا سنی ہوئی اس داستان کا ایک ایک لفظ پتھر پر کھدے ہوئے نقوش کی مانند آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ میں اس سچے واقعے کو انہی کی زبان میں پیش کر رہی ہوں۔

یہ واقعہ 1946ء میں پیش آیا تھا، جب ہندوستان کے مسلمانوں میں پاکستان کا مطالبہ زور پکڑ گیا تھا۔ کونے کونے میں ہندو مسلم فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی کہ بدقسمتی سے ہمارا ہنستا بستا گھرانہ بھی اسی آگ کی لپیٹ میں آ گیا۔

ہم لوگوں کا تعلق تو یو۔ پی کے شہر سے تھا لیکن میرے شوہر ملازمت کے سلسلے میں ایک چھوٹے سے مسلم ریاست تانپارہ میں آ کر آباد ہوگئے تھے۔ میں شادی ہو کر آئی تو سسرالی عزیزوں میں ایک بیاہی نند اور ایک کم سن دیور کے علاوہ کوئی نہ تھا۔

ساس سسر اس جہان فانی سے رخصت ہو چکے تھے۔ میں نے ہی اس کی اولاد کی طرح پرورش کی۔ انگریزی تعلیم کے ساتھ دینی مذہبی علوم کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ خود علیم الحق کا بھی شروع سے ہی مذہب کی طرف جھکاؤ تھا۔ بارہ سال کی عمر میں کلام پاک حفظ کر چکے تھے اور پانچوں وقت کی نماز مسجد میں باجماعت ادا کرتے تھے۔ علیم الحق کی شادی میں نے اپنی حقیقی چھوٹی بہن سے

کرادی تو بچپن کا یہ تعلق اور بھی مضبوط ہوگیا۔

ضلع بہرائچ تانپارہ سے دو اسٹیشن آگے یو۔ پی کا ایک ضلع ہے جو سید سالار مسعود غازی جیسے بزرگ کی نسبت سے کافی مشہور ہے، علیم الحق نے اپنی شادی کے بعد وہاں سائیکلوں کی دکان کھول لی تھی۔ اور پھر بہرائچ ہی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ لیکن جب دلوں میں فاصلے نہ ہوں تو دو اسٹیشن کی دوریاں کیا اہمیت رکھتی کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا جب ہم لوگ ایک دوسرے سے نہ ملتے کبھی تو دو چکر بھی لگ جاتے۔

انہی دنوں علیم الحق کو سائیکلوں کی بلٹی چھڑانے کے لئے کولکتہ جانا پڑ گیا۔ کولکتہ سے ان دنوں فسادات کی خبریں متواتر آرہی تھیں۔ ہمارا جی ہول رہا تھا، اور سب ہی ان کے جانے کی مخالفت کر رہے تھے۔ مگر جن کا خدا پر پختہ یقین ہو انہیں اپنے ارادوں سے کوئی باز نہیں رکھ سکتا، وہ یہ کہہ کر روانہ ہوگئے۔ "اگر نصیب میں شہادت کی موت لکھی ہے تو اسے کون ٹال سکتا ہے۔" علیم الحق کے جانے کے بعد ہم لوگوں کو ایک انجانے خوف نے گھیر لیا۔ اس زمانے میں فون کی بھی سہولت عام نہیں تھی۔ جو ان کے خیریت سے پہنچنے کی فوراً اطلاع مل جاتی۔ بس زبان پر ہر لمحہ ان کی خیریت کی دعائیں رہتیں۔ اور اس کے علاوہ ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔

ایک ڈیڑھ ہفتہ گزرنے پر ان کا مختصر سا خط ملا جس نے ہمارے دلوں کو اطمینان بخشنے کے بجائے تشویش میں اضافہ کر دیا تھا لکھا تھا۔

"یہاں کے حالات انتہائی خراب ہیں۔ سڑکیں شہیدوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہیں۔ جابجا انسانی اعضاء بکھرے نظر آتے ہیں۔ میں جب سے آیا ہوں ہوٹل میں قید ہو کر رہ گیا ہوں۔ دعا کریں کہ خیریت کے ساتھ اپنا کام نمٹا کر واپس آجاؤں۔"

یہ ان کا پہلا اور آخری خط تھا۔ اس کے بعد تو نہ کوئی خیر تھی نہ خبر۔ ہمارے دلوں کا تو خدا حافظ تھا ہر وقت ایک دھڑکا لگا ہوا تھا۔ ہر آہٹ پر کان کھڑے ہو جاتے۔ آنکھیں دروازے میں گڑی رہتیں۔ ایسا لگتا تھا کہ دعائیں بھی بے اثر ہو چکی تھیں۔

آخر میرے شوہر سے نہ رہا گیا۔ بھائی کی محبت نے خون میں ایسا جوش مارا کہ خود بھی اس جلتی آگ میں جا کر کود پڑے کولکتہ پہنچ کر انہوں نے بڑے محتاط طریقے سے علیم الحق کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ شہر کا چپہ چپہ کھنگال ڈالا۔ بڑے چھوٹے سارے ہوٹلوں میں دیکھ ڈالا۔ اسپتالوں میں جا کر ڈھونڈا دینی مدارس اور فلاحی اداروں سے رابطہ قائم کیا۔ ریڈیوں پر اعلانات کرائے اخبارات میں اشتہار دلوائے غرض اپنی طرف سے کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ مگر سوائے ناکامی کے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا اور ایک ماہ بعد وہ مایوس چہرہ لئے تھکے تھکے شکستہ قدموں سے گھر واپس آگئے۔

ان کے آتے ہی گھر پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ امید کی رہی سہی کرن نے بھی دم توڑ دیا۔ ہر آنکھ صدمے سے اشک بار اور ہر چہرہ سوگوار دکھائی دے رہا تھا۔ میری بوڑھی والدہ جوان بیٹی کے دکھ پر الگ نڈھال تھیں۔ بہن کی حالت تو دیوانوں سے بھی بدتر تھی پہروں گم صم بیٹھی آسمان پر نظریں جمائے نہ جانے کیا کھوجتی رہتی۔ نہ کھانے پینے کا ہوش رہا تھا نہ تن بدن کی سدھ اگر خدا نے مجھے ہمت و استقلال کی لازوال دولت نہ بخشی ہوتی تو نہ جانے ان سب کا کیا حشر ہوتا۔

میری دس سالہ بھانجی جب اپنے تائے ابو کا بازو پکڑ کر سوال کرتی کہ "آپ تو میرے ابو کو لینے گئے تھے اکیلے کیوں چلے آئے۔"

اس وقت تو میرے حوصلوں کی دیواریں بھی لرزنے لگتیں۔ اور میرے شوہر کا رنگ اڑ جاتا، وہ اپنی آنکھوں کے آنسو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیتے۔

ایک روز ہمارے پیر صاحب بھی گنج مراد آباد سے تشریف لے آئے انہیں بھی علیم الحق کی گمشدگی کا دلی صدمہ تھا۔ انہیں دیکھتے ہی میرے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ گیا۔ پیر صاحب کچھ دیر کے لئے مراقبہ میں چلے گئے اور پھر سر اٹھا کر مجھے ایک چراغ دیتے ہوئے فرمایا۔

"بارہ بجے رات کے بعد کوئی بھی مرد یا عورت تنہا قبرستان جا کر سب سے اونچی قبر کے اوپر یہ چراغ جلادے اگر یہ چراغ کچھ دیر تک بھی جلتا رہے تو امید کا دامن ہاتھ

سے نہ چھوڑنا۔ لیکن اگر کسی وجہ سے چراغ نہ جل سکے یا جلتے ہی بجھ جائے تو پھر......" وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئے۔

ان کا مطلب بہت واضح تھا مگر اندھیرے میں امید کی یہ مدہم سی کرن بھی بڑی غنیمت تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ چراغ جلانے والے کو کہاں سے تلاش کیا جائے تانپارہ میں ایک ہی قبرستان تھا اور وہ بھی آبادی سے کافی دور تھا۔ اس کے آگے نیپال کے گھنے جنگل شروع ہو جاتے تھے۔ رات تو رات وہاں تو دن کے وقت جاتے لوگ خوف کھاتے تھے۔ میرے شوہر کی چھٹی ختم ہو چکی تھی اور وہ ان دنوں کسی دیہات کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ لے دے کر مردوں میں دکان کا ایک نوکر تھا مگر وہ اس قدر بزدل اور ڈرپوک شخص تھا کہ اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی کسی کو کیا پڑی تھی کہ دوسروں کی خاطر جان جوکھم میں ڈالتا۔

آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی بہن کے سہاگ کی واپسی کے لئے میں خود ہی اس کام کو سرانجام دوں گی۔ میں نے گھر میں کسی سے بھی تذکرہ نہ کیا اور خاموشی سے رات ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

بارہ بجتے ہی میں چپکے سے پرانی ملازمہ کو ساتھ لے کر گھر سے نکل پڑی۔ یہ عورت جسے بہری اور بے وقوف ہونے کی وجہ سے بیدھی کہا جاتا تھا۔ تھی تو لمبی چوڑی مضبوط ہاتھ پیروں کی لیکن دیکھا جائے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا اس میں بات سننے اور سمجھنے کی کوئی صلاحیت ہی نہ تھی مگر مجھے تو بس ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔

آدھی رات گزر چکی تھی ساری کائنات پر ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ ویسے بھی قصبوں اور دیہاتوں میں تو عموماً سر شام سناٹا چھا جاتا ہے۔ یہ تو پھر آدھی رات تھی۔

نیم پختہ سڑک کے کنارے لگے ہوئے نیم املی اور شیشم کے گھنے درخت ملگجی سی چاندنی میں اور بھی ہولناک معلوم ہو رہے تھے۔ دن بھر گلیوں میں آوارہ پھرنے والے کتے بھی اس وقت خوانچہ فروشوں کی ریڑھیوں کے نیچے دم دبا کے بے سدھ پڑے تھے۔ میں جیسے تیسے وہاں تک پہنچ گئی۔ یہ پرانا قبرستان جسے لوگ چھمنہ کہتے تھے۔ اونچے ٹیلے پر واقع تھا۔ جانے کے لئے مجھے سیڑھیاں نظر آرہی تھی۔ میں بیدھی کو درخت کے نیچے بیٹھا کر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ آنکھوں کے سامنے دور تک شہر خموشاں پھیلا تھا۔ مدہم روشنی میں کچی پکی قبریں صاف نظر آرہی تھیں۔ اور فضا میں باسی گلابوں اور اگر بتیوں کی سوگوار مہک رچی ہوئی تھی سکوت کا یہ عالم تھا کہ پیڑ سے پتے کے گرنے کی بھی آواز صاف سنائی دے جاتی تھی یا پھر وقفے وقفے سے آتی ہوئی طرح طرح کے جنگلی جانوروں کی آوازیں اس جامد سکوت کو توڑ دیتی تھی۔

میں نے اونچی قبر کی تلاش شروع کر دی جو مجھے جلد ہی نظر آگئی بیگ سے چراغ اور ماچس کی ڈبیہ نکال کر میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ چراغ روشن کرنا چاہا مگر ہوا کے جھونکے نے فوراً ہی چراغ بجھا دیا۔ دوسری تیسری تیلی کا بھی یہی حشر ہوا ایک ایک کر کے تیلیاں پھونک دیں لیکن امید کے جس چراغ کو تقدیر کی آندھیاں پہلے ہی بجھا چکی تھیں وہ دوبارہ روشن نہ ہو سکا۔

میں بھیگی آنکھوں اور بوجھل قدموں سے پلٹنا چاہتی تھی کہ دور سے آتی ہوئی تیز روشنیوں نے قدم جکڑ دیئے گھبرا کر وہیں بیٹھ گئی۔ چشم زدن میں روشنیاں قریب آگئیں اور میں نے دیکھا وہ پانچ چھ عورتیں تھیں۔ ریاست میں عرصے سے رہنے کی وجہ سے اکثر ایسی خواتین بھی نظروں سے گزری تھیں جن کی صورت دیکھ کر بھوک پیاس تک اڑنے لگتی تھی۔

مگر ان عورتوں کی تو شان ہی نرالی تھی۔ ان کی شکلوں سے عجیب و غریب روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ سفید ریشمی لبادوں کے دامن چلتے ہوئے زمین پر لوٹ رہے تھے۔ اور سیاہ سلکی بال جو کھلے ہوئے تھے گھٹنوں تک آرہے تھے۔ کانوں میں موتیا کی ادھ کھلی کلیوں کی بالیاں تھیں اور ہاتھوں میں بھی موٹے موٹے گجرے پہنے تھیں۔ میں آنکھیں پھاڑے ان عورتوں کی نرالی سج دھج دیکھ رہی تھیں۔

وہ سامنے کسی قبر کے سرہانے کھڑی فاتحہ پڑھ رہی تھیں۔ ایک عورت نے گیس لالٹین اٹھا رکھی تھی اور ایک عورت کے شانے پر مٹھائی کا تھال تھا۔ کچھ دیر بعد وہ

بڑے با وقار انداز میں چلتی اس مسجد تک پہنچ گئی جو جناتوں کی مسجد مشہور تھی۔

میرا ذہن مستقل ان کی کھوج لگانے میں مصروف تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ ان عورتوں کا تعلق کس خاندان سے اور کس قبیلے سے ہے۔ اور یہ اتنی رات گئے اس ویرانے میں کس لئے آئی ہیں۔ میں سب کچھ بھول بھال کر بس یہی سوچ رہی تھی۔ ایک ہلکا سا خیال آیا۔ ''ہوسکتا ہے کہ یہ بڑی یا چھوٹی رانی کی رشتہ دار ہوں اور کسی رسم کے سلسلے میں مسجد میں طاق بھرنے آئی ہوں۔''

لیکن پھر اپنی اس احمقانہ سوچ کو خود ہی بدل ڈالا۔ ان میں راجاؤں یا نوابوں جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی کہاں وہ قوس قزح کے رنگوں والے جھل مل کرتے ملبوسات لشکارے مارتے زیورات سے بجی سجائی ایسی ناریاں جن کے شفق رنگ چہروں پر شعلوں سے لپک آنکھوں میں تفاخر اور چال میں تمانت تھی اور جن کے دائیں بائیں الہڑ کنیزیں ہر قدم پر اللہ آمین کہتی چلتی تھیں۔ اور کہاں یہ نور کے سانچے میں ڈھلے پاکیزگی کے رنگ میں ڈوبے حسن و سادگی کے چلتے پھرتے مجسمے میں اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ وہ لوگ مسجد سے نکل کر باہر آئیں۔

میں جلدی سے قبر کی آڑ میں چھپ گئی۔ اور پھر مجھے اس وقت حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا جب آڑ اور اندھیرا ہونے کے باوجود وہ میرے قریب آکر کھڑی ہوگئیں اس عورت نے جس کے شانوں پر مٹھائی کا تھال تھا خاموشی سے تھال میں ہاتھ ڈال کر چار گرما گرم امرتیاں نکال کر میری طرف بڑھا دیں۔ میں نے اپنی چادر کا پلو آگے بڑھا کر امرتیاں سمیٹ لیں۔ وہ اس خاموشی کے ساتھ باری باری کرکے نیچے اتر گئیں۔

میری زبان تالو سے چپٹی ہوئی تھی اور حلق بالکل خشک تھا۔ ان کے اترتے ہی میں نے جلدی سے چار دیواری سے نیچے جھانک کر دیکھا۔ ان کے چلنے کا انداز بھی اتنا دلکش تھا کہ میں دلچسپی سے دیکھتی رہ گئی، ایسا لگ رہا تھا جیسے راجاؤں کی اجلی قطار کسی سبک فرام ندی کے سینے پر بہتی چلی جارہی ہو۔ اور پھر یہ دیکھ کر تو میرے ہوش اڑ گئے کہ وہ عورتیں بستی یا ریلوے اسٹیشن کا رخ کرنے کے بجائے جنگل کی طرف جانے والے اندھیرے جھاڑ جھنکاڑ راستوں پر بڑھتی ہوئی چلی جارہی تھیں میرا ہلکا شک پختہ یقین میں تبدیل ہو چکا تھا کہ وہ عورتیں جنات کی قوم سے تعلق رکھتی تھیں۔

میری پیشانی ٹھنڈے پسینے سے بھیگ رہی تھی۔ میں کانپتے قدموں سے نیچے اتری، بیدھی اماں بیڈ کے تنے سے ٹیک لگائے اونگھ رہی تھی، میں نے اس کو جھنجھوڑ کر اٹھایا اور تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ہانپتی کانپتی گھر آگئی۔ شکر تھا کہ سب سو رہے تھے۔

صبح جب میں نے اماں سے اپنی رات والی کارگزاری کا تذکرہ کیا تو وہ اچنبھے ہوکر میرا منہ دیکھتی رہیں اور پھر کہنے لگیں۔

''شکر ادا کرو کہ تم وہاں سے زندہ سلامت بچ کر آگئیں، نہیں تو آج علیم الحق کے ساتھ ہم تم کو بھی رو رہے ہوتے۔''

وقت کا پہیہ گردش کرتا رہا۔ علامہ اقبال کے خواب کی تعبیر پاکستان کی صورت میں دنیا کے نقشہ پر ابھر آئی میں اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ پاکستان آگئی۔ والدہ اور بہن بھانجی میری منجھلی بہن اور بہنوئی کے پاس رہ گئے علیم الحق کی بیٹی بھی باپ کی جدائی برداشت نہ کرسکی، اور سال کے اندر ہی خدا نے اسے اپنے پاس بلالیا۔ شوہر بھی پاکستان آکر داغ مفارقت دے گئے۔

دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلتے چلے گئے اور میرے سب چاہنے والے ایک ایک کرکے مجھ سے بچھڑ گئے۔ بس ایک میں ہوں جوان بچھڑے ہوئے لوگوں کا غم سینے میں سمیٹے موت کے قدموں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہی ہوں۔ کبھی کبھی جب رات کی تنہائیوں میں ماضی کی کھڑکیاں کھول کر جھانکتی ہوں تو وہی خوف ناک رات تصور کے پردوں پر ابھرنے لگتی ہے۔ اور ان مکھڑوں کی تابانی سے آنکھیں آج بھی چندھیانے سی لگتی ہیں۔

تابوت کہانی

عامر ملک۔ راولپنڈی

وہ دونوں سامنے والوں کو نابلند اور بے وقوف سمجھتے ہوئے انہیں کرب و اذیت میں مبتلا کرنا چاہتے تھے مگر انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ خود خونی شکنجے میں جکڑے جاچکے ہیں ایک دل گرفتہ سبق آموز کہانی۔

حیران کردینے والی ایک حیران کن کہانی جو پڑھنے والوں کو عجیب اچنبھے میں ڈال دے گی

''**عذرا!** ہماری منزل آگئی ہے۔''

کار جس ویران راستے پر رکی، وہاں خودرو گھاس نے جھاڑیوں کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وسیم نے آنکھوں میں تمام منظر کو سموتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے وہ گھر جس سے میرے بچپن کی تمام اچھی اور بری یادیں وابستہ ہیں۔'' وہ خاموشی سے سامنے دھند میں لپٹے مکان کو گھورتا رہا۔ اور پھر بولا۔

''میں چودہ سال کا تھا۔ جب گھر سے بھاگا تھا اور آج...... آج یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں کسی اور جنم میں اس گھر کو دیکھ رہا ہوں۔''

''یہ گھر!'' اس کی بیوی حیران سی ہوکر اس پرانے کھنڈر نما مکان کو گھور رہی تھی۔ جس کی کھڑکیاں ثابت نہ تھیں اور جس کے چوبی ستون دیمک خوردہ تھے مکان کا نصف حصہ درختوں کے جھنڈ میں روپوش تھا۔

اور نظر آنے والے حصے پر خشک بیلیں کسی سادھو کی بے ترتیب داڑھی کی مانند پھیلی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ دھند غیر ماورائی آسیب کی طرح گردوپیش پر چھارہی تھی۔ اس سناٹے کو کائیں کائیں کرتی کوؤں کی ایک ٹولی نے توڑا۔ عذرا کانپ اٹھی وہ بدصورت نہ تھی لیکن وحشت ناک ماحول سے اعصابی تناؤ کی بنا پر چہرہ جیسے کھنچ کر رہ گیا تھا۔

''نہیں وسیم! تم مذاق کررہے ہو۔''

اس خاموشی میں وسیم کا قہقہہ بھی عجیب وحشت خیز تھا۔

''عذرا! تم میری عادت سے واقف ہو۔ میں روپے پیسے کے معاملے میں کبھی بھی مذاق نہیں کرتا۔''

وسیم کا قد لمبا اور جسم ورزشی تھا۔ لمبے چہرے پر تیکھی ناک اور چھوٹی مگر تیز چمکیلی آنکھیں شام کے دھند لئے میں اس کے دانتوں کی چمک سے کوئی خوشگوار احساس نہ ابھرتا۔ ''میں نے تمہیں چلتے وقت ہی بتایا تھا کہ میں گھر اپنی وراثت کا روپیہ وصول کرنے جارہا ہوں۔ بھلا میں اس گھر کو بھول سکتا ہوں۔ یہ قصبے کا اختتام ہے۔ یہ راستہ جنگل کو جاتا ہے اور اس کے بعد آبادی ختم ہوجاتی ہے اور آگے صرف جنگل اور دلدلی زمین ملتی ہے۔''

اس نے بستر بند اٹھا کر اٹیچی کیس اٹھانے کے لئے عذرا کو اشارہ کیا۔ تو اس نے بددلی سے اٹیچی کیس اٹھالیا۔ اور بولی۔

''مگر وسیم! مجھے یقین ہے کہ اس کھنڈر میں تمہاری وراثت کا پیسہ نہیں۔ بھلا اس بھوت بسیرے میں روپے پیسے کا کیا کام؟''

''مگر مجھے پکا یقین ہے۔'' وسیم کے پاؤں تلے سوکھے پتے چٹخنے کی آواز کانوں کو ناگوار لگ رہی تھی۔ وسیم اسے سمجھانے کے انداز میں کہہ رہا تھا۔

''تم نے سنا نہیں تھا کہ رفیق کا چھ ماہ قبل انتقال ہوا ہے۔ اس کے انتقال کے وقت کیونکہ سب کو میری موت کا یقین تھا۔ اس لئے پانچ لاکھ کی مالک چچی فوزیہ بن رہی ہیں چچی کے علاوہ اور کوئی رشتہ دار موجود ہی نہیں۔ لیکن میں تو زندہ ہوں۔ اور کیا چچی کے مقابلے میں بھائی کا حق فائق نہیں؟ چلو شاباش گھبراؤ نہیں۔''

وہ اب سال خوردہ دروازے کے سامنے تھے جس کے بند کواڑوں کو عذرا مشکوک نگاہوں سے گھورے جارہی تھی۔

وسیم نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''آؤ...... اب اندر چلیں اور ذرا ان سے اپنا تعارف تو کرائیں۔''

دروازے میں سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

یہ دو بوڑھی اور کپکپاتی آوازیں تھیں۔ وسیم نے اپنی بیوی کو بتایا۔ ''ان میں ایک چچی فوزیہ ہے یہ ستر سے کم تو کیا ہوں گی اور دوسری خالہ سکینہ ہیں۔ یہ نوے کے پیٹے میں ہوں گی۔ یہ دونوں مجھے دیکھ کر ششدر رہ جائیں گی۔ یہ دونوں تو مجھے مردہ سمجھے بیٹھی ہیں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ بند کمرے میں عجیب سی بو اور گھٹن تھی۔ قدیم طرز کے شیشوں والے پلنگ، پرانی وضع کے طاق فرسودہ پردے کمرے کی ہر شے عہد پارنیہ کا نشان تھی۔ دونوں عورتوں نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ اس کی خالہ بے نور آنکھوں سے انہیں گھور رہی تھی۔ مگر اس کی ناتواں چچی نے بڑے سکون سے دریافت کیا۔

''تم کون ہو؟ اور یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

وسیم نے اپنے بارے میں بتایا۔

وہ اسی طرح پرسکون لہجے میں بولیں۔ ''وسیم ...... وہ ...... تو کبھی کا مرکھپ چکا ہے۔ وہ تو پانچ سال ایک ڈاکے کے سلسلے میں دیہاتیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ رفیق نے یہ خبر خود اخبار میں پڑھ کر ہمیں سنائی تھی۔''

وسیم ہنسا...... ''چچی! یہ تو محض خوش خیال ہے۔ دیکھ لیں میں آپ کے سامنے زندہ سلامت موجود ہون۔ یہ عذرا ہے میری بیوی۔''

''آداب چچی جان۔'' عذرا نے غیر یقینی لہجے

میں سلام کیا۔

''ہوں'' اس کی خالہ نے نہ دیکھنے والی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔

عذرا نے کچھ کہنا چاہا مگر چچی کی بات شروع ہوچکی تھی۔ ''عذرا میری بیوی۔'' وہ اس کے لہجے کی نقل اتار رہی تھیں۔ ''ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے۔''

عذرا نے پھر کچھ کہنا چاہا۔ مگر وسیم نے اسے روک دیا۔ چچی کہے جارہی تھیں۔ ''عذرا تو خوبصورت جادوگرنی ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ یہ بھی مرچکی ہے۔''

یہ سن کر عذرا کو تو آگ لگ گئی۔ تنک کر بولی۔ ''مجھے مردہ کہنے سے تمہارا کیا مطلب ہے۔؟''

''وسیم...... یہ تم کس پاگل خانے میں مجھے لے آئے ہو مجھے؟''

مگر چچی نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ وہ اسی پرسکون لہجے اور کھوکھلی آواز میں کہے جارہی تھیں۔ ''وسیم مرچکا ہے وہ آج سے پانچ سال قبل ایک ڈکیتی کے سلسلہ میں مارا گیا تھا۔ بچی تم اس بات کو کیوں نہیں سمجھتیں کہ زندوں کے ساتھ زندہ اور مردوں کے ساتھ مردے رہتے ہیں۔ اگر وہ مرچکا ہے تو تم بھی مردہ ہی ہو۔''

عذرا وحشت زدہ ہوکر اسے دیکھ رہی تھی۔ وسیم نے کہا۔

''چچی اب بس کرو اس ڈرامے کو۔ ہم دونوں زندہ ہیں اور یہ تم دیکھ بھی رہی ہو۔''

''ہوں۔'' خالہ جیسے اپنی بے نور آنکھوں سے دیکھ کر بولیں۔

چچی جیسے فتح یابی کے احساس سے چلائیں۔ ''اگر تم واقعی زندہ ہو تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو؟ تمہیں یاد نہیں کہ تمہاری آوارگی کی وجہ سے تمہارے باپ نے تمہیں گھر سے نکالا تھا اور کیا تمہیں یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے کہا تھا کہ تم زندہ اس گھر میں قدم نہیں رکھ سکتے تو کیا تم اب یہاں دفن ہونے کو آئے ہو؟''

مگر وسیم ہنس کر بولا۔ ''چچی! میں نہ دفن ہونے آیا ہوں اور نہ تم زندہ جنازوں کو دفنانے آیا ہوں۔ میں تو اپنی وراثت کی رقم لینے آیا ہوں۔'' اس نے تمام تفصیلات بتائیں۔ ''رفیق مرچکا ہے اور اب تمام دولت پر میرا حق ہے۔''

خالہ خاموشی سے اپنی چندھی آنکھوں سے خوف زدہ بلی کی طرح بیٹھی تھیں۔ چچی نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ''رفیق مرچکا ہے تو تمہیں بھی رفیق کی موت کا علم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد اس کی تم سے ملاقات ہوئی ہوگی اور اس نے تمہیں وراثت کی رقم کے بارے میں بتایا ہوگا۔''

اب وسیم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ وہ چلا کر بولا۔

''چچی! بے کار کی باتیں بند کرو۔ ہم بھوکے ہیں اور بس کے سفر نے انجر پنجر ڈھیلا کردیا ہے۔''

اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا خالہ تو جیسے بالکل ہی اپنی جگہ پر دبک گئی تھیں۔ وہ بولا۔

''ہم دوسری منزل کے کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھوتے ہیں اور اس کے بعد کھانا کھائیں گے۔''

وسیم نے سامان اٹھایا۔ چلتے چلتے ان کے کانوں میں چچی کی آواز آئی۔

''اب تو انہیں کھانا دینا ہی پڑے گا۔ مگر انہوں نے زندہ رہنے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے تو بھلا ہم کیا کرسکتے ہیں۔ لیکن...... یہ لڑکی...... اچھی خاصی شکل کی ہے۔ جوانی میں یہ کیوں مرگئی؟''

وہ دوسری منزل کے جس کمرے میں پہنچے۔ وہ دھول سے اٹا ہوا تھا۔ فرش پر بچھی دری پھٹی ہوئی تھی دیواروں پر خاندان کے مرحومین کی تصاویر انہیں گھور رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں سے بدنیتی اور مسکراہٹ سے تمسخر نمایاں تھا۔ بند کمرے کی مخصوص بو اور گھٹن سے سر میں درد کا احساس ہوتا تھا۔ مگر کھانے اور گرما گرم چائے نے دونوں کی طبیعت کچھ بحال کردی تھی عذرا کے اعصاب کا تناؤ بھی کچھ کم ہوگیا تھا۔ مگر مکمل طور پر نہیں۔ کیونکہ ابھی تک وہ ذرا سی نامانوس آواز سے چونک اٹھتی

تھی۔ دلدل پر کسی مرغابی کی کرر ہ۔ نس یا اس کے جواب میں الو کی آواز سے اس کا دل دہل اٹھتا تھا۔ وہ بولی۔

"وسیم !ہم یہاں کیسے رہ سکتے ہیں۔ مجھ پر تو ابھی سے وحشت سوار ہے۔ تم جانتے ہو کہ مجھے بند اور سیلن والے کمروں سے کتنی کراہیت ہے۔"

وہ چمکار کر بولا۔ "ہمیں یہاں صرف ایک رات ہی تو گزارنی ہے ہم صبح ان سے رقم وصول کریں گے اور پھر یہاں سے نکل جائیں گے۔ تم جانتی ہو کہ پولیس کو اس قتل کے سلسلہ میں اب تک میری تلاش ہے۔ پانچ لاکھ۔ میرے خدا! اس رقم سے ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ ملک سے باہر جا سکتے ہیں ایک نئی زندگی شروع ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" عذرا غیر یقینی لہجے میں بولی۔ "مگر یہاں سے رقم نہیں مل سکتی۔" وہ ایک مرتبہ پھر کپکپائی۔

"سب کچھ یہیں ہے۔" وہ اسے سمجھانے کے انداز میں گویا ہوا۔ "میں نے تمہیں اپنے خاندان والوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے۔ غالباً تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا۔ میرے پردادا امیر علی ٹھگوں کے ساتھیوں میں سے تھے۔ جب ان کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ تمام مال ومتاع لے کر اس دورافتادہ علاقے میں آ گئے تھے اب تو یہ اچھا خاصا قصبہ بن چکا ہے۔ ایل تار ٹیلی فون، اور بجلی سب کچھ ہے یہاں۔ لیکن اس زمانے میں یہ بالکل ویرانہ تھا بس جنگل اور دلدل۔ ان کے پاس لاکھوں کا زروجوار ہو گا۔ تو ہمارے دادا اور اس کے بعد میرے ابو نے خاصی عیاشیاں کیں مگر مجھے یقین ہے کہ اس میں سے اب تک بھی بہت کچھ بچا ہو گا۔ ہمارے بزرگوں نے دولت کے معاملے میں کبھی بھی کسی بینک پر اعتبار نہ کیا تھا۔"

"تمام دولت تمہاری چچی کے قبضہ میں ہے اور یہ کھوسٹ بڑھیا تمہیں ایک ڈھیلہ بھی نہ دے گی۔"

"وہ مجھے کیسے روک سکتی ہے اس کے لمبے چہرے پر اب بھیڑیئے جیسی خشونت اور مکاری تھی۔"

"ضرورت پڑنے پر میں ان دونوں مرغیوں کی گردنیں بھی مروڑ سکتا ہوں۔"

"قتل؟" وہ سرگوشی میں بولی۔

"اور کیا...... قتل کیا۔ یہ دنیا سے ان کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہو گا۔ ویسے بھی چچی اور میں نے کبھی بھی ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا تھا۔ بلکہ یوں سمجھو کے بارہ برس کی عمر سے ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ وہ میری سالگرہ کا دن تھا اور اسی دن میرے دادا کا انتقال ہوا تھا۔ وہی دادا جنہوں نے اپنے تابوت میں کروٹ بدلی تھی۔"

"وسیم!" عذرا چلا اٹھی۔

"گھبراؤ نہیں۔ ہمارے خاندان سے ایسی بہت سی روایات وابستہ ہیں۔"

"نہیں...... نہیں۔"

"ہاں عذرا! یہ حقیقت ہے۔ مثلاً میرے باپ نے اپنے تابوت میں ٹیلی فون رکھوایا تھا حقیقی ٹیلی فون۔ وہ فون جو درست حالت میں ہو اور جسے کام میں لایا جا سکے۔ یہ اس لئے کہ اگر وہ بھی تابوت میں کروٹ بدلیں یا وہاں سے باہر نکلنا چاہیں تو انہیں کسی قسم کی دقت نہ ہو۔"

"کیا کہتے ہو......؟"

"ہاں! ہاں! یہ سب کچھ ان کی وصیت میں تھا۔ ادھر کھڑکی کے پاس آؤ۔" اس نے کھڑکی کے پٹ کھول دیئے گھر کے پچھواڑے میں درختوں کی قطاریں تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر خشک زمین نے دلدلی صورت اختیار کر لی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کے چاند کی ملگجی روشنی میں خشکی اور پانی ملے ملے سے تھے۔ گھر سے سو گز کے فاصلے پر اس نیم دلدلی زمین پر ایک سنگی عمارت نظر آ رہی تھی۔

"یہ تابوت خانہ ہے۔" وسیم نے عمارت کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔ وہ دونوں سحر زدہ سے خاموشی کے بوجھ تلے دبے اس تابوت خانہ کو دیکھ ہی رہے تھے کہ چرچراہٹ کے ساتھ اس کا دروازہ کھلا۔ عذرا نے

ریڑھ کی ہڈی میں خوف کو سرد لہر کی مانند محسوس کیا۔ تابوت خانہ کے دروازے سے ایک دراز قد عورت نکلی۔ جو اس بے نور چاندنی میں کسی بھٹکی ہوئی روح کی پرچھائیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ تابوت خانہ سے نکل کر گھر ہی کی طرف آ رہی تھی۔

"چچی فوزیہ!" وسیم کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ "مگر یہ اس وقت تابوت خانہ میں کیا کر رہی ہے؟"

"تابوت خانہ" عذرا نے کپکپائی ہوئی آواز میں دوہرایا۔

"ہاں اس دلدلی زمین میں مردے دفن نہیں ہو سکتے۔ اسی لئے یہ عمارت تابوت خانہ کے طور پر بنائی گئی تھی۔ اسے تم پرائیویٹ قبرستان سمجھ سکتی ہو۔ گو ہمارے خاندان کے تمام لوگ یہیں پر دفن ہیں پھر بھی خاصی جگہ باقی ہے۔ دراصل اس کے فرش کو واٹر پروف بنا دیا گیا ہے۔

دور بجلی چمکی جس سے ایک لمحے کے لئے یہ وحشت ناک منظر چمک گیا۔ اور ساتھ ہی دور بادلوں کی گرج سنائی دی۔ چند ہی لمحات میں چاند کا دیا بڑھتے سیاہ بادلوں میں بجھنے والا تھا۔

وسیم بڑبڑایا۔ "طوفان آ رہا ہے۔"

کھڑکی سے ہٹ کر وہ دونوں پھر کھانے کی میز پر آ بیٹھے تھے۔ وسیم اسے بتا رہا تھا۔

"جب بارش آتی ہے تو دلدل میں پانی کی سطح ایک دو دنوں کے لئے اونچی ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات نالوں میں سیلاب آ جاتا ہے۔ لیکن اس مکان کی کرسی بہت اونچی رکھی گئی ہے۔ اس لئے یہ پانی سے محفوظ رہتا ہے۔ کہیں بارش کی وجہ سے اس گھر میں چند دنوں کے لئے ٹھہرنا نہ پڑ جائے۔!

"نہیں وسیم!" وہ گھبرا کر بولی۔ "نہیں میں اس گھر میں ایک رات سے زیادہ نہیں گزار سکتی یہ قطعی ناممکن ہے۔"

"گھبراؤ نہیں۔ بھلا ہمیں زیادہ دیر ٹھہرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہاں تو میں تمہیں چچی فوزیہ کے بارے میں بتا رہا تھا جب ہم اپنے دادا کو دفن کر کے آئے تو چچی نے نکلنے میں دیر لگا دی میں نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ مگر چونکہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھرا تھا۔ اس لئے اگلی صبح تک کسی نے بھی چچی کی کمی محسوس نہ کی۔ ادھر رات کو چچی نے دادا کو مدد کے لئے پکارتے ہوئے سنا تو چچی نے انہیں جواب بھی دیا۔ دادا نے ان سے التجا کی کہ وہ اسے یہاں سے نکلنے میں مدد کریں مگر چچی نہ مانیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دادا تو مردہ ہیں۔ اس دن کے بعد چچی کو یہ وہم ہو گیا ہے کہ وہ مردوں سے بات چیت کر سکتی ہیں۔"

عذرا کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اور ہونٹ زرد ہو رہے تھے۔ وہ حلق میں تھوک نگل کر بولی "تم" مگر وسیم مسکرایا اور بولا۔ "یہ تو صرف مذاق تھا۔ ابھی یہ قصہ پورا کہاں ہوا ہے پہلے پہل تو کسی کو چچی کی بات پر یقین ہی نہ آیا مگر پھر میرے والد کو تجسس ہوا۔ چنانچہ سب نے مل کر قبر کھودی تو واقعی دادا کی نعش کروٹ کے بل تھی۔ یہی نہیں بلکہ منہ بھی یوں کھلا تھا تو گویا مدد کے لئے پکارتے پکارتے ہی جان نکلی ہے۔ ان کی آنکھیں ابھی کھلی تھیں حتیٰ کہ ادھر ادھر کھرچنے کی وجہ سے انگلیوں کے ناخن بھی ٹوٹ چکے تھے۔

"خدا کے لئے وسیم،! کیوں میری جان نکالے دے رہے ہو۔"

"عذرا! اس قصہ کا ایک ایک لفظ سچ ہے۔ دراصل ہمارے ابا میں کسی کو سکتہ کا مرض تھا اس لئے امکان ہے کہ دادا کو بھی سکتہ ہی ہوا ہے۔ اس بات سے میرے ابا بہت ہی خوف زدہ ہوئے چنانچہ انہوں نے پیش بندی کے طور پر اپنی قبر میں ٹیلی فون لگوا لیا۔"

"وسیم!" وہ کپکپا کر بولی۔

"سچ ہے یہ۔" وہ زور دے کر بولا۔ "چنانچہ میرے ابا کو ان کی وصیت کے مطابق فون کے ساتھ دفن کیا گیا تا کہ اگر آنکھ کھلے تو مدد کے لئے لوگوں کو بلا سکیں۔"

"اف خدایا!"

"اچھا! چلو چھوڑو اس قصے کو۔ میں تو اب چچی فوزیہ سے معاملے کی بات کرنے کا خواہاں ہوں۔ لیکن ٹھہرو۔ تجوری ابا کی تصویر کے پیچھے ہوتی تھی۔ دیکھیں تو بھلا یہ اب تک وہیں ہے؟" اس نے جب دیوار کے پاس جاکر ایک تنومند۔ سرخ چہرہ اور باہر کو نکلی آنکھوں والے شخص کی تصویر اٹھائی تو تجوری اس کے پیچھے ہی تھی اور جب حرفوں کو جوڑ کر تالا گھمایا تو تجوری کے پٹ کھل گئے۔ عذرا کی سانس تیز تیز چل رہی تھی اور اب کھلی تجوری دیکھ کر خوف اور پریشانی کے احساسات بھی ختم ہوچکے تھے۔ وسیم نے خوشی سے ہنستے ہوئے نقدی رکھنے والا ڈبہ باہر نکال کر جب اسے توڑا تو اس میں سے صرف ایک کاغذ نکلا۔ وہ بے تابی سے اسے پڑھنے لگا عذرا بھی پنجوں کے بل اونچی ہوکر اس کے کندھے پرسے جھانک کر اس کے ساتھ ہی پڑھنے لگی۔ دونوں تحریر میں محو تھے اور سیاہ حروف گویا ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ پشت پر چوبی تختے کی چرچراہٹ سنی تو دونوں نے یکلخت گردنیں گھمائیں۔ دروازے میں چچی فوزیہ کھڑی انہیں گھور رہی تھی۔ وسیم چلا کر بولا۔

"یہ کاغذ کہہ رہا ہے کہ رفیق کے بعد تمام دولت کی مالک ہو۔"

"پھر؟"

"پھر یہ کہ...... یہ میری دولت ہے اور میں اسے حاصل کرکے رہوں گا۔ بتاؤ تم نے وہ سب مال کہاں چھپا رکھا ہے؟"

"وسیم بیٹے! وہ سب محفوظ ہے۔ بالکل محفوظ ۔ اگر تم اتنے ہی چالاک ہو تو تلاش کرلو ناں۔"

"بے فکر رہو۔ چچی۔ میں وہی کروں گا۔" ایک دو لمحوں تک دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔ پھر وسیم بولا۔ "اور ہاں اتنی رات گئے تم وہاں تابوت خانے میں کیا کرتی پھر رہی ہو۔؟"

"میں تمہارے بھائی رفیق سے باتیں کرنے جایا کرتی ہوں وہ اپنی ٹھنڈی قبر میں تنہائی محسوس کرتا ہے اور میری باتوں سے اس کی طبیعت بہل جاتی ہے تم تو جانتے ہو کہ مردے خود تو چل کر آنے سے رہے۔ اس لئے میں ہی اس سے بات چیت کے لئے چلی جاتی ہوں۔"

عذرا خوف سے کانپ رہی تھی۔ مگر چچی فوزیہ اپنی دھن میں کہے جارہی تھی۔

"مگر بیٹے! تم اتنی دولت کا کیا کروگے؟ اس طرح جس طرح میں نے پہلے تمہارے دادا اور پھر تمہارے ابا سے بات چیت کی تھی۔ وسیم! تمہیں وہ والی بات تو نہ بھولی ہوگی۔"

عذرا دہشت سے چلا اٹھی۔ مگر بڑھیا نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اور وہ وسیم سے پوچھنے لگی...... "تم تو مردہ ہو۔ اور مردوں کو دولت سے کیا کام؟"

وسیم جھلا کر بولا۔ "چچی! ختم کرو اس پاگل پن کو کہ تم مجھے سختی پر مجبور کررہی ہو۔ میں تمہیں کرسی سے باندھ کر جلتے سگریٹ کے کرشمے دکھاؤں گا تو پھر میری زندگی کا یقین آئے گا تمہیں۔"

وہ اطمینان سے بولی۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں دراصل اس وقت رفیق کے پاس تمہارے ہی سلسلہ میں مشورہ کرنے گئی تھی۔"

"اچھا ہم" وہ بے اعتباری سے بولا۔

"ہاں! اور اس نے کہا ہے کہ تمہیں دولت کا بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ آخر تم اپنے ہی تو ہو اب یہ اور بات ہے کہ تم مرچکے ہو۔"

وہ بے تابی سے بولا۔ "کہاں ہے وہ دولت؟"

"تابوت خانہ میں۔" وہ فاتحانہ انداز میں بولی۔ "ہاں ہاں۔ تابوت خانہ میں ۔ یہ ایسی جگہ ہے وہاں کسی کا وہم وگمان بھی نہیں جاسکتا۔ تابوت خانہ میں جہاں اس خاندان کے تمام لوگ سو رہے ہیں۔ جہاں تمہارا۔ دادا، باپ اور بھائی ہیں اور جہاں تمہارے لئے بھی ایک قبر تیار ہے اور وہ دولت تمہاری ہی خالی قبر میں رکھی ہے۔"

وسیم نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "پانچ لاکھ روپے میری اپنی قبر میں...... واہ...... کیا ستھرا مذاق ہے چچی

...... ہاہاہا۔ عذرا اب تمہیں اندازہ ہوا کہ ہمارا خاندان کتنا پہنچا ہوا ہے ہاہاہاہا۔"

"وسیم!" اس کے لہجے میں التجا تھی۔ "خدا کے لئے رقم لو اور جلد از جلد اس پاگل خانے سے نکلنے کی کرو۔ میرے اعصاب جواب دے رہے ہیں۔"

"ہاں" چچی بولی...... "تمہیں یہ کام جلدی سے کرنا ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شمالی حصوں میں زبردست بارش ہوچکی ہے کیونکہ دلدلوں میں پانی چڑھ رہا ہے۔ تابوت خانے کا فرش بھی درست حالت میں تھا۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی۔ کیونکہ اب میں فرش پر ایک ایک انچ پانچ دیکھ کر آرہی ہوں۔"

"چچی! ہم جاتے تو ہیں لیکن اگر یہ جھوٹ ہوا تو۔"

"پگلے! مجھے مردوں سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم بڑے ضدی ہو۔ بات مانتے ہی نہیں اگر تم خود کو مردہ مان لو تو سارا قصہ ہی ختم ہوجائے۔ ہم بڑے اطمینان سے رہ سکتے ہیں اور پھر میں تم اور ہم سب خوب مزے سے گفتگو کیا کریں گے۔"

مگر دولت کے تصور نے وسیم کے جسم میں ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ چنانچہ اب اسے چچی کی باتوں پر غصہ نہ آیا بلکہ وہ ہنس دیا۔ عذرا نے بھی اس ہنسی میں شریک ہونے کی کوشش کی۔

☆......☆......☆

جب گھر سے کلہاڑی اور ٹارچ لے کر وہ تابوت خانے کی طرف جارہے تھے تو ان کے سر پر بادل ایک مرتبہ پھر گرجے۔ فضا تاریک تھی، تیز ہوا جیسے درختوں پر چابک برسا رہی تھی اور ٹوٹے ٹوٹے قطرے زبردست بارش کا پیغام لا رہے تھے۔ تابوت خانہ میں خاموشی اور گھٹن کے ساتھ ساتھ سیلن کی سردی بھی تھی اور ہوا جیسے مردہ جسموں کی بو سے بوجھل تھی۔ اس تاریکی میں ٹارچ کی روشنی کا دائرہ ماحول کو اور بھی خوفناک بنا رہا تھا۔ اس بند جگہ میں وسیم کی آواز کھوکھلی اور اس کی گونج خوفناک تھی۔ عذرا ایک دم اچھل پڑی۔

اس کے پیچھے ایک تہہ خانے میں ہمارے بزرگ آرام کررہے ہیں۔ اس کا راستہ ایک پتھر کی سلیب سے بند کیا گیا ہے تم ذرا یہ ٹارچ پکڑو اور میں اسے کھولتا ہوں۔"

وہ ایک کونے میں جھک کر دیوار کے ساتھ ٹٹولتا رہا۔ پھر ایک ہلکی سی "کلک" کی آواز آئی۔ جب اس نے اپنے پاؤں کا دباؤ ڈالا۔ تو ایک مدہم شور سے گویا احتجاج کرتی ہوئی ایک سیاہ سیل اوپر اٹھ گئی۔ نیچے تاریکی منہ پھاڑے جھانک رہی تھی وسیم نے سل پکڑ کر اوپر کرلی اور "کلک" کی دوسری آواز کے ساتھ سل اپنے بالائی خانے میں پیوست ہوگئی۔ ٹارچ کی روشنی تنگ اور سیلی سیڑھیاں ظاہر کررہی تھی ۔ نیچے تہہ خانے سے متعفن اور سرد ہوا کے پہلے جھونکے سے ہی عذرا کے تو جیسے اوسان خطا ہوگئے۔ وہ منت کرتے ہوئے بولی۔

"میں باہر رہتی ہوں۔ تم نیچے اتر جاؤ۔ اندر ٹھنڈ اور سیلن ہوگی جو مجھے ناپسند ہیں۔"

وسیم تنک کر بولا۔ "ذرا سی ٹھنڈ سے مر نہ جاؤ گی۔ چلو آخر ٹارچ بھی تو کسی نے پکڑنی ہے۔"

وسیم نے احتیاط سے سیڑھیوں پر قدم رکھا تو اندر سے شوں سے کوئی چیز وسیم کے منہ سے ٹکراتی ہوئی گزر گئی اور عذرا کی چیخ سے تمام تابوت خانہ گونج اٹھا۔ وسیم کے حواس بھی جاتے رہے۔ چند لمحے وہ دونوں خاموشی سے کھڑے کانپتے رہے۔ وسیم کے کپکپاتے ہاتھوں سے ٹارچ کی تھرکتی روشنی میں سیڑھیاں اور بھی ویران نظر آرہی تھیں اتنے میں ویسی ہی ایک اور چیز آئی تو وسیم نے دیکھا تو وہ چمگادڑ تھی۔ وہ ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"اوہ اس کم بخت چمگادڑ نے تو جان ہی نکال دی۔" مگر عذرا خاموش تھی اور اس کے دل کی دھڑکن ابھی تک قابو میں نہ آئی تھی۔

وسیم نے پھر اترنا شروع کیا۔ عذرا نے اعصابی تناؤ اور خوف سے مٹھیاں اس زور سے بھینچ رکھی تھیں کہ ناخن ہتھیلیوں میں چبھ رہے تھے وہ کانپتی ہوئی خاموشی سے اس کے پیچھے پیچھے اترنے لگی۔ سیڑھیاں بالائی کمرہ

سے مشابہ کمرے میں لے آئی تھیں۔فرش پر دو دو انچ پانی تھا جو سیاہ معلوم ہو رہا تھا۔عذرا آخری سیڑھی پر رک گئی۔

"میں اس سے نیچے نہیں اتروں گی۔ میں یہاں سے روشنی کرتی رہوں گی۔"

"بہت اچھا۔" وسیم ناگواری سے بولا ۔اور ٹارچ اسے پکڑا کر کہنے لگا۔

"چلو یہیں سے روشنی کرتی رہو۔ادھر روشنی کرو ۔ادھر اور ادھر اب ذرا دیکھو تو۔"

روشنی کے دائرے میں قبروں کے کتبے اور تعویذ چمک اٹھے...... یہ ہیں میرے پردادا......اور یہ...... یہ رہے میرے دادا جنہوں نے قبر میں کروٹ بدلی تھی یہ دیکھو ان کا کتبہ۔

"عبدالعزیز پیدائش 1835ء وفات 1937ء" اور یہ...... یہ رہی میرے والد کی قبر یہ ادھر ۔یہ ان کا کتبہ ہے۔"عبدالغفور پیدائش 1885ء وفات 1945ء......اور یہ ہاں یہی تو رفیق کی قبر ہے اور اس پر ایک کتبہ ہے۔ارے......وہ ایک لمحے کو حیرت سے چپ رہا۔عذرا گھبرا کر چیخی یہ کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں...... یہ قبر میرے لئے ہے۔"

"ہیں۔"

"ہاں یہ قبر میرے لئے ہے۔ بلکہ اس پتھر پر میرا نام بھی لکھا ہے۔"

"نام"

"ہاں......ہاں...... یہ دیکھو۔ وسیم۔ پیدائش 1925ء وفات 21 نومبر 1959ء" وہ خود سے بولا۔

"دیکھی چچی کی مکاری...... یہ آج کی تاریخ ہے۔"

"اف خدایا۔" عذرا جیسے چیخی۔

"معلوم ہوتا ہے۔ وہ شام کو یہی لکھنے آئی تھی کیونکہ یہ کوئلے سے لکھا ہے میں اس منحوس بڑھیا کے مزاج درست کردوں گا۔"

"خدا کے لئے کام ختم کرو اور جلد از جلد یہاں سے نکلنے کی کوشش کرو۔"

"ٹھیک ہے۔ٹھیک ہے۔" وہ جیسے بے صبری سے بولا......"میں بھی کس چکر میں پڑ گیا تھا۔"

اس نے قبر پر سے پتھر کی سلیں اٹھائیں ۔دونوں کی نظریں قبر کی تہہ میں کھبی جا رہی تھیں ٹارچ کی روشنی میں واقعی نوٹ پڑے نظر آ رہے تھے بہت سلیقے سے بنڈل قطار در قطار رکھے تھے۔عذرا کی سانس تیز تھی وسیم بھی خاموش کھڑا گھور رہا تھا۔ بالآخر وہ بولا۔

"تو گویا چچی ٹھیک کہہ رہی تھی ۔مگر یہ سب کچھ کیسے لے جائیں گے؟"

پھر خود ہی ہنس کر اس نے اپنا کوٹ اتارا۔ اس کے بٹن بند کئے اور بازوؤں کو بل دے کر کوٹ کو ایک تھیلے میں تبدیل کر دیا اور عذرا سے مخاطب ہو کر بولا۔" اب تم ادھر آ جاؤ اور اس میں نوٹ ڈالتی جاؤ۔"

"اوں......اوں۔" عذرا جیسے منمنائی۔

"شاباش" وہ خوش دلی سے بولا۔ "ٹھنڈ سے نہ گھبراؤ۔پانچ لاکھ کے نوٹوں کی گرمی کافی ہوتی ہے۔"

کسی نامعلوم ذریعے سے آنے والا پانی بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ عذرا نے کانپتے ہوئے سیاہ پانی میں پاؤں ڈالا۔ تو اس کے ٹخنوں تک آ رہا ابھی اس نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک شور کے ساتھ اوپر راستے کی سل دوبارہ اپنی جگہ پر آ چکی تھی۔ عذرا نے چیخ ماری۔ جس کے جواب میں مردہ ہڈیوں جیسی کھڑکھڑاہٹ سے مشابہ چچی کی ہنسی سنائی دی۔

"چچی!" وہ پوری قوت سے چیخا۔

وہ پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتا گزرا اور سیڑھیاں چڑھ کر اپنی پوری قوت سے سل اٹھانے لگا۔

"چچی!" اب اس نے زور سے آواز دی۔

زور لگانے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ "چچی۔ چچی!" سل اپنی جگہ سے نہ ہلی۔

"چچی! خدا کے واسطے چچی!" وہ ایک مرتبہ پھر چلایا۔

اس کے جواب میں وہ دوبارہ ہنسی۔ جواب بتدریج دور ہوتی جا رہی تھی وہ پھر چیخا۔ "چچی!"

مگر اب باہر خاموشی تھی دور سے بادل گرجنے کی آواز آ رہی تھی اور فرش پر پانی بڑھنے لگا۔

"وسیم!" اب جو عذرا بولی تو اس کی کپکپاتی آواز محض ایک سرگوشی تھی۔

"اس خبیث بڑھیا نے ہمیں یہاں بند کر دیا ہے۔ان مردوں کے ساتھ۔ وسیم اب ہم کبھی بھی یہاں سے باہر نہ نکل سکیں گے۔"

اب وہ خوف سے چیخ رہی تھی۔ "کبھی نہیں وسیم! کبھی نہیں۔" اور اچانک وہ خاموش تھی۔ وسیم ایک ہی جست میں اس کے پاس تھا۔ اس نے وحشت کے عالم میں عذرا کو ایک تھپڑ مارا اور پھر ایک اور...... پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ۔ عذرا نے جیسے سکتے کے عالم میں اپنی انگلیوں سے گالوں کو چھوا۔ اس کی پھیلی ہوئی پتلیاں وسیم پر مرکوز تھیں۔

وہ دھاڑا۔ "بند کرو یہ بکواس۔"

عذرا ٹکر ٹکر اسے دیکھے جا رہی تھی ۔ پھر وہ قدرے نرم لہجے میں بولا۔

"چیخنے چلانے سے کیا بنے گا۔ وہ سنکی ہے بعد میں ہمیں نکال دے گی۔ لیکن ہمیں اس کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ ہمارے پاس کلہاڑی ہے۔ اب تم ٹارچ کو ٹھیک طریقے سے پکڑے رکھو۔"

اس نے خاموشی سے حکم کی تعمیل کی۔ وہ جب سل پر کلہاڑیاں برسا رہا تھا تو نیچے پانی کا شور اور بھی بڑھ چکا تھا۔ دو چار ہی ہاتھ مارے تھے کہ کلہاڑی کا پھل دستے سے نکل کر نیچے سیاہ پانی میں جا گرا۔ وسیم کے حکم کے مطابق عذرا نے پانی میں اس کی تلاش شروع کر دی۔

"مجھے نہیں مل رہا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ "مجھے نہیں مل رہا وسیم۔"

اب وسیم خود بھی گالیاں دیتا ہوا اسے تلاش کر رہا تھا۔ وہ سرد پانی کو بھول چکا تھا۔ اور اپنی دھن میں مگن کسی کتے کی طرح ہاتھ اور پاؤں کے بل جھکا فرش ٹٹول رہا تھا۔

"چلو تم بھی جھکو۔" اب وہ غضب ناک تھا۔

"مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ پانی کتنا سرد ہے اور نہ ہی مجھے تمہارے ٹھنڈ لگنے کا ڈر ہے۔ زندہ باہر نکلنا ہے تو اسے تلاش کرو۔"

بڑبڑاتی ہوئی عذرا بھی اس کے ساتھ پانی میں جھکی ہاتھوں سے پانی میں ٹٹول رہی تھی دونوں کمر تک پانی میں بھیگ چکے تھے۔ بالآخر عذرا کی ٹھنڈ سے سن انگلیوں نے کلہاڑی کا پھل پالیا۔ وسیم نے جھپٹا مار کر پھل لے لیا۔ اب وہ سیڑھیوں پر تھا۔ اس نے رومال میں پھل کا سرا لپیٹ لیا اور لکڑی کے دستے میں ٹھونس کر نئی قوت سے سل پر وار شروع کر دیئے حتیٰ کہ سانس پھول گئی پسینے میں شرابور ہو گیا۔ اور تھکن سے چور چور ہو گیا۔ جب ہاتھ روک کر دیکھا تو سل پر ایک نشان بھی نہ تھا۔

"یہ تین انچ موٹی سل ہے۔" اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

"تین انچ" وہ دونوں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔

عذرا کا گیلا لباس اس کے جسم اور منتشر بال اس کے گالوں سے چپکے تھے وسیم کا جسم اور چہرہ گندا ہو رہا تھا مگر آنکھوں میں وحشیانہ چمک تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ وہ ہنستا گیا۔ اتنا ہنسا کہ اس کی ہنسی کسی پاگل کی چیخوں میں تبدیل ہو گئی ۔ایسے لگ رہا تھا۔ جیسے وہ ہنستا ہنستا نیچے لڑھک جائے گا۔ جب وہ خاموش ہوا تو بولا۔

"ابا!" وہ ابھی تک ہنس رہا تھا۔ "ابا۔ابا!"۔

"کیا ہوا؟" عذرا چیخی۔

"ابا کی قبر...... میں تو بھول ہی گیا۔ وہ دیکھو! وہ دیکھو!" وہ اس وحشیانہ ہنسی کے ساتھ پانی میں سے ہوتا ہوا اپنے باپ کی قبر کی طرف گیا۔

"تم بھی آؤ۔" وہ چیخا۔ "دونوں مل کر قبر کھولتے ہیں۔"

"مگر کیوں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو۔؟"

"وہ ہنس کر بولا۔" فون ...... ٹیلی فون بھول گئیں۔ چلو ادھر بڑھو۔ قبر میں فون ہے۔"

دونوں پاگلوں کی طرح کلہاڑی سے قبر کی سلیں ادھڑتے رہے اور آخر گھنٹوں کی مشقت کے بعد قبر کھولنے میں کامیاب ہو گئے کفن میں لپٹی نعش کے سامنے آتے ہی کافور کی مردہ بوان کے نتھنوں میں سرایت کر گئی۔ مردہ جسم کی بو اس پر مستزاد تھی۔

عذرا کی آنکھیں بند تھیں۔ "دیکھا؟" وہ فاتحانہ انداز میں چیخا۔ "میں نے کیا کہا تھا یہ ہیں ہمارے پاگل بزرگ۔ میرا باپ زندگی میں مجھ سے نفرت کرتا رہا۔ مگر اب وہی مجھے موت سے نجات دلائے گا۔" اس نے ریسیور اٹھالیا۔ کوئی پاگل ہی اپنی قبر میں فون رکھ سکتا ہے ہم تھانے اطلاع دیں گے پولیس ہماری مدد کو ضرور پہنچے گی سارا قصبہ چچی کی حماقتوں سے واقف ہے۔"

"مگر اتنے طویل عرصے بعد تار میں......"

مگر وسیم نے اس کی بات کاٹی۔ "گھنٹی بج رہی ہے۔"

"کمال ہے۔"

"ہاں۔ ہاں۔ واقعی۔" وہ پرجوش آواز میں چلایا۔ "آپریٹر جواب دے رہی ہے۔ ہیلو، ہیلو۔" وہ چلایا۔ "کیا آپ میری آواز سن رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"آپریٹر...... میں وسیم بول رہا ہوں۔" اس نے اپنے گھر کا پتہ بتایا۔ "کیا تمہیں اس جگہ کا علم ہے؟"

"ہاں"

"مجھے مدد کی ضرورت ہے۔ آپ تھانے میں اطلاع کرا دیں پولیس کو بتا دیں کہ میں اپنے خاندانی تابوت خانے کے تہہ خانے میں بند ہوں۔ کیا سمجھ گئی ہو؟"

"ہاں"

"انہیں جلدی کی تاکید کرنا۔ ہم خاصی دیر سے اندر بند ہیں۔ ویسے بھی اب ہم چند گھنٹے ہی زندہ رہ سکتے ہیں۔ تہہ خانے میں پانی بڑھتا جا رہا ہے۔ جلدی کرنا۔"

"اچھا!"

وسیم نے اسے ایک مرتبہ پھر پتہ سمجھایا۔ "دیر نہ کرنا۔"

"اچھا۔" اور ٹیلی فون بند ہو گیا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس نے ریسیور اپنے باپ کی نعش کے پاس رکھ دیا۔

وہ عذرا کو سمجھا رہا تھا۔ "بس ابھی مدد پہنچ جاتی ہے اتنی دیر تک ٹارچ کی روشنی بھی ختم نہ ہو گی یہ بہترین ٹارچ ہے۔ اب خود پر قابو پائے رکھو۔ اس کے بعد دولت ہی دولت ہو گی جان من!"

"میں تمہاری ہر فرمائش پوری کروں گا۔ ساری عمر اب عیش سے بسر ہو گی بس ذرا سی دیر کے لئے صبر کر لو۔"

سو گز کے فاصلے پر اس شکستہ سے مکان میں چچی نے بڑی آہستگی سے ریسیور ٹیلی فون پر رکھ دیا اور تھکی تھکی آواز میں کہنے لگی۔

"یہ وسیم تھا۔ ابھی تک اسے مرنے اور دفن ہونے کے بعد کی زندگی کی عادت نہیں پڑی۔ وہ باہر نکلنے کے لئے مدد طلب کر رہا ہے۔ اس نے مجھے آپریٹر سمجھ لیا۔ اب بھلا میں یہ ظلم کیسے کرتی کہ اسے یہ بتاتی کہ تم اور لڑکی تو مر چکے ہو۔ اس لئے تمہارے واپس آنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے یہ امید دلا دی کہ لوگ ان کی مدد کو پہنچ رہے ہیں اس طرح ان دونوں کا دل بہلا رہے گا پھر جب کل یا پرسوں تک وہ ...... وہ واقعی خاموش ہو جائیں گے تو میں ان سے گفتگو کروں گی اب تو وہ افراتفری میں تھے کہ ان سے ڈھنگ سے بات نہ ہو سکی۔"

خالہ سکینہ بے نور آنکھوں سے اسے گھور رہی تھیں۔ باہر بادل گرج رہے تھے اور دلدل پر چھا جوں مینہ برس رہا تھا۔ اور چچی فوزیہ دھیمے سروں میں گنگنا رہی تھیں۔

خون آشام

صفدر شاہین۔ملتان

اچانک حسینہ کو آواز سنائی دی۔ نوجوان میں ہر حال میں تمہارا خون پیوں گی کیونکہ میں نوجوانوں کا خون پی کر ہمیشہ جوان بننا چاہتی ہوں اور اس کے ساتھ ہی اس نے نوجوان کے نرخرے پر چھری رکھ دی۔

دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی ایک خوفناک ......اور خونی کہانی......

ایف اے کرنے کے بعد میرے والد نے جو ایک سال پہلے ریلوے سے ریٹائر ہوئے تھے، ریلوے میں اپنے دیرینہ دوستوں کی کوشش سے مجھے ریلوے میں بھرتی کرا دیا جہاں تربیت مکمل کرنے کے بعد مجھے گارڈ بنا دیا گیا۔ میری ڈیوٹی سب سے پہلے تھل ایکسپریس پر شروع ہوئی۔ یہ ٹرین ملتان سے براستہ مظفر گڑھ، لیہ، میانوالی اور راولپنڈی جاتی تھی۔ شام پانچ بجے سردیوں کا سورج غروب ہونے کے قریب تھا جب بطور گارڈ میرے پہلے سفر کا آغاز ہوا۔ ان دنوں ریلوے کے پاس ڈیزل انجن بہت کم تھے اور وہ مین لائن یعنی لاہور کراچی روٹ پر چلتے تھے۔ باقی روٹس پر بھاپ والے کالے انجن گاڑیاں کھینچتے تھے۔ چنانچہ اس گاڑی میں بھی بھاپ والا انجن لگایا گیا تھا جو کوئلے سے چلتا تھا اور اس کی رفتار بھی زیادہ نہ تھی۔

یوں تو میں اس ریلوے لائن پر پہلے بھی کئی مرتبہ راولپنڈی تک سفر کر چکا تھا مگر ریلوے افسر کی حیثیت سے پہلی مرتبہ اس طرف جا رہا تھا۔ اور یہ سفر میرے کیریئر کی ابتداء تھی جس میں کامیابی پر ہی میرے مستقبل کا انحصار تھا۔ چنانچہ میں پوری ہوشیاری اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ رات کے دس بجے ٹرین لیہ پہنچی۔ یہ ضلعی ریلوے اسٹیشن خوب صورت اور اس لائن کا اہم اسٹیشن سمجھا جاتا تھا۔ یہاں زیادہ دیر تک گاڑی نے رکنا تھا۔ چنانچہ میں نے اسٹیشن پر واقع ریلوے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھایا، ابھی میں نے آخری نوالہ حلق سے اتارا ہی تھا کہ اچانک میں نے ایک نوجوان اور حسین و جمیل لڑکی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس لڑکی نے سیاہ رنگ کا ریشمی برقع پہن رکھا تھا لیکن چہرے سے نقاب ہٹا ہوا تھا۔ اسے اپنی جانب آتے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

سفید رنگت اور دلکش نقوش والی اس لڑکی کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا۔ شاید وہ بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہی تھی اور کھانا کھانے یا چائے پینے کے لئے ریسٹورنٹ میں آئی تھی۔ شاید وہ مجھ سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ ٹرین ابھی کتنی دیر رکے گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ وہ دراز قامت اور اسمارٹ بدن لڑکی میری میز کے پاس آرکی۔ میں نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو اس کے خوبصورت اور رس بھرے گلابی لبوں پر تبسم مچل رہا تھا۔ غزالی آنکھوں میں جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی اور رخساروں پر شفق پھوٹ رہی تھی۔

''کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں جناب۔'' اس نے آہستہ سے پوچھا۔ اس کے چہرے کی طرح اس کی آواز بھی نہایت دلکش تھی اور لہجے میں بے حد مٹھاس تھی۔

''کیوں نہیں...... بیٹھیے......'' میں نے اس کے سحر خیز حسن سے متاثر ہوتے ہوئے کہا تو وہ میرا شکریہ ادا کرتی ہوئی میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی اور بیگ فرش پر کرسی کے پہلو میں رکھ دیا۔

''جی فرمایئے۔'' مجھ سے کوئی کام ہے۔ میں نے اس سے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ پتا چلا کہ آپ کھانا کھا رہے ہیں اس لئے ادھر چلی آئی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے

''بہر حال میرا نام نیلوفر ہے اور میں یہاں لیہ میں ٹیچر ہوں۔''

میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ بات کرنے کے دوران اس کی نگاہیں میرے چہرے پر مرکوز رہی تھیں۔ ''آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے لئے چائے منگواؤں یا کھانا؟''

''تھینک یو۔ میرا خیال ہے آپ کے جانے کا وقت ہو گیا ہے، اس لئے پھر کبھی سہی۔'' اس نے مسکرا کر کہا۔ ''اب تو روزانہ ہی ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ سے پہلے اس ٹرین کے ساتھ جو گارڈ تھا، وہ مجھ پر مہربان تھا اور مجھے بیٹی کہا کرتا تھا۔ میں ہمیشہ اس کے کمپارٹمنٹ میں سفر کرتی تھی۔ آج اس کے نہ آنے سے میں پریشان ہو گئی کہ نہ جانے آپ مجھے ساتھ لے جانا پسند کر سکیں گے یا نہیں۔''

''کیوں نہیں۔ بالکل لے چلوں گا۔'' میں نے جواب میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کمپارٹمنٹ میں......''

''نہیں، نہیں......'' اس نے تیزی سے بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''لیڈیز کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا ہوتا تو میں ٹکٹ خرید لیتی۔ میں آپ کے روم میں بیٹھوں گی۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں؟'' ساتھ ہی اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور اس سے نگاہیں ملتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی آنکھوں سے مقناطیسی لہر نکل کر میرے دماغ کو جکڑتی جا رہی ہو۔ میں نے اس کیفیت سے نجات پانے کے لئے فوراً ہی نگاہوں کا زاویہ بدلا اور سوچنے لگا کہ یہ کس طرح مناسب ہو سکتا ہے کہ وہ لڑکی میرے کمرے میں سفر

کرے۔ مجھ سے پہلا گارڈ ادھیڑ عمر بوڑھا آدمی تھا اور بقول نیلوفر اسے بیٹی کہتا تھا۔ لیکن میں نوجوان تھا اور نیلوفر میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ پھر رات کا وقت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تنہائی میں شیطان مجھے بہکا دے۔ یا اگر میں کچھ بھی نہ کروں تب بھی بدنام تو ہو سکتا ہوں اور یہ بدنامی میرے کیریئر کے لئے تباہ کن ثابت ہوگی۔

میں نے چند سیکنڈ تک سوچنے کے بعد جواب میں کہا۔ ''نہیں نیلوفر۔ یہ قطعی مناسب نہیں ہوگا کہ آپ میرے روم میں سفر کریں۔ اس میں آپ کے ساتھ میری بھی بدنامی کا اندیشہ ہے۔''

''بے فکر رہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔'' نیلوفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''سب لوگوں کو پتا ہے کہ میں ہمیشہ گارڈ روم میں سفر کرتی ہوں۔ آج تک ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''آپ سمجھنے کی کوشش کریں نیلوفر۔ پچھلا گارڈ بوڑھا آدمی تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تو کیا ہوا؟ کیا آپ کو خود پر اعتماد نہیں ہے؟'' اس نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا تو اس کی بات سن کر میرے دماغ کو جھٹکا لگا اور مجھے اپنی بزدلی و حیرانگی پر غصہ آنے لگا۔

''آل رائٹ مس نیلوفر۔ آیئے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہتے ہوئے کرسی چھوڑ دی۔ وہ بھی اٹھی اور میرے ساتھ کھانے کے کمرے سے نکل کر پلیٹ فارم پر آ گئی۔ پلیٹ فارم پر آ کر میں نے وسل بجائی تو باہر کھڑے مسافر گاڑی میں سوار ہونے لگے۔ ''آپ میرے روم میں چلیں مس۔'' میں نے اس سے کہا تو وہ گاڑی کی طرف بڑھی۔ میرا مخصوص گارڈ روم چند قدم پر تھا۔ میں نے اسے اپنے روم میں سوار ہوتے دیکھا اور خود بھی اسی طرف بڑھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر میں نے انجن ڈرائیور کو گرین لائٹ کا سگنل دیا اور گاڑی حرکت میں آ کر رینگنے لگی۔ اسٹیشن کی حدود سے باہر آنے کے بعد میں نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کیا اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگا مگر مجھے حیرت ہوئی۔ اس کا سفر یہاں سے پانچ منٹ کا تھا۔ مگر وہ برقع اتارے میری سیٹ پر بڑے ہوشربا انداز میں دراز تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے طویل سفر کرنا ہو۔ مجھے حیرت ہوئی کہ سردی کے باوجود اس کے بدن پر باریک اور سفید لان کا سوٹ تھا اور اندر اس نے کوئی کپڑا نہیں پہن رکھا تھا جس کے سبب اس کا گلابی بدن واضح دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بڑے دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

چونکہ وہ برتھ پر دراز تھی۔ اس لئے میں اس کے سرہانے کی جانب سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہاں اس کا چہرہ اور بدن میرے زیادہ قریب تھا اور میں اس کے حسن کی رعنائیاں اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس کا قیامت خیز سراپا سرکش انداز میں میرے سامنے تھا اور میں آخر جوان تھا۔ اس لئے اس کی قربت سے میرا دوران خون تیز ہوتا جا رہا تھا اور میں خود پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''ناصر صاحب کوئی بات کیجئے تا کہ وقت پاس ہو؟'' دفعتاً اس نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا بات کروں مس۔ تین چار منٹ ہی گزارنے ہیں آپ نے۔ پھر آپ کا اسٹاپ آ جائے گا۔'' میں نے اپنی محویت سے چونکتے ہوئے کہا۔ مجھے حیرت تھی کہ اسے میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ لیہ ریلوے اسٹیشن پر مجھے کوئی نہیں جانتا تھا اور میرا نام صرف اسٹیشن ماسٹر کو معلوم تھا۔ ممکن نہیں تھا کہ اس نے اسٹیشن ماسٹر سے میرا نام معلوم کیا ہو۔

''یہ تین چار منٹ گھنٹوں میں بھی تو بدل سکتے ہیں۔'' نیلوفر نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ اس سے نگاہیں ملتے ہی میرے دماغ میں سنسناہٹ سی پھیلنے لگی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں سے کوئی نادیدہ مقناطیسی لہر نکل کر میری کھوپڑی میں سرایت کرتی جا رہی ہو۔ اس کیفیت میں چند لمحوں کے لئے میں ماحول سے یکسر بے خبر ہوتا چلا گیا۔

پھر ٹرین کی وسل نے مجھے ایک دم چونکایا اور مجھے گویا ہوش سا آ گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں سے نگاہیں ہٹا کر اس کے ہونٹوں پر نظر ڈالی تو اس کے گلابی لبوں پر دعوت انگیز مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔

”میں۔ میں سمجھا نہیں مس نیلوفر......؟“ مجھے اچانک اس کا جواب یاد آیا تو میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”مجھے اگلے اسٹیشن دورہ سے پیچھے سگنل کے پاس اترنا ہے۔“ وہ دائیں پہلو کے بل لیٹی اور کہنی کے بل سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔ ”وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر میرے گھر کو جانے والا شارٹ کٹ راستہ ہے۔ چنانچہ میں اسٹیشن پر نہیں جاتی اور وہیں سگنل پر ہی اتر کر گھر جایا کرتی ہوں مگر اسٹیشن سے گھر جانے کے لئے مجھے تقریباً ایک کلومیٹر پیدل چلنا پڑتا ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ایک منٹ کے لئے وہاں اتر کر اپنے گھر اطلاع دینے کے بعد آپ کے ساتھ چند گھنٹے اور سفر کرلوں گا۔ پھر صبح دوسری گاڑی سے واپس اپنی ڈیوٹی پر لیہ جاؤں گی۔ کیا خیال ہے؟“

اس کی پیش کش اور اپنے ساتھ چند گھنٹے گزارنے کا پروگرام سمجھ کر میرے دل کی دھڑکن ایک دم تیز ہوگئی۔ وہ صبح تک میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی اور اس کا لیٹنے کا ہوشربا انداز بتارہا تھا کہ وہ طویل وقت میں کیا کچھ کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

”میری اجازت کی کیا ضرورت ہے آپ کی خواہش ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”خواہش تو بہت ہے۔ خواہش کے بغیر دنیا میں کچھ بھی نہیں ہوتا ناصر صاحب۔“ وہ دوسرا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھتی ہوئی بولی۔

”میں سمجھا نہیں مس نیلوفر......!“ میں نے اس کے ہاتھ کی نرمی اور ملائمت محسوس کرتے ہوئے بے چین ہوکر کہا۔

”دیکھئے۔ انسان کو کھانے کی خواہش ہوتی ہے تو کھانا کھاتا ہے نا۔ بھوک کے بغیر تو اچھے سے اچھا کھانا بھی نہیں کھایا جاسکتا۔ اسی طرح پیٹ کی بھوک ہی نہیں۔ ہر قسم کی طلب اور بھوک کو مٹانا انسانی فطرت ہے۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”اچھا۔ کیا پیٹ کے علاوہ بھی کوئی بھوک ہوتی ہے؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں...... پیٹ کی طرح انسانی جسم کے ہر عضو کو بھوک لگتی ہے۔ آنکھوں کی بھوک، دل کی بھوک، بدن کی بھوک وغیرہ۔“ اس نے کہا اور ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ اٹھا کر میرے سینے پر پھیرتے ہوئے مخمور انداز میں میری طرف دیکھا اور اس کا مطلب سمجھ کر میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسی لمحے ٹرین نے وسل دی اور اس کی رفتار کم ہونے لگی۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر وقت دیکھا۔ یقیناً اگلا اسٹاپ آرہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر دیکھا تو انجن کی روشنی میں اگلے اسٹیشن کا سگنل پول دکھائی دے رہا تھا جو ابھی چار پانچ سو گز کے فاصلے پر تھا۔ مگر سگنل ابھی ڈاؤن نہیں کیا گیا تھا جس کے سبب ڈرائیور نے بریک لگائی تھی اور گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی تھی۔

”سگنل ابھی ڈاؤن نہیں ہے...... کیا آپ نے اترنا ہے......“ میں نے پلٹ کر نیلوفر سے کہا۔

”ہاں ڈیئر......“ اس نے اٹھتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔ ”اور تمہیں بھی اترنا ہے۔“

”او...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میرے بغیر ٹرین کیسے جائے گی؟“ میں نے چونک کر کہا۔

”ہماری واپسی تک گاڑی سگنل پر ہی رکی رہے گی۔ سگنل پانچ منٹ سے پہلے کبھی ڈاؤن نہیں ہوتا۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیا......؟“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”تجربہ......!“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”میں روزانہ آتی ہوں اور دیکھتی ہوں۔ تم بے فکر رہو۔ ہم صرف تین منٹ کے اندر اندر گھر میں اطلاع دے کر واپس آجائیں گے۔“

ٹرین کی رفتار کم ہوتی گئی اور پھر وہ سگنل سے چند قدم پیچھے ہی رک گئی۔ چونکہ میں پہلی مرتبہ اس ٹرین میں سفر کررہا تھا اور نیلوفر روزانہ اسی ٹرین پر یہاں آتی تھی، اس لئے میں نے یقین کرلیا کہ گاڑی یہاں پانچ منٹ کے لئے رکے گی۔

”تمہارا گھر کہاں ہے......؟“ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے ہاتھ سے باہر اشارہ کیا۔

میں نے اس طرف دیکھا تو وہاں ریلوے لائن کے متوازی دور تک گھنے درخت نظر آرہے تھے جو لائن کے قریب ہی تھے اور ٹرین کی بوگیوں میں چلنے والی روشنیاں ان درختوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن درختوں کی دوسری جانب اندھیرا ہی تھا۔

”اوہ۔ یہ تو جنگل ہے۔ کوئی آبادی نہیں ہے ادھر۔“ میں نے حیران ہوکر کہا۔

”تم آؤ تو سہی ڈیئر......“ اس نے بے تکلفی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”اس علاقے میں بجلی نہیں ہے اس لئے تمہیں آبادی نظر نہیں آرہی۔ ان درختوں کے دوسری طرف گھر ہیں۔“

اس کے ہاتھ کے لمس سے میرے بدن میں کرنٹ سا دوڑ گیا اور میں بے اختیار دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میرا ہاتھ اس کے نرم و نازک ہاتھ میں تھا۔ ٹرین سے باہر کافی سردی تھی۔ مگر نیلوفر کی قربت مجھے گرما رہی تھی۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے درختوں کی طرف بڑھنے لگی۔ درختوں کی دوسری جانب آکر میں نے دیکھا تو ہم آموں کے باغ میں تھے۔ جو نہ جانے کتنا وسیع و عریض تھا۔

”اس باغ کے باہر آبادی ہے......“ اس نے تاریکی میں آگے بڑھتے ہوئے کہا اور میرے اتنے قریب ہوگئی کہ اس کا پہلو میرے بدن سے چھونے لگا۔ اس کی قربت نے مجھ پر ہیجان سا طاری کردیا اور مجھے یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس کا برقع اور بیگ ٹرین میں ہی رہ گیا ہے۔ میں نے بے اختیار ہوکر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

”نہیں ڈیئر......“ وہ میری نیت بھانپ کر تیزی سے بولی۔ ”یہاں نہیں۔ صبر سے کام لو......“

”تمہارے حسن نے مجھ سے صبر کی طاقت چھین لی ہے......“ میں نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔

”اچھا میری جان ذرا گھر تو پہنچنے دو۔“ اس نے میرے بازو کے حلقے سے نکلتے ہوئے ہنس کر کہا۔

ایک تو اندھیرا تھا۔ دوسرا میں جذبات سے بے خود تھا اس لئے مجھے پتا نہ چلا کہ اس کی قربت میں کتنا فاصلہ طے ہوا۔ پھر مجھے سامنے کی جانب کسی چراغ کی لو ٹمٹماتی ہوئی دکھائی دی۔

”وہ بتی میرے گھر میں جل رہی ہے۔“ اس نے قدم روکتے ہوئے کہا۔ ”تم ذرا یہاں ٹھہرو۔ میں گھر میں بتا آؤں۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں بلالوں گی۔“

”جلدی آنا۔ وقت بہت کم ہے۔“ میں نے بے تابی سے کہا۔ ”گاڑی لیٹ نہ ہوجائے۔“

”بے فکر رہو ڈیئر۔ ہمارے آنے تک گاڑی ہمارا انتظار کرے گی۔“ اس نے تاریکی میں میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور مجھے اس کا ہیولہ تاریکی میں مدغم ہوتا دکھائی دیا۔ اب میں اندھیرے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر میں ٹارچ یا سگنل بتی ساتھ لے آتا تو اچھا ہوتا۔ وقت لمحہ لمحہ گزرتا گیا اور میری بے تابی میں اضافہ ہوتا رہا۔ تقریباً ایک منٹ بعد مجھے سامنے کی جانب ایک آواز سنائی دی۔

”سیدھے چلے آؤ ناصر......!“ وہ آواز نیلوفر کی ہی تھی۔

اس کی آواز سن کر میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ میرا رخ چراغ کی طرف تھا اور میں اس کی سیدھ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر پھر اچانک ہی

ایک آواز سن کر میرے قدم رکتے چلے گئے۔

وہ آواز میرے عقب سے بلند ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دو افراد آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ میں نے رکتے ہوئے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو عقب میں کچھ نظر نہ آیا۔ تاریکی میں دو قدم سے زیادہ دور کی چیز نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اچانک نیلوفر کے الفاظ گونجے کہ ٹرین ہمارا انتظار کرے گی۔ اور میں سوچنے لگا کہ یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ میری واپسی تک ٹرین رکی رہے۔ میں سنائی دینے والی آواز کو اپنا واہمہ سمجھ کر دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ لیکن جیسے ہی میں نے قدم اٹھایا۔ وہی پراسرار سرگوشیاں دوبارہ سنائی دینے لگیں اور اس مرتبہ میں خوفزدہ ہوگیا۔ میں نے چلتے چلتے ایک بار پھر چہرہ گھما کر پیچھے دیکھا تو اس دفعہ بھی بولنے والے افراد نظر نہ آئے۔ میرے ذہن پر چھائے خوف میں اضافہ ہوگیا اور میں تیزی سے قدم آگے بڑھانے لگا۔

آموں کا باغ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ شاید میں نے سو ڈیڑھ سو قدم کا فاصلہ طے کرلیا تھا لیکن نیلوفر کے گھر میں جلنے والا چراغ اب بھی پہلے جتنی دوری پر دکھائی دے رہا تھا۔ اس مرتبہ سرگوشیاں بند ہونے کے بجائے مسلسل میرا پیچھا کر رہی تھیں اور میں لرزتے قدموں کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ اب مجھے ٹرین کے انجن کا شور بھی نہیں سنائی دے رہا تھا۔ پھر اچانک میرے عقب سے ابھرنے والی سرگوشیاں ایک دم تیز ہوگئیں۔ لیکن ان کے الفاظ اب بھی میری سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے سرگوشیاں کرنے والے میرے قریب آتے جارہے ہوں۔ میرے خوف اور گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہوگیا اور میں بھی اپنی رفتار بڑھانے لگا۔ نہ جانے وہ نادیدہ افراد کون تھے اور کیوں میرے پیچھے آرہے تھے۔

چند لمحوں بعد میں چراغ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں درخت ختم ہوگئے تھے اور دور تک خودرو چھوٹی بڑی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ سامنے ایک کنواں نظر آرہا تھا۔ کنویں پر لکڑی کی چرخی میں پانی نکالنے کی رسی لپٹی ہوئی تھی جبکہ چراغ کنویں کی منڈیر پر جل رہا تھا۔ خود کو کسی آبادی کے بجائے اس ویرانے میں واقع کنویں کے پاس پا کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں نے خوفزدہ نگاہوں سے آس پاس کا جائزہ لیا لیکن وہاں کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ البتہ بائیں جانب ستاروں کی روشنی میں چند اونچی نیچی قبروں کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ شاید وہاں کوئی قبرستان تھا۔ میں نیلوفر کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ کہاں گئی اور اس کا گھر کہاں ہے جبکہ اس نے کہا تھا کہ چراغ اس کے گھر میں جل رہا ہے۔ لیکن وہاں صرف ایک کنواں تھا۔ کنویں کے پاس اگر لمبی لمبی گھاس اور سرکنڈوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کنواں زیر استعمال نہ تھا اور کافی مدت سے ویران تھا۔ میرے وہاں پہنچنے پر نادیدہ افراد کی سرگوشیاں بند ہوگئی تھیں۔ میں اپنے عقب میں پھیلے باغ کے درختوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”ناصر...... آؤ نا...... رک کیوں گئے ہو......؟“ دفعتاً مجھے نیلوفر کی آواز سنائی دی۔

میں نے تیزی سے مڑ کر آواز کی سمت دیکھا اور حیرت سے اچھل پڑا۔ وہ کنویں کی منڈیر پر بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کے لمبے بال ہوا سے اڑ رہے تھے میں اس کی طرف بڑھا تو وہ کھڑی ہوگئی۔

”تم، یہاں کیا کر رہی ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے......؟“ میں نے قریب پہنچ کر نیلوفر سے سوال کیا۔

”آؤ...... میں تمہیں گھر دکھاتی ہوں......“ اس نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے پیار سے کہا۔ اور میں اس کے لمس سے اپنے بدن میں سنسناہٹ سی محسوس کرنے لگا۔

”نہیں...... نہیں...... پہلے ہی کافی دیر ہوچکی ہے......!“ میں نے جلدی سے کہا۔

”فکر مت کرو ڈیئر...... تمہاری گاڑی تمہارے بغیر نہیں جاسکے گی......“ وہ میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولی۔

نیلوفر کی آنکھیں اندھیرے میں بھی چمک رہی تھیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس سے نگاہیں ملتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے نادیدہ مقناطیسی لہریں میرے دماغ کو جکڑ رہی ہوں۔ پھر جلدی میرا ذہن ہر قسم کے احساسات سے عاری ہوگیا۔

”میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ......“ اس نے میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا تو اس کا لہجہ کافی تحکمانہ تھا۔

اس کے ساتھ ہی وہ پلٹی اور کنویں کی منڈیر پر چڑھ گئی۔ میں بے سوچے سمجھے ہپناٹزم کے معمول کی طرح اس کی تقلید کرنے لگا منڈیر پر چڑھ کر اس نے کنویں میں قدم رکھا اور اندر اترنے لگی۔ میں نے منڈیر پر چڑھ کر کنویں میں جھانکا تو چراغ کی روشنی میں کنویں کے اندر اترنے کے لئے زینے دکھائی دیئے۔ نیلوفر زینے اترنے لگی تھی۔ چنانچہ میں اس کی پیروی کرنے لگا۔ کنویں کی تہہ میں اندھیرا تھا۔ اسی لئے اس کی تہہ نظر نہ آرہی تھی اور نہ ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ میں سحر زدہ انداز میں نیلوفر کے پیچھے پیچھے زینے سے اتر رہا تھا۔ وہ مجھ سے دو زینے آگے تھی اور منڈیر پر رکھے چراغ کی روشنی اس کی پشت پر پڑ رہی تھی اور اس کی باریک قمیص سے اس کی گلابی جلد جھانک رہی تھی۔

”احتیاط سے اترنا......!“ چار پانچ زینے اترنے کے بعد اس نے چہرہ موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی طرف دیکھا مگر چراغ کی روشنی میں اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ایک دم میرے منجمد حواس کام کرنے لگے اور خوف کی شدت سے مجھ پر کپکپی طاری ہوتی چلی گئی۔

وہ چہرہ اس خوبصورت حسینہ نیلوفر کا نہیں تھا جس نے ٹرین میں میرے ساتھ اپنی چاہت کا اظہار کیا تھا بلکہ کسی عمر رسیدہ بڑھیا سی عورت کا تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد خوفناک تھیں۔ ناک طوطے کی چونچ کی طرح خم دار اور لمبی تھی جبکہ اس کے ہونٹ بھدے اور تھوڑی تک لٹکے ہوئے تھے۔ اس بھیانک چہرے کو دیکھ کر وحشت کے مارے میری چیخ نکل گئی اور قدم لڑکھڑا گئے۔ دوسرے ہی لمحے میں زینوں پر بائیں جانب جھکا اور بے جان پتھر کی طرح گہرائی میں گرتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہوگیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اس کنویں کی تہہ میں پڑا ہوا تھا اور میرے اردگرد روشنی ہی روشنی تھی۔ دہانے کی نسبت کنویں کی تہہ کسی بڑے کمرے کی طرح کشادہ تھی، اس میں خشک انسانی کھوپڑیوں اور ہڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور میں اس میں تنہا موجود تھا۔ ان انسانی کھوپڑیوں اور ڈھانچوں کو دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ میں کسی چڑیل کے مسکن میں ہوں۔ خوف کی شدت سے میرا حلق خشک ہونے اور دم گھٹنے لگا۔ پھر مجھے نیلوفر کی بدلی ہوئی شکل یاد آئی۔ یقیناً وہ کوئی خون آشام چڑیل ہی تھی جو مجھے جذبات کے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئی تھی۔ کنویں میں پڑی کھوپڑیوں اور ہڈیوں سے اپنا انجام صاف نظر آرہا تھا۔

دفعتاً کسی کے ہنسنے کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی میں نے جلدی سے بائیں جانب دیکھا اور دہشت کی شدت سے میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس جانب کونے میں نیلوفر کھڑی ہنس رہی تھی اس کا بدن لباس کی قید سے آزاد تھا مگر وہ نوجوان کے بجائے کسی سو سالہ بڑھیا کا کمزور اور جھریوں بھرا جسم تھا اور پتلی جلد سے ہڈیاں جھانک رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں کے ناخن ایک ایک انچ لمبے تھے اور پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ہنسنے سے اس کے منہ کے اندر لمبے اور نوکیلے دانت نظر آرہے تھے۔ اس کی خوفناک آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور وہ خون آشام نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”ناصر ڈیئر۔ مجھے بے حد پیاس لگی ہے کیا کروں؟“ دفعتاً نیلوفر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”پپ۔ پا۔ پانی پی لو......“ میرے منہ سے خوف کے مارے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

”نہیں۔ میری پیاس صرف تمہارے خون سے ہی بجھ سکتی ہے ڈیئر......“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہارا گرم اور تازہ خون چاہئے۔ کیوں کہ تم نوجوان ہو اور میں ہمیشہ جوان خون پسند کرتی ہوں۔“

''نن...... نہیں...... نہیں......!'' میں دہشت کی شدت سے گھگھیانے لگا۔

''ڈرو مت میری جان......'' اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے باغ میں تم نے میرے بدن سے اپنے دل کی پیاس بجھانے کی کوشش کی تھی۔ تب تمہیں ڈر محسوس نہیں ہوا تھا اور اب کیوں مجھ سے خوفزدہ ہو......''

''تت...... تم۔ تم چڑیل ہو......'' میں نے بہ مشکل کہا اور الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگا۔

''بہت خوب۔ اب میں تمہیں چڑیل نظر آتی ہوں۔'' اس نے طنزیہ انداز میں ہنس کر کہا۔ ''ٹرین میں تو تم مجھ پر لٹو ہو رہے تھے، میرے بدن کی رعنائیوں سے اپنی آنکھیں سینک رہے تھے۔ آؤ مجھ سے لپٹ جاؤ ڈیئر......''

اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا دیئے۔ مگر میں نے جواب میں کچھ نہ کہا۔ خوف سے میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔

''تم میری پیاس بجھائے بغیر نہیں جا سکتے ناصر۔ اگر میں نے تمہارا گاڑھا اور سرخ خون نہ پیا تو ہمیشہ کے لئے مر جاؤں گی۔'' وہ بولتی ہوئی میرے قریب آتی چلی گئی۔ میں پیچھے ہٹتا ہوا کنوئیں کی دیوار سے جا لگا۔

''میں سو برس سے صرف تازہ اور گرم خون پر زندہ ہوں ناصر ڈیئر......'' اس نے رکے بغیر کہا اور میرے بالکل قریب پہنچ گئی۔

میں دیوار سے لگا دہشت سے کانپ رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے بھیانک موت رقص کر رہی تھی۔ اس چڑیل سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہ آ رہی تھی۔ اس نے میرے سامنے رک کر اپنے تیز ناخنوں والے دونوں ہاتھ میری گردن کی طرف بڑھائے تو میں نے آخری چارے کے طور پر ایک دم اس کے پیٹ میں لات رسید کر دی۔ مگر فوراً ہی درد سے میری چیخ نکل گئی۔ میرا پاؤں ایک درخت کے تنے سے ٹکرایا تھا اور میں لڑکھڑا گیا۔ میں نے خود کو بہ مشکل سنبھالا اور ادھر ادھر دیکھا تو ماحول بدل چکا تھا۔ میں باغ میں اس جگہ کھڑا تھا جہاں نیلوفر مجھے چھوڑ کر اپنے گھر گئی تھی۔

اسی لمحے مجھے ٹرین کا وسل سنائی دیا تو میں بوکھلا کر پلٹا اور ریلوے لائن کی طرف دوڑنے لگا۔ باغ سے نکل کر میں ریلوے لائن کے قریب پہنچا تو سگنل ڈاؤن ہو چکا تھا اور ٹرین حرکت میں آ کر سست رفتاری سے حرکت کر رہی تھی۔ میں فوراً دوڑ کر رینگتی ہوئی ٹرین کی طرف بڑھا اور گارڈ روم میں سوار ہو کر ہانپتا ہوا اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹرین کی رفتار بڑھتی گئی اور اگلا اسٹیشن قریب آنے لگا۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مجھ پر جو گزری تھی وہ حقیقت تھی یا کوئی خواب......؟

میں نے برتھ کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا۔ وہاں نہ نیلوفر کا برقع تھا اور نہ ہی اس کا بیگ نظر آ رہا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ واقعی نیلوفر کی شکل میں ایک چڑیل نے مجھے شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھ سے پہلا گارڈ چونکہ ادھیڑ عمر بوڑھا تھا۔ اس لئے چڑیل کبھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی اور چونکہ وہ چڑیل صرف جوان خون پینے کی عادی تھی۔ اس لئے اس نے مجھے اپنے حسن و جوانی کے جال میں پھنسایا اور غلط بیانی کر کے باغ کے درختوں میں لے گئی تھی لیکن میں اس پر حملہ کر کے اس کی کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ آپ بھی غور کریں کہ میں نے خواب دیکھا تھا یا واقعی، میں ایک چڑیل کا شکار ہونے سے بال بال بچا تھا۔

بہر حال میں اس واقعہ سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ منزل پر پہنچتے پہنچتے میں تیز بخار میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرے روز میں واپس ٹرین کے ساتھ ملتان پہنچا اور آفس سے بیماری کی رخصت لے لی۔ تیسرے دن میری طبیعت سنبھل گئی تو میں نے والد صاحب کی سفارش سے اپنی ڈیوٹی تبدیل کرا لی اور تھل ایکسپریس کے بجائے مین لائن پر چلنے والی تیز رو ایکسپریس میں بطور گارڈ فرائض انجام دینے لگا۔ لیکن وہ خوفناک واقعہ آج تک مجھے یاد ہے۔

سمادھی کا بھوت

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

انتظار کی گھڑیاں بہت کٹھن ہوتی ہیں اور یہ حقیقت اس کہانی میں پنہاں ہے، مرنے کے بعد بھی انتظار کرنے والے کی روح ایک مقررہ وقت پر اپنے مطلوبہ وجود کا انتظار کرتی رہتی تھی اور پھر آخر کار......

خود غرضی اور ہوس پرستی کے گرداب میں ڈولتی ہوئی دل شکستہ اور دل فگار کہانی

میری طبیعت آج بہت بے چین تھی۔ میں ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھا مجھے سنیل کے خط کا انتظار تھا۔ ہر چند اپنا دل دوسرے کاموں میں لگانا چاہتا تھا مگر چمپا کی یاد کچھ نہ کرنے دیتی۔ میری سب امیدیں سنیل کے خط سے وابستہ تھیں...... میں اپنی زندگی کی بیس منزلیں طے کر چکا تھا۔ اب تک کسی عورت نے میرے دل پر قبضہ نہ کیا تھا۔ عشق و محبت میرے نزدیک بالکل لغو اور بے معنی الفاظ تھے۔ لیکن آہ برا ہو سنیل کا جو مجھے شکار کی غرض سے کرپا چو پارہ ایک پہاڑی گاؤں میں اپنے ایک دوست کے گھر لے گیا۔ جہاں میں اپنے دیہاتی میزبان رام شنکر کی لڑکی چمپا کے تیر نگاہوں کا خود ہی شکار ہو گیا۔

چمپا بحر حسن کا انمول موتی تھی۔ وہ اس وقت سترہ اٹھارہ سالہ دوشیزہ تھی مگر اپنے حسن و شباب سے قطعاً بے

خبر چمپا اپنے پتا کی توجہ سے علم میں کافی دسترس رکھتی تھی۔ اسی تعلیم کے اثر سے وہ دیہاتی لڑکیوں سے بالکل جداگانہ طبیعت کی مالک تھی۔ میں نے سنیل کے ذریعے رام شنکر کو رشتے کا پیغام دیا جو اس نے نامنظور کردیا۔ تاہم سنیل کے خطوط مجھے برابر آتے رہے اس کا خیال تھا کہ رام شنکر ایک شہری امیر زادے کو رشتہ دیتے ہچکچاتا ہے لیکن عنقریب ہی وہ رضامند ہوجائے گا۔

آج کئی دن سے سنیل کا خط نہ آیا تھا۔ اسی وجہ سے میں مضطرب تھا۔ بارہ بجے کے قریب ملازم ایک لفافہ لایا۔ میرے دل کا کنول کھل گیا۔ مگر خط دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سنیل کا خط نہ تھا بلکہ میرے ایک دوست آکاش کی طرف سے دعوتی رقعہ تھا۔ اس نے رات کو مجھے کھانے پر مدعو کیا تھا۔

آکاش کی کوٹھی میری کوٹھی سے ملحق تھی۔ وہ کوئی نوے سال کا بوڑھا آدمی تھا لیکن کاٹھی اچھی پائی تھی۔ اسے یہاں آباد ہوئے نصف صدی گزر چکی تھی۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اسے اسی حالت میں دیکھا باوجود اس دیرینہ ہمسائیگی کے ہمارا آپس میں میل جول نہ تھا۔ یوں تو بار ہا پھاٹک سے گزرتے وقت میرا اس کا سامنا ہوتا مگر معمولی خیر خیریت کے سوائے اس نے کبھی مجھے بات چیت کا موقع نہ دیا تھا۔

آکاش بہت بدمزاج، چڑچڑا اور سخت گیر آدمی تھا۔ اس کو آج تک کسی نے ہنستے نہ دیکھا تھا۔ لوگ اس سے نفرت کرتے تھے، اس کو مغرور کہتے تھے۔ آج اس کی طرف سے دعوتی رقعہ پاکر مجھے سخت تعجب ہوا۔ آکاش اور دعوت انہونی بات معلوم ہوتی تھی۔

رات میں وقت مقررہ پر میں آکاش کے یہاں پہنچ گیا۔ اس نے دروازے پر میرا استقبال کیا۔ اس کی خشونت اور سخت گیری دور ہوچکی تھی اور وہ حسن اخلاق کا دیوتا معلوم ہوتا تھا۔ وہ مجھے لائبریری میں لے گیا جہاں تین اور مہمان بھی تھے ان مہمانوں کو دیکھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

یہ رام شنکر اور اس کی لڑکی چمپا تھے تیسرا مہمان روی تھا جو آکاش کا مشیر قانونی تھا۔ یہ لوگ ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے وہ مجھے بڑی گرمجوشی سے ملے۔ اس ملاقات کو کچھ پراسرار خیال کرتے ہوئے میں کھٹکا اور چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا۔

"روی کچھ لکھ رہا تھا۔ میرے دل میں سینکڑوں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد روی اپنے کام سے فارغ ہوا اور کاغذ میری طرف سرکا کر کہنے لگا۔

"آکاش کی خواہش ہے کہ آپ ان کی وصیت پر بطور گواہ کے دستخط کریں۔"

وصیت کا مضمون پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ آکاش اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیر منقولہ جس کی مالیت دس لاکھ روپے ہے چمپا کے نام اس شرط پر وصیت کرتا ہے کہ وہ تمام عمر کنواری رہے ورنہ بصورت دیگر یہ تمام جائیداد یتیم خانوں کو ملے دوسرا وہ اقرار نامہ تھا چمپا کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

نفس مضمون سے آگاہ ہو کر یاس واندوہ سے میرا دل بیٹھنے لگا میں نے دستخط تو کردیئے لیکن میری حالت ناگفتہ بہ تھی۔ میری تمام آرزوؤں کا خون ہوچکا تھا۔ وہ تمام ہوائی قلعے جو میں نے تیار کر رکھے چشم زدن میں مسمار ہوگئے۔ میرا سر چکرا رہا تھا۔ تاہم حوصلہ کرکے بیٹھا رہا۔

یہ کام ختم کرکے آکاش ہمیں کھانے کے کمرے میں لے گیا۔ میز انواع واقسام کی نعمتوں سے پر تھا مگر مجھ سے ایک لقمہ بھی نہ اٹھایا گیا آکاش میری حرکات وسکنات کا پرغور مطالعہ کررہا تھا۔

کھانے کے بعد روی رخصت ہوا رام شنکر اور چمپا اپنے اپنے مخصوص کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ ایک میں تھا کہ نقش پا کی طرح جوں کا توں جما رہا۔ میرا دماغ بوجھل ہو رہا تھا۔ میں سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا۔ کمرے میں مکمل سکوت تھا۔ آخر آکاش نے مہر خاموشی توڑتے ہوئے کہا۔ "ونود!"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ متانت سے بولا۔

"مجھے معلوم ہے تم کس خیال میں ہو اور! یہ سب کچھ میں نے مظلوم چمپا کی بہتری کے لئے کیا ہے۔ یہ ایک راز ہے جو میں تم پر ظاہر کردینا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے رام شنکر کی زبانی معلوم ہوا ہے کہ چمپا سے شادی کے خواہش مند ہو......" یہ کہتے ہوئے وہ میرے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔

آکاش کہنے لگا۔ "بچپن میں مجھے اپنی پھوپھی کی لڑکی سے محبت تھی۔ اس لڑکی کا نام چمپا تھا۔ میرا پھوپھا جاگیردار تھا میری پھوپھی سے اس کی دوسری شادی تھی۔ اس کی پہلی بیوی سے بہت سی اولاد تھی مگر میری پھوپھی سے صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ میرے ماتا پتا سورگ باش ہوچکے تھے۔ پھوپھی نے ہی میری پرورش کی تھی۔

چمپا امیر آدمی کی لڑکی تھی اور میں ایک یتیم لڑکا لیکن آہ! محبت اندھی ہوتی ہے۔ میں اس پر پروانہ وار فدا تھا۔ 1864ء میں جب کہ میں اٹھارہ سالہ نوجوان تھا میرے پھوپھا کا انتقال ہوگیا۔ ان کی موت کے بعد پھوپھی کے ساتھ سوتیلی اولاد نے بہت برا سلوک کیا۔ چونکہ ان کو میرا بھی وہاں رہنا سخت ناگوار تھا اس لئے میرے متعلق چمپا پر تہمتیں تراشنے لگے۔

پھوپھی نہایت صابر تھی۔ ان کے سب ظلم وستم سہتی رہتی مگر چمپا کے ساتھ ان کا حقارت آمیز سلوک برداشت نہ کرسکی اور گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ پھوپھی نے اپنے زیورات بیچ کر ہری پور کے علاقہ میں موضوع کھوڑ کے قریب کچھ اراضی خرید لی۔ ہم لوگ وہیں جھونپڑی بنا کر رہنے لگے اور اب اس اراضی کی کاشت پر ہمارا گزارا تھا۔

چمپا مجھ سے پانچ سال چھوٹی تھی جو چند سال میں ایک مکمل عورت بن گئی۔ پھوپھی کو چمپا کی بہت فکر تھی۔ ایک دن وہ تنہائی میں مجھ سے کہنے لگی۔

آکاش تم دیکھتے ہو۔ میری صحت روز بروز گر رہی ہے۔ تم جوان آدمی ہو اگر ہمت کرو گے تو ہماری مشکلیں آسان ہوسکتی ہیں۔

پھر میرے حلفیہ اقرار پر کہنے لگی۔

ہری پور میں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔ اس کا پتی ایک کمپنی کا حصہ دار ہے۔ یہ کمپنی مصر میں آثار قدیمہ کی کھدائی کا کام کرتی ہے اگر تم مصر جا کر روپیہ کما لاؤ تو تمہارے ساتھ چمپا کا نکاح کرکے اپنے فرض سے سبکدوش ہوجاؤں۔

پھوپھی کے ارادے سے آگاہ ہو کر ایک مسرت کی لہر میری رگوں میں دوڑ گئی۔ یہ وہ وقت تھا کہ ہمارے علاقے میں کوئی ریل گاڑی کا نام نہ جانتا تھا اور دس بیس میل بھی اکیلے سفر کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ مصر جانا گویا قطب شمالی کی مہم پر جانے کے برابر تھے۔ لیکن چمپا سے وابستہ ہونے کے لئے مصر کا سفر کوئی سفر نہ تھا۔

میری مستعدی دیکھ کر پھوپھی بہت خوش ہوئی۔ اسی دن پھوپھی نے مجھے تین سو روپیہ نقد اور ایک طلائی زنجیر دی۔ یہ روپیہ اور زنجیر میری ماں نے مرتے وقت پھوپھی کے پاس امانت رکھے تھے تاکہ میں بڑا ہو کر کسی ضرورت کے وقت کام میں لاسکوں۔ یہ زنجیر بہت بیش قیمت تھی۔ اس کے درمیان ایک سورج مکھی کا پھول بنا ہوا تھا جس پر قیمتی نگینے جڑے ہوئے تھے۔

دوسرے دن صبح سویرے نکلا تو چمپا نہایت مغموم چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس کی صورت پر حسرت برس رہی تھی۔ میں جانتا تھا کہ میری جدائی کے غم نے اسے نڈھال کررکھا ہے۔ میں بھی چپ چاپ اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے اپنی بڑی بڑی سرمگیں آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔

اس کی آنکھوں سے محبت کے چشمے ابل رہے تھے۔ آہ! اگر میرے پاس دنیا بھر کی دولت ہوتی تو ان غم آلود نگاہوں پر تصدیق کردیتا مگر میرے پاس اس وقت سوائے ایک پرمحبت دل کے اور کوئی چیز نہ تھی جو میں بارگاہ حسن میں پیش کرسکتا۔

اپنی ناداری اور مجبوری کو محسوس کرکے میری پیشانی عرق آلود ہوگئی۔ میری آنکھیں بار ندامت سے جھک گئیں یکایک مجھے اس زنجیر کا خیال آیا جو میری ماں کی نشانی تھی۔ میں دوڑا ہوا اندر گیا اور زنجیر لاکر چمپا کے گلے میں ڈال دی اور کہا۔

چمپا یہ ایک مسافر کی نشانی ہے۔ اس کو اپنی سگائی کا

تحفہ سمجھ کر اپنے گلے سے جدا نہ کرنا۔" چمپا نے وعدہ کیا کہ وہ اس زنجیر کو اپنی جان کے ساتھ رکھے گی۔

اسی دن ہم لوگ ہری پور گئے۔ جہاں پھوپھی نے مجھے اپنی سہیلی کے پتی کے سپرد کیا۔ اور چند دنوں میں اپنے سرپرست کی معیت میں مصر کی مہم پر روانہ ہوگیا۔

مجھے ساتھ لے جانے والا بہت مہربان اور نیک آدمی تھا۔ چھ مہینے تک میں اس کے پاس بطور ملازم کام کرتا رہا۔ مگر بعد میں اس نے مجھے ہر طرح قابل اور محنتی پا کر حصہ دار بنالیا۔ قسمت یاور تھی۔ میں خوب روپیہ کمانے لگا۔ ان دنوں ڈاک کا سلسلہ بھی محدود تھا اس لئے کبھی کبھی مجھے پھوپھی کا خط ملا کرتا۔ جس میں وہ میری کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتی۔

تین سال بعد چمپا کے ایک خط سے مجھے پھوپھی کے انتقال کی اطلاع ملی۔ چمپا نے لکھا تھا کہ میں گھبرا کر جلدی آنے کی کوشش نہ کروں کیوں کہ اس نے اپنی بوڑھی اماں کو اپنے پاس بلالیا تھا جو سگی ماں کی طرح اس کی حفاظت کررہی تھی۔

☆☆☆

میں اپنا کام برابر سرگرمی سے کرتا رہا حتیٰ کہ وہ دن بھی آپہنچا کہ ہم اپنے وطن کو واپس لوٹے۔ گردش کے ایام گزر چکے تھے۔ میں اس وقت دو لاکھ روپے کا واحد مالک تھا۔ اپنی شاندار زندگی کے دلآویز نظارے میرے پیش نظر تھے خوشیوں سے بھری ہوئی دنیا میری منتظر تھی۔ میں چمپا کو آغوش میں لینے کے لئے بے قرار تھا...... اس زمانہ میں بحری سفر بے حد خطرناک ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ خیر تمام سفری صعوبتوں کے بعد ہم لوگ اپنے شہر پہنچے۔ یہاں میں نے چمپا کے لئے قیمتی زیور اور خوبصورت کپڑے خریدے اور ہزاروں آرزوئیں دل میں لئے گھر کو روانہ ہوا۔ ان دنوں ریل گاڑی صرف لاہور تک آتی تھی اور باقی سفر تانگے اور رتھوں کے ذریعہ طے کیا جاتا تھا۔ جب میں سفر کی صعوبتیں سہتا ہوا ہری پور پہنچا تو معلوم ہوا کہ تمام علاقے میں ہیضہ پھیلا ہوا ہے۔ ہزار ہا جوان بوڑھے اور بچے اس وبا کی نذر ہوگئے۔ اس خبر سے میرا دل بجھ گیا۔ مجھے چمپا کی فکر ہوئی جس کی خیریت کی خبر مجھے اک عرصہ سے نہ ملی تھی۔

گو میرا گھر یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا مگر میں نے ہری پور میں گھڑی بھر دم نہ لیا اور وہاں سے چل دیا۔ راستے میں جو گاؤں ملتا سنسان گلی کوچے اجاڑ، کنوئیں جن پر پانی بھرنے والی پری وشوں کے جھرمٹ ہوتے تھے بالکل ویران پڑے تھے۔ جہاں پر امیروں کی محفل جما کرتی تھی اور بانکے کڑیل نوجوان خوش گپیاں ہانکا کرتے تھے قبرستان کی طرح خاموش تھے۔ اس تباہی و بربادی پر میں کانپ اٹھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں چمپا بھی اس وبا کی نذر نہ ہوگئی ہو۔

ساون کا مہینہ تھا۔ اس سال برسات اس کثرت سے ہوئی تھی کہ کھیت اور میدان دریا بن رہے تھے۔ جس طرف نگاہ اٹھتی سوائے عالم آب کے کچھ دکھائی نہ دیتا۔ وبا پھیلنے کی بھی یہی وجہ تھی کنوؤں کا پانی خراب اور ہوا زہریلی ہوچکی تھی۔

دوپہر کا وقت تھا ایک خاص قسم کی بھڑاس کھیتوں سے نکل کر فضا کو گندہ کررہی تھی جس سے خود بخود طبیعت میں اضمحلال پیدا ہورہا تھا۔ مجھے دور سے اپنی جھونپڑی دکھائی دی۔ اس کا دروازہ بند دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگے۔ مگر ساتھ ہی میری نظر بڑ کے تناور درخت پر پڑی۔ اس کے نیچے کوئی چارپائی پر سورہا تھا۔ یہ چمپا تھی۔

میں والہانہ اشتیاق سے آگے بڑھا۔ وہ اس ویرانے میں بے خبر سورہی تھی۔ اس کی دراز مشکیں بال چارپائی سے نیچے گر رہے تھے۔ وہ سفید ڈھیلے ڈھالے لباس میں تھی اس کا دلکش چہرہ اترا ہوا تھا۔ جس سے یاس و حرماں کے علامات ہویدا تھے۔ عالم خواب میں اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کے سینے سے ایک ڈیڑھ دوسالہ بچہ لپٹا ہوا تھا۔

میں پرمحبت نگاہوں سے اس کے زاہد فریب حسن کا نظارہ کرنے لگا لیکن جوں ہی میری نظر اس کے بچے پر پڑی میں دھک سے رہ گیا اس بچے کی شکل ہوبہو چمپا جیسی تھی۔ ذہنی اضطراب سے میرا دل پھٹنے لگا۔ "آہ چمپا نے مجھ سے بے وفائی کی۔" یہ خیال اتنا اشتعال انگیز تھا کہ غیرت سے میرا خون کھولنے لگا۔ میرے نزدیک چمپا ایک فاحشہ عورت تھی۔ میں حالت غیظ میں زمین پر پاؤں پٹخنے لگا۔

دفعتاً میرا پاؤں اس کی لٹکی ہوئی زلفوں سے الجھا جس کی تکلیف سے وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ مجھے دیکھ کر ایک خوشی کی چیخ اس کے منہ سے نکلی اور اپنے غمگین چہرے پر مسکراہٹ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ تعظیم کو اٹھی۔

اس کی ڈھٹائی پر میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ میں نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

"چمپا بچہ کس کا ہے؟"

وہ نہایت طمانت سے بولی۔ "اب میرا ہی سمجھئے!"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں یہ ہے تو تمہارا ہی بچہ مگر اس کا باپ کہاں ہے؟"

وہ کہنے لگی۔ "میں اس کی بابت کچھ نہیں جانتی۔ شاید وہ کوئی مسافر تھا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے بچہ گود میں لے لیا۔ جواب رو رہا تھا۔ بچے کو اس کی گود میں دیکھ کر مجھے تاب نہ رہی، میں نے کڑک کر کہا۔ "بے حیا لڑکی! تو نے خاندان بھر کی ناک کاٹ ڈالی۔ تجھ پر اور تیرے آشنا پر جس کا تو نے بچہ جنا ہے ابدی لعنت ہو۔"

میرے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ کانپ گئی اور سسکتی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔

"آ کاش خدا کے لئے یہ شرمناک الزام مجھ پر نہ لگاؤ یہ بچہ تو مجھے کل ہی ملا ہے۔ اس سے پیشتر میں نے اس کو دیکھا تک نہ تھا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہمارے علاقے میں سخت وبا پھیلی ہوئی ہے۔ تمام علاقہ تباہ و برباد ہوگیا ہے چنانچہ میری اماں بھی جس کو میں نے اپنے پاس بلالیا تھا اسی وبا کی بھینٹ چڑھ گئی۔ اب میں یہاں تنہا تھی اس بیابان کے خوفناک سناٹے میں میرا دل سخت گھبرا رہا تھا اس لئے میں قریب و جوار کے گاؤں میں جا کر وبا زدہ لوگوں کی خدمت کرنے لگی۔

کل میں تمام دن مریضوں کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ رات کو جب میں وہاں سے واپس آرہی تھی تو راستے میں بارش نے آلیا۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک سے خوفزدہ ہوکر میں نے بھاگنا شروع کیا لیکن جب موضع کھوڑ کے قریب پہنچی تو بارش بڑے زور و شور سے ہونے لگی اور مجھے اس کی یورش سے بچنے کے لئے اس اجاڑ بستی کے ایک تاریک گھر میں پناہ گزین ہونا پڑا۔ اس تاریک اور ہولناک فضا میں پریشان روحیں منڈلاتی معلوم ہوتی تھیں ہر طرف موت کا تسلط تھا قریب کے ایک گھر سے باد و باراں کے طوفان میں ملی جلی انسانی آہ و بکا کی آواز آرہی تھی جس نے میرے خوف و ہراس میں مزید اضافہ کیا۔ میں آنکھیں بند کرکے دیوار کے سہارے بیٹھ گئی۔

بارش تھم کر مطلع صاف ہوا تو میں اس ڈراؤنے گھر سے باہر نکلی۔ ابھی تک کسی بدنصیب کی آہ و زاری ختم نہ ہوئی تھی اس لئے میرے ضمیر نے گوارا نہ کیا کہ ایک دکھی کو ایسی حالت میں چھوڑ کر چلی جاؤں۔ چنانچہ میں اس ماتم کدہ کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی اندر ایک کونے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ سامنے ایک عورت کی لاش پڑی تھی جس کے پاس ایک بوڑھا آدمی اس بچے کو گود میں لئے دردناک بین کررہا تھا۔ یہ شخص انتہائی صدمہ سے پاگل ہورہا تھا اور عالم دیوانگی میں کہہ رہا تھا۔ "ستیہ بالا۔ ستیہ بالا، میں نے ظلم تم پر کیا تھا، مجھ سے قدرت اس کا انتقام لے رہی ہے۔ میں نے تمہارا ایک بچہ چھینا تھا جس کے عوض پرماتما نے مجھ سے کئی بچے چھینے۔ اور اب یہ میرا آخری بچہ ہے جسے میں نے بڑی منتوں اور آرزوؤں سے پایا تھا میرے سامنے بلک رہا ہے۔"

آہ! یہ صدمہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ اے مظلوم ستیہ بالا میں تجھے کہاں تلاش کروں۔ تیری آتما امن و سکون کی غیر فانی دنیا میں پرواز کررہی ہوگی۔ تمہیں کیا غرض کہ ایک بدعہد اور بدطینت کی گریہ و زاری سنو مگر نہیں! ستیہ بالا! بہت رحم دل تھی۔ وہ مجھے معاف کردے

گی اور اس بے ماں کے بچے کو اس بچے کے عوض جو میں نے اس سے چھینا تھا لے کر میرے بارِ غم کو ہلکا کر دے گی۔" پھر وہ لگاتار ستیہ بالا ستیہ بالا، کہہ کر چلانے لگا۔

اس بوڑھے کی حالت پر مجھے بہت رحم آیا۔ میں اس کی دلجوئی کے لئے اندر چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر بوڑھے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا۔

"اوہ! اے نیک ستیہ بالا کی آتما۔ آخر تمہیں میری حالت پر رحم آ ہی گیا۔ افسوس میں نے تمہاری قدر نہ کی۔" میں نے کہا۔

"میں ستیہ بالا نہیں ہوں' میرا نام چمپا ہے اور تمہارا واویلا سن کر آئی ہوں۔"

"نہیں نہیں! میری نگاہ کبھی غلطی نہیں کرتی، تم اسی کی آتما ہو۔ پرماتما کے لئے میرے سب گناہ معاف کر دو۔ نیک آتمائیں کسی سے دشمنی نہیں رکھتی اور اس بچے کو لے جاؤ۔ یہ بچہ بالکل تمہارے بچے کا ہمشکل اور اسی عمر کا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے بچہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اس مظلوم کا دم توڑنا پسند نہ کیا اور بچے کو گود میں اٹھا کر گھر چلی آئی۔

میں نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن اس بچے کی شکل گواہی دے رہی ہے کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔"

وہ لرز کر کہنے لگی۔

"آہ! آ کاش یہ بالکل اتفاق کی بات ہے ورنہ میں ہرگز نہیں جانتی کہ یہ بدنصیب بچہ کس کا ہے۔"

میں کڑے تیوروں سے چمپا کو دیکھ رہا تھا۔ یکایک میری نظر اس کے گلے پر پڑی۔ میری دی ہوئی زنجیر اس کے گلے میں موجود نہ تھی۔ میں نے اسے جھٹلاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم سچی ہو تو میری دی ہوئی زنجیر گلے میں کیوں نہیں؟"

یہ سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے بدحواسی سے گلے پر ہاتھ پھیرا اور زنجیر نہ پا کر تھراتے ہوئے میرے پاؤں پر گر کر بیہوش ہو گئی۔ میں نے حقارت سے اس کے سر کو پاؤں کی ٹھوکر سے پرے دے پٹکا اور وہاں سے چلا آیا۔

میں چند سال ہری پور میں مقیم رہا مگر بعد میں آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے راولپنڈی چلا آیا۔ یہاں میں نے بہت سی زمین خرید لی اور باقی روپیہ تجارت میں لگا دیا۔ اس واقعہ سے میرا امزاج سخت چڑچڑا ہو گیا اور خصوصاً عورتوں، بچوں سے مجھے سخت نفرت ہو گئی۔

☆☆☆

اس شکستہ دلی کی حالت میں، میں نے ساٹھ سال گزار دیئے۔ لیکن آج سے چند ماہ پیشتر مجھ پر ایک ایسے راز کا انکشاف ہوا جس نے میری زندگی کو بالکل بدل دیا۔

گزشتہ مارچ کو مجھے ایک دلال سے اطلاع ملی کہ موضع نور پور کے قریب ایک بیوہ کی بہت سی زمین فروخت ہونے کو ہے مجھے وہاں زمین کی ضرورت تھی اس لئے میں نے فوراً وہ زمین خرید لی۔ موضع نور پور ایک نہایت خوشحال گاؤں ہے جو ایک سرسبز و شاداب خطہ میں واقع ہے۔

بہار کا موسم تھا، کھیتوں اور میدانوں کی گود سبزے سے بھری ہوئی تھی۔ نونہالانِ چمن کی دھانی پوشاک آنکھوں میں سمائی جا رہی تھی۔ خوشبودار پھولوں سے مزین جھاڑیوں پر بلا کا نکھار تھا۔ درختوں پر بہار شان بے نیازی سے کھڑے اپنی عظمت و جلال کا مظاہرہ کر رہے تھے ایک طرف سیال چاندی کی طرح نورانی چشمہ فردوسی گیت گاتا ہوا بہہ رہا تھا۔

انہی ایام میں ایک دن میں اپنے مزارع کے ہمراہ زمین کی دیکھ بھال کر کے واپس آ رہا تھا۔ شام کافی ہو چکی تھی مگر ایک دھندلا سا اجالا ابھی تک چار سو محیط تھا۔ ایک موڑ کے قریب جہاں شاہراہ سے ایک راستہ گاؤں کی طرف گھومتا تھا، ہمارے گھوڑے رک گئے۔ میرا ساتھی کہنے لگا۔

"یہ سادھو والا موڑ ہے۔ گھوڑے سوار سمیت آگے نہیں بڑھیں گے۔"

میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا "وہاں ایک بھوت رہتا ہے جسے دیکھ کر جانور آگے نہیں بڑھتے۔"

ہم دونوں نیچے اترے، میں نے قدم بڑھایا تو فضا میں ایک ہلکا سا ارتعاش اور دھیمی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میرے ساتھی نے کہا۔

"یہ سرسراہٹ اسی بھوت کے گزرنے سے ہوئی ہے۔"

میں گھر پہنچ کر تمام رات سوچتا رہا کہ یہ کسی جانور کے پاؤں کی سرسراہٹ تھی یا سچ مچ کوئی اسرار تھا۔ دوسرے دن جب میں پھر اپنے ساتھی سمیت وہاں سے گزر رہا تھا تو وہی سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے اچھی طرح ارد گرد دیکھا لیکن کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دی۔

چنانچہ ایک دن جب کہ میرا ساتھی بیمار تھا۔ میں کھیت پر اکیلا ہی مزدوروں سے کام کرواتا رہا۔ اس دن مجھے کافی دیر ہو گئی۔ میں واپسی پر تنہا تھا۔ اماوس کی آخری راتیں تھیں۔ میں ٹارچ ہاتھ میں لئے اطمینان سے راستہ طے کر رہا تھا۔ جب سادھو والے موڑ پر پہنچا تو پھر وہی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں لاپرواہی سے آگے بڑھتا گیا۔

یکایک مجھے قریب سے ایک دلدوز آہ سنائی دی۔ میں ایک لمحہ کے لئے رک گیا۔ میں نے دوبارہ قدم اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے پھر آہ بھری۔ ان آہوں میں کچھ ایسا تاثر تھا کہ باوجود انتہائی خوف کے میرے پاؤں زمین سے نہ اٹھ سکے۔

یکایک مجھے اپنے سامنے چند قدم کے فاصلے پر ایک سفید اور لطیف سا دھواں دکھائی دیا۔ میں عجب سے اس کو دیکھنے لگا پھر آہستہ آہستہ وہ دھواں سادھو کی طرف بڑھنے لگا۔ جو دور ایک ویران باغ کی آخری کونے میں بنی ہوئی تھی۔ اس دھوئیں کا حرکت کرنا تھا کہ خود بخود میرے پاؤں کو بھی جنبش ہوئی اور میں بغیر کسی ارادے کے اس طرف چلنے لگا۔ گو خوف سے میرا رواں رواں کانپ رہا تھا تاہم کوئی نامعلوم قوت مجھے اس طرف کھینچ رہی تھی کہ میں بالکل اس پرانی سادھو کے قریب پہنچ گیا۔

سادھو کی عمارت بوسیدہ اور چاروں طرف سے بند تھی۔ جس کو برگد کے گنجان درختوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک پرانے زمانے کی باؤلی تھی جس کی ایک دیوار بالکل اسی سادھو سے ملحق تھی۔ وہ سفید سایہ سادھو سے آگے بڑھ کر باؤلی کے قریب ٹھہر گیا اور پھر آہوں کی آواز آنے لگی۔

یکایک وہ سایہ سیڑھیوں کے ذریعے باؤلی میں اترنے لگا۔ میں بھی کسی پراسرار کشش کے ماتحت اس کے پیچھے چلنے پر مجبور ہوا۔ شکستہ سیڑھیاں زنگ آلود ہونے کی وجہ سے چکنی ہو رہی تھیں۔ ہر قدم پر خطرہ تھا کہ اس زنگ پر سے پھسل کر میں نہ گر جاؤں لیکن دوسو سیڑھیاں اتر کر پانی کے قریب آ گیا۔

یک دم وہ سایہ دیوار کے ساتھ ساتھ باؤلی میں چلنے لگا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو باؤلی کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی روشنی بنی ہوئی تھی۔ جس پر ایک آدمی بمشکل چل سکتا تھا اب چونکہ میں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکا تھا۔ بادل نخواستہ اس سایہ کے پیچھے روش پر چلنے لگا۔ روش کے اختتام پر وہ سایہ غائب ہو گیا۔ میں نے سامنے والی دیوار پر روشنی ڈالی تو ایک چھوٹا سا دروازہ دکھائی دیا جو کسی زمانے میں اینٹوں کے جھرنے بنا کر چن دیا گیا تھا مگر اب اینٹیں پانی کی نمی کی وجہ سے گل کر گر گئی تھیں اور دروازے میں شگاف ہو گیا تھا۔

میں دوازے کے اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا سا تکون کمرہ تھا جس کی ہوا کثیف اور بدبودار تھی۔ میں سمجھ گیا کہ میں اس وقت پرانی سادھو کے نیچے تہ خانے میں کھڑا ہوں جس کی سیاہ اور کاہی آلود بالائی منزل برگد کے درختوں میں محصور ہے۔

سامنے کی دیوار میں ایک بالکل چھوٹی سی کھڑکی تھی، نہ جانے کس طرح وہ کھڑکی کھول کر میں اندر گھس گیا۔ ٹارچ کی روشنی جب اس وسیع کمرے میں پڑی تو میرا خون خشک ہو گیا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ گو ٹارچ میرے ہاتھ سے گر گیا تھا تاہم اس کی روشنی کمرے میں اجالا کر رہی تھی۔ میں نے قریب کی دیوار کا سہارا لیا اور

شدت خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔

دفعتاً مجھے آہوں کی آواز سنائی دی۔

ان آہوں نے میری ڈھارس بندھادی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اکیلا نہیں بلکہ کوئی ہمدرد ہستی میرے پاس موجود ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ اٹھا کر اس چیز کو دیکھنے لگا جس کے لئے میں اتنا خوفزدہ ہو رہا تھا۔

یہ ایک بڑا سا مربع کمرہ تھا جس کے عین درمیان میں ایک انسانی ڈھانچہ لکڑی کی ٹیک لگائے آسن مارے بیٹھا تھا۔ وہ ڈھانچہ بالکل بدھ مذہب والوں کی طرح اپنے استخوانی ہاتھ اس لکڑی پر ٹیکے عبادت میں محو دکھائی دیتا تھا۔

میں واپس ہونے کو تھا کہ ڈھانچے کی ہڈیوں میں کھڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ ہلتا ہوا محسوس ہوا۔ میرے پاؤں پھول گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔

☆☆☆

جب مجھے ہوش آیا تو میں اسی طرح تہہ خانے میں پڑا تھا مگر اب کمرے میں بجائے اندھیرے کے اجالا تھا۔ سورج کی روشنی ان جھروکوں سے آرہی تھی جو چھت کے قریب باؤلی کی طرف بنے ہوتے تھے۔ میں بھگوان کا نام لے کر اٹھا گو ڈھانچہ اب بھی موجود تھا اور رات والی باتیں بھی سب یاد تھیں لیکن دن کے اجالے میں خوف کسی حد تک دور ہوچکا تھا۔ میں نے دل کڑا کرکے اس ڈھانچے کو دیکھا۔ اس کی استخوانی کمر میں ایک رسی بندھی ہوئی دکھائی دی جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ٹین کا ڈبہ لٹک رہا تھا۔

اس ڈبے کو دیکھ کر مجھے بے انتہا حیرت ہوئی اور میں ڈبے کا راز دریافت کرنے پر تل گیا۔ حالانکہ ڈھانچے کے قریب جاتے ہوئے میری آتما فنا ہوتی تھی، تاہم میں نے جان پر کھیل کر وہ ڈبہ اس رسی سے کھول لیا اور بھاگ کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

اب مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی میں مناسب جگہ پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر پہنچ گیا......

گھر پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اس ڈبے کو کھولا۔ اس کے اندر نیلے رنگ کی دھجی میں کچھ کاغذات بندھے ہوئے تھے، میں نے کاغذوں کو کھولا تو کوئی سنہری سی چمکتی ہوئی چیز زمین پر گر پڑی۔ اس کو دیکھ کر میرا رنگ فق ہوگیا۔ "آہ! یہ وہی طلائی زنجیر تھی جو میں نے اپنی منگیتر چمپا کو محبت کے تحفے میں دی تھی۔"

اس زنجیر کو دیکھ کر میرا دل بہت غمگین ہوا، میں زنجیر کو پکڑے اپنی بدنصیبی پر آنسو بہا رہا تھا کہ میری نظر ان کاغذات پر پڑی جن پر موٹے قلم سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے انہیں پڑھنا شروع کیا۔ وہ کسی کی داستان زندگی تھی جس نے میری زندگی میں یکلخت انقلاب پیدا کردیا۔

میرا نام گوکل ہے۔ میں 1816ء میں پیدا ہوا۔ میرا باپ جاگیردار تھا۔ ہماری جاگیر سے ملحق ایک برہمن کی زمین تھی۔ میرا باپ اس برہمن سے ناحق دشمنی رکھتا تھا۔ اور اس کی زمین میں بے جا دخل اندازی کیا کرتا۔ یہ عداوت کئی سال سے چلی آتی تھی۔ اس برہمن کے دو بیٹے تھے جو نہایت خوبصورت اور جوان تھے۔ میرا باپ ان لڑکوں کو دیکھ کر بہت حسد کرتا۔

جب میں اٹھارہ سال کا ہوا تو ایک نہایت اندوہناک واقعہ پیش آیا۔ اس سال فصل بہت اچھی ہوئی تھی۔ کسان بہت خوش تھے۔ میرا باپ مزدوروں سے کھیت پر کاشت کروا رہا تھا، ادھر برہمن بھی دونوں بیٹوں سمیت اپنا کھیت کاٹنے میں مصروف تھا۔ میرا باپ ان لوگوں پر فقرے کستا رہا۔ بوڑھا برہمن بالکل خاموش تھا لیکن کہاں تک برداشت کرتا۔ تنگ آکر وہ بھی ایک آدھ بات کا جواب دے بیٹھا۔ اس طرح بات طول پکڑ گئی اور دنگا فساد کی نوبت آن پہنچی۔

وہ صرف تین آدمی تھے۔ ادھر ہمارے کئی ملازم میرے باپ کے اشارے پر بے گناہ برہمنوں پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میرا باپ گاؤں کا سردار تھا اس لئے بظاہر کسی کو بھی مخالفت

کی جرأت نہ تھی۔ مگر در پردہ وہ بہت سے لوگ ہمارے دشمن ہوگئے۔ بوڑھی برہمنی کی حالت بہت پردرد تھی۔ میرا باپ تو چاہتا تھا کہ اس کو بھی ٹھکانے لگا دیا جائے مگر وہ اپنی پوتی سمیت راتوں رات غائب ہوگئی۔

اس واقعے کے دو سال بعد میرے باپ کو کسی نے قتل کردیا۔

میرا چال چلن پہلے سے خراب تھا، باپ کے مرنے کے بعد خوب دل کھول کر عیش و عشرت شروع کردی۔ اس گناہ آلود زندگی میں سات سال گزر گئے......

میری شادی باپ کی زندگی میں ہی ہوچکی تھی اور ابھی تک وہ بیچاری میکے میں بیٹھی میری جان کو رو رہی تھی۔ ماں میری آوارگی پر بہت کڑھتی اور ہمیشہ مجھے سمجھا بجھا کر اس کام سے روکنے کی کوشش کرتی۔ مگر مجھ پر اس کی نصیحتوں کا کچھ اثر نہ ہوتا۔

میں نے ایک اچھوت عورت کو گھر میں ڈال لیا۔ میری ماں یہ ذلت کیسے گوارا کرسکتی تھی وہ اپنے بھائی کے گھر چلی گئی، پہلے میں نے کچھ پرواہ نہ کی لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ ماں کے بغیر گھر کا انتظام اور بزرگوں کی شان نبھانا مشکل ہے۔ ادھر اس اچھوت عورت سے بھی جی بھر گیا تھا اس لئے اب مجھے ماں کو منانے کی فکر ہوئی۔

دوارکا بھومی جہاں میری ننھیال تھی۔ یہاں سے چھبیس کوس کے فاصلے پر تھا۔ میں نے سامان سفر درست کیا اور باپ کے وقت کے ایک بوڑھے ملازم کو لے کر ماں کے پاس چلا گیا......

ماں کا دل بھی مہر و محبت کا سرچشمہ ہوتا ہے وہ مجھے دیکھ کر باغ باغ ہوگئی۔ میں نے ماں کو گھر لانے کی بہت کوشش کی مگر ماموں نے اجازت نہ دی اس لئے کچھ دن مجھے یہاں ٹھہرنا پڑا...... دوارکا بھومی ایک خوبصورت گاؤں تھا۔ میرا دل بھی وہاں لگ گیا۔ میں تمام دن اپنے پرانے یار دوستوں کے ساتھ سیر سپاٹے میں مشغول رہتا۔ یہاں سے کوس بھر کے فاصلے پر ایک ندی تھی جہاں ہم لوگ اکثر سیر کو جایا کرتے تھے۔ ایک دن ہم ندی کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں ہانک رہے تھے ساون کا مہینہ تھا بادل گھرے ہوئے تھے۔ یک دم بارش ہونے لگی۔ میرا ایک دوست کہنے لگا۔ یہاں قریب ہی ایک برہمن کی جھونپڑی ہے چل کر وہاں پناہ لیں۔

ہم لوگ وہاں سے بھاگے تھوڑی دور نیم کے درختوں سے گھرے ہوئے کنج میں ایک جھونپڑی دکھائی دی جھونپڑی کے دروازے پر نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایک دوشیزہ کھڑی تھی۔ اس کی نازک کلائیوں پر کانچ کی نہایت کم قیمت چوڑیاں تھیں۔ وہ نہایت غمگین تھی۔ اس کی مدھ بھری آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے جھلک رہے تھے۔ اس کا توبہ شکن حسن و جمال باوجود اس افلاس کے بھی بے پناہ تھا۔ اس کے کندنی چہرے پر شاہانہ رعب و داب تھا۔ میں اس کے حسن سے مرعوب ہوگیا۔

اس لڑکی نے بڑے خلوص سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ میرے دوست نے کہا۔ "ستیہ بالا! بہن آج اتنی پریشان کیوں ہو؟"

وہ بولی۔ "بھیا کیا بتاؤں، دادی کی صحت روز بروز گر رہی ہے، آج اسے پھر دورے پڑ رہے ہیں۔"

میرے دوست نے مجھے بتایا کہ دونوں دادی پوتی بہت غریب اور شکستہ دل ہیں۔ بوڑھی برہمنی دنیا سے متنفر ہے اس لئے آبادی سے دور رہتی ہے اور نوخیز ستیہ بالا تمام دن کچے سوت سے جنیو تیار کرتی رہتی ہے جنہیں بیچ کر وہ شام کو اپنا اور اپنی دادی کا پیٹ پالتی ہے۔

بارش تھمنے تک ہم لوگ وہیں ٹھہرے اور دفعہ از راہ ہمدردی سب نے ایک ایک جنیو اس لڑکی سے خرید لیا۔ گھر پہنچ کر چپ چپ میں بستر پر پڑا رہا۔ اس لڑکی کی صورت میرے دل میں اتر گئی تھی دوسرے دن صبح سویرے میں اکیلا ہی دل بہلانے کی خاطر ندی پر جا پہنچا۔

پگھلی ہوئی چاندی کی طرح چمکتی دمکتی ندی سورج کی اچھوتی کرنوں سے کھیلتی اور معشوقانہ انداز سے اٹھلاتی ہوئی بہہ رہی تھی۔ کناروں پر ریت کے چھوٹے چھوٹے بے شمار ذرے گوہر ہائے شب تاب کی طرح آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ دور دور تک چھوٹے چھوٹے رنگین گھونگے

اور جگمگاتی ہوئی سیپیاں پھیلی تھیں جن سے قوس قزح کے جلوے منعکس ہوکر انوکھی شان پیدا کررہے تھے۔

دفعتاً چوڑیوں کی کھنک نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا، میں نے محویت سے چونک کر سر اٹھایا تو سامنے ستیہ بالا پانی بھرتی ہوئی دکھائی دی۔ میں دوڑ کر اس کے پاس گیا اور اس کی دادی کی خیریت دریافت کی، جب وہ پانی بھر کے واپس جانے لگی تو میں بھی جنیو خریدنے کے بہانے اس کے ساتھ ہولیا۔

اس روز سے میں علی الصبح کسی نہ کسی بہانے ستیہ بالا کے ہاں جاتا اور اس کی دادی کی تیمارداری میں اس کی مدد کرتا، اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا، ستیہ بالا مجھ سے بہت مانوس ہوگئی۔

ایک دن موقع پا کر میں نے اس پر اپنی محبت کا اظہار کیا تو اس نے کوئی جواب نہ دیا مگر اس کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ اس کا بدن جوش مسرت سے کانپنے لگا۔ اس کا ہر انداز ثابت کررہا تھا کہ وہ بھی میری محبت میں سرشار ہے۔ اسے خاموش پا کر میں نے زیادہ پر محبت الفاظ میں شادی کی درخواست کی، وہ لجاتے ہوئے بولی؟

"دادی کی زندگی میں مجھے اس انتخاب کا کوئی حق نہیں۔ اگر آپ ایسا چاہتے ہیں تو دادی سے اجازت حاصل کریں۔"

دوسرے دن ستیہ بالا کے ہاں گیا تو وہ پانی لینے ندی پر گئی ہوئی تھی اس کی دادی پرارتھنا میں مشغول تھی۔ میں نے بوڑھی برہمنی کو پرنام کیا اس نے مجھے آشیرباد دی۔ میں نے اس کی خیریت کی خبر پوچھی۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرکے حرف مطلب زبان پر لایا وہ میری درخواست پر خوش تھی۔ اتنے میں ستیہ بالا بھی آگئی۔ برہمنی نے اسے بلایا اور میری درخواست سے مطلع کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ وہ اس رشتے کو پسند کرتی ہے یا نہیں۔ ستیہ بالا نے شرماتے ہوئے دبی زبان سے ہاں کردی۔

اس کے بعد برہمنی نے میرا حسب نسب دریافت کیا، جب میں نے اپنے باپ دادا کا نام بتایا تو غیظ و غضب سے برہمنی کا رنگ سرخ پڑگیا۔ وہ گرج کر کہنے لگی۔

"دشٹ پاپی، یہاں سے دور ہوجا۔ تمہی لوگوں کے ظلم و ستم کی بدولت میں تباہ و برباد ہوئی۔ تمہارے ہی ظالم باپ نے میرا سہاگ لوٹا اور میرے نوجوان بچوں کو مار ڈالا مجھے اور میری پوتی کو در بدر کیا۔ اب تم کس منہ سے ستیہ بالا کے رشتے کی درخواست کرتے ہو۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

برہمنی کا جلال دیکھ کر میں کانپتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکل آیا۔ باہر سے میں نے سنا۔ وہ اپنی پوتی سے کہہ رہی تھی۔

"دیکھ ستیہ بالا خبردار بھول کر بھی اس کا خیال دل میں نہ لانا۔ یہ اس باپ کا بیٹا ہے جس نے تمہارے دادا اور تمہارے چچا کو بے گناہ قتل کیا!"

ستیہ بالا رو کر کہنے لگی۔

"لیکن اس کا تو کوئی قصور نہیں۔ اگر گنہگار تھا تو اس کا باپ تھا۔"

برہمنی فیصلہ کن لہجے میں کہنے لگی۔

"خاموش! یہ شخص ہرگز تمہارا پتی نہیں ہوسکتا! شاید میرے مرنے پر تم اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آجاؤ۔ اس لئے میں تمہیں تنبیہ کرتی ہوں کہ کبھی اس کے دھوکے میں نہ آنا۔ یاد رکھنا اگر تم نے میری وصیت پر عمل نہ کیا تو تمہیں سہاگ کا سکھ نصیب نہ ہوگا اور ایک اناتھ برہمنی کا یہ سراپ اس جنم تو کیا کسی جنم میں بھی تمہارا پیچھا نہ چھوڑے گا۔"

برہمنی کی باتوں سے مایوس ہوکر، میں وہاں سے چلا آیا اور دوسرے ہی دن ماموں کی منت سماجت کرکے ماں کو لے کر اپنے گاؤں واپس آگیا۔ یہاں آکر میں نے بہت کوشش کی کہ ستیہ بالا کو بھول جاؤں لیکن یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ ستیہ بالا کے لئے میری آتش شوق دن بدن بھڑکتی رہی۔

دوارکا بھومی میں دسہرہ کا تہوار بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا تھا۔ اب کی مرتبہ ماموں نے مجھے اور ماں کو اس تہوار پر بلاوا بھیجا میں پہلے ہی موقع کا منتظر تھا جھٹ ماں کے ساتھ تیار ہوگیا۔ دوارکا بھومی آکر مجھے اپنے ایک دوست کی زبانی معلوم ہوا کہ بوڑھی برہمنی سورگباش ہوگئی ہے۔

دوسرے دن میں ڈرتے ڈرتے جھونپڑی کی طرف گیا۔ مہندی کے پودوں کے قریب ستیہ بالا پیکر یاس بنی بیٹھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا وہ بالکل سفید موم کا مجسمہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کے احمریں لبوں کی رنگت گو پھیکی پڑگئی تھی تاہم وہ ابھی تک پر کشش تھے۔ اس کے رخسار اگرچہ زرد ہورہے تھے مگر اس کے بیضوی چہرے پر غم کی تاثیر سے غیر معمولی ملاحت ٹپک رہی تھی۔ اس کی مژگان پر غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے ایسی دلفریب چمک ہویدا تھی جس کی تاب زاہد صد سالہ کے لئے بھی دشوار تھی۔

وہ مجھے دیکھتے ہی جھونپڑی میں چلی گئی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا مگر اس کے اس سلوک سے میں مایوس نہ ہوا اور ہر روز بلا ناغہ وہاں جانے لگا۔ آخر میں نے اس پری کو شیشے میں اتار لیا۔ اس نے دادی کی وصیت توڑ دی اور مجھ سے شادی کرکے میری ڈگمگاتی کشتی حیات کو حسن کے پرمسرت ساحل سے لگادیا۔

شادی کے بعد میری زندگی بہت طمانیت بخش تھی لیکن میں اکثر اس کے لالہ گوں لبوں پر سرد آہیں محسوس کرتا۔ اور اس کی غزالی آنکھوں کو نمناک پاتا، میں ہمیشہ اسی کی دلجوئی کے لئے کہتا۔

"ستیہ بالا مجھ کو تم سے ایسا عشق ہے جیسا بلبل کو پھول سے" ان باتوں پر وہ بجائے خوش ہونے کے کانپنے لگتی کیوں کہ دادی کی شراپ کا اثر ابھی تک اس کے دل پر موجود تھا۔

شادی کے ایک سال بعد ستیہ بالا کو پرماتما نے ایک بچہ دیا۔ بچہ بہت خوب صورت اور پیارا تھا۔ مجھے اب تک ستیہ بالا سے بدستور محبت تھی۔ مگر آہ! میرا یہ عشق ایک شیریں خواب ثابت ہوا۔ میری محبت کا مدہوش کن طلسم ایک گوالے کی لڑکی نے آن واحد میں مکڑی کے جالے کی طرح توڑ دیا۔

ستیہ بالا میری اس کیفیت سے بالکل بے خبر تھی لیکن جب میں گوالے کی لڑکی نندنی کو گھر لے آیا تو اس پر کوہ الم ٹوٹ پڑا۔ پھر بھی اس نے ماتھے پر شکن نہ ڈالی اور بدستور میری خدمت گزاری کو اپنا فرض سمجھتی رہی۔

نندنی ضدی اور پھوہڑ عورت تھی۔ وہ اسے بہت تنگ کرتی اور ہر وقت لڑتی بھڑتی رہتی۔ پھر اس کے خلاف الٹا میرے اور میری ماں کے کان بھرتی میری اماں پرانی عداوت کی وجہ سے پہلے ہی اس سے خوش نہ تھی نندنی کے بھڑکانے سے وہ اور زیادہ خلاف ہوگئی۔

آخر ایک دن میں نے ستیہ بالا کا بچہ جو اب دو سال کا تھا چھین کر اسے گھر سے باہر نکال دیا۔

میرے اس ظلم سے ستیہ بالا کا دماغ پھر گیا۔ اس کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ وہ گلیوں میں آوارہ پھرتی اور پاگل پنے میں نعرے لگا کر کہتی۔ "شراپ شراپ!"

آخر ایک دن وہ غائب ہوگئی، میں خوش تھا کہ اس بلا سے چھٹکارا ملا۔ دوسرے دن ایک کنوئیں سے اس کی لاش برآمد ہوئی اس نے خودکشی کرلی تھی۔

اس کی موت کے کچھ عرصہ بعد نندنی نے بچے کو زہر دے کر مار ڈالا، بچے کی موت کا مجھے اور میری ماں کو بہت صدمہ ہوا۔ میں نے نندنی کو گھر سے نکال دیا اور اپنے کئے پر پچھتانے لگا۔

مرد کے لئے رنج و غم عارضی چیز ہے۔ چند دن بعد میں یہ صدمہ بھول گیا۔ اب میں نئی شادی کی فکر میں تھا۔ میری ماں ایک اور پتنی لے آئی۔ اس پتنی سے میرے گھر تیرہ بچے ہوئے۔ یہ سب دو سال کی عمر میں ماں کا دودھ چھوڑ دیتے اور بلک بلک کر مرجاتے۔ مجھے اور میری ماں کو یقین ہوگیا کہ یہ اسی ظلم و ستم کا بدلہ ہے۔ جو ہم لوگوں نے ستیہ بالا پر کیا تھا۔ تیرہواں بچہ پیدا ہوتے ہی میری پتنی گزر گئی۔

میری ماں کو پوتے کی بڑی آرزو تھی اس لئے وہ چاہتی تھی کہ میں اور شادی کروں مگر میرا دل ان متواتر صدموں سے ٹوٹ چکا تھا میں نے شادی کا خیال چھوڑ دیا۔ آخر جب میری ماں کا مرتیو ہوا اور گھر بالکل ویران ہوگیا تو دوستوں کے کہنے سننے پر میں نے آخیر عمر میں پھر شادی کرلی۔

میری یہ پتنی بہت نیک اور فرمانبردار تھی۔ اس سے بھی یکے بعد دیگرے تین لڑکے پیدا ہوئے لیکن انہوں

نے بھی دو دو سال کی عمر میں دودھ چھوڑ دیا اور گھل گھل کر مر گئے......

1857ء میں جب غدر ہوا تو کئی گھرانے تباہ و برباد ہو گئے۔ چنانچہ اس مصیبت سے بھی نہ بچ سکا۔ میری جاگیر چھن گئی۔ میں برباد ہو گیا اور در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پنجاب میں آنکلا۔ یہاں موضع کھوڑ میں ایک ٹھاکر کے ہاں مجھے نوکری مل گئی۔ جہاں میں اپنی پتنی سمیت زندگی کے دن پورے کرنے لگا۔ میرے ہاں پھر ایک لڑکا پیدا ہوا جو بالکل ہی ستیہ بالا کے بچے کا ہمشکل تھا۔

یہ بچہ خوبصورت اور صحت مند تھا۔ مجھے خیال تھا کہ شاید بچ نکلے مگر بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ جو یہ بچہ دو سال کا ہوا تو تمام علاقہ میں ہیضہ کی وبا پھیل گئی۔ گاؤں کے گاؤں ویران ہو گئے۔ ہمارے گاؤں میں صرف دو تین گھر محفوظ تھے۔ باقی سب صفایا تھا۔

ایک دن شام کے قریب میری پتنی کی طبیعت خراب ہوئی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے اندر اس نے پران تیاگ دیئے۔ طوفانی رات تھی۔ بادل خوب زور سے برس رہے تھے۔ لاش سامنے پڑی تھی بچہ ماں کے واسطے بلک رہا تھا اور دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو رہی تھی کچھ دیر بعد بارش بند ہو گئی۔ میں نے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو تمام گاؤں پر اندھیرا محیط تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گاؤں میں اس وقت کوئی ایسا نہیں تھا جو میری مدد کر سکے۔

اپنی بے کسی پر میرا دل سخت رنجیدہ ہوا۔ میں چیخ چیخ کر آہ و بکا کرنے لگا۔ میں بار بار ستیہ بالا کی آتما کو مخاطب کر کے اس سے معافی مانگتا اور اس کی آتما سے التجا کرتا کہ وہ اس وقت میری مدد کرے۔ میں گہرے جذبے اور عقیدت مندی سے ستیہ بالا کو پکار رہا تھا کہ ایک دم دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر داخل ہوئی جسے دیکھ کر میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔ آنے والی عورت ستیہ بالا تھی۔

میں نے گڑگڑا کر اس سے التجا کی "یہ بچہ لے کر میرے گناہ معاف کر دے۔"

بچہ تو اس نے میرے ہاتھوں سے پکڑ لیا مگر کہنے لگی۔ "بابا تمہیں دھوکا ہوا ہے۔ میں ستیہ بالا نہیں۔ میرا نام چمپا ہے۔" یہ کہہ کر وہ بچہ سمیت باہر نکل گئی۔

بچہ اس کی گود میں جاتے ہی خاموش ہو گیا۔

صبح اس جگہ سے جہاں وہ لڑکی تھی مجھے سونے کی ایک زنجیر ملی۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وہ ستیہ بالا کی آتما نہیں تھی، ضرور کوئی نیک دل لڑکی تھی جو پرماتما نے میری مدد کو بھیجی......

میرے دل میں اس لڑکی کو ملنے کی زبردست خواہش تھی تا کہ یہ زنجیر اسے واپس دے دوں مگر باوجود انتہائی تلاش کے اس لڑکی کا سراغ نہ ملا۔ اب میرے سر پر بار تو تھا نہیں جس کی مجھے فکر ہوتی، چنانچہ میں سادھو بن کر شہر بہ شہر، گاؤں گاؤں گھومنے لگا۔ مجھے دنیا سے کچھ دلچسپی نہ تھی البتہ یہ آرزو مجھے چین نہ لینے دیتی کہ کسی طرح یہ زنجیر اس لڑکی تک پہنچا دوں۔

آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ سادھی لگاؤں۔ اس زنجیر کا مالک خود میرے پاس آئے گا اور یہ امانت لے جائے گا۔ اب میں یہاں سادھی لگائے، رات دن ایشور کی یاد میں رہتا ہوں۔ شام کے وقت صرف دو گھنٹہ کے لئے اس زنجیر کے مالک کا انتظار کرتا ہوں لیکن ابھی تک میری خواہش پوری نہیں ہوئی۔ شاید میرے مرنے کے بعد وہ یہاں آئے...... اگر اس کے آنے سے پیشتر میں مر گیا تو میری آتما وقت مقررہ پر موڑ کے قریب حسب دستور اس کا انتظار کیا کرے گی۔"

یہ قصہ ختم کر کے آکاش اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"یہ واقعات پڑھ کر مجھے چمپا کی مظلومیت کا یقین ہو گیا اور اس صدمہ کو برداشت نہ کرتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ میری تمام سخت گیری آنکھوں کے راستے بہہ گئی۔ میں اسی دن ہری پور پہنچا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ چمپا خواہ میرے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کرے میں اسے ضرور ملوں گا۔

مجھے بالکل خیال تک نہ آیا کہ چمپا اب پچاسی سالہ بڑھیا ہو گی بلکہ یہی سمجھ رہا تھا کہ میں اپنی نوخیز منگیتر سے صلح صفائی کرنے جا رہا ہوں جیسا کہ کسی زمانہ میں مصر

سے آتے وقت کر چکا تھا۔ مجھے اپنی عمر کا بھی احساس نہ رہا، میں اسی شوق اور ولولے سے سفر کر رہا تھا۔

جب اس جگہ پہنچا تو وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا پایا۔ اب وہاں ایک گاؤں آباد تھا۔ میں نے بمشکل برگد کے درخت اور کنوئیں سے جھونپڑی کا سراغ لگایا۔ اس جھونپڑی میں ان دنوں چمار رہتے تھے۔ میں نے ان سے چمپا کی بابت دریافت کیا۔ ایک بوڑھے چمار نے مجھے بتایا کہ وہ دونوں ماں بیٹی جھونپڑی فروخت کر کے کرپا چورہ میں آباد ہو گئی ہیں اور چمپا کا لڑکا رام شنکر کبھی کبھی اپنی زمین کی دیکھ بھال کرنے آیا کرتا ہے۔"

میں باول نخواستہ واپس لوٹا اور لوگوں سے دریافت کرتا ہوا چوپارہ پہنچا۔ رام شنکر سے ملاقات ہوئی تو اسے دیکھ کر میں دنگ رہ گیا کیونکہ وہ ایک سفید ریش آدمی تھا۔ اب مجھے محسوس ہوا کہ وقت نے ہمیں کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ رام شنکر وہی منحوس بچہ تھا جس کی وجہ سے میں نے چمپا سے قطع تعلق کیا تھا...... میں نے اسے بتایا کہ میں اس کی ماں کا رشتہ دار ہوں اور اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ چمپا کو مرے پچیس سال گزر چکے ہیں۔ اس خبر سے میں بہت غمزدہ ہوا۔ دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ رام شنکر مجھے نہایت احترام سے اپنے دیوان خانے میں بیٹھا کر خود کھانا لانے کی غرض سے زنان خانے میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ پر آہٹ ہوئی میں نے زمانہ گزشتہ کی یاد سے چونک کر دروازہ کی طرف دیکھا حیرت و استعجاب سے میری چیخ نکل گئی۔ دروازے پر وہی نوخیز چمپا ہاتھ میں کھانے کا طشت لئے کھڑی تھی۔ میری چیخ سے ڈر کر وہ مودبانہ طریقے پر کہنے لگی۔

"بابا جی میں آپ کے لئے کھانا لائی ہوں۔"

اتنے میں رام شنکر آ گیا اور ان دونوں نے مل کر میرے سامنے کھانا چن دیا۔

میں نے رام شنکر سے اس لڑکی کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے، جس کا نام اس نے اپنی ماں کے نام پر چمپا رکھا ہے۔ شکل و صورت کے علاوہ اس لڑکی کی چال ڈھال آواز غرضیکہ ہر انداز میری منگیتر جیسا تھا۔ میں دیر تک اس لڑکی سے گفتگو کرتا رہا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی چمپا ہے جس نے اب کی مرتبہ رام شنکر کے گھر جنم لیا ہے۔

چنانچہ میں نے وہ طلائی زنجیر اس کے گلے میں ڈال دی۔ وہ لڑکی بھی مجھ سے مانوس ہو گئی۔ میں کئی دن ان کے گھر مہمان رہ کر واپس چلا آیا۔ لیکن آج سے ایک ماہ پیشتر جب میں پھر اس لڑکی سے ملنے گیا تو رام شنکر نے مجھے بتایا کہ راولپنڈی کا ایک رئیس جس کا نام روی ہے چمپا کا رشتہ مانگتا ہے۔ اس نے تمہارے متعلق بہت سی باتیں دریافت کیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عنقریب ہی تمہاری درخواست منظور کر لے گا۔ اس خیال سے کہ ایک نہ ایک دن اس کی شادی ضرور ہو گی، مجھے سخت تشویش تھی۔

ایک دن جب کہ رام شنکر کہیں باہر تھا، موقع پا کر میں نے وہ ساری کہانی چمپا کو سنا دی جو ان کاغذات میں قلم بند تھی اور آپ بیتی سنا کر اس کے ذہن نشین کر دیا کہ پہلے جنم میں وہ ستیہ بالا تھی جس نے دادی کی شراپ سے گوکل کے ہاتھوں دکھ پایا اور دوسرے جنم میں چمپا کے روپ میں میری ذات سے تکلیف اٹھائی۔ اب پھر وہ تیسری مرتبہ دنیا میں آئی ہے اور وہی شراپ اس جنم میں بھی اس کو سہاگ کا سکھ نہ دیکھنے دے گی چنانچہ اب اس کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ تمام عمر شادی نہ کرے۔

چمپا پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی تھی۔ وہ میری داستان سے اتنی خوفزدہ ہوئی کہ شادی کے نام پر لرزنے لگی۔ اب مجھے یہ فکر تھی کہ اس کا باپ کہیں اسے زبردستی بیاہ نہ دے۔ اس لئے انتہائی سوچ بچار کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنی تمام جائیداد اسے اس شرط پر دے دوں کہ وہ تمام عمر کنواری رہے۔

یہ سب کچھ میں نے چمپا کی بہتری کے لئے کیا ہے تا کہ اسے پچھلے جنم میں جو تکلیف میری طرف سے ہوئی تھی اس کی تلافی کر سکوں۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 7

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

میں اس کی نگاہوں کو نہ سمجھ سکی، البتہ کچھ سوچ کر میں نے کہا۔

”مگر میری رائے ہے کہ اسے ساتھ رکھا کریں۔“

”ہر رشتہ ایک الگ الگ ہوتا ہے نشاء ہر ایک کو یہ مقام نہیں دیا جا سکتا، خیر کچھ کرلیں گے، فی الحال اب تو چل ہی پڑے ہیں تو موڈ خراب نہ کریں۔“

کچھ دیر کے بعد ہم ساحل پر پہنچ گئے، ساحل کے ایک دور دراز حصے میں ٹہلتے ہوئے ہم ایسی جگہ پہنچے جہاں پر انسانی زندگی کا دور دور تک دخل نہیں تھا۔

”ایک بات پوچھوں نشاء؟“ عسکری بولا۔

”ہاں۔“

”تم نے میرے اوپر کچھ زیادہ اعتماد نہیں کرلیا؟“

”کیوں؟“

”انسان ہوں، جوان ہوں بھٹک سکتا ہوں، ہوسکتا ہے تمہیں نقصان پہنچ جائے، میرے ہاتھوں۔“

”نہیں عسکری یہ ممکن نہیں ہے، میں اتنا نرم نوالہ نہیں ہوں، معاف کرنا جو سوال تم نے کیا ہے اس کا اسی انداز میں جواب دے رہی ہوں۔“

”سنسان ساحل کتنے رومان انگیز ہوتے ہیں۔“

”شاید۔“ میرا ذہن بھٹکا بھٹکا سا ہو رہا تھا، ایک طرح سے ڈبل مائنڈڈ ہوگئی تھی، جمال پاشا بے شک ہوا کے ایک جھونکے کی مانند آیا تھا لیکن اس نے مجھ پر جو اثرات قائم کئے تھے وہ بہت گہرے تھے۔ اپنا تجزیہ کرنا اپنے آپ کو پڑھنا شاید ناممکن ہی ہوتا ہے، انسان اپنا محاسبہ کرتے ہوئے عام طور سے اپنے نازک پہلو بچا جاتا ہے چاہے وہ اپنے آپ ہی کو جواب کیوں نہ دے رہا ہو، پاشا کی یاد اب ایک دکھ بن گئی تھی، میں دعوے سے اب بھی یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ مجھے پاشا سے محبت ہوگئی تھی، اصل میں، میں جن کیفیات سے گزر رہی تھی ان میں کسی کی بھی قربت اگر وہ مجھے محبت اور پیار سے اپنے قریب بلائے میرے لئے اہمیت اختیار کرسکتی تھی، کہیں سے بھی پاشا کا کوئی پتہ نہیں چلا اور ایسے وقت میں عسکری میرے پاس آ گیا تو میں عسکری سے ہی منسلک ہوگئی اور اس کے بعد عسکری نے جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی میرے حق میں تھا۔

روز ہی وہ آ جاتا تھا اور ہم لوگ کہیں نہ کہیں نکل جاتے، حیرت ناک بات یہ تھی کہ میں نے یہ شہر جہاں

میں پیدا ہو کر جوان ہوئی تھی عسکری کے ہمراہ ہی دیکھا تھا، کبھی اس کے نواحات میں قدیم عمارتوں اور کھنڈرات پر غور نہیں کیا تھا، کیا نہیں تھا یہاں، لیکن کون تھا جو مجھے میرے شہر سے روشناس کراتا، میرا تھا ہی کون، ہارون دانش کے ساتھ مصروف رہا کرتی تھی اور وہی لمحے میری زندگی بن گئے تھے۔ غرضیکہ کافی دن اسی طرح گزر گئے، گھر کے لوگ بھی نارمل تھے، فیض بابا مجھ سے کچھ اکھڑے اکھڑے سے رہا کرتے تھے، لیکن بدتمیزی کبھی نہیں کی تھی۔ بہرحال اس طرح سے وقت گزرتا رہا، پھر ایک دن ذرا کچھ تبدیلی رونما ہوئی، مجھے مشل کا فون موصول ہوا تھا۔

''ارے مشل تم۔''

''بھول گئیں مجھے۔'' مشل کے لہجے میں کچھ عجیب سی کیفیت تھی اور ایک دم مجھے احساس ہوا کہ یہ کیا ہوگیا۔ مشل اور عسکری مجھے ساتھ ساتھ ملے تھے، عسکری مشل کا منگیتر تھا لیکن اب وہ روزانہ ہی میرے پاس آجاتا تھا اور ہم لوگ مشل کو اس طرح بھول گئے تھے جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ اس وقت اچانک ہی مجھے ایک جرم کا سا احساس ہوا تھا مشل نے کہا۔

''ہیلو۔ کیا بات ہے طبیعت ٹھیک ہے؟''

''ہاں مشل کہاں غائب ہو؟''

''نہیں۔ نہیں۔ نشاء تم یقین کرو کہ میرے خیالات جس طرح بھی بھٹک چکے ہوں لیکن پتہ نہیں کیوں تمہاری عزت میرے دل سے کم نہیں ہوئی، میں تمہارا اب بھی اسی طرح احترام کرتی ہوں، یہ نہیں کہوں گی کہ تم سے محبت کرتی ہوں۔''

''مشل کیا ہوگیا ہے؟''

''یہ تم سوچو، میرے علم میں ہر بات ہے، تم باقاعدہ عسکری سے ملتی ہو، عسکری صرف تمہارے ہی گیت گاتے ہیں، مجھے بالکل درمیان سے نکال دیا گیا ہے، میں تم سے مشورہ کرنا چاہتی ہوں نشاء، میں کیا کروں، کیا عسکری کو بھول جاؤں، تمہارے حق میں دستبردار ہو جاؤں جیسا تم کہو، ویسے میں تمہیں بتادوں کہ تمہارا یہ عمل میرے لئے حیرت ناک ہے اور ظاہر ہے مجھے دکھ ہوا ہے اور کچھ نہیں کہوں گی، سوچنا ذرا غور کرنا۔''

یہ کہہ کر مشل نے فون بند کردیا، میں ہیلو ہیلو ہی کہتی رہ گئی اور اس کے بعد میرا ذہن عجیب سے سناٹوں میں ڈوب گیا، میں نے واقعی پچھلے دنوں پر غور کیا تو مجھے لگا کہ عسکری کی قربت بے شک ایک دلچسپ عمل ہوتا ہے لیکن کیا میں اس سے محبت کرنے لگی ہوں، کیا میں مشل کے حق پر ڈاکہ ڈال رہی ہوں، دل نے فوراً جواب دیا کہ نہیں اسے صرف تنہائی دور کرنے کا عمل کہا جاسکتا ہے محبت نہیں اور محبت تو شاید مجھے پاشا سے بھی نہیں ہوئی تھی، بس ایک کٹی پتنگ تھی، فضا میں ڈول رہی تھی، کوئی بھی لنگر ڈال کر پکڑنے کی کوشش کرلے میرا اپنا کوئی عمل نہیں تھا، سوچتی رہی، پھر کیا کیا جائے، کیا نہ کیا جائے۔

عسکری آج نہیں آیا تھا، لیکن دن کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے کا وقت تھا جب فیض بابا نے مجھے کسی کے آنے کی اطلاع دی۔

''نشاء بی بی ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں کہتے ہیں آپ سے ملنا ضروری ہے۔''

''کون ہیں؟''

''بزرگ آدمی ہیں، غالباً ایک پاؤں سے معذور ہیں، خاص قسم کی بیساکھی بغل میں دبی ہوئی ہے۔''

''کون ہوسکتے ہیں، چلو بلاؤ ڈرائنگ روم میں بیٹھاؤ۔''

''میں نے انہیں بیٹھا دیا ہے۔'' فیض بابا نے جواب دیا۔

میں تیار ہوگئی اور اس کے بعد میں ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی، جو صاحب بیٹھے ہوئے تھے وہ خاصے عمر رسیدہ تھے اور ان کی شخصیت انتہائی جاذب نگاہ تھی، اس طرح کے بزرگ بہت اچھے لگتے ہیں، میرے ذہن پر ایک اچھا اثر پڑا تھا، میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے جواب دیا اور پھر بولے۔

''آپ نشاء ہارون ہیں۔''

''جی ہاں۔ میں آپ سے ناواقف ہوں۔''

''احمر جنیدی کہتا تھا کہ اس نے تمہیں میرے بارے میں بتایا تھا، کیا تمہارے ذہن میں کسی عدنان ثنائی کا نام محفوظ ہے؟''

''عدنان ثنائی، انڈونیشیا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، بالکل انڈونیشیا۔''

''اوہو، آپ کب تشریف لائے، اور ذرا مجھے ایک بات بتائیے کیا آپ کو احمر جنیدی کے بارے میں علم ہے جو واقعات ان کے ساتھ پیش آئے ہیں میں اپنے ذہن پر قابو نہیں پاسکی تھی۔'' میرے ان الفاظ پر عدنان ثنائی کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں بیدار ہوا بلکہ انہوں نے کہا۔

''مجھے کئی دن ہوگئے آئے ہوئے، دو تین دن سے تم سے ملنے کی کوشش کررہا ہوں، لیکن تمہاری بے پناہ مصروفیات کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس وقت یہ طے کرکے یہاں آیا تھا کہ اگر مسٹر عسکری یہاں آ بھی جائیں تب بھی میں تم سے ملوں گا۔''

''اوہو...... آپ عسکری صاحب کو جانتے ہیں؟''

''ہاں...... میں جانتا ہوں۔''

''اوہ...... اب میں فوراً ہی یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟''

''دوسرا سوال تم نے احمر جنیدی کے بارے میں کیا تھا، احمر جنیدی کافی زخمی ہے، لیکن اب بہتر ہوتا جارہا ہے، وہ میرے پاس محفوظ ہے، میں نے اسے محفوظ مقام پر رکھا ہے۔''

میرے ذہن میں ایک چھناکہ سا ہوا تھا۔ احمر جنیدی کے ساتھ جو پراسرار واقعات پیش آئے تھے وہ میرے علم میں تھے اور بعد کے واقعات بھی انتہائی حیرت ناک تھے، یعنی یہ کہ پاشا کے بقول احمر جنیدی کو مردہ تصور کرکے مردہ گھر پہنچا دیا گیا تھا، لیکن مردہ گھر سے ان کی لاش غائب ہوگئی اور اب میں دوسرے پراسرار آدمی کے ذریعے اس کی زندگی کی خبر سن رہی تھی، لیکن بہرحال احمر جنیدی کی زندگی کے بارے میں خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی تھی، میں نے کہا۔

''براہ کرم، ذرا مجھے ان کے بارے میں بتائیے، کیا کیفیت ہے ان کی؟''

''سر اور بازو میں شدید زخم آئے ہیں، بہت ہی شدید زخمی ہوا تھا وہ، لیکن قدرت نے اسے نئی زندگی دے دی۔''

''ہوں، واقعی بڑی عجیب سی بات تھی۔''

''اس کے علاوہ میں آپ کو ایک بات اور بتانا چاہتا ہوں مس نشاء ہارون۔''

''جی۔ جی۔''

''ایک شخص احمر جنیدی کی موت کا خواہاں ہے وہ اسے ہر قیمت پر قتل کردینا چاہتا ہے اور اس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے، میں آپ کو کچھ ایسی اہم باتیں بتانا چاہتا ہوں جو آپ کو ممکن ہے ناپسند آئیں لیکن بہرحال میرا فرض ہے کہ میں اس کے بارے میں آپ کو بتادوں۔''

''وہ کون ہے جو احمر جنیدی کو قتل کردینا چاہتا ہے۔''

''سن سکیں گی آپ اس کا نام؟'' عدنان ثنائی نے پراسرار لہجے میں کہا اور میں سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

''میں نے پوچھا تھا سن سکیں گی آپ اس کا نام؟''

''کیا وہ ایسا ہی کوئی نام ہے؟''

''ہاں۔''

''تو بتائیے نا۔''

''نادر عسکری۔'' عدنان ثنائی نے کہا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ ایک لمحے تو میں اپنی سماعت کو یقین دلاتی رہی کہ عدنان ثنائی نے یہی نام لیا ہے، پھر مجھے غصہ آگیا اور میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ پائی۔

''کیا بکواس کررہے ہیں آپ، کیا نام لیا ہے آپ نے، اندازہ ہے آپ کو۔''

”ہاں مجھے اندازہ ہے، بہت عجیب وغریب کھیل ہوا ہے بے بی، بہت عجیب وغریب کھیل ہوا نہیں ہے بلکہ ہو رہا ہے، سمجھ رہی ہو نا تم، جو کچھ ہوا ہے وہ بہت ہی پریشان کن ہے، احمر جنیدی نے مجھ سے انڈونیشیا سے رابطہ قائم کیا اور مجھے اس کی کہانی سن کر یہاں آنا پڑا، کیونکہ وہ میرا بہترین دوست ہے۔“

”لیکن آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں کہ عسکری انہیں قتل کرنا چاہتا ہے۔“

”اس کے جواب میں کچھ تصویریں دیکھنا ہوں گی تمہیں پیش کرتا ہوں۔“ عدنان ثنائی نے بغلی جیب سے ایک لفافہ نکالا اس میں تین تصویریں تھیں، اس نے یہ تصویریں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیں مختلف زاویے سے ایک ہی وقت میں بنائی گئی تصویریں تھیں، تصویروں میں تین افراد کی شکلیں تھیں جن میں ایک نادر عسکری دوسرا جو تھا وہ ناقابل یقین تھا اک لمحے کے لئے میری آنکھیں بند ہوگئی تھیں اور سر بری طرح چکرا گیا تھا، اس چہرے کو میں نہیں بھول سکتی تھی، یہ روشاق تھا، روشاق ایک پراسرار اور عجیب وغریب کردار جسے میں زندگی سے دور کا انسان سمجھتی تھی، اس تصویر میں بھی وہ خونخوار بلی اس کی گود میں بیٹھی ہوئی تھی۔ میری حالت خراب سے خراب تر ہونے لگی، دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے یوں لگتا تھا جیسے سر پھٹ جائے گا، تصویریں میرے سامنے تھیں اور میں غور کر رہی تھی کہ وہ کسی قسم کی کیمرہ ٹرک سے پاک ہیں یا نہیں، تصویروں میں عسکری روشاق سے باتیں کرنے میں مصروف تھا۔ عسکری روشاق، عسکری۔ عسکری جو مجھے ہوٹل میں اپنی منگیتر کے ساتھ ملا تھا اور اس نے اس عورت کی نشاندہی کی تھی اور پھر اس کوٹھی کی، خدا کی پناہ، خدا کی پناہ وہ کوٹھی جو میرے باپ کی ملکیت نکلی، لیکن یہ بات بھی مشکوک ہوگئی تھی کہ ہارون دانش میرے باپ ہیں یا نہیں، روشاق، تیونس میں کارچوک کی پہاڑیاں، مجھے یوں لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی، میرا دماغ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

تبھی عدنان ثنائی کی آواز ابھری۔ ”اور تم اس شخص کو جانتی ہو نا جس کا نام روشاق ہے، یقیناً تم نے اس شخص کو پہچان لیا ہے۔“

”لیکن یہ یہ سب کیا ہے، آپ کو علم ہے کہ عسکری سے میری ملاقات کس طرح ہوئی، میں تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی، بلکہ ایک طرح سے کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اس نے میری بڑی رہنمائی کی تھی۔“

عدنان ثنائی کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی، پھر وہ بولے۔ ”مزید انکشافات کروں بے بی تو تم یقین نہیں کر پاؤ گی۔“

”جی۔ جی۔“

”راتوں کو اکثر عسکری تمہاری لائبریری میں پایا جاتا ہے، اگر یقین نہ آئے تو تجزیہ کر لو اگر تم اپنے اعصاب پر قابو کر سکتی ہو تو، وہ تمہارے والد کی لائبریری میں کیا تلاش کر رہا ہے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے لیکن میں تمہیں بتا دوں کہ وہ سو فیصدی روشاق کا آلہ کار ہے یہ الگ بات ہے کہ اس وقت جب اس کی تم سے اچانک ملاقات ہوئی تھی روشاق اس سے نہ ملا ہو۔“

”تو کیا، تو کیا روشاق یہاں موجود ہے، اگر وہ ہے تو میرے والد ہارون دانش......“ میں جملہ پورا کرتے کرتے رک گئی، میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ عسکری عسکری عسکری۔

عدنان ثنائی میرا چہرہ دیکھتے رہے، پھر انہوں نے کہا۔ ”میں تمہیں کچھ اور تفصیلات بھی بتانا چاہتا ہوں۔ بے بی براہ کرم نادانی سے کام نہ لینا۔ مجھ سے تعاون کرو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“

میرے ذہن میں شدید جھنجھلاہٹ پیدا ہوگئی، میں نے تلخی سے انہیں دیکھا اور بولی۔

”آپ...... آخر آپ لوگ مجھ سے یہ فضول باتیں کرنے کے لئے کیوں چلے آتے ہیں، آپ سب نے مجھے لاوارث کیوں سمجھ لیا ہے، میری کوئی مرضی ہی نہیں ہے، جسے دیکھو، نصیحتوں کا پلندہ اٹھائے آجاتا ہے، آپ بتائیے کیا تعاون کروں آپ سے، بتائیے آپ کیا چاہتے ہیں؟“ عدنان ثنائی کے چہرے کے

عضلات سخت ہوگئے، وہ سرد نگاہوں سے مجھے دیکھتے رہے، پھر بولے۔

”احمر جنیدی نے مجھے تمہارے بارے میں تفصیل سے بتایا ہے، مجھے ایک بات کا جواب دو، آخر ہارون دانش تیونس سے اچانک کہاں غائب ہوگئے اور اس وقت وہ اس قدر پراسرار حالات میں زندگی کیوں بسر کر رہے ہیں جبکہ تمہیں علم ہے کہ وہ زندہ ہیں۔“

”آہ میرے خدا، میرے خدا میرا دماغ پھٹ جائے گا۔“

”نہیں، میں نے خود تم سے کہا ہے کہ اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کرو۔“

”مجھے میرے پاپا کے بارے بتائیے، آپ بتا سکتے ہیں۔“

”ہاں۔“ عدنان ثنائی نے کہا اور میرے پورے بدن میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئیں، لیکن مجھے شدید غصہ آ رہا تھا، میں نے کہا۔

”تو پھر بتائیے۔“ میری آواز میں شدید غراہٹ تھی۔ لیکن عدنان ثنائی نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور بولے۔

”ہارون دانش اپنی تحقیق کے جال میں الجھ گئے ہیں، فراعنہ کی پراسرار سرزمین کا ایسا کوئی راز، کوئی ایسی انوکھی تحقیق جو دنیا کو چونکا دے، حتمی بات نہیں کہی جا سکتی، ہو سکتا ہے یہ مافوق الفطرت قوتوں کا کوئی کھیل ہو، اگر ایک بار ہارون دانش مل جائیں تو پتہ چل جائے کہ یہ کیا قصہ ہے، یوں لگتا ہے جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہوں، سخت خوفزدہ، کسی پر بھروسہ نہ کرتے ہوں، حالاں کہ بات جب بس سے باہر ہو جائے تو کسی کا سہارا حاصل کر لینا اچھا ہوتا ہے۔“

”میں کیا کروں مجھے بتائیے میں کیا کروں۔“

”میں تمہارے والد کا نوادر خانہ دیکھنا چاہتا ہوں۔“ عدنان ثنائی نے کہا۔

”ہرگز نہیں بالکل نہیں، میری آپ سے کوئی شناسائی نہیں ہے، آپ لوگ، احمر جنیدی اس کے ساتھ جو کچھ ہوا میرے گھر میں ہی ہوا، کس سے اجازت لی تھی اس نے، کیا ہوا تھا وہ سب کچھ، میرے باپ کے نوادر خانے میں، کیا تعلق تھا ان کا اس سے، کیا یہ مجرمانہ کارروائی نہیں تھی؟“

”ہو سکتا ہے اس میں تمہارے لئے بہتری نکل آئے۔“ عدنان ثنائی نے کہا۔

”آپ سارے کے سارے میری بہتری کے خواہاں کیوں ہیں، میں نے آپ میں سے کس سے کب مدد مانگی ہے؟“

”ٹھیک ہے تمہاری مرضی ہے جو کچھ کرتا تمہارے تعاون سے ہی کر سکتا تھا، اس سے زیادہ اور کیا حق پہنچا ہے، اچھا اجازت دو۔“

”جا سکتے ہیں آپ۔“ میں نے کہا اور عدنان ثنائی اٹھ گئے، میں خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی رہی، وہ بیساکھی ٹکاتے ہوئے دروازے تک گئے پھر رک کر بولے۔

”کیا تمہیں ان تصویروں کی ضرورت ہے؟“

”لے سکتی ہوں انہیں؟“

”ہاں رکھ لو، میں سمجھتا ہوں تم بچی ہو، جذباتی ہوگئی ہو اور سنو، اگر اپنے ارادے میں کوئی لچک پیدا کر سکو تو میں ہوٹل الاسکا کے روم نمبر تین سو آٹھ میں ہوں، وہیں فون کر لینا اور اگر چاہو تو مجھ سے مل لینا اور سنو ہو سکتا ہے تمہاری ملاقات احمر جنیدی سے بھی ہو جائے۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئے اور میں سکتے کے عالم میں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

ساری دنیا بری لگ رہی تھی، ہر شے سے نفرت کا احساس ہو رہا تھا، بس وہ تصویریں سامنے تھیں، عسکری، عسکری بھی فریب ہے، اتنا بڑا فریب، لیکن یہ ہوا کیسے، وہ تو ایک سادہ سے انسان کی حیثیت سے مجھ سے ملا تھا اور اس کے بعد وہ روشاق کے جال میں کیسے پھنس گیا، روشاق وہ بدروح جسے دیکھ کر کسی بدروح کا احساس ذہن میں ابھرتا تھا۔ دماغ درد سے پھٹا جا رہا تھا، دل پر گھبراہٹ طاری تھی، سکون نہیں ملے گا ساری

رات دیوانگی کا شکار رہوں گی، ابھی بات کروں اس سے، ابھی بات کروں اس کمینے سے۔ مشل کو فون کروں یا نہ کروں، جا کر ملتی ہوں ان سے۔ فون پر تو کوئی بھی کہانی سنائی جا سکتی ہے، چہرہ سامنے ہوگا تو سچ اور جھوٹ کا پتہ لگے گا۔ ڈرائنگ روم سے باہر نکل آئی، کار کی چابی فیض بابا کے پاس تھی ان سے چابی مانگی تو انہوں نے ذرا تکلف سے مجھے چابی دے دی، کار میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کی، فیض بابا گیٹ کے پاس موجود تھے، کار کے سامنے آ گئے، دونوں ہاتھ سیدھے کر کے بولے۔

"کیا وقت ہو رہا ہے اس کا اندازہ ہے؟"

"چوکیدار گیٹ کھولو۔" میں نے غرا کر کہا اور چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔

"آپ ہٹ جایئے سامنے سے فیض بابا مجھے جانا ہے۔"

"ارے کمال کی لڑکی ہو تم، کیا سمجھا ہے تم نے آخر مجھے۔" فیض بابا نے گرج کر کہا۔ اور میں نے کلچ چھوڑ دیا گاڑی گیئر میں تھی، تیر کی طرح آگے بڑھی، فیض بابا اگر پھرتی سے اپنی جگہ سے ہٹ نہ جاتے تو یقیناً کار کی لپیٹ میں آ جاتے، پھر بھی میں نے عقب نما آئینے میں انہیں زمین پر گرتے ہوئے دیکھا۔ گاڑی سڑک پر آ کر فراٹے بھرنے لگی۔ بہت سنبھل کر گاڑی چلائی، دماغ کی بری حالت تھی، بار بار تصویریں ذہن میں ابھر آتیں، کیا یہ سچ ہے، شاید جھوٹ ہو، عسکری کا ان تصویروں سے کوئی تعلق نہ ہو، یہ کوئی کیمرہ ٹرک ہو، عدنان شائی کوئی غلط انسان ہو جو میرے اور عسکری کے درمیان دیوار بننا چاہتا ہو، آخرکار عسکری کی رہائش گاہ تک پہنچی۔ گاڑی لاک کر کے اندر داخل ہوئی تھی کہ سامنے مشل نظر آ گئی۔ ناکافی روشنی میں اس کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا، لیکن اتنا ضرور محسوس کر لیا کہ اس کے انداز میں تپاک نہیں تھا وہ خاموش کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں آگے بڑھی اور بولی۔

"خیریت مشل، کیسے کھڑی ہوئی ہو۔ یہاں...... عسکری ہیں۔"

"نہیں آؤ اندر آ جاؤ۔" اس نے کہا اور میں اس کے ساتھ اندر داخل ہو گئی، وہ مجھے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ اور بیٹھنے کا اشارہ کر کے خود بھی بیٹھ گئی، تیز روشنی میں اس کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا، اجڑا اجڑا اور بے رونق۔

"عسکری کہاں گئے ہیں؟"

"اب وہ مجھے بتا کر نہیں جاتے۔"

"کیا بات ہے مشل، کیسی لگ رہی ہو آج؟" میں نے سوال کیا مگر وہ کچھ نہیں بولی، میں انتظار کرتی رہی پھر میں نے کہا۔

"کیا میں چلی جاؤں؟"

"نہیں بیٹھو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں نشاء۔"

"کہو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"قصور تمہارا نہیں ہے میں جانتی ہوں، غلطی سراسر میری ہے۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"تم لوگ بہترین اداکار ہو میں تسلیم کرتی ہوں، اب نئے ڈائیلاگ کیا ہیں تمہارے یہ تو بتاؤ۔" میرے لہجے اور الفاظ پر وہ سخت حیران ہوئی، پھر متعجب لہجے میں بولی۔

"کیا تمہیں کچھ معلوم ہو گیا ہے؟"

"کیا معلوم ہو گیا ہے؟" میں نے سوال کیا اور وہ رو سی پڑی۔

"عسکری مجھے واپس دے دو نشاء، وہ میرا منگیتر ہے میں اس سے محبت کرتی ہوں میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے، بس غلطی ہو گئی مجھ سے مجھے معاف کر دو، میرے سر پر ایک اور بم پھٹا تھا، میں لرز کر رہ گئی، بڑے زور کا چکر آیا اور میں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔ دیر تک اسی کیفیت کا شکار رہی، پھر میرے منہ سے آواز نکلی۔

"مشل۔"

"ہاں، وہ میرے سگے تایا کا بیٹا ہے۔ ہماری منگنی بچپن ہی میں ہو گئی تھی، میرے [illegible] عسکری کے بچپن

میں ہی انتقال کر گئے تھے، عسکری کو میرے والدین نے پرورش کیا۔ پھر میری والدہ کا انتقال ہو گیا، ہم دونوں ایک دوسرے کے سہارے ہی جی رہے تھے۔ عسکری تعلیم مکمل کر رہا تھا کہ اس کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا اور پھر میرے والد کا، وہ بہت ہی روشن ذہن کا مالک ہے وہ زندگی کو کسی اونچے مقام پر دیکھنا چاہتا ہے، اس نے پرانا مکان بیچ کر یہ مکان خریدا اور کسی اعلیٰ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا، لیکن ملازمت آسانی سے کہاں ملتی ہے، اس کی امیدیں ٹوٹتی رہیں، اس کے بعد وہ برے انداز میں سوچنے لگا، وہ ہر قیمت پر دولت کمانا چاہتا تھا چاہے اس کے راستے غلط کیوں نہ ہوں اور وہ اس کے لئے سرگرداں رہا، پھر اس کے مطلب کے لوگ مل گئے، شاید ایسے لوگ جن کے ذریعے وہ دولت حاصل کر سکتا تھا۔ پرانا مکان فروخت کر کے نئے مکان کی خریداری اور اس پر ہونے والے دوسرے اخراجات کے بعد ہم لوگ اتنے پریشان ہو گئے تھے کہ کبھی کبھی ہمارے پاس کھانے کے لئے بھی پیسے نہ ہوتے تھے۔ وہ قرض ادھار لے کر کام چلا رہا تھا، لیکن لوگوں نے اسے کار خرید کر دی۔ سارے اخراجات پورے کر دیئے اور اس کے بعد اس نے مجھے اپنے منصوبے میں شامل کر لیا۔ اس نے کہا کہ ایک شاندار مستقبل کے حصول کے لئے ہمیں مل کر کام کرنا ہوگا، وہ یہ کام تنہا نہیں کر سکتا تھا، تمہیں اندازہ ہو گیا ہوگا نشاء کہ میری مجبوریاں کیا تھیں، اس کی منگیتر ہوں میں، اس سے میری زندگی وابستہ ہے اور پھر اس کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے، پھر بھی میں بڑی مشکل سے راضی ہوئی تھی، کیونکہ اس وقت جب ہم تم سے پہلی بار ملے تھے نا سادہ لوح اور غریب سے لوگ تھے، لیکن اس کے بعد اچانک ہی سب کچھ ہو گیا، اس نے مجھے اپنا پورا منصوبہ کبھی نہیں بتایا، لیکن اس منصوبے کا مرکز اچانک تم بن گئی تھیں۔"

میں سر پکڑے ساری باتیں سن رہی تھی میں نے کہا۔ "مگر کار تو تمہارے پاس پہلے سے موجود تھی۔"

"ہماری [illegible] نہیں تھی، بس آغاز اسی دن سے ہوا جب عسکری نے اس عورت کی باتیں سنیں اور اس کے بعد تمہاری مدد کی، بس یوں سمجھ لو کہ اس دن کے بعد سے کچھ لوگ اس کے پیچھے لگ گئے اور اسے آخرکار ٹریپ کر لیا گیا، لیکن اب جو صورتحال ہے وہ بڑی خطرناک ہو چکی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے سرد نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ تمہاری محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔"

"خوب......" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ سچ ہے اس نے مجھ سے گریز کرنا شروع کر دیا ہے، مجھ سے زیادہ اسے اور کون جانتا ہے، بچپن سے آج تک ساتھ رہی ہوں، اب وہ مجھ سے نہیں تم سے محبت کرتا ہے۔"

میرے ذہن میں ایک زہریلا سا احساس جاگا تھا، میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ "میرے خیال میں یہ الفاظ بھی تمہارے منصوبے ہی کا حصہ ہیں۔"

مشل نے شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

"جو دل چاہے کہہ لو۔ میں نے تمہارے ساتھ کوئی ایثار نہیں کیا ہے بلکہ اپنا مستقبل بھی بچانا چاہتی ہوں۔" آگے تمہیں اختیار ہے۔

"تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔" میرا لہجہ اب بھی طنزیہ تھا۔

"تحقیق کرو اور اگر میری بات سچ نکلے تو اسے دھتکار دو۔ اپنے آپ سے دور کر کے اپنا تحفظ کرو۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"وہ مایوس اور بددل ہو جائے گا۔ پہلے وہ ایسا نہیں تھا۔ لیکن اب برے لوگوں کے جال میں پھنس گیا ہے۔ ناکامی اسے اس کی دنیا میں واپس لے آئے گی۔"

"ایک بات کہوں مشل۔"

"ہاں۔ بولو۔"

"ممکن ہے تم جوش رقابت میں جھوٹ بول رہی ہو۔"

"میں نے کہا ہے کہ پہلے تحقیق کرلو۔ پھر فیصلہ کرنا۔"

"وہ لوگ کون ہیں جن کے لئے وہ کام کررہا ہے۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"کچھ تو روشنی ڈالوان پر۔"

"وہ موبائل فون پر رابطہ رکھتے ہیں۔"

"اس وقت وہ کہاں ہے۔"

"میں نہیں جانتی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے اس انکشاف پر غور کروں گی۔ چلتی ہوں۔" میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو نشاء۔ پلیز۔" وہ عاجزی سے بولی۔

"ہونہہ۔ میں نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے اور باہر نکل آئی۔ پھر کار میں بیٹھ کر چل پڑی۔ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ کار کیسے ڈرائیو کررہی تھی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ مشل کا کوئی قصور نہیں تھا وہ محبت کی ماری تھی۔ لیکن عسکری...... اور پھر عدنان ثنائی کے انکشافات کی مکمل تصدیق ہوگئی تھی۔ عسکری فریبی، مکار ہے۔ بہت افسوس ہورہا تھا۔ ایسے وقت میں جمال پاشا یاد آیا۔ اور میرے منہ سے آہ نکل گئی۔

"آپ سب کو ایک کمرے میں بند کروں گی۔ اور پھر پوری کوٹھی میں پیٹرول چھڑک کر اس میں آگ لگادوں گی۔ خود بھی باہر نہیں جاؤں گی اور یہیں جل مروں گی۔ سمجھے آپ فیض بابا۔ اور شاید آپ کو اندازہ ہو کہ میں جو کہتی ہوں کر دکھاتی ہوں۔

"تم پاگل ہوچکی ہو۔"

"ہاں فیض بابا۔ میں پاگل ہوچکی ہوں۔"

"اس کے باوجود تمہیں کچھ انتظار کرنا ہوگا۔"

"کیسا انتظار۔"

"بدنصیبی ہے ہماری کہ ہم نمک حرام نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب۔"

"دانش ہارون آجائیں تو ہم سب کچھ ختم کر کے لعنت بھیج دیں اس وفاداری پہ۔ اور یہاں سے چلے جائیں۔ میں وہ لمحے کبھی نہ بھول سکوں گا جب تم نے میرے اوپر گاڑی چڑھادی تھی۔

"تم بھی تو میرے ساتھ یہی سلوک کررہے ہو فیض بابا۔ کتنا فرق آگیا ہے تمہاری زبان میں۔ کیا تم اسی طرح مجھے مخاطب کرتے تھے۔"

"اور تم نشانی بی۔" فیض بابا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"وجہ ہے اس کی۔"

"کیا؟"

"تم مجھ سے جھوٹ بولتے رہے ہو۔"

"کیسا جھوٹ۔"

"کون جانے دانش ہارون۔" اب دنیا میں ہیں یا نہیں۔ تم نے عسکری کے سامنے پاپا کے وکیل کا حوالہ دیا تھا جس کے پاس پاپا کا وصیت نامہ موجود ہے۔

"ہاں۔" دیا تھا۔

"کیا وہ سچ تھا۔"

"بالکل سچ تھا۔"

"میں اس وکیل سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"میں نے منع کردیا ہے تمہیں۔"

"آخر کیوں۔"

"اس لئے کہ مجھے اس کی اجازت نہیں ہے۔"

"کس کی اجازت نہیں ہے۔"

"میرے مالک کی۔"

"میں تمہیں اسی مالک کی بیٹی کی حیثیت سے حکم دے رہی ہوں کہ مجھے وکیل کے بارے میں بتاؤ۔"

"یہ ممکن نہیں ہے۔"

"تب فیض بابا مجبوری ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ پولیس اسٹیشن جاؤں اور آپ لوگوں کے خلاف رپورٹ کروں۔ میں بتاؤں کہ آپ لوگ مجھے میری دولت اور میری جائیداد کے بارے میں اندھیرے میں رکھ رہے ہیں۔" فیض بابا مجھے دیکھتے رہے پھر بولے۔

"ٹھیک ہے، تم ایسا ہی کرو۔ ہم گرفتار ہوجائیں اس طرح ہماری وفاداری کا بھرم تو قائم رہ جائے۔" یہ کہہ کر فیض بابا باہر نکل گئے۔

دن کو گیارہ بجے عسکری آگیا۔ میری خوابگاہ کے دروازے پر دستک دی اور کہا۔ "میں اندر آسکتا ہوں۔" میں نے اس کی آواز پہچان لی اور سخت لہجے میں کہا۔ "ملازم سے کہو ڈرائنگ روم کھولے۔ وہاں جا کر بیٹھو میں آرہی ہوں۔"

پتہ نہیں میرے لہجے اور الفاظ پر عسکری پر کیا رد عمل ہوا لیکن دوبارہ اس کی آواز نہیں سنائی دی۔ میں نے واش روم میں جا کر حلیہ ٹھیک کیا، عسکری سے مجھے بے پناہ نفرت کا احساس ہورہا تھا، بہرحال میں ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ اور دروازہ کھول کر اندر داخ ہوگئی وہ صوفے پر بیٹھا ہوا تھا مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور ہکلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"نشاء کیا ہوا۔ یہ تم......" لیکن میں نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔

"مسٹر عسکری مجھے آپ کے فریب کا علم ہوگیا ہے اور اس طرح میرے اور آپ کے درمیان تمام رابطے ختم ہوگئے ہیں۔ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے لفظوں میں احتیاط برتیں۔

"وہ جھاگ کی طرح آہستہ آہستہ بیٹھ گیا۔ اس نے گردن جھکالی تھی۔ میں اس کے سامنے صوفے پر جا بیٹھی۔

"جی مسٹر عسکری۔"

"وہ سب کچھ سچ ہے، جو مشل نے آپ کو بتایا ہے لیکن نشاء اب میں آپ کو چاہتا ہوں۔ آپ یقین کیجئے نشاء اب میں دنیا میں کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا۔"

"زبردست۔ میرے بعد آپ کیسے جائیں گے۔"

"دیکھو نشاء میں خود کو مجرم مانتا ہوں۔ لیکن میرے دل میں اب صرف تمہارا پیار ہے۔ میں ہر چیز پر لعنت بھیجتا ہوں۔ کچھ نہیں چاہئے مجھے تمہارے پیار کے سوا اور یہ بھی تمہیں بتادوں کہ تمہیں میری ضرورت ہے۔ تم بہت سے دشمنوں میں گھری ہوئی ہو۔ میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔"

"اور کوئی خاص بات۔"

"نشاء میری بات سنو۔ غلطی انسان سے ہی ہوجاتی ہے۔ مجھ سے بھی ہوگئی۔ بس ایک بار معاف کردو۔"

"کس کے لئے کام کررہے ہو عسکری۔ کون لوگ ہیں وہ اور کیا چاہتے ہیں۔" میں نے بدستور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"ان کا سرغنہ ایک عجیب وغریب انسان ڈاکٹر روشاق ہے وہ دانش ہارون صاحب کی تلاش میں ہے۔"

"کیا کہتا ہے وہ ان کے بارے میں۔"

"اسے کسی اہم کام کے لئے ان کی تلاش ہے، اس کا خیال ہے کہ تمہیں یا تمہارے نوکروں کو ان کے بارے میں معلوم نہیں ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح تمہارے والد تمہارے اردگرد کہیں موجود ہیں اور وہ تم پر نگاہ رکھتے ہیں روشاق نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تمہارے قریب ہونے کی کوشش کروں تمہیں اپنی محبت کے جال میں پھانس کر ایسے ذرائع تلاش کروں جن سے اسے تمہارے والد کی تلاش میں آسانی ہو۔"

"وہ کیا کہتا ہے، دانش ہارون زندہ ہے۔"

"ہاں سو فیصدی۔ وہ دعوے سے یہ بات کہتا ہے۔"

"لیکن آپ کا خیال تو مختلف تھا۔ آپ میرے ملازموں پر شبہ کررہے تھے۔"

"ڈرامہ تھا وہ سب۔ جو میں نے روشاق کے لئے کیا وہ چاہتا تھا کہ اس طرح کوئی ایسا کردار سامنے آجائے جو تمہارے والد کے بارے میں جانتا ہو۔"

"آپ اس کی وفاداری سے منحرف کیسے ہوگئے مسٹر عسکری۔"

"اس لئے کہ میں تمہیں پورے خلوص سے چاہنے لگا ہوں۔"

"اور مشل کے بارے میں کیا سوچا آپ

نے۔"

"ہم اسے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے مستقبل کے لئے سب کچھ کریں گے۔"

"لیکن اس سے پہلے آپ اس سے چاہت کا اظہار کر کے رہیں گے۔"

"میں اسے اپنی ایک ذمے داری سمجھتا ہوں۔"

"کیوں۔"

"اس لئے کہ اس کے باپ نے میری پرورش کی ہے۔ اس کے اچھے مستقبل کی ذمے داری میں اب بھی پوری کروں گا۔"

"ٹھیک۔ میرے والد کی لائبریری سے آپ کیا کیا چرا کر لے جا چکے ہیں۔ میں نے سب سے کاری وار کیا اور عسکری سکتے میں رہ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ بات مجھے مشل نہیں بتا سکتی کیونکہ اسے معلوم ہی نہیں تھا بمشکل تمام اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔

"مم...... میں...... میں سمجھا نہیں۔" میں ہنس پڑی۔

"یہ پہلا سوال ہے عسکری صاحب۔ ابھی تو آپ سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ یہ فیصلہ کر لیجئے کیا آپ سچ بول سکتے ہیں۔"

"میں سمجھ گیا اس چور نے تم سے رابطہ کیا ہے۔ مگر تم نے اس سے یہ نہیں پوچھا نشاء کہ وہ خود یہاں کیا کر رہا تھا۔

"ایک سوال اور مسٹر عسکری۔ وہ چور یہاں جو کچھ بھی کر رہا تھا لیکن مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے عسکری صاحب یہاں کیا کر رہے تھے۔"

"میں نادانیوں کا شکار تھا اس وقت۔"

"خوب، خوب، خوب، کیا کیا لے گئے آپ یہاں سے۔ آپ نے بتایا نہیں۔"

"تمہارے والد کی تصویر اور کچھ کتابیں۔" وہ گردن جھکا کر بولا۔

"کوئی قیمتی چیز تو ہاتھ نہیں لگی آپ کے۔ ویسے آپ بہت چالاک ہیں۔ عسکری صاحب۔"

"چ...... چالاک......"

"میرے قریب آ کر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ روشاق آپ کو جو بھی دے گا میری رفاقت اس سے لاکھ گنا زیادہ قیمتی ہے چنانچہ مجھے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر آپ زیادہ فائدے میں رہیں گے۔

چنانچہ مجھے اپنی محبت کے جال میں پھانس کر آپ روشاق سے معاوضہ وصول کرنے کے بجائے براہ راست میری دولت پر قبضہ کیوں نہ کریں۔ لیکن...... ناکام ہو گئے آپ عسکری صاحب۔ ناکام ہو گئے۔"

"خدا کی قسم یہ بات نہیں ہے نشاء۔ میرے دل میں تمہاری محبت جاگ اٹھی ہے۔ اب تمہارے سوا مجھے کسی اور چیز کی طلب نہیں ہے۔ بھلا میں ان لوگوں سے تمہارا تحفظ کرنا چاہتا ہوں سچ بول رہا ہوں میں۔"

"مجھے کسی باڈی گارڈ کی ضرورت نہیں ہے عسکری صاحب اور پھر اگر ہوتی بھی تو آپ جیسے مکار آدمی کی نہیں۔"

"میری بات سنو نشاء۔"

"میری طرف سے ایک تحفہ بھی قبول کرنا ہے۔"

"تحفہ؟"

"جی!"

"کیسا تحفہ......" وہ بدحواسی سے بولا۔ اور میں نے تصویروں والا لفافہ نکال کر اس کے سامنے ڈال دیا۔

"یہ...... یہ کیا ہے۔"

"ملاحظہ فرمالیں......" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اور اس نے لفافے میں سے تصویریں نکال لیں۔ یہ تصویریں دیکھ کر اس کی حالت اور خراب ہو گئی۔

"یہ...... یہ کہاں سے آ گئیں۔" وہ ہکلا کر بولا۔

"بکواس بند کریں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"دیکھو نشا۔"

"اس کے بعد بھی آپ یہاں موجود ہیں۔ آپ خود یہاں سے چلے جائیں گے یا میں ملازموں کو بلاؤں۔" میں نے کہا۔

"میری بات سنو۔"

"اور اس کے بعد آپ کبھی یہاں نہیں آئیں گے۔ ورنہ۔ ملازم آپ کو ماریں گے۔"

"او کے نشاء۔ ٹھیک ہے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اب میں تمہارا سایہ ہوں۔ کبھی تم سے دور نہیں رہوں گا۔ اور ایسا بس اپنی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کروں گا۔"

"گیٹ آؤٹ۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ اور وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل گیا۔ اس کے ساتھ یہ سلوک کر کے بڑی خوشی ہو رہی تھی۔ اپنے بارے میں آخر کار یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ تنہا پیدا ہوئی ہوں اور مجھے یہ تنہائیاں قبول کر لینی چاہئیں۔"

دو دن گزر گئے۔ وہی پہلے جیسا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ میں نے مشل یا عسکری سے پھر کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ پھر اس دن فیض بابا اچانک میرے پاس آ گئے۔

"اے کے ہمدانی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"کون ہیں یہ۔"

"دانش ہارون صاحب کے وکیل۔"

"کون۔"

"وکیل صاحب۔" میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا ہے۔ فیض بابا نے کہا اور میں اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اے کے ہمدانی بڑی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ میرے سلام کا جواب البتہ انہوں نے بڑی سرد مہری سے دیا تھا۔ اور بغیر کسی تمہید کے کہا۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ان دنوں بہت سرگرم ہو اور اپنے باپ کا راز جاننے کے لئے سرگرداں ہو۔"

ان الفاظ نے مجھے گرم کر دیا...... میں نے کہا۔

"آپ اس بات پر مجھے سرزنش کرنے آئے ہیں۔"

"نہیں...... بلکہ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ تم بہت جلد بازی کر رہی ہو۔ تمہاری جلد بازی بہت سے کام بگاڑ دے گی۔

"کون سے کام......" میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

"تمہاری اصلیت تمہیں ضرور بتائی جائے گی۔ لیکن اس کے لئے کچھ وقت درکار ہے۔"

"میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ اپنے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں۔ اس لئے "کیوں" کہہ رہے ہیں۔ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بے باکی کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن ہارون دانش کے وکیل کی حیثیت سے میری کچھ قانونی ذمے داریاں ہیں۔"

"میں تو اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔"

"ہارون دانش سے میرے تیس سال سے تعلقات ہیں۔ میں ان کے مسائل سے واقف ہوں۔"

"میں اس کی تصدیق کیسے کروں۔"

"تم اس سلسلے میں اپنا کوئی وکیل کر کے میرے اوپر کیس کر سکتی ہو۔ اور عدالت کے ذریعہ تصدیق کر سکتی ہو کہ میرا دعویٰ سچ ہے یا غلط۔

نہ جانے کیوں یہ لہجہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ میرے انداز میں خود بخود تبدیلی پیدا ہو گئی اور اس نے مسکرا کر کہا۔

"آپ ناراض ہو گئے۔"

"نہیں۔ ایک بات ہم جانتے ہیں کہ بہت کم لوگ خود پر قابو پا سکتے ہیں اور بزرگوں کا احترام کر سکتے ہیں۔ لیکن وکالت کا شعبہ نوکری کے زمرے میں نہیں آتا۔"

"آپ کو معلوم نہیں ہے کہ مجھ پر کیا بیتی ہے، میں ذہنی طور پر بالکل ختم ہو چکی ہوں۔ کیا آپ پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا تھا کہ آپ میری خبر گیری کرتے۔"

"ہارون دانش نے فیض صاحب اور آپا ندیمہ کو تمہاری خبر گیری کے لئے مخصوص کیا تھا اور یہ دونوں بھروسے کے لوگ تھے۔ شاید تم ان سے غیر مطمئن ہو۔"

"میں کس سے اس بارے میں کہوں۔ کیا آپ سے؟ یا اپنے پاپا سے۔ کہاں ہیں وہ؟"

"افسوس تو یہ ہے کہ تم کسی پر بھروسہ نہیں کرتیں۔"

"میں کس پر بھروسہ کروں۔ میری آواز رندھ گئی۔"

"نشاء۔ مسٹر ہارون دانش کسی الجھن کا شکار ہیں جس کے بارے میں مجھے بھی نہیں معلوم۔ لیکن وہ خیریت سے ہیں۔ اور اپنی الجھنوں سے نجات حاصل کرکے تم سے ملتے اور تمہیں مطمئن کرتے۔ لیکن تم نے بہت سے کھیل بگاڑ دیئے ہیں۔"

"تو پھر میں کیا کروں۔"

"تمہیں انتظار کرنا ہوگا۔"

"کتنا؟"

"کوئی تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن ایک بات اب ذہن نشین کرلو تمہیں روکا جائے گا۔ کیونکہ تم نے اپنی احمقانہ حرکتوں سے خود کو بے شمار مشکلات میں گرفتار کرلیا ہے۔ تم بہت سی نگاہوں میں آچکی ہو۔"

"مجھے صرف ایک بات بتادیجئے سر۔"

"سر نہیں۔ انکل کہنا پسند کروگی؟"

"جی انکل۔ مجھے بس ایک بات بتادیجئے۔ میرے پاپا زندہ ہیں۔"

"ہاں وہ زندہ ہیں۔"

"اور میری ماں۔"

"ان کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

"مجھے ان سے ایک بار ملادیں۔"

"بہت مشکل ہے۔"

"میں ہر مشکل سے گزرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"بات تمہاری مشکل تو نہیں ہے۔"

"تو پھر......؟"

"ان کے بارے میں کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔"

"آپ کو بھی نہیں......؟"

"میں واقعی نہیں جانتا۔"

"تو پھر آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔"

"آج غالباً اٹھارہ تاریخ ہے۔ اسی ماہ کی گیارہ تاریخ کو میری ان سے بات ہوئی تھی۔"

"میرے پاپا سے؟" میرے حلق سے جیسے چیخ سی نکل گئی۔

"ہاں۔"

"تو پھر آپ یہ بتایئے کہ وہ میرے پاپا ہیں بھی یا نہیں۔ انہیں میری حالت کا اندازہ نہیں ہے۔ تیونس میں وہ مجھ سے جس طرح بچھڑے تھے کیا یہ انہیں احساس نہیں ہے کہ میری ذہنی کیفیت کیا رہی ہوگی، یا پھر یہ ہی ہوسکتا ہے کہ میں ان کی اولاد ہی نہ ہوں۔"

"شاید ایسا نہیں ہے۔"

"تو پھر بتایئے انکل جب وہ آپ سے فون پر بات کرسکتے ہیں تو کیا مجھے فون نہیں کرسکتے۔ انہیں میری کوئی پرواہ ہے۔"

"تم ابھی کم عمر ہو، معصوم ہو، حالات کو سمجھ نہیں سکتیں کچھ وقت اور گزر جانے دو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں انکل۔" میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"فیض بابا اور آپا ندیمہ مکمل طور پر قابل بھروسہ ہیں۔ انہیں غیر نہ سمجھو۔"

"میں تنہائی میں مرجاؤں گی۔"

"اچھا میں ایک کام کرتا ہوں۔ حالانکہ یہ ایک خطرناک کام ہے لیکن مجبوری ہوگی۔ میں ایک خاتون کو تمہارے پاس بھیجوں گا اس کا نام صوفیہ ہوگا۔ اسے اپنے پاس رکھ لینا۔ تمہاری تنہائی دور ہوجائے گی۔"

"اس کے علاوہ بیٹے میں تمہیں فون کرتا رہوں گا اور اب میں چلتا ہوں۔" اے کے ہمدانی نے کہا۔

"انکل آپ نے کچھ پیا بھی نہیں۔"

"تمہاری ڈانٹ پی ہے۔ کافی ہے۔" ہمدانی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں انہیں چھوڑنے باہر تک آئی تھی۔ باہر ہمدانی صاحب کی خوب صورت کار کھڑی ہوئی تھی۔ باوردی ڈرائیور تھا جس نے ادب سے پچھلا دروازہ کھولا تھا۔ ہمدانی صاحب کار میں بیٹھے اور میری طرف الوداعی ہاتھ ہلایا۔ ان کی کار لان پر پھیلے ہوئے درختوں کے پاس کھڑی تھی۔

اچانک ہی کسی درخت سے ایک بھیانک آواز کے ساتھ کسی جانور یا پرندے نے چھلانگ لگائی اور پچھلی سیٹ کے شیشوں سے ٹکرا کر نیچے گرا۔ تبھی میں نے اس بھیانک بلی کو دیکھا۔ جس نے درخت سے یقینی طور پر ہمدانی صاحب پر چھلانگ لگائی تھی۔ اگر شیشہ کھلا ہوتا تو ہمدانی صاحب کا جو حشر ہوتا وہ آسانی سے سمجھا جاسکتا تھا۔ بلی نیچے گری اسی وقت کار اسٹارٹ ہوئی تھی اور پھر فوراً وہ بلی اٹھ کر گیٹ کی جانب دوڑی ایک بار پھر اس نے کار پر چھلانگ لگائی تھی لیکن دوبارہ پھسل کر نیچے گر پڑی تھی۔ کار باہر نکل گئی۔ ساتھ ہی بلی بھی۔

میرا دل دھاڑ دھاڑ کررہا تھا۔ بلی یقیناً ہمدانی صاحب کو چیر پھاڑ ڈالنا چاہتی تھی۔ وہ اتنی ہی خونخوار ہورہی تھی۔ وہ بھی کار کے ساتھ باہر نکل گئی تھی۔ پیچھے فیض بابا کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے ہانپتے ہوئے فیض بابا کو اشارہ کیا اور بولی۔

"فیض بابا وہ......وہ، بلی......"

"ہاں میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔ اس کے علاوہ فیض بابا اور کچھ نہ کہہ سکے۔ مجھے دیر تک چکر آتے رہے تھے۔ حالات پراسرار سے پراسرار ہوتے جارہے تھے۔ ہر چیز ایک معمہ تھی۔

باقی وقت سخت الجھن میں گزرا تھا۔ ہمدانی صاحب کی باتیں یاد آرہی تھیں وہ خون خوار بلی کس کے اشارے پر ان پر حملہ آور ہوئی تھی۔ پتہ نہیں خود ان کی کیفیت کیا تھی۔

آہ یہ سب کچھ کیا ہے۔ میری ذات اس قدر معمہ کیوں ہے رات میں پاپا کے کمرے میں پہنچ گئی۔

عجیب و غریب قوانین

☆ بائیو کلیو لینڈ (امریکہ) ریاست میں شکار کے لائسنس کے بغیر چوہے پکڑنا غیر قانونی ہے۔

☆ اٹلی کے شہر "فیریرا" لوکل، چیری ڈیری" کے ملازمین اگر کام کرنے کے دوران سوجائیں تو انہیں قید کی سزا ملتی ہے۔

☆ پیراگوئے میں خون دینے والے کی لسٹ میں رجسٹرڈ افراد کا آپس میں ڈوئل لڑنا غیر قانونی ہے۔

☆ تھائی لینڈ میں سڑک پر چلتے ہوئے چیونگم پھینکنے پر 600 ڈالر جرمانہ کی سزا ہوسکتی ہے۔

☆ امریکی ریاست منی سوٹا میں سر پر بطخ رکھ کر سیاست کی حد پار کرنا غیر قانونی ہے جبکہ بطخ سر پر رکھے بغیر ساتھ لے جانا قانونی طور پر جائز ہے۔

☆ "ایلائیو" میں کوئی شخص اپنی محبوبہ کو 50 پاؤنڈ سے کم چاکلیٹ کا تحفہ نہیں دے سکتا۔

☆ نیویارک میں راہ چلتے کتاب پڑھنے پر پابندی ہے۔

☆ نیویارک میں مونگ پھلی کھاتے ہوئے الٹے پاؤں چلنا منع ہے۔

☆ نیویارک میں کسی کے سر پر بال مارنا جرم ہے اور بالکنی میں کپڑے لٹکانے کیلئے لائسنس لینا لازم ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

ہمدانی صاحب کے کچھ الفاظ میرے لئے بڑی ڈھارس کا باعث تھے انہوں نے کہا تھا کہ پاپا نے چند ہی روز پہلے ان سے بات کی ہے۔

پاپا کی لائبریری میں وہ ہی پراسرار خاموشی طاری تھی، پھر مجھے عسکری کا خیال آیا۔ کتنا برا انسان نکلا وہ۔ چوری تک کر ڈالی اس نے میرے گھر میں۔ میں لائبریری کا جائزہ لینے لگی۔ نجانے کون کون سی کتابیں چرا کر لے گیا ہے بدبخت۔ پھر کوئی صحیح اندازہ نہیں لگا پائی تو لائبریری سے واپس آ کر اپنے بیڈروم میں لیٹ گئی، رات کا وقت نیند آئی اندازہ نہ ہوسکا، پھر صبح ہوگئی، کوئی نئی بات نہ تھی اس دن میں لیکن شام کو پانچ بجے کے قریب اچانک ہی فیض بابا میرے کمرے میں آئے ان کے چہرے پر کوئی خاص بات تھی۔

''کیا بات ہے فیض بابا؟''

''بہت بری خبر ہے۔''

''کیا......؟''

''اے کے ہمدانی اسپتال میں ہیں صوفیہ نامی کسی لڑکی نے مجھے یہ بات بتائی ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔ انہیں کیا ہوا۔''

''صوفیہ کا کہنا ہے کہ انہیں رات کو اغواء کرلیا گیا تھا اور دوسرے وہ شدید زخمی حالت میں ایک ویران سے علاقے میں کسی کو ملے اور اس نے انہیں زندہ پا کر اسپتال پہنچادیا۔

''مائی گاڈ۔'' میں نے سر پکڑلیا۔

''کیا حکم ہے بیٹا۔ اسپتال چلوگی۔''

''جی۔''

''نیو ایج اسپتال میں ہیں۔ صوفیہ تم سے رابطے کے لئے بے چین ہے۔''

''وہ کہاں ہے۔''

''شاید اسپتال میں یا پہنچنے والی ہے۔''

''میں چینج کرلوں آپ گاڑی نکالئے۔''

اس وقت میں نے کار چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے اعصاب کشیدہ تھے اور میرا دماغ خیالات کا مسکن بنا ہوا تھا۔ رہ رہ کر وہ خوف ناک بلی میری نگاہوں میں آرہی تھی۔ جو روشاق کی ملکیت تھی۔ احمر جنیدی کو بھی اسی بلی نے زندگی سے محروم کرنے کی کوشش کی تھی اور اب ہمدانی صاحب پر بھی اس نے حملہ کیا گویا وہ ہمدانی کی طاق میں تھی۔ روشاق مختلف شکلوں میں میرے آس پاس موجود تھا اور نجانے کیا کررہا تھا۔

''آہ کیسا ہے یہ سب کچھ۔''

اسپتال بہت ہی شاندار تھا ہمیں اے کے ہمدانی کے بارے میں آسانی سے پتہ چل گیا۔ وسیع و عریض کمرے میں کئی افراد موجود تھے۔ یہ سب ہمدانی صاحب کے اہل خاندان تھے۔ انتہائی خوب صورت آنکھوں والی بھرے بدن کی ایک ستائیس اٹھائیس سالہ خاتون نے میرا استقبال کیا۔

''آپ نشا ہارون ہیں؟''

''جی۔''

''میرا نام صوفیہ ہے۔ مجھے ہدایت کی گئی تھی کہ مجھے آپ کے ساتھ رہنا ہے۔''

''جی۔''

''ہمدانی صاحب پر بدترین تشدد کیا گیا ہے۔''

''تشدد......؟''

''جی ہاں۔''

''میں انہیں دیکھ سکتی ہوں۔''

''ہاں آیئے۔''

صوفیہ مجھے بستر کے پاس لے گئی۔ ہمدانی صاحب کے منہ پر بڑا سا ٹیپ چپکا ہوا تھا جس کے نیچے روئی کا انبار تھا۔ ہاتھوں پر پٹیاں کسی ہوئی تھیں۔ چہرہ بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ اوپری بدن برہنہ تھا اور ہر آنچ پر شدید زخموں کے نشانات تھے۔

صوفیہ نے لرزتی آواز میں کہا۔

''ان کی زبان کاٹ لی گئی ہے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ پورا بدن آگ سے داغا گیا ہے اور پھر شاید مردہ سمجھ کر پھنکوا دیا گیا تھا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' میری آواز رندھ گئی۔

بمشکل تمام میں نے کہا۔

''کچھ اور معلوم ہوسکا۔''

''نہیں۔ پولیس تفتیش کررہی ہے۔ میری نگاہیں ہمدانی صاحب کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ہوش میں تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں بے چینی نمودار ہوگئی۔ انہوں نے جسم کو جنبش بھی دی تھی۔

میں پتھرائے ہوئے انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔ صاف ظاہر ہورہا تھا کہ ہمدانی صاحب کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اچانک انہوں نے پیر کو جنبش دی اور قریب کھڑے ہوئے ایک نوجوان کو ٹھوکر ماری۔ نوجوان جلدی سے ان پر جھک گیا۔

''کیا بات ہے تایا ابو کیا بات ہے؟''

''ہمدانی صاحب نوجوان کو دیکھنے لگے ان کی نظریں نوجوان کے سینے پر تھیں اور وہ آنکھوں آنکھوں میں اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔

''کوئی تکلیف ہے تایا ابو؟'' نوجوان نے پھر پوچھا۔ اور ہمدانی صاحب نے پاؤں کو پھر جنبش دی لیکن اسے زیادہ اونچا نہ اٹھا سکے۔ صوفیہ بھی ادھر ہی متوجہ ہوگئی تھی۔ پھر اس نے کہا۔ ''تم ہٹو صوفیہ ہٹو وہ خود ہمدانی صاحب پر جھک گئی اور بولی۔ ''کچھ کہنا چاہتے ہیں سر مجھے آنکھوں سے بتایئے۔'' اور اس کے ان الفاظ پر ہمدانی صاحب کی نگاہیں پھر اسی نوجوان کی طرف اٹھ گئیں۔

صوفیہ نے ان کی نگاہوں کا زاویہ دیکھا۔ پھر سیدھی ہوکر نوجوان سے بولی۔ ''نسیم یہ قلم دو ذرا۔''

میں نے چونک کر نوجوان کو دیکھا۔ اس کی جیب میں ایک بال پوائنٹ لگا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے بال پوائنٹ نکال کر صوفیہ کو دے دیا۔ ہمدانی صاحب نے آنکھوں کو جنبش دی۔ پھر پاؤں ہلایا۔ صوفیہ نے قلم پاؤں کی طرف کیا تو ہمدانی صاحب نے انگوٹھے اور انگلی کی مدد سے قلم پکڑلیا۔

''اوہ۔ وہ کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔''

''پاؤں سے۔'' نسیم نے حیرت سے کہا۔

''کوئی کاغذ دو پلیز۔'' صوفیہ بولی۔

دواؤں کا ایک پرچہ مل گیا تھا جسے چارٹ پیڈ پر لگا کر اسے ہمدانی صاحب کے پاؤں کے قریب کرلیا۔ ہمدانی صاحب ایک مشکل عمل کرنے لگے۔ سب ان کی مدد کررہے تھے۔ بمشکل تمام انہوں نے آڑے ترچھے لفظوں میں لکھا۔

''نشاء۔ اسٹمر ماؤسز ہیں۔''

بڑی مشکل سے نئی آڑی ترچھی لکیروں کی ترتیب کی گئی۔ نسیم نے حیران لہجے میں کہا۔ ''یہ کیا ہے۔ صوفیہ صاحبہ۔''

''یہ ان کے لئے ہے۔'' صوفیہ نے میری طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ بولی۔ ''یہ پرچہ آپ اپنے پاس رکھیں۔ مس نشاء۔''

''مگر یہ کیا ہے۔ میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

کسی نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری نگاہیں مسٹر ہمدانی کے چہرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ نہ جانے کیوں میرے دل کو بڑے دکھ کا احساس ہوا۔ ان کی یہ حالت میری وجہ سے ہوئی ہے۔ کتنی پروقار شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی باتیں مجھے یاد آنے لگیں۔ اسی وقت صوفیہ نے مجھے مخاطب کیا۔

''نشاء۔''

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

''اب تم واپس جاؤ۔''

''صوفیہ صاحبہ۔''

''صرف صوفیہ۔'' صوفیہ نے کہا۔

''کیا۔ کیا انکل ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''ہم اللہ سے یہی دعا کریں گے۔''

''میں اب کیا کروں صوفیہ۔''

''گھر واپس جاؤ۔ ہم فون پر رابطہ رکھیں گے۔''

''یہ پرچہ۔'' میں نے کہا۔

''اسے اپنے پاس محفوظ رکھو۔ لیکن سنو۔''

''ہوں۔''

"کیا لکھا ہے اس پر۔"
"اسٹمر ماؤسز ہیں۔"
"یاد رکھ سکو گی۔"
"کیا۔"
"جو لکھا ہے۔"
"ہاں۔ کیوں نہیں۔"
"تب پھر وہ سامنے واش روم ہے۔ اس کاغذ کو پرزے پرزے کر کے کموڈ میں بہادو۔ خطرہ بھی ٹل جائے گا۔"
"اوکے۔ میں نے صوفیہ کی بات سمجھ کر کہا۔ اور اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اس کے بعد میں واپس گھر چل پڑی تھی۔ فیض بابا کے لئے ایک بار پھر میرے دل میں نرم گوشہ پیدا ہوگیا تھا۔ ان کی مجھ سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔ میں نے یہ بات محسوس کر کے خود ہی انہیں پوری تفصیل لفظ بہ لفظ بتادی۔
"میں تم سے ایک بات کہوں نشاء بیٹا۔
"جی فیض بابا۔"
"وہ بلی کوئی بدروح ہے۔ اس دن وہ وکیل صاحب پر حملہ آور ہوئی تھی۔"
میں نے فیض بابا کو کوئی جواب نہیں دیا۔ بلی کا سلسلہ بہت طویل تھا۔ روشاق خود ایک بدروح تھا تیونس میں اس کے کردار کے بہت سے پہلو سامنے آئے تھے۔
یہ رات میرے لئے بڑی پریشانی کی رات تھی۔ کسی پل میں نہیں آیا تھا۔ دوسری صبح بھی بڑی بدرونق تھی۔ رہ رہ کر پاشا یاد آرہا تھا۔ بڑی ڈھارس تھی اس سے پہلے۔ دل بے اختیار اسے یاد کررہا تھا۔ اور پھر عسکری غدار۔ نامراد۔ فریبی۔
موبائل پر بیل ہوئی تو میں چونک پڑی۔ صوفیہ کا خیال آیا تھا۔ لیکن وہ مشل تھی۔ "ہیلو نشاء۔"
"ہاں مشل۔ بولو کیا بات ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔
"میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔"
"سوری مشل۔ میں تم سے نہیں ملنا چاہتی۔"
"بہت ضروری بات کرنی ہے۔"
"میں نے سوری کہا ہے۔"
"میں تمہاری احسان مند ہوں نشاء تم نے میرے لئے......"
"فون بند کردوں۔"
"پلیز نہیں...... میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ تم نے میرے لئے جو کچھ کیا ہے اس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ مجھ سے دور ہٹ گیا ہے۔ وہ سچ مچ تم سے پیار کرنے لگا ہے۔"
"بہت گھٹیا ہو تم لوگ۔ سی کلاس۔ اپنی اوقات پر نگاہ رکھو۔ میں رحم دل ہوں ورنہ عسکری اپنی ضمانت تک نہیں کرا سکتا تھا۔"
"نشاء۔ میری بات تو سن لو۔"
"شٹ اپ۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔
لیکن چند سیکنڈ بعد پھر بیل ہوئی۔ میں نے دانت پیس کر فون کو دیکھا۔ لیکن اس بار نمبر بدلا ہوا تھا۔ میں نے فون آن کیا تو دوسری طرف سے آواز آئی۔
"ہیلو مس نشاء۔"
"کون۔"
"صوفیہ ہوں۔"
"ہیلو صوفیہ صاحبہ۔"
"صرف صوفیہ۔" وہ بولی۔
"فرمائیے۔"
"کچھ ہدایات دینی ہیں تمہیں۔"
"جی۔ بتائیے ویسے انکل......"
"سوری۔ پہلے وہ سن لو، جو میں کہہ رہی ہوں۔"
"جی۔"
"میں تمہارے پاس آنا چاہتی ہوں۔ ایک مستقل نوکر کی حیثیت سے۔" آپ مجھے ملازمہ کا درجہ دیں گی اور میری رہائش دوسرے ملازموں کے ساتھ ہونی چاہئے۔
"ٹھیک اور کچھ۔"

"فی الحال اتنا ہی۔ باقی سب بعد میں۔ فون بند کررہی ہوں۔"
"اوکے۔" میں نے کہا۔ اور دوسری طرف سے فون بند ہوگیا۔
میں گہری سانس لے کر صوفیہ کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس نے مجھے اے کے ہمدانی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ پتہ نہیں ان کا کیا حال ہے اور صوفیہ اتنی جلدی انہیں چھوڑ کر میرے پاس کیوں آنا چاہتی ہے۔"
پھر ایک خیال سے دل تھوڑا سا خوش ہوا۔ ایک اچھی شخصیت کی قربت ہوجائے گی۔ کچھ تو تنہائی دور ہوگی۔ کسی خیال کے تحت آپا ندیمہ کو طلب کرلیا۔
"ایک خاتون کے لئے انتظام کرنا ہے۔"
"کون ہیں۔"
"جو میں کہہ رہی ہوں وہ سنو۔ آسمان پر اڑنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا اور آپا ندیمہ کو صورت حال سمجھادی۔ آپا ندیمہ نے میری خواہش کے مطابق ایک کوارٹر ٹھیک کردیا۔ میں نے خود اس کا جائزہ لے لیا تھا۔
ٹھیک دو بجے صوفیہ بالکل بدلے ہوئے انداز میں آگئی۔ سادہ سا سفید لباس پہنا ہوا تھا۔ اپنی عمر سے کہیں زیادہ وہ نظر آرہی تھیں۔ انداز میں پھوہڑ پن تھا جبکہ اسپتال میں وہ ایک خاص فیشن ایبل نظر آرہی تھیں۔
تاہم وہ اپنے کوارٹر میں منتقل ہوگئی۔ پھر شام پانچ بجے وہ پھولوں کا ایک گلدستہ لئے ہوئے کمرے میں آگئی۔ "لو یہ کمرہ ہے یا کباڑ خانہ۔ یہ پھول کہاں لگاؤں۔"
"ہیلو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔
"کیسا؟" "سب ٹھیک ہے نا۔"
"ہاں۔ کمال کا روپ بدلا ہے آپ نے۔"
"شکریہ۔" وہ بولی۔
"میں انکل ہمدانی کے لئے مضطرب ہوں۔ آپ مجھے ان کے بارے میں بتائیے۔"
"انہیں لندن روانہ کردیا گیا ہے۔"
"اوہ۔ حالت کیسی ہے۔"
"ابھی تشویشناک۔ خدا کرے ٹھیک ہوجائیں۔ ہاتھوں اور زبان سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوگئے۔"
"خدا ان درندوں کو غارت کرے جنہوں نے ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا ہے۔ پولیس کو اس بارے میں اطلاع دی گئی ہے۔"
"ہاں۔ ان کے اہل خاندان نے رپورٹ کی ہے۔"
"میں بھی پولیس کو کچھ بتانا چاہتی ہوں۔" میں نے کہا۔
"کیا؟"
"خاصی دہشت گردی ہورہی ہے۔ اس کا پس منظر تو ہے۔ اس کے پیچھے کون ہے۔ اس کا پتہ تو چلنا چاہئے۔"
"اوہ۔" صوفیہ نے گہری سانس لے کر کہا۔
"اور وہ روشاق کے سوا کوئی نہیں ہے۔"
"روشاق۔" صوفیہ کے لہجے سے یہ واضح نہ ہوسکا کہ وہ روشاق کے بارے میں پہلے سے کچھ جانتی ہے۔
"سو فیصدی وہی مردود۔ میں نے پرزور لہجے میں کہا۔
"دروازہ بند کردو۔" اچانک صوفیہ نے کہا۔
"ہاں۔ کیوں؟" میں نے کہا۔ "اس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اٹھ کر دروازہ بند کیا اور پھر میرے پاس آبیٹھی۔" پھر بولی۔
"کون ہے روشاق؟"
"آپ کو میرے بارے میں کیا معلوم ہے۔"
"بہت مختصر۔ مجھے بتاؤ۔" صوفیہ نے کہا اور میری زبان کھل گئی۔ دل کی بھڑاس تھی ورنہ ہر بات ہر ایک کے لئے نہیں ہوتی۔ میں نے صوفیہ کو پوری کہانی سنادی۔ احمر جنیدی، عدنان ثنائی، عسکری اور روشاق کے

بارے میں سب کچھ بتادیا۔
"میرے خاموش ہونے کے بعد صوفیہ بہت دیر تک خاموش رہی پھر بولی۔ "سیامی بلی۔"
"کیا مطلب۔"
"نہیں۔ میں اس کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کیا واقعی وہ کوئی بدروح ہوسکتی ہے۔ بیشتر مقامات پر وہ نمودار ہوتی رہی ہے۔ کہیں بلی کے روپ میں کوئی قدیم روح نہ ہو۔ اور روشاق۔ اوہ میرے خدا۔"
"کیا ہم پولیس کو اس بارے میں اطلاع دیں۔"
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"کوئی فائدہ نہیں ہوگا یہ پولیس کیس ہے ہی نہیں۔ میں ایک فون کرلوں؟"
"ہاں۔ کیوں نہیں۔" میں نے کہا اور صوفیہ اپنے موبائل پر کوئی نمبر پش کرنے لگی۔ پھر سیل کان سے لگا کر بولی۔
"صوفیہ...... ہاں شاہد۔ فیصل کہاں ہے۔ بات کراؤ۔ جی فیصل...... بہت سی تفصیلات سامنے آئی ہیں ہاں مختصر سنو۔ اس نے ضروری پوائنٹس فیصل نامی آدمی کو بتائے پھر بولی۔ "ہاں روشاق اور اس کا ٹریڈ مارک وہی دہشت ناک روح یعنی سیامی بلی ہے۔ تمہیں وہ خونخوار بلی کا خیال رکھنا ہے۔ اس کے علاوہ احمر جنیدی اور عدنان ثنائی کو بھی بیک کرنا ہے۔ میں تمہیں اس کے ہوٹل کے بارے میں بتاتی ہوں۔' صوفیہ نے مجھ سے عدنان ثنائی کے ہوٹل کا نام اور کمرہ پوچھا۔ اور پھر مخاطب کو بتادیا۔ پھر بولی۔ "کام ہوگیا۔ کیا پوزیشن ہے۔ گڈ ویری گڈ۔ اچھا ایک پتہ نوٹ کرو۔ وائی اسٹریٹ، گھر نمبر تیس۔ اس کے بارے میں پوری تفصیل معلوم کرو۔ او کے۔"
فون بند کرکے وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "ہمدانی صاحب منزل پر پہنچ گئے۔ ان کی حالت بھی پہلے سے بہتر بتائی گئی ہے۔"
"شکریہ۔" میں نے کہا۔
"بڑی مشکل سے انہیں یہاں سے نکالا گیا ہے۔ وہ لوگ انہیں مردہ سمجھ چکے تھے۔ ورنہ انہیں نہ چھوڑتے۔"
"ایک سوال کروں صوفیہ۔"
"ہوں۔"
"تم ان کی کون ہو؟"
"میں۔ صوفیہ نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ پھر مزید کسی تمہید کے بولی۔ "تین افراد پر مشتمل تھا۔ میرا کنبہ۔ میرے ماں باپ اور میں۔ چار سال کی تھی میں جب والد صاحب ٹریفک کے حادثے میں ہلاک ہوئے اس حادثے میں میری ماں اندھی ہوگئیں۔ میرے والد ہمدانی صاحب کے پاس کلرکی کرتے تھے۔ انہوں نے ہمیں سنبھال لیا۔ میری تعلیم و تربیت پہلے سے بہتر انداز میں ہوئی۔ والد صاحب شاید وہ کچھ نہ کرسکتے میرے لئے جو ہمدانی صاحب نے کیا۔ انہوں نے مجھے قانون کی تعلیم دلا کر وکیل بنادیا۔ نہ صرف یہ کہ انہوں نے مجھے مارشل آرٹس کی تعلیم بھی دلائی اور میں بلیک بیلٹ ہوں۔ انہوں نے مجھے تمہارے بارے میں بہت سی ہدایات دی تھیں لیکن افسوس وہ تمہارے دشمنوں کا شکار ہوئے۔"
"آپ نے ابھی کس سے رابطہ کیا تھا۔"
"ہاں۔"
"یہ کون ہیں۔"
ہمدانی صاحب کے ساتھی۔ اصل میں ہمارا ایک طریق کار ہے ہم کیس لے کر صرف کورٹ میں پیش نہیں کھڑے ہوتے بلکہ جو کیس ہمارے پاس آتا ہے اس کی چھان بین کرتے ہیں کہ اصل قصہ کیا ہے کون گناہ گار ہے کون بے گناہ۔"
"گڈ۔ مجھے ایک سوال کا جواب اور دیں گی صوفیہ۔"
"ہاں۔ ضرور۔"
"انکل ہمدانی نے کیا کہا کہ میں تھوڑا سا وقت اور گزار لوں مجھے سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔"

"اوہ۔ یہ کہا تھا انہوں نے؟"
"ہاں۔ لیکن کیوں؟"
"یقین کرو، میں نہیں جانتی۔ لیکن تم فکر مت کرو سب معلوم ہوجائے گا۔"
"ایک بات پوچھوں صوفیہ۔"
"سو پوچھو۔"
"آپ نے ملازمین کے ساتھ کوارٹر میں رہنا کیوں پسند کیا۔"
"بہت سی وجوہات ہیں۔"
"آپ میرے پاس نہیں رہ سکتیں۔"
"تمہارے ساتھ ہی رہوں گی چندا لیکن مجھے لازم ہی رہے اس طرح میں ہر طرف سے چوکنا رہنا چاہتی ہوں۔"
"او کے۔" میں نے کہا۔ صوفیہ میرے ساتھ ہی ہوتی تھی اور حالات پرسکون تھے۔ دوسرے دن صوفیہ کے ساتھی شاہد نے رپورٹ دی۔
"وائی اسٹریٹ کے گھر نمبر تیس کے بارے میں معلومات حاصل ہوگئی ہیں۔ وہ گھر خالی ہے وہاں ایک مالی کام کررہا ہے مالکان اس گھر میں آنے والے ہیں۔ شاہد کی اس رپورٹ کے بعد صوفیہ سوچ میں ڈوب گئی پھر اس نے کہا۔
"کیا خیال ہے نشاء۔ وائی اسٹریٹ کے اس گھر میں چلو گی۔"
"وہاں کیا ہے صوفیہ؟"
"اوہ۔ کیا مسٹر ہمدانی نے تم سے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔"
"مجھے یاد نہیں ہے۔"
"خیر۔ ہمیں وہیں چلنا ہے۔ تم خوف تو محسوس نہیں کروگی۔"
"نہیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔
صوفیہ برابر کام کررہی تھی۔ اس کے ساتھی کے ذریعے تمام معلومات فراہم کررہے تھے۔ عدنان ثنائی کے بارے میں رپورٹ موصول ہوئی۔
"میڈم اب وہ اس ہوٹل میں موجود نہیں ہیں۔ وہ کمرہ خالی ہوچکا ہے۔ اس میں وہ ایک اپاہج شخص کے ساتھ مقیم تھے۔" یہ رپورٹ عدنان ثنائی کے بارے میں تھی۔
صوفیہ بہت ذہین تھی مطلوبہ جگہ پہنچنے کے لئے اس نے بڑا سنسنی خیز طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہم کئی گاڑیاں بدل کر وائی اسٹریٹ کے اس گھر میں پہنچے تھے۔ قبول نامی کوچوان ہمارے ساتھ تھا۔ رپورٹ کے مطابق مالی وہاں موجود تھا۔ جس نے ہمیں سلام کیا تھا۔
"ہم اس گھر کے مالک ہیں مالی بابا۔" کیسا کام ہو رہا ہے۔
"تابعدار ہیں بیگم صاحبہ۔ آپ دیکھ لیں، ہر چیز چمک رہی ہے۔"
"ہوں۔" زمرد نے پرس سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مالی کو دیا اور مالی نے پھر کئی سلام کرڈالے۔
"اندر کی چابی ہے تمہارے پاس۔"
"جی بیگم صاحبہ۔ صفائی والی کام کرکے آتی ہے۔ یہ لیجئے۔" مالی نے چابی نکال کر صوفیہ کو دیدی۔
"آؤ۔ صوفیہ نے کہا اور بڑے پراعتماد قدموں سے اندر چل پڑی۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ صوفیہ ایک غیر معمولی خاتون ہے۔ بے خوف، نڈر، ہم لوگ اندر داخل چونکہ دن کا وقت تھا اس لئے اندر خوب روشنی تھی۔ گھر بے حد خوب صورت اور صاف ستھرا تھا۔
میری نگاہیں چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ اندر کمرے میں تین دروازے تھے۔ صوفیہ نے سوئچ آن کرکے روشنیاں جلائیں اور گہری نگاہوں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ لمحوں کے بعد ہم نے آگے کی جانب قدم اٹھادیئے۔ اور دوسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔ یہ بھی کافی وسیع کمرہ تھا۔ کشادہ اور روشن بائیں سمت کی دیوار کے پاس دو تابوت نظر آئے۔ جنہیں دیکھ کر نہ صرف میں بلکہ صوفیہ بھی ایک لمحے کے لئے ساکت ہوگئی تھی۔ چند لمحات ہماری نگاہیں ان تابوتوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ دونوں تابوتوں

میں تالے پڑے ہوئے تھے۔صوفیہ نے کہا۔
''انہیں کھولیں۔''
''نہیں۔'' میرے منہ سے سرد آواز نکلی۔ اور صوفیہ مجھے عجیب وغریب سی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گئی۔ہم تیسرے کمرے میں داخل ہوگئے۔شاید یہ آخری کمرہ تھا۔
''نشا کیا تم خوفزدہ ہوگئی ہو۔''
''بالکل نہیں۔ میں کچھ سوچ رہی ہوں۔''
''کیا۔''
''یہی کہ ہمدانی صاحب نے اس جگہ کی نشاندہی کیوں کی ہے۔''
''ہاں۔یقیناً یہاں کچھ ہے۔
بظاہر تو کچھ نظر نہیں آیا۔''
''سوائے ان تابوتوں کے۔''
''تمہارا مطلب ہے کہ ان تابوتوں میں کچھ ہے۔''
''شاید۔''
''پھر آؤ ٹرائی کرتے ہیں۔''
ہم دونوں واپس پلٹے اور دوبارہ اس کمرے کی جانب بڑھ گئے۔جس میں تابوت رکھے ہوئے تھے ہم ساتھ ساتھ ہی کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئے۔میری نگاہیں تابوتوں کی طرف اٹھیں اور اچانک ہی میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔صوفیہ نے بھی اپنا ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا تھا۔ان میں سے ایک تابوت کا ڈھکن اٹھا ہوا تھا۔ وہ بڑا سا تالہ جو تابوت میں لٹک رہا تھا تابوت سے تھوڑے فاصلے پر پڑا ہوا تھا۔
پسینہ آ گیا تھا، سارے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے اور جسم میں ٹھنڈی ٹھنڈی لہریں دوڑ رہی تھیں۔
''تابوت میں کون تھا۔تالا کس نے کھولا؟'' ڈھکن کس نے کھولا۔بدن جیسے منجمد ہو کر رہ گئے تھے اور شدید سردی لگنے لگی تھی۔صوفیہ کی سرسراتی آواز ابھری۔
''دوسرے تابوت کا تالہ بند ہے۔''
''ہاں۔چلیں یہاں سے چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔
''ہرگز نہیں۔''
''تو پھر......''
''نشاء ہم یہ معلوم کرکے یہاں سے جائیں گے کہ اے کے ہمدانی صاحب نے ہمیں یہاں کیوں بھیجا تھا۔''
''ڈش تو پھر۔'' میں نے سوال کیا۔
''آؤ دیکھیں تابوت میں کیا ہے۔''
ایک لمحے کے لئے میں جھجکی اور پھر صوفیہ کے ساتھ آگے بڑھ گئی ہم دونوں تابوت کے قریب پہنچ گئے۔تابوت سے ایک عجیب سی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ اس کی تہہ میں گھاس بچھی ہوئی تھی۔صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی ابھی کوئی تابوت سے باہر نکلا ہے۔ لیکن کون؟ صوفیہ نے دوسرے تابوت کی طرف دیکھا اور پھر اس کے قریب بیٹھ گئی۔
درحقیقت میں صوفیہ سے بہت متاثر ہوگئی تھی وہ مجھ سے کہیں زیادہ بہادر تھی جبکہ میری زندگی بڑے سنسنی خیز حالات سے گزری تھی۔ میں صوفیہ کو دیکھنے لگی۔ وہ اب اس تالے کو ٹٹول رہی تھی تالہ کھولنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں تھا کچھ دیر تک صوفیہ اس تالے کو ٹٹولتی رہی پھر اس نے مایوسی سے گردن ہلائی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔
''تالہ کھولنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔
''آؤ۔ادھر چلتے ہیں۔'' ہم دونوں وہاں سے آگے بڑھ گئے اور اس بغلی دروازے سے اندر داخل ہوگئے۔ جسے ہم نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی ہمارے سانس بند ہونے لگے۔ لہو خشک ہوگیا۔ جو کچھ ہم نے دیکھا ناقابل یقین تھا ایسا کہ پورے وجود میں شدید تھرتھراہٹ پیدا ہوگئی۔
(جاری ہے)

احسان فراموش

عبدالحمید ساگر۔کندیاں

اچانک سامنے آنے پر لڑکی اپنے محبوب کو دیکھ کر گھبرا گئی لیکن محبوب نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔ پسٹل سے گولی نکلی اور لڑکی سینہ چیرتی ہوئی باہر نکل گئی، چشم زدن میں وہ احسان فراموش لڑکی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی ایک خوفناک ڈراؤنی اور ششدر کرتی کہانی

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ شارک جیسا انسان قتل بھی کر سکتا ہے۔ شارک ایک چھوٹے قد کا بھورے بالوں والا شخص تھا۔ وہ شادی شدہ تھا۔شارک کی شادی اس کی پسند سے ہوئی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ کیونکہ ایڈرا خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ وفادار بھی تھی۔ کبھی کبھی وہ شارک کو اپنی وفاداری کا یقین بھی دلاتی تھی۔ یہ بات شارک کو نا پسند تھی کیونکہ اسے ایڈرا پر مکمل اعتبار تھا۔ شارک ایڈرا کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کرتا تھا اور اسے کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دیتا تھا۔ شارک ایڈرا کو فٹ پاتھ پر ملی تھی جب اسے کچھ بدمعاش لڑکے چھیڑ رہے تھے۔ شارک نے اسے ان بدمعاشوں سے بچایا اور پھر کچھ عرصے بعد اس سے شادی کر لی، کیونکہ ایڈرا شارک کو پسند بھی آ گئی تھی اور دوسرا بقول ایڈرا کے اس کا اس دنیا میں کوئی نہ تھا، وہ اکیلی تھی بے سہارا تھی، اسے ایک سہارے کی ضرورت تھی۔ اور وہ سہارا اسے شارک نے فراہم کیا۔ اسے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اپنے گھر میں لے آیا شارک اور ایڈرا بہت خوش تھے اور ایک مطمئن زندگی گزارنے لگے تھے۔
شارک ایک انشورنس کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس صبح شارک جیسے ہی گھر سے نکلا، ایڈرا نے آواز دی۔ ''آج جلدی گھر آ جانا، تمہیں پتہ ہے مجھے اکیلے گھر پر ڈر لگتا ہے۔''
''او کے'' شارک نے مخصوص آواز میں کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔
دن کا کچھ خاص پتہ نہیں چلا، اور پھر رات بھی ہو گئی۔ آج ایسا پہلی بار ہوا تھا، ایسا موقع پہلے کبھی نہیں آیا تھا

کہ شارک کو آفس میں کام کرتے کرتے رات کے گیارہ بج گئے ہو۔ شارک نے کچھ فائلیں بند کیں، اور ایک پانی کا گلاس پی گیا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ آج بہت دیر ہو گئی ہے۔ "ایڈرا مجھ سے بہت ناراض ہو گی۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے خود سے کہا۔ بائیس منزل کی اس بلڈنگ کے تیسرے فلور پر اس کا شیشے کا آفس تھا۔ اس نے شیشے کا پردہ ہٹایا تو اسے شہر کی روشنیاں نظر آئیں۔ اس نے جلدی سے پردہ سیٹ کیا اور دروازہ لاک کر کے لفٹ میں گھس گیا، کچھ دیر بعد وہ سڑک پر چل رہا تھا۔ شارک جاتے جاتے جب ہیری کے بار سے گزرا تو بے اختیار اس کی پیاس جاگ گئی، آج ویسے بھی دیر ہو گئی ہے۔ آج پینی چاہئے میرے خیال میں ایک دو پیگ پینے سے ایڈرا کو پتہ نہیں چلے گا۔ اسے میرے منہ سے شراب کی بو نہیں آئے گی۔" حسب عادت اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

چنانچہ وہ بار میں داخل ہو گیا۔ بار میں اکا دکا لوگ تھے۔ اس نے دو برانڈی اور وسکی کا آرڈر دیا، بار کا مالک ہیری اسے جانتا تھا، وہ اس کی آج اچانک آمد پر حیران تھا۔ پینے کے دوران اس کی نظر اپنے دوست پال پر پڑی۔ پال نے بھی جب اسے دیکھا تو اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا ان کے دوران کچھ رسمی گفتگو ہوئی۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔ جاتے ہوئے پال نے اسے اپنی کار میں گھر چھوڑنے کی پیشکش کی جسے اس نے رد کر دیا۔ "دیکھ لو باہر میری نسان کھڑی ہے۔ بہت آرام دہ ہے اور تمہیں اس میں بیٹھنے میں بہت مزہ آئے گا۔" پال نے اپنی گاڑی کی اوقات بتائی۔

"نہیں، بہت شکریہ میں پیدل چلنے کا عادی ہوں۔" شارک نے کہا۔ اور بار سے باہر نکل گیا۔

ایڈرا بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ وہ فون پر کسی سے دھیمے لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔ "مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے...... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ اگر کچھ...... کہیں کچھ ایسا ویسا...... پلیز...... تم...... پلیز" اور لائن کٹ گئی۔ شاید شارک لیٹ ہو گیا تھا، اس لئے وہ اس کے کسی دوست کو فون کر رہی تھی۔

رات کا ایک بج رہا تھا اور شارک چھوٹی سڑک پر پیدل چل رہا تھا، وہ ایڈرا کی سوچوں میں گم تھا کہ اچانک ایک کار اس کے قریب آ کر رکی اور کار سے ایک آدمی نے سر باہر نکال کر کہا۔ "تم ہی مسٹر شارک ہو؟"

"کک...... کیوں؟" شارک نے کہا۔ "جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" وہ آدمی غرایا۔

"آ...... آ...... نن نہیں۔" اچانک اس کے منہ سے نہ جانے نہیں کیوں نکل گیا۔

"ٹونی یہی شارک ہے۔ یہ ہمیں بے وقوف بنا رہا ہے، اسے گاڑی میں بیٹھاؤ۔" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ اگلے ہی لمحے ٹونی اترا اور شارک کو زبردستی گاڑی میں بیٹھانے لگا۔ شارک نے مزاحمت کی لیکن اس نے پسٹل نکال لی وہ شارک کے مقابلے میں کافی بھاری جان کا مالک تھا۔ اور شارک کو زبردستی کار میں بیٹھا لیا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے دوران شارک کا پرس اس کی جیب سے نکل کر سڑک پر گر گیا تھا۔ اس میں شناختی کارڈ بھی تھا۔ لیکن اسے پتہ نہیں چلا۔

گاڑی درمیانی رفتار سے جا رہی تھی۔ انہوں نے شارک کو بیک سیٹ پر بیٹھایا ہوا تھا۔ اور اس پر ٹونی نے پسٹل تانی ہوئی تھی۔ گویا شارک اگر معمولی سی حرکت بھی کرتا تو وہ اسے گولی مار دیتے۔ "جوزف" ٹونی نے اچانک ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص کو پکارا۔ "اگر یہ شارک نہیں ہوا تو...... میرا مطلب ہے کہیں ہم غلط آدمی کو تو نہیں لے جا رہے۔"

"یار یہی وہ آدمی ہے تم کیوں مرا سر کھا رہے ہو تم اس سے دوبارہ پوچھ لو کہ تم شارک ہو کہ نہیں...... تمہارے پاس تو پسٹل بھی ہے۔" جوزف بولا۔ وہ کافی کم سوچنے والا اور بد طبیعت کا مالک شخص لگ رہا تھا۔

"جلدی کرو پوچھو اس منحوس سے اگر میرا دماغ گھوم گیا تو میں اس کا مار مار کہ برا حال کر دوں گا۔ کچھ ڈالر کمانے کے لئے جیم نے ہمیں کتنا مشکل کام دیا ہے۔ اگر ہمیں پولیس نے پکڑ لیا تو ہمیں کم از کم پانچ سال تک کی قید ہو سکتی ہے۔"

ٹونی شارک کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دوران گاڑی نے ایک موڑ موڑا اور اب وہ زیادہ بڑی اور کھلی سڑک پر چل رہی تھی۔ آس پاس کی اور ایڈورٹائیزنگ بورڈ کی روشنیاں انہیں پریشان کر رہی تھیں۔ "بولو کیا تم شارک ہو؟ ٹھیک بتانا ورنہ ہم تمہیں مار دیں گے۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ میں شارک نہیں ہوں...... میرے خیال میں، میں نے پہلی بار میں مذاق نہیں کیا تھا۔" شارک جو ان کی باتوں سے ان کے بارے میں کچھ اندازہ لگا چکا تھا۔ مطمئن لہجے میں بولا تھا۔ "میں شارک واقعی نہیں ہوں۔" اس نے ایک بار پھر کہا۔

"تو پھر کون ہو تم......؟ بتاؤ بکواس کرو۔" جوزف چلایا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

"میرا نام ڈینی ہے۔ میں ایک موٹر مکینک ہوں، جس روڈ پر سے تم لوگوں نے مجھے اغوا کیا تھا، اسی روڈ پر میرا گیراج ہے۔" شارک نے بتایا۔

"بکواس...... بالکل بکواس...... تم جھوٹ بول رہے ہو...... اس روڈ پر کوئی گیراج نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس سارے علاقے کو جانتا ہوں میں۔" جوزف غرایا۔

"مجھے لگتا ہے یہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ شارک نہیں ہے۔ ہم کسی غلط آدمی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔" ٹونی نے کہا۔

"نہیں...... یہی شارک ہے یہ ہمیں دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ تا کہ اپنی جان بچا لے۔" جوزف نے گاڑی کو یک تنگ سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔

"ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ شارک ہے؟" ٹونی نے تنگ آ کر کہا۔

"تم جانتے ہو کہ پچھلی بار، جیم نے غلط آدمی کو پکڑ کر لانے پر ہمیں کتنی سزا دی تھی۔ اس نے ہم سے تمام رقم چھین لی تھی۔ اور مارا بھی تھا۔ اس نے ہمیں چالیس دن تک مچھروں والی اندھیری کوٹھری میں بند بھی رکھا تھا، میں اس بار یہ سزا نہیں بھگت سکتا۔"

"میرے پاس ایک حل ہے اس مسئلے کا، تم اس کا پرس چیک کرو اس میں اس کا آئی ڈی کارڈ ہو گا، اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ شارک ہے کہ نہیں۔" جوزف نے ٹونی سے کہا۔

"جلدی کرو نکالو اپنا پرس...... جلدی۔" ٹونی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ جوزف کی بات سن کر بہت خوش ہو گیا تھا۔

میرے پاس نہیں ہے میرا پرس...... بے شک میری تلاشی لے لو۔" شارک نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "میں پرس اپنے گیراج میں رکھتا ہوں۔ رات کے ٹائم کوئی چھین بھی تو سکتا ہے...... اس لئے نہیں لایا ساتھ میں۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے ٹونی۔ تم اس کی تلاشی لو۔ جلدی کرو۔" جوزف نے کہا۔ اس دوران گاڑی ایک تنگ گلی میں داخل ہو چکی تھی۔ گاڑی کو جھٹکوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور وہ بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی۔ ٹونی نے زبردستی شارک کی تلاشی کی لیکن اسے کچھ نہیں ملا۔

شارک حیران تھا کہ اس کا پرس کہاں گیا۔ پہلے تو اس کا خون خشک ہونے لگا تھا، لیکن بعد میں اس نے کہا۔ "اب تو میرا یقین کرو...... تم نے تو مجھے آزما بھی لیا ہے کہ میں سچا ہوں۔"

"جوزف یہ ٹھیک کہہ رہا ہے یہ شارک نہیں ہے۔ ہم کسی غلط آدمی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔" ٹونی نے کہا۔ "اب جیم ہمارا کیا حشر کرے گا۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"یہی شارک ہے تم کیوں نہیں سمجھتے...... اب زیادہ دماغ مت کھاؤ، دیکھو ہمارا ٹھکانہ آ گیا ہے۔ چلو اتارو اسے۔" انہوں نے ایک سائیڈ پر کار روک لی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا، جس کی دیواریں اونچی تھیں۔ اور اس پر چھوٹا جنگلا لگا ہوا تھا۔ ٹونی پہلے خود اترا اور بعد میں اس نے پسٹل کے زور پر شارک کو اتارا۔

"میں شارک نہیں ہوں۔" شارک نے ایک بار پھر کوشش کی۔

"چلو سیدھی طرح...... ٹونی اندر لے جاؤ اسے...... دروازہ کھولو۔" جوزف غرایا۔

وہ دونوں اسے اندر لے گئے۔ ایک راہداری میں

سے گزرتے ہوئے ایک تنگ کمرے میں لے گئے۔ یہ ایک بند کمرا تھا۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص داخل ہوا۔ اس کے سر کے کچھ بال سفید ہو چکے تھے۔ اور کچھ سیاہ تھے...... اس نے کالی پینٹ اور خاکی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔

"تم اسے یہاں کیوں لائے ہو...... میں نے تمہیں یہ جگہ تو نہیں بتائی تھی۔ تم جانتے ہو کہ یہاں کتنا خطرہ ہے۔ پولیس کسی بھی وقت یہاں آ سکتی ہے۔" یہ جیم تھا، جوان دونوں کو سنا رہا تھا۔

"دراصل جیم ہم کنفرم کرنا چاہتے تھے کہ یہی ہمارا مطلوبہ بندہ ہے کہ نہیں...... اس لئے اسے یہاں لے کر آئے...... بس آپ بتائیں کیا یہی ہے وہ۔" جوزف نے کہا۔

"ہاں...... ہاں یہی ہے وہ میں نے اس کی تصویر دیکھی تھی۔" جیم نے کہا۔ "تم لوگ اب اسے لے جاؤ۔ اس کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے باس...... پر ہمارا انعام مت بھولنا...... ہم نے اسے بہت دیر برداشت کیا ہے۔ اس کی بک بک اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔" جوزف نے کہا۔ "یہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے حرام خور کہیں کا۔"

"اوھو بند کرو یہ فضول بکواس۔" جیم غرایا۔ "لے جاؤ اسے یہاں سے۔" اس سے پہلے کہ وہ شارک کو باہر لے جاتے۔ اچانک شارک کی لات گھومی اور ٹونی کے ہاتھ سے پسٹل گر گیا اسے اس نے تیزی سے اٹھایا اور ان تینوں کو اشارے سے اکٹھا کھڑا ہونے کو کہا۔

"یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟" جوزف چیخا۔

"موو جلدی...... باتیں نہیں ورنہ میں گولی چلا دوں گا۔ میں پھانسی سے ضرور ڈرتا ہوں لیکن تمہاری ٹانگوں پر گولی چلانے سے مجھے پھانسی نہیں ہوگی۔ اور تم عمر بھر کے لئے معذور ہو جاؤ گے۔ اس لئے چپ چاپ میری بات مانو۔" شارک نے کہا۔ "ٹونی تم جیم اور جوزف دونوں کو باندھو...... جلدی کرو رسی سے ورنہ میں تمہاری ٹانگوں پر گولی چلا دوں گا۔ اور مجھے کوئی روک نہیں سکتا...... جلدی"

ٹونی جو شاید کچھ زیادہ ہی بزدل تھا، پاس پڑی ہوئی رسی اٹھا کر جیم اور جوزف کو باندھنے لگا تھا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جیم اور جوزف اس دوران خود بخود کرسیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر میں ٹونی نے ان دونوں کو باندھ دیا۔

"اب تم اس سامنے والے کمرے میں گھسو...... جلدی......" شارک نے کہا۔ اور ٹونی اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے متعلقہ کمرے میں چلا گیا۔ شارک نے پیچھے سے دورازہ لاک کیا اور جوزف اور جیم کی چہرے پر دو زوردار تھپڑ مارا اور پسٹل سمیت باہر نکل گیا۔

اس کا رخ اپنے گھر کی طرف تھا۔ اس کا دھیان صرف ایڈرا کی طرف تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسے بتائے گا کہ وہ شراب پینے نہیں گیا تھا، بلکہ اسے کچھ بد معاشوں نے اغوا کر لیا تھا۔ مختلف راستوں سے ہوتا ہوا جب وہ گھر کے قریب پہنچا، اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ ایڈرا کے کمرے سے کھڑکی کے راستے روشنی باہر آ رہی تھی۔ شارک جیسے ہی چھوٹے گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اسے ایڈرا کی ہلکی آواز سنائی دی۔ وہ کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ شارک کمرے کے قریب گیا تو اس نے پوری بات سمجھی۔

"ہیلو...... ہیلو...... تمہاری آواز نہیں آ رہی جیم، بولو، تم نے شارک کو قتل کیا کہ نہیں۔ تم جانتے نہیں کہ میں اس خبیث سے کتنا تنگ آ گئی تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس نے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر احسان کیا ہے۔ حالانکہ میں بھی اسے برابر کا سکون دیتی ہوں۔ صرف وہ تو مجھے پرسکون نہیں کرتا...... تم بولو بھی......" اس دوران لائن کٹ گئی۔

اور شارک اندر داخل ہوا۔ ایڈرا اسے زندہ دیکھ کر بوکھلا گئی۔ اور کچھ کہنے کی کوشش کرنے ہی لگی تھی، لیکن شارک نے اسے بولنے کا موقع کہاں دیا ٹونی سے چھینی ہوئی پسٹل اس کے پاس تھی۔ اس نے گولی چلا دی اور ایڈرا جیسی احسان فراموش عورت کو موت کی نیند سلا دیا۔

موت کا راز

راجندر سنگھ بیدی

وقت پر نظر نہ رکھنے والے اکثر پشیمان ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے عبرت کا نشان بن جاتے ہیں اور پھر قبر کی عمیق گہرائیوں میں انہیں ڈال دیا جاتا ہے اس کا ثبوت اتم کہانی میں موجود ہے۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے تاریخ کے جھروکے سے ایک زبردست دلفریب کہانی

اس بے ربط و ناہموار زمین کے شمال کی طرف نباتاتی ٹیلوں کے دامن میں میں نے گندم کی بتیسویں فصل لگائی تھی اور سرطانی سورج کی حیات کش تمازت میں پکتی ہوئی بالیوں کو دیکھ کر میں خوش ہو رہا تھا، گندم کا ایک ایک دانہ پہاڑی دیمک کے برابر تھا۔ ایک خوشے کو مسل کر میں نے ایک دانہ نکالا۔ وہ کناروں کی طرف سے باہر کو قدرے پچکا ہوا تھا۔ اس کی درمیانی لکیر کچھ گہری تھی۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ گندم اچھی ہے۔ اس میں خوردنی مادہ زیادہ ہے اور گورکھپور کی منڈی میں اس سال اس کی فروخت نفع بخش ہوگی۔

میرے خیالات کچھ یکسوئی اختیار کر رہے تھے۔ اس وقت زندوں میں سے میرے نزدیک کوئی نہ تھا۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اگر زندوں میں سے کوئی تمہارے نزدیک نہ تھا تو کیا مردوں کی یاد تمہارے ویران خانہ دل کو آباد کر رہی تھی؟...... میرا جواب اثبات میں ہے۔ میں آپ سے ایک اور بات بھی اصرار سے منوانا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ میں مردوں کا تصور ہی نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان کو اپنے سامنے، پیچھے، دائیں اور بائیں کتھاکلی انداز سے رقص کرتے، ہنستے اور خوف سے کانپتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ جس طرح آپ کی داڑھی کا بال بال مجھے علیحدہ نظر آتا

ہےاور آپ کی تمازت زدہ آنکھوں کے سرخ ڈورے دیکھ رہا ہوں، اسی طرح میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کا چہرہ جموی موتیا کی اس کلی کی مانند جس کا چہرہ صبح کے وقت کاشمیری بہار کی شبنم نے دھودیا ہو، شگفتہ ہوکر چمک رہا تھا اور کسی کے چہرے پر جھریاں اور گہری گہری لکیریں تھیں۔ شاید وہ کسی نتیجہ خیز تجربہ زندہ کی نشانیاں تھیں۔

نہ وہ گندم کے کھیت کے کناروں پر کھیل رہے تھے، نہ ہی بتیس سالہ شیشم جس کے گھنے سایہ دار پھیلاؤ کے نیچے میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اپنے ہلکے ہلکے پاؤں کو نچا رہے تھے۔ بلکہ وہ خود میرے جسم کے اندر تھے...... ہائیں! آپ حیران کیوں کھڑے ہیں۔ آپ پوچھتے ہیں کہ میں کہاں تھا؟...... سنئے تو...... میں جسم کی اس حالت میں تھا جسے انہماک کی آخری منزل کہنا چاہئے۔ میں خود اپنے جسم سے علیحدہ ہوکر اسے یوں دیکھ رہا تھا جس طرح پرانی حکایتوں کا شہزادہ، کسی اونچے اور نباتاتی ٹیلے پر کھڑا دور سے اس شہزادی کے محل کا اٹھتے ہوئے دھوئیں کے وجود سیا ندازہ لگائے جس نے اپنی شادی مشروط رکھی ہو۔

وہ رقصاں، خنداں، لرزاں لوگ میرے بزرگ تھے...... بچہ اپنے والدین کی تصویر ہوتا ہے۔ میرا باپ اپنے باپ کی تصویر تھا، اس لئے میں اپنے دادا کی تصویر بھی ہوسکتا ہوں۔ اور یوں ارتقائی منازل طے کرنے کی وجہ سے اپنے بزرگان سلف کی اگر صاف نہیں تو دھندلی سی تصویر ضرور ہوں...... ہندوستانی تہذیب دو نسلوں سے شروع ہے، ایک دراوڑی اور دوسری آریہ۔ میں آریہ نسل سے ہوں۔ میرا دراز قد، سفید رنگ، سیاہ چشم، خوش باش اور قدرے وہم پرست ہونا اس بات کا ثبوت ہے...... یہ بات معلوم کرنے کی میری زبردست خواہش تھی کہ موت کا راز کیا ہے۔ مرتے وقت مرنے والے پر کیا کیا عمل ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مجھے یہ یقین دلایا جاچکا تھا کہ مادہ اور روح لافانی ہیں۔ ایسی حالت میں اگر وہ موت کے عمل میں اپنی ہیئت بدلتے ہیں تو اس وقت ان کی کیا حالت ہوتی ہے...... آخر مرنے والے گئے کہاں؟ وہ جا بھی کہاں سکتے ہیں، سوائے اس بات کے کہ وہ کوئی دوسری شکل اختیار کرلیں، جسے ہم لوگ آواگون کہتے ہیں۔ کیونکہ مختلف ہیسات میں ظہور پذیر ہونے کے بعد پھر اس ذرے کو جس سے ہم پیدا ہوئے ہیں، آدمی کی شکل دی جاتی ہے۔

یہ بات سن کر شاید آپ بہت ہی متعجب ہوں گے کہ میں اپنے سامنے اپنی پیدا ہونے والی اولاد کو بھی دیکھ رہا تھا۔ میرے سامنے ایک گھنگھریالے سیاہ بالوں اور چمکتے ہوئے دانتوں والا گیم گیم بچہ آیا جو آج سے ہزاروں سال بعد پیدا ہوگا اور بنو میری ایک دھندلی سی تصویر تھا۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور چھاتی سے لگا، بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگا۔ اسے پیار کرتے وقت مجھے فقط یہی محسوس ہوا جیسے میں اپنا دایاں ہاتھ بائیں کندھے اور بایاں ہاتھ دائیں کندھے پر رکھ کر اپنے آپ کو کھینچ رہا ہوں۔ اس بچے نے کہا:

"بڑے بابا...... پرنام...... میں جارہا ہوں۔"

میرا ہونے والا بچہ اور بزرگان سلف تمام واپس جارہے تھے۔ اس انہماک کے عالم میں، میں ابھی تک دور کھڑا یہی محسوس کررہا تھا کہ میرا جسم زمین کا ایک ایسا حصہ ہے جس میں میرے بزرگان سلف کی غاریں اور آئندہ نسلوں کے شاندار محل ہیں جن میں برسوں کے مردے اور نئے آنے والے اپنے قدیم اور جدید طریقوں سے جوق در جوق داخل ہورہے ہیں۔

...... گھبرایئے نہیں، اور سنئے تو...... یہ میری باتیں جو بظاہر پاگلوں کی سی دکھائی دیتی ہیں، دراصل ہیں بڑی محنت خیز...... مجھے کچھ سمجھا لینے دو...... پھر میں آپ کو ادبی مضمون میں تشبیہ دینے کا طریقہ بتاؤں گا۔ کل ہی آپ کہہ رہے تھے کہ درختوں پر گدھ شام کے وقت بیٹھے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی اونچے شیشم پر سنہری تربوز اوندھے لٹک رہے ہوں...... کتنی بھونڈی تشبیہ کہی آپ نے!......

یہ تو میں جانتا ہی تھا کہ روح کے علاوہ مادہ کی فنا نہیں ہوتا۔ مگر اس بات کو دیکھنے کی ایک آگ سی ہر وقت سینے میں سلگتی رہتی تھی کہ موت کے عالم میں، بظاہر فنا ہوتے ہوئے شخص یعنی ذریعے کی مجموعی صورت کو کن کن تخریبی و تعمیری مدارج سے گذر کر دوسری ہیئت میں آنا

پڑتا ہے...... یعنی...... آخر...... موت کا راز کیا ہے؟...... وہ ذرۂ عظیم، وہ جزولاتجزی، جو کہ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مغز ہے، کیسا منظم ہے۔ مثال کے طور پر اجرام فلکی کی گردش کا نظام لیجئے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی جرم اپنے مخصوص راستے سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹ جائے تو کیسی قیامت بپا ہو۔ چاند گرہن کے موقع پر ہم لوگ دان پن بھی کرتے ہیں تو اسی لئے کہ وہی ایک ایسا وقت ہوسکتا ہے جبکہ اجرام فلکی کا کشش ثقل سے ادھر ادھر ہوکر اور آپس میں ٹکرا کر مادۂ ہیولٰی کی شکل اختیار کرلینا ممکن ہے۔ ہم آریہ...... حساس، من موجی اور تو ہم پرست لوگ یہ نہیں چاہتے کہ ہم کوئی برا کام کرتے ہوئے تباہ ہوجائیں اور مادۂ ہیولٰی کا ایک حصہ بن جائیں۔ دان پن سے اچھا کام اور کیا ہوگا؟

...... آپ اسے تصوف، وہم اور خشک اور ترش مضمون کہیں، مگر یہ ان ہر سہ اقسام سے بالاتر ہے۔ ہاں ہاں! آپ نے پوچھا تھا کہ ذرہ عظیم کیا ہے...... یہ جاندار شے کی ابتدائی صورت ہے۔ یہ عورت اور مرد دونوں میں زندہ ہے۔ تمام ارضی و سماوی طاقت کا مرکز ہے۔ شاید اس سے بہتر اس کی کوئی تعریف نہیں کرسکتا۔ اس کے متعلق میں ایک قیاس غیر مصدق، جو بظاہر یاوہ گوئی دکھائی دیتا ہے مگر ہے بہت جامع اور درست، دہرا دینا چاہتا ہوں۔ وہ قیاس غیر مصدق ریاضی طبعیات کے ایک ماہر نے کہا تھا:

ذرہ...... جزولاتجزی...... ہم نہیں جانتے کیا کیا کچھ کرتا ہے...... ہم نہیں جانتے کیسے!......؟......!!"

شاید ریاضی دانوں نے ریاضی کے قواعد ضرب و تقسیم اس ذرے سے ہی سیکھے ہیں۔ وہ دو سے چار، چار سے آٹھ اور آٹھ سے چوگنا ہوجاتا ہے...... اور پھر ہزاروں سے حیران کن طور پر ایک...... یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ یہ سب وہ ہوجاتا ہے مگر اس بات سے پردۂ راز نہیں اٹھا کہ وہ کیسے؟ جس دن یہ پردۂ راز اٹھے گا تو موت کا راز منکشف ہونے میں باقی رہ ہی کیا جائے گا؟

چند دن ہوئے میں اسی اضطراب ذہنی میں مبتلا بیٹھا تھا اور سرطانی سورج گندم کی بالیوں کو پکار رہا تھا۔ بالیاں بالکل سوکھ چکی تھیں اور ان کی داڑھی اس قدر خشک ہوگئی تھی کہ ایک ایک بال کانٹے کی مانند چبھتا تھا، کچھ دبانے سے بات خود بخود جھڑنے لگتے۔ سٹے کو مسلتے مسلتے اس کا ایک بال میرے ناخن میں اتر گیا اور لاکھوں ذرات جن کی میں مجموعی صورت ہوں، ان میں سے ایک ذرے کو جو کہ انفرادی طور پر ذرہ عظیم سے کم نہیں، اس نے آگے دھکیل دیا۔ وہ ذرہ جو آگے دھکیلا گیا، نامعلوم گزشتہ زمانے میں میرا کوئی بزرگ تھا، یا شاید آئندہ نسلوں میں سے کوئی...... یہ میں جان نہ سکا۔ بہرحال سٹے کا بال ان دونوں میں سے نہ تھا۔ وہ ایک بیرونی خارجی چیز تھی جس کا میرے نظام جسم میں چلے آنا اس مسافر کی مداخلت بے جا کی مانند تھا "شارع عام نہیں ہے" پڑھتے ہوئے بھی اندر گھس آتے۔ یہ قطعی ممانعت کی وجہ ہی تھی کہ درد کی ٹیس اٹھ اٹھ کر مجھے لرزہ براندام کررہی تھی......

بھلا ایک کتا اپنی گلی میں دوسرے کتے کو نہیں آنے دیتا، تو میرے قابل پرستش بزرگوں اور معرکتہ لآرا کام کرنے والی آئندہ نسلوں کی عظیم الشان ہستیاں اس خارجی چیز کی مداخلت بے جا کو کب برداشت کرسکتی تھیں۔ اف درد! ماسوا اس چیز کے...... اس ذرے کے جو کہ ہماری آئندہ نسلوں کا اپنی ضرب و تقسیم کے ساتھ روحانی اور جسمانی بت بنے، یا ہمارے بزرگوں سے ہمیں ورثے میں آئے، کسی اور چیز کو مطلق دخل نہیں۔ مادہ اور روح دونوں اس وقت تک چین نہیں پاتے جب تک خارجی مادے کو ہر ایک تکلیف سہہ کر جسم سے باہر نہیں پھینک دیا جاتا۔

وہ ذرہ تو ہر جنبش سے اثر پذیر ہوتا ہے۔ اگر آپ نے غلط روی سے، اپنے جسم و روح کے نامناسب استعمال سے انہیں کسی طرح مفلوک اور ناتواں بنادیا ہے تو آپ کے وہ ذرے جنہوں نے آپ کے بیٹے اور پوتے بننا ہے، مفلوک اور ناتواں حالت میں آپ کے سامنے آکر آپ کے دلی اور ذہنی اضطراب کا باعث ہوں گے۔ وہ اسے قسمت و تقدیر کہیں گے۔ لیکن اگر قسمت کی تعریف مجھ سے پوچھیں تو وہ یہ ہے "صحبت نیک و بد کے اثر کے علاوہ جو چیز پوری ذمہ داری سے ہمارے بزرگوں نے ہمیں دی

ہے وہ ہماری قسمت ہے۔" اس لئے آپ جو بھی فعل کریں، سوچ کر کریں۔ انگلی بھی ہلائیں تو سوچ کر...... یاد رکھئے، یہ ایک معمولی بات نہیں ہے...... اب شاید آپ ذریعے کے قول وفعل سے کچھ واقف ہو گئے ہوں گے۔

جس دن سٹے کا بال میرے ناخن میں داخل ہوا، میں بہت مضطرب رہا...... شام کو میں گھبرایا ہوا قریب ہی شہر کے ایک بڑے اختر شناس کے پاس گیا۔ اس نے میری راس وغیرہ دیکھتے ہوئے قیافہ لگایا اور مجھے کہا کہ برہسپ کا اثر تمہیں ہر بلا سے محفوظ رکھے گا اور تمہاری عمر بہت لمبی ہے۔ اس کا شاید خیال ہو کہ درازی عمر کی پیشین گوئی سن کر یہ مالدار زمیندار اپنے بائیں ہاتھ کی انگلی میں چمکتی ہوئی طلائی انگوٹھی اتار کر دیدے گا۔ مگر یہ بات سن کر مجھے سخت بے چینی ہوئی۔ مایوسی کے عالم میں میں نے اسے اس کی قلیل فیس...... ایک ناریل، آٹا اور پانچ پیسے دے دیئے...... میں تو مرنا چاہتا تھا اور دیکھنا چاہتا تھا کہ اس حالت میں مجھ پر کیا عمل ہوتا ہے۔ مجھے اس بات کا بھی شوق تھا کہ میں اس راز کو، جس کی بابت بڑے بڑے حکیم اور طبیعیات کے ماہر کہہ چکے ہیں...... "وہ کرتا ہے کچھ...... ہم نہیں جانتے کیسے"...... طشت از بام کردوں، اور دنیا میں پہلا شخص بنوں جو کہ دوسری ہیئت میں آتے ہوئے اپنی حیرت انگیز یادداشت کے ذریعے سے دنیا پر واضح کردے کہ ذرے کو یہ حالت پیش آتی ہے...... اور وہ اس شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔

اس بات کے مشاہدے کے لئے خود مرنا لازمی تھا مگر عاقل اختر شناس نے اس کے برعکس درازی عمر کی روح فرسا خبر سنائی تھی۔ آتم گھات، خودکشی ایک پاپ تھا، جس کا ارتکاب نہ صرف میرے بزرگوں کے نام پر دھبا لگاتا تھا ، بلکہ موجودہ بچوں اور آئندہ نسلوں پر بھی اثر انداز ہوتا تھا ، چنانچہ میں نے خودکشی کے خیال کو بالکل باطل گردانا

میں جنگل میں ایک ٹیلے پر بیٹھا تھا۔ وہاں سے دریائے گنڈک کے کسی معاون کے ایک آبشار کی آواز صاف طور پر کانوں میں آ رہی تھی۔ اور چونکہ مجھے وہی بات خوش کرسکتی تھی جو کہ میرے دل کو مضطرب کرے، اس لئے گنڈک کے معاون کے آبشار کی دل کو بٹھا دینے والی آواز مجھے بھا رہی تھی۔ ایک پتھر کو الٹاتے ہوئے میں نے بہت سے کیڑے مکوڑے دیکھے۔ پھر میں نے کہا۔

"شاید اس آبشار کی آواز اور موت کے راگ میں کچھ مشابہت ہو"...... شام ہو چکی تھی، سورج مکمل طور پر ڈوبا بھی نہیں تھا کہ سر پر چاند کا بے نور اور کاغذی رنگ کا جسم دکھائی دینے لگا۔ پتھروں میں سے ایک جلا دینے والی بھڑاس نکل رہی تھی۔ یکایک مجھے ایک خیال آیا، ایک ترکیب سوجھی، جس سے میں ذرے کی ہیئت بدلنے کا مشاہدہ کرسکتا تھا۔ یعنی موت کا عمل بھانپ سکتا تھا۔ اسے ہم خودکشی بھی نہیں کہہ سکتے۔ وہ صرف مشاہدے کی آخری منزل ہے۔ وہ یہ...... کہ گنڈک کے معاون کے آبشار سے آدھ میل میں بہاؤ کی طرف، جہاں پانی کی خوفناک لہریں ایک پتھریلے ٹیلے کو عموداً ٹکرا کر اپنا دم توڑتے ہوئے جنوب مشرق کی طرف گنڈک سے ملنے کے لئے بہہ نکلتی ہیں، نہانے کے لئے اتر جاؤں اور غیر ارادی طور پر پانی کے اندر ہی اندر گہرائی اور تیز بہاؤ کی طرف آہستہ آہستہ چلتا جاؤں اور یہ صورت پیدا ہو کہ یا میرا پاؤں کسی آبی جھاڑی میں آڑ جائے یا کوئی جانور مجھے کھینچ لے آیا پانی کا کوئی زبردست ریلا وہ عمل میرے سامنے لے آئے جس سے ذرے کو کوئی دوسری صورت ملے...... شاید آپ اسے بھی خودکشی کہیں، مگر اس غیر ارادی فعل کو میں تو قدرتی موت کہوں گا۔

چنانچہ مرنے سے بہت پہلے ہی میں نے اپنے تصور میں کنکھل...... گنگا مائی کے چرنوں پر سر رکھا اور سوگندلی کہ میں ضرور اس غیر ارادی فعل کو پایہ تکمیل تک پہنچاؤں گا۔

گنڈک کی معاون آبشار سے ایک میل بہاؤ کی طرف بھی پانی اسی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا، باوجود یکہ عمودی چٹان سے ٹکراتے ہوئے اس کی لہریں اپنا دم توڑ چکی تھیں۔ میں کمر تک مکتی ناتھ اور دھولا گری کے اردگرد کی پہاڑیوں سے آئے ہوئے برفانی پانی میں داخل ہو چکا تھا۔ میں جلدی جلدی آگے بڑھنا نہ چاہتا تھا، کیونکہ

ایسا کرنا ارادتاً اپنے آپ کو مار ڈالنا تھا۔ کچھ آگے بڑھتے ہوئے میں نے آہستہ آہستہ پاؤں کو اقلیدی سی نصف دائرے کی شکل میں گھمانا شروع کیا اور تقریباً پانچ منٹ تک ایسا کرتا رہا تاکہ پانی کا کوئی ریلا مجھے بہالے جائے یا کوئی تیندوا یا گھڑیال پانی میں ٹانگ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔

...... معاً میرا پاؤں ایک آبی جھاڑی میں الجھ گیا اور میں پانی میں غوطے کھانے لگا۔ میرا پاؤں پھسلا اور دوسرے لمحے میں پانی کے ریلے بڑے زور شور سے میرے سر سے گزر رہے تھے۔

کچھ دیر تک تو میں نے اپنا دم سادھے رکھا، مگر کب تک؟ بے ہوش ہونے سے پہلے مجھے چند ایک باتیں یاد تھیں کہ میری ٹانگیں اور ہاتھ تیز پانی میں کانپتے ہوئے ادھر ادھر چل رہے تھے۔ باہر نکلتے ہوئے سانس سے چند بلبلے اٹھ کر سطح کی طرف گئے۔ میرے دماغ میں زندہ رہنے کی ایک زبردست خواہش نے اکساہٹ پیدا کی۔ اس کوشش میں میں کسی چیز کو پکڑنے کے لئے پانی میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ مگر اب میں پانی کی ڈوب سے باہر نہ آسکتا تھا، اگرچہ میں نے اس کے لئے بہت کچھ جدوجہد کی۔

اس کے بعد میری یادداشت مختل ہونے لگی...... میرے بزرگان...... کنکھل...... پرانی حکایتوں کا شہزادہ...... موت کا راز...... مکتی ناتھ...... کنکھل...... موت کا راز...... اس کے بعد ایک نیلا سا اندھیرا چھا گیا...... اندھیرے میں کبھی کبھی روشنی کی ایک جھلک ایک بڑے سے کیڑے کی شکل میں دکھائی دیتی...... پھر پرانی حکایتوں کا شہزادہ...... ذرہ...... موت کا عمل...... خاموشی اور اندھیرا ہی اندھیرا!

اس مکمل بے ہوشی میں مجھے ایک نقطہ سا دکھائی دیا جو کہ برابر پھیلتا گیا۔ شاید یہ وہی ذرہ عظیم تھا جس کی بابت میں نے بہت کچھ کہا ہے جو بسیط ہوتا گیا۔ وہ پھیل کر ایک جھلی کی سی صورت میں میرے جسم کے اردگرد لپٹ گیا۔ اس طرح کہ اب پانی اس میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی خلا میں ہوں، جہاں سانس لینا بھی ایک تکلف ہے۔

ذرہ عظیم سے آواز آنے لگی۔

"موت کے عمل میں تین حالتیں ہوتی ہیں۔ قبل از موت، موت، بعد از موت اول حالت میں ہوسکتا ہے کہ دوسری حالت تم پر طاری ہونے سے پہلے تم زندہ رہ جاؤ۔ قدرتاً اس میں تمہیں دوسری حالت کا احساس نہیں ہوسکتا۔ دوسری حالت میں تم اس بات کو ایک عارضی عرصے کے لئے جان سکتے ہو جس کی تم اپنی خواہش لئے ہوئے ہو، مگر اس کا اظہار نہیں کرسکتے۔ مابعد موت تمہیں زندگی کی پہلی نشانی گویائی کی قوت عطا کی جاتی ہے۔ پھر یادداشت کو جو اول دوم حالت میں تمہارے ساتھ ہوتی ہے، اسے خیرباد کہنا ہوتا ہے۔ ذرے کو فراموشی عطا کرکے اس پر مہربانی کی جاتی ہے۔ عین اسی طرح جیسے آدمی کو غیب سے ناآشنا رکھ کر اس پر کرم کیا جاتا ہے...... وہ راز یادداشت کی مکمل تحلیل میں پنہاں ہے۔"

"یادداشت کی مکمل تحلیل" میں نے ان الفاظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے کہا۔ "یادداشت کی تحلیل۔" "کیا ہماری نسلیں بھی ہماری یادداشت ہیں......؟ اور کیا اس کی مکمل تحلیل پر میں وہ راز دنیا والوں کے سامنے طشت از بام کرسکتا ہوں......؟ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

زندگی کی اس خواہش کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو مکتی ناتھ اور دھولا گری کے اردگرد کی پہاڑیوں سے بہہ کر آتے ہوئے برفانی پانی کی سطح پر پایا۔ جھلی سی میرے جسم پر سے اتر چکی تھی۔ زندگی کی ایک اور خواہش کے پیدا ہوتے ہی گنڈک کے معاون کے ایک ریلے نے مجھے کنارے پر پھینک دیا۔ اس وقت چاندنی رات میں ہوا تیزی سے چل کر سانس کی صورت میں میرے ایک ایک مسام میں داخل ہو رہی تھی۔

حنوط

افشاں رمضان۔سرگودھا

کئی صدیاں گزرنے کے باوجود بھی فراعنہ میں سے ایک فرعون کی روح حاضر ہوئی اور اپنا مذاق اڑانے والے نوجوانوں کو خوفناک موت سے ہمکنار کردیا۔ کیا ایسا ہوسکتا ھے۔ ثبوت کھانی میں موجود ھے۔

جسم وجاں پر سکتہ اور رگ وپے میں خون کو منجمد کرتی اور رونگٹے کھڑے کرتی دردناک کہانی

قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے ابراہیم ایک دم چونک گیا۔ اسے باہر کار پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ تلاوت ختم کرکے اب مخملی غلاف میں قرآن مجید کو لپیٹ رہا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اب اس کے ایسے دوست کی آمد ہوگئی ہے جو اسے کوئی کام سکون سے نہیں کرنے دیتا۔

''ہیلو ابراہیم! کیا ہورہا ہے؟'' شہادت کی انگلی میں کی چین گھماتے ہوئے وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ چکا تھا۔

''قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔'' ابراہیم طمانیت سے بولا۔

''حضرت علیؓ کا فرمان ہے۔ ''جب تم یہ چاہو کہ تم اللہ سے باتیں کروتو نماز قائم کیا کرو۔ اور جب تم یہ چاہو کہ اللہ تم سے باتیں کرے تو قرآن مجید کی تلاوت کیا کرو۔''

''ویری نائس'' جوزف نے چیونگم منہ سے نکال کر کونے میں رکھی باسکٹ کی طرف اچھالتے ہوئے کہا۔

''اور سناؤ تمہاری جاب کا کچھ بنا؟'' ابراہیم نے سوال داغا۔

''تیری جاب کا بنا کچھ؟'' جوزف نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''جاب ملتی نظر نہیں آتی، کافی تگ ودو کرلی ہے مگر یہاں نوکریاں میرٹ پر کم ہی ملتی ہیں۔'' ابراہیم قرآن پاک الماری کے سب سے اوپر والے خانے میں رکھ کر اب جوزف کے ساتھ صوفے پر آبیٹھا تھا۔

''تمہیں ہی شوق ہے اس ملک میں رہ کر کام کرنے کا۔ تمہاری وجہ سے میں بھی نہیں جا پا رہا...... میں بتادیتا ہوں ابراہیم، اگر مجھے یہاں زیادہ ذلیل ہونا پڑا، تو میں بیرون ملک کے لئے پر تول لوں گا، تم یہیں بیٹھ کر یہ نغمہ گنگناتے رہنا...... ''اے ارض وطن، تیری مٹی کو سلام......'' جوزف جل بھن کر بولا۔

ابراہیم کا جوزف جگری دوست تھا اور اس کے بغیر اسے ملک سے باہر جانا بالکل گوارہ نہ تھا۔ ابراہیم نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی تواتر سے بج اٹھی۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ جوزف نے اسے نہ اٹھنے کا اشارہ کردیا اور خود فون ٹرالی کی جانب بڑھ گیا۔

''ارے...... یہ تو کوئی بیرون ملک سے کال لگتی ہے۔ کہیں یسوع نے ہماری سن تو نہیں لی۔'' CLI پر نمبر دیکھ کر جوزف خوشی سے جیسے چلایا تو ابراہیم نے بھی

صوفے سے اٹھ کر فون کی جانب قدم بڑھا دیئے۔
"تمہیں تو ماسٹر کی ڈگری پتہ نہیں کیسے مل گئی جوزف؟ یہ مصر کا لینڈ لائن نمبر ہے اور مصر سے ہمارے لئے کسی کا فون آتا ہے؟ ابراہیم نے مسکراتے ہوئے بھنویں اچکائیں۔
"اوہ...... آنند کا۔" جوزف کو اچانک کچھ یاد آیا، لیکن تب تک ابراہیم فون اٹھا چکا تھا اور اس کے چہرے پر خاصے پریشان کن تاثرات تھے تھوڑی دیر بعد وہ فون رکھ کر دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے بیٹھا تھا۔
"کیا ہوا؟ کیا کہا آنند نے؟" جوزف سچ مچ پریشان ہوگیا تھا۔ "فون پر آنند نہیں تھا۔" ابراہیم نے ٹشو سے ماتھے پر آیا پسینہ صاف کیا۔
"پھر کون تھا؟ تم مجھے پوری بات بتاتے کیوں نہیں؟"
"اس نے پھر سے خودکشی کی کوشش کی ہے مگر اللہ کا شکر ہے کہ وہ پھر سے بچ گیا ہے۔ جوزف...... قدرت کب تک اسے یوں بچاتی رہے گی؟" ابراہیم نے نم آلود آنکھوں سے جوزف کو دیکھا جو اپنی بے قابو سانسوں کو ہموار کرنے کی کوشش کررہا تھا۔
ابراہیم، آنند اور جوزف، تینوں الگ الگ مذہب سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ اپنے درمیان صرف ایک مذہب کو رکھتے تھے اور وہ دوستی کا مذہب تھا۔ تینوں نے تعلیم کے مدارج ایک ساتھ شروع اور مکمل کیے تھے۔ ابراہیم اور جوزف کو کہیں نوکریاں نہیں مل رہی تھیں جبکہ آنند ایک مصری نژاد حسینہ پاربتی سے نیٹ فرینڈ شپ کے نتیجے میں مصر جا بسا تھا۔ وہاں ان دونوں نے شادی کرلی تھی۔ مگر بدقسمتی سے شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی بیوی ایک پراسرار بیماری کے نتیجے میں یہ دنیا چھوڑ گئی تھی۔
آنند ایک لاوارث نوجوان تھا۔ اس کا مصری دنیا میں کوئی نہ تھا۔ تعلیم بھی حکومت سے ملنے والے وظیفوں پر مکمل کی گئی تھی۔ ایک لمبے عرصے بعد، لے دے کے پاربتی اس کی زندگی میں آئی تھی اور اس کے یوں اچانک چلے جانے کے بعد وہ کافی ڈپریشن میں تھا جس کی بناء پر وہ کئی مرتبہ خودکشی کی کوشش بھی کرچکا تھا۔ وہ بھری دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔

☆............☆

"اپنا خیال رکھنا بیٹا، کب تک لوٹ آؤ گے؟" الفت بیگم نے بیٹے کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا۔
"وہ یہاں آنے پر نہیں مانتا امی جان، اسی لئے مجھے اور جوزف کو وہاں جانا پڑ رہا ہے۔ واپسی کی مدت تو اس کی حالت پر منحصر ہے دیکھتے ہیں، کب وہ زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ کر آتا ہے؟ اپنا دوست ہے وہ، اسے اس حالت میں اکیلا بھی تو نہیں چھوڑا جاسکتا۔" ابراہیم نے ماں کے ہاتھوں کو چوما اور ٹرالی بیگ لے کر باہر گیراج کی جانب بڑھ گیا جہاں ڈرائیور اس کا انتظار کررہا تھا۔
گرجا گھر کی بڑے سے شیشے والی کھڑکی سے، گھنگھریالے بالوں والی روزی نے نیلے آسمان کی جانب دیکھا جہاں ایک ہوائی جہاز مصر کی جانب بلندیوں پر محو پرواز تھا۔ اس نے نظر بھر کر جہاز کو دیکھا۔ پھر سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے، آنکھیں موند لیں۔ اسے بہت ساری دعائیں کرنی تھیں۔ آخر کو اوپر آسمان پر اڑتے جہاز میں اس کا منگیتر جوزف سوار تھا۔
قاہرہ کا ایئرپورٹ اس شہر کی "قدامت پسندی" کی گواہی دے رہا تھا۔ عملہ خوش اخلاق، مگر عمارتوں اور سہولتوں پر قدیم تہذیب کی چھاپ نمایاں تھی۔ جہاز کی سیڑھی کھلی تو معلوم ہوا کہ سرنگ کا انتظام نہیں ہے۔ سامان کی آمد کا انتظار۔ بارات کی آمد میں تاخیر کا منظر پیش کررہا تھا۔ قاہرہ کی ٹریفک سست روی کا شکار تھی۔ گاڑیاں رینگ رینگ کر چل رہی تھیں۔
"قسم سے! میرا تو دل کررہا ہے، گاڑی سے اتر کر پیدل چلنا شروع کردوں، کم از کم گاڑی سے تو تیز ہی چل لوں گا۔" مصر کی جھلساتی گرمی میں مسلسل دو گھنٹوں سے گاڑی میں قید جوزف بھنا کر بولا۔ "بھائی صاحب! یہ ساری گاڑیاں اتنی آہستہ کیوں چل رہی

ہیں؟" ابراہیم نے ڈرائیور سے پوچھا۔ جو اردو اسپیکنگ لگ رہا تھا۔
"جناب! یہاں قاہرہ میں اس وقت ایک کروڑ چالیس لاکھ کے قریب گاڑیاں ہیں۔ اب اتنی گاڑیوں کے ہوتے ہوئے ایسی سست رفتاری تو بنتی ہے ناں۔" ڈرائیور نے گیئر بدلا۔
"اوہ گاڈ...... اتنی گاڑیاں......؟ جوزف حیران ہوکر بولا۔
"پھر تو ہمیں یہاں سے بہت سارا پیٹرول لے کر پاکستان جانا چاہیے، وہاں کے عوام کو تھوڑا ریلیف مل جائے گا۔" جوزف نے گاڑی سے باہر سرپٹ دوڑتے کھجور کے درختوں کو دیکھا۔
کچھ ہی دیر بعد وہ آنند کے ساتھ اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ شیشے کی دیو ہیکل کھڑکی سے جھانکتا سورج آگ کا بڑا سا گولہ لگ رہا تھا۔ فضا میں قہوے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔
"میرا اس سنسار میں اب کوئی نہیں رہا۔ کیا کروں اس جیون کا اب؟" آنند خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولا۔
"تجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ زندگی تیرے بھگوان کی امانت ہے۔ تو اس میں کیسے خیانت کرسکتا ہے؟" ابراہیم نے آنند کی ڈھارس بندھائی۔
"ارے...... ابراہیم اور آنند! جلدی سے ادھر دیکھو۔ پلازما اسکرین پر کوئی چینل آرہا تھا۔ ریموٹ ہاتھ میں پکڑے جوزف نے اپنے دونوں دوستوں کو اس طرف متوجہ کیا وہ تینوں کافی دیر تک بت بنے اسکرین کو گھورتے رہے۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد کوئی دوسرا پروگرام لگ گیا تھا۔ اور وہ تینوں دوست آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ طے کررہے تھے۔

☆......☆......☆

وہ ایک بہت بڑا محل تھا۔ جس کے گرد جیل سے اونچی اور مضبوط فصیل تھی۔ فصیل کے ہر کونے پر مضبوط اور دفاعی چبوترے بنائے گئے تھے۔ محل کے چاروں طرف برآمدے تھے۔ جن میں قدرتی روشنی کے علاوہ مصنوعی روشنی کا بھی انتظام تھا۔ اس محل کی کرسی سطح زمین سے غیر معمولی طور پر بلند تھی۔ اس میں رہنے والے افراد بھی محل کی طرح ہی حسین تھے۔ "کیا بات ہے شوانی؟ ہم نے تمہیں کھانے پر بلانے کے لئے کنیز کو بھیجا تم نے اسے واپس بھیج دیا۔" قبیلے کے بہادر ترین سردار۔ "خوفو" اپنی بیوی شوانی سے کھانے کا کہہ رہا تھا۔
"ہمیں کھانا نہیں کھانا خوفو، ہمارے دانتوں میں بے پناہ درد ہے۔" شوانی کپڑا اپنے گال پر رکھے اسے دبائے بیٹھی تھی۔
"ہمیں سمجھ نہیں آتا کہ ہم تمہیں اس دانت کے درد سے کیسے آزاد کریں؟ ایک بہادر فرعون کی بیوی ہوتے ہوئے تم اس دانت کے درد کے آگے بے بس ہو اور ہم کچھ نہیں کرسکتے۔" خوفو نے سر جھکالیا۔ "آپ کو کچھ کرنا ہوگا خوفو، ہمارے دانت ختم ہوتے جارہے ہیں۔ ہم کچھ کھانے پینے کے لائق نہیں رہیں گے۔" شوانی بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔
"کاش! یہ دانت کا درد کوئی انسان بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہوتا تو ہم اسے ایک پل میں تہہ و تیغ کرکے رکھ دیتے مگر اب...... ہم مجبور ہیں شوانی۔ تم جانتی ہو کہ ہمارے چاروں طرف سبھی کے دانت خراب ہورہے ہیں۔ خود میرے اپنے بھی کافی دانت ختم ہوچکے ہیں۔ دانتوں اور ہڈیوں کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ ان کو نہیں روکا جاسکتا۔ فرشان، شامن، آہوم اور کالام، یہ سب بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ تم ان کی طرح ہمت پکڑو۔" خوفو آگے بھی کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ ایک خادم سر کو جھکائے اندر داخل ہوا۔
"فرعون ثانی" "خوفو" کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ان کے مقبرے کی تعمیر مکمل ہوگئی ہے۔ سارا سامان، جن میں ہتھیار، لباس اور اشیائے ضرورت شامل ہیں۔ وہیں رکھ دی گئی ہیں۔" خادم ہاتھ جوڑے سر جھکائے کھڑا ہوا تھا۔
"اوہ...... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔" خوفو

مسکرایا۔ پھر وہ اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''شوانی! مقبرے میں تمام لباس میری پسند کے رکھوانا۔ جب میں دوبارہ زندہ ہو جاؤں گا تو میں اپنی پسند کے کپڑے پہننا پسند کروں گا۔'' خوفو نے کہا اور اپنا بھڑکیلا اور وزنی لباس سنبھالتے ہوئے چلا گیا۔ خادم بدستور مؤدب انداز میں کھڑا تھا۔

''ملکہ شوانی! لگتا ہے آپ کے دانت کا درد پھر زور پکڑ گیا ہے۔ میری مانیں تو جلدی سے آپ اپنی مرگ کی راہ تکیں۔ آپ کے جسم کو حنوط کر دیا جائے گا۔ یوں آپ حنوط زدہ حالت میں بھی بہت سکھ سے رہیں گی اور جب آپ دوبارہ زندہ ہو کر اٹھیں گی تو اپنے دانتوں کے درد سے نجات پا چکی ہوں گی۔'' خادم کی بات پر شوانی نے سر ہلایا اور آنکھیں موند کر بستر پر لیٹ گئی۔ اب وہ خیالوں کی رتھ پر سوار اپنی موت کے آنے کے بارے میں سوچنے لگی۔

☆......☆......☆

''سب تیاری مکمل ہے؟'' آنند کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ اور اپنے دوستوں کے ہمراہ ایک نئے مشن کی تیاری میں مصروف تھا۔

''تیاری تو سب مکمل ہے۔ ڈیڈ باڈی لینے کے لئے بس آج ہی نکلیں گے اور آج رات سے ہی کام شروع کر دیں گے۔'' جوزف لیٹر پیڈ پر پنسل چلاتے ہوئے کوئی تخمینہ لگا رہا تھا۔

''ابراہیم کو بھی آج ہی جانا تھا۔ اتنا بھاری پلان تم اور میں کیسے ہینڈل کر پائیں گے؟'' آنند متفکر سا ہوا۔

''اچھا ہی ہوا وہ واپس وطن چلا گیا۔ وہ کون سا دل سے راضی تھا اس پلان پر؟ بس ہماری خاطر کچھ دیر کے لئے مان گیا تھا۔ بعد میں صاف انکار کر دیا۔'' جوزف نے تخمینہ لگا کر لیٹر پیڈ اب سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔

''ہمیشہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہنا [illegible] کرو جوزف۔ ابراہیم کا اس کام کیلئے راضی نہ ہونا بنتا ہے۔ میرے کئی مسلمان دوست ہیں۔ اس لئے یہ بات میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ ان کے دھرم، میں مُردوں کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر وہ کیسے اس کام کے لئے راضی ہوتا؟'' آنند نے رسانی سے اسے سمجھایا۔

''ہوں...... اٹس او کے، یہ کام ہم دونوں ہی کر لیں گے اور اگر ہم اس کام میں کامیاب ہو گئے تو اس سے ملنے والا پرافٹ کے تین حصے ہوں گے۔ دو ہمارے اور ایک حصہ ابراہیم کا...... کیا یاد کرے گا وہ بھی؟ اس کام میں شرکت کے بغیر بھی وہ ایک حصے کا مالک بن جائے گا۔'' جوزف نے خیالی پلاؤ پکایا۔ ''ہاں یار...... دوست ہے وہ ہمارا۔ اس کا ہمارے ہر منافع پر حق ہے۔ اچھا چلو، فریش ہو کر نیچے آ جاؤ۔ کھانا کھاتے ہیں۔'' آنند نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ مگر فوراً ''آنند...... آنند رک یار! میں تجھے اپنے خواب کے بارے میں بتانا تو بھول ہی گیا۔ جوزف کو بھاگنے کی وجہ سے سانس چڑھا ہوا تھا۔

''کیسا سپنا؟'' آنند اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے کھڑا تھا۔

''بہت عجیب سا خواب تھا۔ انتہائی قدیم دور کے لوگ تھے وہ۔ غالباً کوئی فرعون تھا، جو اپنے مرنے کے لئے مقبرہ تعمیر کروا رہا تھا اور اس کی کوئی بیوی بھی تھی۔ جس کا نام اب مجھے یاد نہیں آ رہا۔ وہ سب دانتوں اور ہڈیوں کی بیماریوں کی وجہ سے بہت پریشان تھے۔ ''جوزف کہیں کھویا کھویا سا لگ رہا تھا۔''

''تو۔ تم انہیں ڈاکٹر ٹوتھ پیسٹ استعمال کرنے کا مشورہ دے دیتے۔'' آنند نے مسکراتے ہوئے کہا اور سیڑھیاں اترتا نیچے چلا گیا۔

☆......☆......☆

جابجا درختوں کے بیچ وہ بھاگتا پھر رہا تھا۔ کوئی راستہ اسے آشنا نہ لگ رہا تھا۔ درختوں پر بیٹھے الو اسے طنزیہ نگاہوں سے گھورے جا رہے تھے۔ اس کا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اندازے کا ہاتھ پکڑ کر وہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھر رہا تھا۔ مگر راستہ تھا کہ اسے منزل تک پہنچانے سے عاری تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے قدم قدم پر گر کر اس کے گھٹنے بری طرح لہولہان ہو چکے تھے اور ان سے لال گاڑھا خون قطروں کی مانند رس کر اس کے سفید نائٹ ٹراؤزر کو اپنے رنگ سے رنگ رہا تھا۔

تھک ہار کر وہ ایک پرانے برگد کے پیڑ تلے سانس لینے کو رکا تو درخت پر موجود بھوری چیونٹیاں اس کی کمر پر چڑھنے لگیں۔ گھبرا کر وہ آگے بڑھا تو اس کا پاؤں عین درخت کے سامنے بنے قدرے گہرے کھڈ میں جا گرا۔ دلخراش چیخ کے ساتھ گڑھے سے بچنے کے لئے اس نے درخت کے ساتھ لپٹی کالی رسی کا سہارا لیا۔ مگر یہ دیکھ کر اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا کیونکہ وہ تو ایک مادہ سانپ تھا۔ وہ اسی سمیت گہرے کھڈ میں جا گرا۔ مادہ سانپ کی تیز پھنکاریں اور اس کی چیخیں عجب طوفان برپا کر رہی تھیں۔ مادہ سانپ نے کھڈ میں گرنے سے پہلے ہی اس پر زوردار حملہ کر دیا۔ درد کے طوفان انگیز احساس نے اس کی چیخیں مزید بڑھا دیں۔

''یہ کیسی آواز ہے؟'' قبرستان میں داخل ہو کر وہ دونوں مطلوبہ قبر کی تلاش میں تھے کہ انہیں کسی کی چیخوں کی آواز آئی۔ ''لگتا ہے، کوئی مصیبت زدہ چیخ رہا ہے۔'' جوزف نے گمان کیا۔

''چلو چل کر دیکھتے ہیں۔'' شاید ہم کسی کی جان بچا سکیں۔'' آنند نے ٹارچ کا رخ آوازوں کی سمت کیا۔ مگر اب آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔

آنند احتیاط سے جھاڑیاں ہٹاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جوزف کے منہ سے فلک شگاف چیخ بلند ہوئی اور وہ ایک قدرے گہرے کھڈ میں جا گرا۔ قسمت اچھی تھی کہ کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا۔

''یوں بچوں کی طرح کیوں چیخ رہے ہو جوزف؟ ہاتھ دو مجھے اپنا۔ ابھی باہر نکل آؤ گے تم۔'' آنند وہیں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔

''آن...... آنند...... یہاں...... لل...... لل...... لاش ہے۔'' جوزف نے اپنا لرزہ ہوا ہاتھ آنند کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''واٹ......؟'' آنند چلایا۔ ''تم تو باہر آؤ، پھر دیکھتے ہیں۔'' آنند نے جوزف کو کھینچ کر باہر نکالا۔ پھر ان دونوں نے ٹارچ کی روشنی نیچے کھڈے میں ڈالی تو وہاں واقعی ایک لاش تھی۔ گھٹنوں سے رستے خون میں لت پت، سفید ٹراؤزر پہنے وہ کوئی لڑکا تھا۔ اس کی کھلی بے جان آنکھوں میں دہشت نمایاں تھی۔ رستا ہوا خون بتا رہا تھا کہ اس کی موت واقع ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ کا ٹائم نہیں ہوا تھا۔

''لگتا ہے، ہم نے چیخوں کی جو آواز سنی تھی، وہ اسی کی تھی۔ پتہ نہیں اسے اتنے زخم کھڈے میں گرتے وقت ہی لگے ہوں۔ جوزف ٹارچ کی روشنی بے جان لاش پر ڈال رہا تھا۔

''ہم یہاں کیا کرنے آئے تھے جوزف؟'' آنند معنی خیز انداز میں بولا۔

''لاش لینے...... میرا مطلب ہے، قبر سے ڈیڈ باڈی نکالنے کے لئے۔'' جوزف نا سمجھی کے سے انداز میں بولا۔

''تو کیا یہ ضروری ہے کہ ہم مشقت کر کے قبر کھودیں، پھر اس میں سے ڈیڈ باڈی نکالیں، جبکہ بھگوان نے ایک بالکل تازہ لاش ہمارے سامنے رکھ دی ہے۔'' آنند نے بھنویں اچکائیں۔

''کہہ تو تم بالکل ٹھیک رہے ہو، ارے دیکھو، اس کے پیر دیکھ کر لگتا ہے کہ کہیں بہت دور سے یہ اندھا دھند بھاگتا رہا ہے۔ اوہ! مائی گاڈ، آنند! اس کے ٹخنے کے اوپر دیکھو، یہ دو چھوٹے چھوٹے سوراخ کیسے ہیں؟ اس کی ٹانگ بھی نیلی پڑ رہی ہے۔'' ٹارچ کی روشنی میں وہ لاش کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''کاٹ لیا ہو گا کسی زہریلی چیز نے۔ ہم تو اسے بچانے آئے تھے، پر اب کیا کر سکتے ہیں؟ سوائے اسے اپنے مقصد میں استعمال کرنے کے۔'' آنند نے کہا اور

کھڈے میں اترنے کی تیاری کرنے لگا۔
کچھ ہی دیر بعد وہ اس لاش کے ہمراہ، گاڑی میں اپنے گھر کی جانب رواں دواں تھے۔

☆......☆......☆

وہ ایک بہت خوب صورت، عالیشان مگر قدیم طرز کی عمارت تھی۔ جس کے عین وسط میں سنگ مرمر کا فوارہ پانی اگل رہا تھا۔ نیچے تالاب تھا، جس میں آسمانی رنگ کا شفاف سنگ مرمر استعمال کیا گیا تھا اور نیلا نیلا شفاف پانی بڑا ہی بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ تالاب کے چاروں کونوں میں ''آئی سس'' اور ''عدونس'' کے مجسمے سجائے گئے تھے سنگی روشنیوں کے گرداگرد سرسبز گھاس بچھی ہوئی تھی، جس میں جگہ جگہ ''قلوپطرہ'' اور ''گالیکا'' کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس کے آگے کافی دور تک سبزہ بچھا ہوا تھا، جس کی حد بندی سیاہ گلاب سے کی گئی تھی۔ وسیع وعریض ہال کی چاروں طرف کی دیواریں اطلسی پردوں کے پیچھے گم تھیں اور انہی اطلسی پردوں میں سے جابجا دروازے نظر آرہے تھے جو غالباً صندل کی لکڑی سے تیار کردہ تھے۔ چاروں طرف صندل کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ چھت کے ساتھ جہازی سائز کا فانوس لٹکا ہوا تھا۔ اس میں جڑے بیش قیمت ہیروں کی چمک کچھ ایسی تھی کہ فانوس روشن کرنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔

''نفنقور و طورخس...... صطفوا، صطفوا...... آرقو صطفوا...... صطفوا......'' جنگلی پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے ملا جلا لباس پہنے وہ شخص، راہداریوں کے شفاف فرش پر بھاگ رہا تھا۔ فرش میں ایسا اجلا پن تھا کہ جیسے اس میں سفید دودھیا شیشہ استعمال کیا گیا ہو۔ بالآخر وہ شخص سونے اور جواہرات سے بنے بڑے سے تخت پر بیٹھے ایک آدمی کے پیروں میں جھک گیا اور کوئی التجا کرنے لگا۔

''رحم...... مارد قلبو معکوسط...... ایکیلا مارتا دیوتا...... ایکیلا قلبو معکوسط...... رحم، ایکیلا نفس الدورا۔''

(میرے مالک کا دل الٹ گیا ہے، یہ میرا دیوتا ہے، ایکیلاس کا دل الٹ گیا ہے۔ رحم کرو، ورنہ ایکیلاس کی روح جسم سے دور ہوجائے گی)

''مسرت مصوا پچھم آترت میلم۔'' تخت پر بیٹھا آدمی شان سے بولا۔ (ابھی میں مصروف ہوں، شام کو آنا)

بے بس آدمی اٹھا اور الٹے قدموں لوٹ گیا۔ جہاں اس کا بھائی ایکیلاس دم توڑ رہا تھا۔ آدمی کو مرے ہوئے قدموں سے لوٹتا دیکھ کر، تخت پر براجمان، زرق برق لباس پہنے وہ شخصیت زہرخند انداز میں مسکرائی اور بولی۔ ''ام خامزی۔''

(میں خامزی ہوں)

☆......☆......☆

سبزی کی ٹوکریوں سے لدا پھندا آنند بازار سے سیدھا گھر آیا تھا۔ جب سے انہوں نے اپنے پلان پر کام شروع کیا تھا۔ وہ کچن کا ہفتے بھر کا سامان ایک ہی دن بازار جاکر لے آتا۔ جوزف کو وہ کمرے کا پینٹ کرنے کا کام سنبھال کر گیا تھا۔ آکر دیکھا تو کمرے کی طرف ایک دیوار کا پینٹ ہوا تھا اور وہ بھی گہرے پیلے رنگ میں۔ جوزف نجانے کہاں غائب تھا؟ آنند کو پیلا رنگ سخت ناپسند تھا۔ سبزی کی ٹوکریاں میز پر پٹخ کر وہ جوزف کو آوازیں دیتا گھر میں چاروں اور پھرنے لگا۔ بالآخر اسے نرم صوفے پر آرام کرتا جوزف مل ہی گیا۔

''جوزف کے بچے اٹھ، پینٹ کرنے کا اس سے بہتر کوئی رنگ نہیں ملا تھا تجھے؟'' آنند نے سائیڈ ٹیبل پر پڑے پانی کے گلاس سے اس پر چھینٹا مارا۔ جوزف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''ابے...... اتنے سندر محل والا سپنا دیکھ رہا تھا میں۔ میں تو کہتا ہوں، تجھے بھی اس ظالم جلاد صفت ''خامزی'' کے حوالے کردینا چاہئے۔'' جوزف اب اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ ''اب یہ خامزی کون ہے؟'' آنند اکتا کر بولا۔

''ارے وہ آنند! تیرے اس سوال پوچھنے تو مجھے کچھ

سوچنے پر مجبور کردیا ہے۔ وہ خامزی کوئی بادشاہ لگ رہا تھا۔ جو قدیم مصری اور افریقی قبائلی زبان کو مرکبی انداز میں بول رہا تھا۔

''ہوں...... اسی ڈگری کی وجہ سے تجھے پاکستان میں کہیں نوکری نہیں ملتی......'' آنند کے کہنے پر جوزف کھسیانا سا ہوگیا۔

''اچھا چل...... اس سے پہلے کہ لاش گل سڑ جائے، ہمیں اپنا کام شروع کردینا چاہئے۔'' آنند کے کہنے پر جوزف بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

''انہوں نے اپنے مقصد کے لئے ایک الگ سے کمرہ بنا رکھا تھا۔ جس کے عین وسط میں ایک اسٹریچر نما میز پر سفید کپڑے میں لپٹی لاش پڑی تھی۔ اس کے دائیں طرف تقریباً اسی کے سائز کی میز تھی۔ جس پر مختلف اقسام کی چمکدار چاقو چھریاں سجی تھیں۔ ساتھ ہی کچھ دوسری قسم کا سامان بھی پڑا تھا، جو عموماً پوسٹ مارٹم کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک دوسری میز پر مختلف مصالحہ جات پڑے تھے۔ جوزف اور آنند نے کسی ماہر سرجن کی طرح چہروں پر ماسک اور ہاتھوں پر گلوز چڑھائے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر وکٹری کا نشان بنایا۔ سب سے پہلے انہوں نے لاش کو پیٹ کی طرف سے کاٹنا شروع کیا۔ پیٹ کی کھال کسی ڈھکن کی طرح ایک طرف کو لڑھک گئی۔ اس کے بعد انہوں نے پیٹ کے اندر سے تمام اجزاء ہولے ہولے کرکے نکالنا شروع کردیئے۔

ایک چھوٹی میز پر تمام اجزاء نکال کر رکھے جارہے تھے۔ خون میں ڈوبی انتڑیوں کا جال دیکھ کر جوزف کو جھرجھری سی آگئی۔ مگر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔

آنند نے ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری لے رکھی تھی۔ وہ کئی لاشوں کے پوسٹ مارٹم کرچکا تھا۔ لہٰذا اسے کوئی مشکل پیش نہیں آرہی تھی۔ وہ نہایت انہماک سے اپنا کام کررہا تھا۔

''اس بیچارے میں سے سب کچھ تو نکال لیا ہے یار، اور باقی کیا رہ گیا ہے؟'' خون آلود بڑا سا چھرا جوزف نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ ''اس کی آنکھیں بھی نکالنی ہونگی۔'' ماسک کے پیچھے سے آنند کی آواز ابھری۔ ''واٹ......؟'' ''جوزف چیخا مگر فوراً ہی آنند کے گھورنے پر تیز اور سائز میں نسبتاً چھوٹی چھری اٹھالی۔ وہ آج تک بہت سے لوگوں کو ان کی آنکھیں نکالنے کی دھمکیاں دیتا آیا تھا مگر آج وہ زندگی میں پہلی بار حقیقی طور پر کسی کی آنکھیں نکال رہا تھا۔

خون میں تر ڈھلکتی اور پھسلتی ہوئی آنکھوں کی پتلی جب اس نے ہتھیلی پر رکھی تو اچانک اسے الٹی سی آگئی۔ اور وہ وہیں بیٹھ کر کے بعد دیگرے الٹیاں کرنے لگا۔ آنند کے اشارہ کرنے پر وہ دروازے کو پکڑتا، قے کرتا ہوا روم سے باہر نکل گیا۔

واش روم سے فریش ہونے کے بعد وہ صوفے پر بے جان سا ہوکر گر گیا۔ مسلسل قے کرنے کی بدولت اس کا معدہ خالی ہوچکا تھا اور پیٹ میں بھی درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس مشن کا طریقہ کار حالانکہ وہ پہلے کیبل کے ایک انگریزی پروگرام میں، آنند اور ابراہیم کے ہمراہ بیٹھ کر دیکھ چکا تھا۔ اور وہیں سے ان تینوں نے اس مشن پر عمل پیرا ہونے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر بعد میں ابراہیم کی مذہبی ممانعت کی وجہ سے وہ دونوں اکیلے رہ گئے تھے۔ آج مشن کے پہلے دن ہی وہ کافی تھک چکا تھا۔ اس نے اپنا آئی پیڈ آن کیا اور گیم کھیلنے لگا۔

کچھ دیر پہلے تک جہاں صرف لاش کے پیٹ کے اجزاء تھے۔ اب وہاں انسانی اندرونی اعضاء کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ سرخ گاڑھا خون میز سے ٹپک ٹپک کر فرش کو رنگین کررہا تھا۔

''آنند نے تھکے ہوئے انداز میں ہاتھ میں پکڑے اوزار واپس میز پر رکھے اور کمرے کے کونے میں جاکر بڑا سا ڈسٹ بن اٹھا لایا۔ اس کے بعد اس نے ٹیبل شیٹ، جس پر دل، جگر، پھیپھڑے، گردے، لبلبہ، آنتیں، معدہ، پتہ اور دوسرے اجزاء، خون میں لتھڑے ہوئے پڑے تھے، چاروں کونے سمیٹ کر

اٹھائی اور ڈسٹ بن میں الٹ دی۔

ماسک اور گلوز پہنے، ڈسٹ بن اٹھائے وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ رات کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ اپنے گھر کا مین گیٹ کھول کر وہ باہر آیا اور ڈسٹ بن، سامنے بہنے والی ندی میں دے مارا۔ ایک چھپاکا سا ہوا۔ ندی کا رنگ سیکنڈ بھر کیلئے سرخ ہوا مگر پھر سے اپنی اصلی حالت پر آگیا۔ ''جرم چھپانے کے لئے چلتا پانی کافی فائدہ مند رہتا ہے۔'' پرسکون سا ہو کر آنند واپس اندر چلا گیا۔ ندی کی ننھی منی موجیں اچھل اچھل کر آنند سے یہ سوال کرتی رہ گئیں کہ جب ان بیش قیمت اجزاء کو بیچ کر پیسہ کمانے کے بجائے یونہی دریا برد کرنا تھا تو پھر ایسا کرنے کا مقصد کیا تھا؟

☆......☆......☆

''یہ نہیں ہوسکتا نوفرتیت! وہ تمہارے باپ کی بہن کا بیٹا ہے، یہ بیاہ جائز نہیں ہوگا۔ سورج دیوتا ناراض ہوگا ہم سے۔'' وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے جسم پر سوائے ہیروں کی مالاؤں کے کچھ بھی نہ تھا۔ ''ہم بیاہ کریں گے تو صرف ''اخناتون'' سے، اس کے علاوہ ہم کسی سے بھی بیاہ نہیں کریں گے'' ''نوفرتیت'' کے چیخ کر بولنے کی وجہ سے اس کا جبڑا مکمل کھلا تھا۔ اس کے سامنے کے دو دانت مکمل طور پر غائب تھے، جس کی وجہ سے وہ کافی بھیانک لگ رہی تھی۔ اپنا حکم سنا کر وہ چلی گئی۔ ''بندہ غلام فرعون مصر ''منقارہ'' کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔'' دربار میں صدا بلند ہوئی۔

''اجازت ہے۔'' ہیروں کی مالائیں پہنے آدمی نے ہاتھ بلند کیا۔

''شاہ مصر! آپ کی مرگ کے لئے بنے مقبرے کی پختگی کو پرکھنے کے لئے اس پر تمام طرح کی ضربات لگائی ہیں۔ طرح طرح کے وار کئے ہیں۔ وہ سب کو سہہ گیا ہے۔ مرگ کے بعد آپ کے دشمن یوساف، توسامہ، اتریکا اور آتون، آپ پر حملہ کرسکیں گے اور حنوط ہو کر آپ بہت سکھی رہیں گے۔'' خادم، نما آدمی نے پتوں کی بڑی سی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ ''اچھا ہے۔'' منقارہ نامی سردار مسکرایا تو عیاں ہوا کہ اس نے بھی اپنے سامنے کے دو دانت تڑوائے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

''وہ بہت بدل گیا ہے ابراہیم، مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ پہلے ہمارے ذہن میں اسے مصروف رکھنے کے لئے اس طرح کا آئیڈیا کیوں نہیں آیا؟ صحیح کہتے ہیں کہ مصروفیت میں انسان غلط سوچوں سے بچا رہتا ہے۔ ورنہ تو وہ بیچارہ تو زندگی سے بالکل ہی اکتا گیا تھا۔ جوزف نے ریلنگ سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اچھا چلو، یہ تو بتاؤ کہ تمہارا پلان کہاں تک پہنچا؟'' ابراہیم نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کچھ خاص تو نہیں پتہ، مگر آنند کہہ رہا تھا کہ لاش کے سارے اندرونی اجزاء نکال دیئے گئے ہیں۔ مصالحہ لگانا باقی ہے، یہ کام ہم آج شام سے شروع کریں گے۔ آنند نے بے شمار مصالحہ جات اکٹھے کئے ہوئے ہیں۔ ویسے ابراہیم! اگر ہم یہ ممی بنانے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ایک ریکارڈ ہوگا۔ پوری دنیا میں ایک تہلکہ مچ جائے گا۔ تم جانتے ہو؟ ماڈرن سائنس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود بھی، مردے کو مصالحوں کے ذریعے محفوظ رکھنے کا طریقہ نہیں سمجھ پائی ہے۔ اس ضمن میں تاحال مختلف نظریات گردش کررہے ہیں۔'' باتیں کرتا جوزف اب تسلی سے بیڈ پر لیٹ چکا تھا اور ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر مسلسل پیر ہلائے جارہا تھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ انگریزوں نے کوئی کمپنی بنائی ہے۔ ''سومم'' کے نام سے...... انہوں نے انسانوں اور جانوروں کو بعداز مرگ حنوط کرنے کا دعویٰ کیا ہے بلکہ کچھ برطانوی لوگوں نے تو ابھی سے اپنی اور اپنے پالتو جانوروں کے لئے بکنگ بھی کروالی ہے کہ بعد از مرگ ان کی ممی بنائی جائے۔'' ابراہیم نے گاڑی ''سیور ہوٹل'' کے سامنے روک دی اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا اندر جانے لگا۔ اندر جا کر ہاتھ کے اشارے سے اس نے ویٹر کو مینو کارڈ لانے کا کہا اور خود کرسی کھینچ کر بیٹھ کر تسلی سے بات کرنے لگا۔

''سب بکواس ہے یار! اسی فیصد لوگوں کا خیال

ہے کہ ان کا دعویٰ ہوا میں چھوڑا ہوا تیر ہے، وہ کبھی کسی کو حنوط نہیں کرسکیں گے۔ اور سچ بتاؤں! پر یقین تو میں بھی نہیں ہوں مگر کیا پتہ؟ کہ خداوند نے یہ تہلکہ نما کام ہم دونوں کے ہاتھوں ہی لکھ دیا ہو۔'' جوزف نے بیڈ پر پڑے لیٹے اب کروٹ بدل لی تھی۔

عین اسی لمحے آنند اس کے کمرے میں داخل ہوا اور اشارے سے فون کی بابت معلوم کیا۔ ''ابراہیم......! آنند آگیا ہے، لو اس سے بات کرو۔'' جوزف نے موبائل آنند کی طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو آنند...... کیسے ہو؟'' ابراہیم نے خوش خلقی سے کہا، مگر اس سے پہلے کہ آنند کچھ بولتا، دوسری طرف سے رابطہ منقطع ہوچکا تھا۔ اس کے بعد جانے کتنی ہی دیر ابراہیم اور آنند ایک دوسرے کو ری ڈائل کرتے رہے مگر رابطہ ممکن نہ ہوسکا۔

''بیرون ملک کی کال ہے، اتنی آسانی سے نہیں ملے گی۔'' آنند نے ہار مانتے ہوئے موبائل بیڈ پر پھینک دیا۔

کچھ دیر بعد، ایک بار پھر وہ لاش کے ساتھ کمرے میں موجود تھے۔ فضاء میں عجیب سی مہک رچی ہوئی تھی جو ناقابل برداشت تھی۔

''جوزف! لاش کو اٹھا کر اس میز پر رکھو۔'' آنند ریزسٹ کرتے ہوئے بولا۔ جوزف نے جیسے ہی لاش کو اٹھایا تو اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیونکہ لاش میں تو چھٹانک بھر کا بھی وزن نہیں تھا۔ وہ تو کاغذ کے پتلے کی طرح اس کے بازوؤں پر لٹک گئی تھی۔ جوزف نے اسے ایک ہاتھ سے اٹھایا اور میز پر دھر دیا۔ لاش کسی کپڑے کی طرح میز پر پڑی تھی۔

''یہ بھس اور دوسری اشیاء دیکھ رہے ہو؟ یہ سب اس جسم میں بھر کر اسے انسانی جسم کے جتنا کردیں گے۔ اس کے بعد یہ مصالحہ جات اس کے اوپر لگادیں گے پھر بھگوان سے پرارتھنا کریں گے کہ ہمارا یہ کام مکمل ہو۔'' آنند نے مسکراتے ہوئے آگے کی ساری پلاننگ بتائی۔

''یہ لاش کا منہ ایسا کیوں ہے آنند؟ جیسا اکثر جیری کے پیچھے بھاگتے ہوئے ٹام کو چوٹ لگ کر ہوجاتا ہے۔'' جوزف نے حیرت سے لاش کا بے حد پچکا ہوا منہ دیکھ کر کہا۔

''کیونکہ اس کے سر میں سے تمام دماغی اجزا نکال دیئے گئے ہیں۔ اندرونی اجزا اس لئے نکالے جاتے ہیں کہ یہ گل سڑ کر جسم کو خراب کردیتے ہیں۔'' آنند تفصیل بتاتے ہوئے ہاتھوں پر گلوز چڑھانے لگا۔

ایک تھکا دینے والے دورانیے کے بعد جوزف اور آنند بنچ پر بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ ان کے سامنے مصالحے سے ڈھکی ہوئی لاش پڑی تھی۔ جس کے ہاتھ انہوں نے قدیم فراعنہ کے سے انداز میں سینے پر باندھ رکھے تھے۔

''چادر ڈھک دوں اس کے اوپر؟'' جوزف نے بڑی سی سفید چادر اٹھائی۔ ''پاگل ہوگیا ہے؟'' آنند نے پھرتی سے آگے بڑھ کر جوزف کے ہاتھ سے چادر چھینی۔ ''لاش کا مصالحہ ابھی گیلا ہے، چادر ڈھکنا مناسب نہیں ہے۔ ابھی اسے ہوا لگنی چاہئے۔'' آنند نے لاش کو اس طرح دیکھا ایک ماں اپنے بچے کو ممتا بھری نظروں سے دیکھتی ہے۔

''باہر چلیں یہاں سے؟'' جوزف کے کہنے پر آنند بھی ماسک اور گلوز اتار کر کمرے سے باہر آگیا۔ وہ دونوں اب راہداری سے گزر رہے تھے۔

''تمہیں پتہ ہے آنند؟ وہ لاش بغیر دانتوں کے کتنی خوفناک لگ رہی تھی اور اس کا وہ بھیانک جبڑا......'' جوزف کو واقعتاً بہت خوف آرہا ہے۔

''قدیم زبانوں کو جاننے کے علاوہ کاش تو قدیم رسوم ورواج کو بھی پڑھ لیتا۔ قدیم ترین تہذیب میں تو سامنے کے دو دانت تڑوانا باقاعدہ فیشن تھا۔ وہ لوگ انتہائی خوب صورت سمجھے جاتے تھے۔ جن کے سامنے کے دو دانت سرے سے ہی غائب ہوتے تھے۔ اسی لئے لوگ سامنے کے یہ دو دانت باقاعدہ طور پر تڑواتے تھے۔'' چلتے چلتے آنند نے جونہی جوزف کی طرف دیکھا

تو جوزف تو جانے کہاں غائب تھا؟ اس نے مڑ کر اپنے پیچھے دیکھا تو وہ اس سے دس قدم پیچھے ساکت کھڑا تھا۔
"کیا ہوا؟" آنند حیرت زدہ سا ہو کر اس کے پاس آیا۔
"یہ...... ایسے لوگ تو میرے خواب میں آئے تھے۔ ہاں، اس آدمی اور اس لڑکی کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ لڑکی کسی سے شادی کرنا چاہ رہی تھی مگر وہ آدمی نہیں مانتا تھا۔ میں خوابوں پر یقین نہیں رکھتا آنند! مگر اس حد تک سچائی پر مبنی خواب مجھے آج تک نظر نہیں آئے۔" ہنسنے کھیلنے والا جوزف ایک دم سیریس ہو گیا تھا۔
"اپنے خوابوں کو بھول جایا کرو جوزف۔ دیکھو! ہم آج کل ایک انسانی لاش کو ممی بنانے کا کام کر رہے ہیں۔ ممیوں کا تعلق قدیم مصر سے ہے، فراعنہ کے دور سے ہے، ایسے میں ان سب خوابوں کا آ جانا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ ہمارے خوابوں میں عموماً وہی ہوتا ہے، جس کے متعلق ہم زیادہ تر سوچتے رہتے ہیں۔" آنند، جوزف کے کندھوں پر ہاتھ رکھے اسے سمجھا رہا تھا۔ اسے اپنے ہمیشہ ہنسنے والے دوست کے اچانک سنجیدہ ہو جانے پر ایک دم بہت ترس آیا تھا۔
مصر کی فضاؤں میں رات کچھ زیادہ ہی کالی ناگن کی طرح ناچتی ہے۔ بیابانوں میں وحشت کی راجدھانی قائم ہو جاتی ہے۔ رات کے تاریک اندھیروں میں جنتوں کی اس سرزمین پر جنات واقعی اترنے لگتے ہیں۔
"کاش! کہ ہم یہ ممی بنانے میں سپھل ہو جائیں۔" آنند گویا ہوا۔
"یسوع مسیح کرے، ایسا ہی ہو۔ ارے آنند! ابراہیم سے کتنے دنوں سے ہماری بات نہیں ہو رہی۔ کال لگ کر ہی نہیں دے رہی۔" جوزف ڈائری لکھتا ہوا بولا۔ وہ اپنے روزمرہ کے واقعات، خیالات ڈائری میں اکثر درج کرتا تھا۔
"ہاں! مجھے بھی بہت یاد آ رہا ہے وہ میری کچھ لوگوں سے بات ہوئی ہے۔ ان کی تو پاکستان کال آرام سے لگ رہی ہے، پھر نہ جانے کیوں ہماری کال نہیں ملتی؟ خیر...... میں اپنے کمرے میں سونے جا رہا ہوں، سونے سے پہلے ایک بار پھر ابراہیم کو کال ملاؤں گا، آئی وش! کہ اب کال مل جائے۔" آنند نے کہا اور اپنا مصری قہوے کا پیالہ اٹھا کر اپنے کمرے میں آ گیا۔
روز مرہ کی مصروفیات لکھ کر جوزف نے ڈائری کے اگلے صفحے پر خط کشیدہ الفاظ میں We miss you ibrahim لکھا اور ڈائری دراز میں رکھ کر سو گیا۔
رات کے سناٹے پوری طرح گونجنے شروع ہو گئے تھے۔ لوگ نیند کے جھولوں میں جھول رہے تھے۔ موسم بالکل خشک تھا، ہوا کا نام و نشان تک نہ تھا۔
لاش جس کمرے میں پڑی تھی، وہاں کے شیشے کی کھڑکی میں سے چاند بالکل سامنے پڑتا تھا۔ چاند کی روشنی کچھ دیر تک مصالحہ لگی لاش پر پڑتی رہی اور اس میں منعکس ہوتی رہی۔ پھر چاند بادلوں میں جا چھپا اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ اس ملگجے اندھیرے میں کوئی عکس ہولے ہولے نمایاں ہو رہا تھا۔ وہ کوئی دوشیزہ تھی۔ اس نے انتہائی قدیم طرز کا لباس پہن رکھا تھا اور وہ دائرے کی صورت میں چکراتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے سے دودھیا رنگ کی سبزی مائل روشنی پھوٹ رہی تھی...... فاسفورس نما اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس دوشیزہ کی نظر شیشے کی کھڑکی سے نظر آتی لاش پر پڑی۔ وہ ہولے سے مسکرائی جس سے اس کے سامنے کے دو ٹوٹے ہوئے دانت نمایاں ہو گئے تھے۔ پھر وہ دائرے کی صورت میں چکراتی ہوئی کھڑکی کی جانب بڑھنے لگی۔
کھڑکی میں سے وہ یوں کمرے میں داخل ہو گئی، جیسے اس کے رستے میں کوئی رکاوٹ ہی نہ ہو۔ مصالحہ لگی لاش کے پاس جا کر وہ خوشی سے اچھلی اور اپنا منہ لاش کے منہ کے پاس لے جا کر اسے غور سے دیکھنے لگی۔ پھر ماتھے میں بل لا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

اس کی بھنویں سرے سے ہی غائب تھیں۔ بس ایک گنجا سا انگا ہی تھا، جس پر اس نے بہت سارے بل ڈالے ہوئے تھے۔ اس کے بعد کمرے میں اندھیرا سا چھا گیا اور لڑکی کے جسم سے پھوٹتی سبزی مائل دودھیا روشنی بھی غائب ہو گئی۔
کچھ دیر بعد مصالحہ لگی لاش میں حرکت سی پیدا ہوئی۔ اس نے اپنے سینے پر باندھے ہوئے ہاتھ کھول کر بستر پر ہموار رکھ دیئے۔ ہولے ہولے پوری لاش میں لرزش سی ہونے لگی۔ اور وہ اپنی ٹانگیں میز سے نیچے اتار کر اکڑی ہوئی حالت میں بیٹھ گئی۔ چرمرکی سی کچھ آوازیں آئیں اور لاش کھڑی ہو کر فرش پر چلنا شروع ہو گئی۔ اس کا رخ کمرے سے باہر نکل کر آنند اور جوزف کے کمروں کی جانب تھا۔
گیلے مصالحے سے لبریز قدموں کے بھاری نشانات فرش پر دور تک بنتے جا رہے تھے۔ لاش پر لگے مصالحے میں سے ہلکی سی مائل روشنی پھوٹ رہی تھی۔ سوئے ہوئے آنند کا کمبل کسی نے کھینچ ڈالا۔ اس نے جو کمبل دوبارہ لینے کی کوشش کی تو اس کا ہاتھ کسی اکڑے ہوئے نرم ہاتھ کی گرفت میں آ چکا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو ایک دلخراش چیخ اس کے منہ سے بلند ہوئی اور وہ ہاتھ اس سے چھڑا کر اچھل کر بیڈ کے دوسری طرف آ کھڑا ہوا۔ لاش کے مصالحہ لگے جبڑوں سے ہالوں سی آوازیں نکل رہی تھیں اور وہ خرخراتے ہوئے آنند کی طرف بڑھنے لگی۔ آنند نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً ہی دیوار پر لگا ہنگامی الارم بجا دیا تھا۔ ان کے گھر کی بیرونی دیواریں وائس پروف تھیں۔ لہٰذا صرف ہنگامی الارم سے جوزف ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ کچھ دیر تک وہ بیٹھا سوچتا رہا، پھر جلدی سے بیڈ سے اتر کر بھاگتا ہوا سیدھا آنند کے کمرے کی طرف آیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور لائٹ بھی جل رہی تھی۔
"آنند! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟" جوزف نے جونہی کمرے میں قدم رکھتے ہی پوچھا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں حیرانی سے پھٹنے لگیں اسے پورا کمرہ ایک دم گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔
سامنے بیڈ پر آنند کی ادھڑی ہوئی لاش پڑی تھی۔ بیڈ کے سائیڈ ٹیبل اس کے جسم سے نکالے جانے والے اندرونی اجزا سے بھرے ہوئے تھے۔ اور وہ حنوط شدہ لاش، اپنے جسم سے مصالحہ اتار کر آنند کی بے جان کھال پر لگا رہی تھی۔
جوزف کے آنند کو پکارنے پر لاش نے جونہی مڑ کر جوزف کو دیکھا تو اس کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اور وہ الٹے قدموں بے تحاشا بھاگا۔ آنند کی لاش کو چھوڑ کر لاش کے گیلے مصالحہ لگے پاؤں جوزف کی طرف بڑھنے لگے۔ جوزف بھاگتا ہوا اندھا دھند سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کا رخ گھر کے مین گیٹ کی جانب تھا۔

☆......☆......☆

رہے نہ رہے
یہ جیون بھی
بنی رہے یہ دوستی
ہے تیری قسم!
او یارا میرے
جدا ہم نہ ہوں گے کبھی

ابراہیم نے تنگ آ کر موبائل میز پر پٹخا تو ایک دم اس کا دھیان ٹی وی کی طرف گیا۔ جہاں فل والیوم میں جواد احمد کا گانا "دوستی" چل رہا تھا۔ آج مسلسل دسواں دن تھا۔ آنند اور جوزف سے کوئی رابطہ ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ حالانکہ اس نے مصر میں دوسری جگہوں پر فون کیا تھا تو وہاں باآسانی رابطہ ہو گیا تھا۔ پھر آخر ایسا کیا تھا؟ کہ جوزف اور آنند سے رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا دل کسی انجانے خطرے کے پیش نظر دھڑک اٹھا تھا۔ اس کا دل آفس جانے کو بھی نہیں کر رہا تھا۔ اسے نئی نئی جاب ملی تھی۔ وہ چھٹی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا آفس فائل نکالنے کے لئے اس نے دراز کھولا تو اس کی نظر فائل کے ساتھ رکھے فوٹو فریم پر پڑی۔ جو ملازمہ نے غالباً صفائی کے دوران دراز کے

اندر رکھ دیا تھا۔ فائل کو چھوڑ کر اس نے فوٹو فریم نکالا اور وہ وہیں بیٹھ کر دیکھنے لگا۔

یہ جوزف، آنند اور ابراہیم کی تصویر تھی۔ جس میں وہ تینوں درخت کی شاخوں پر چڑھے اچھل کود میں مصروف تھے۔

"جو دوست بات کئے بغیر ایک گھنٹہ مشکل سے گزارتے تھے۔ انہوں نے بغیر رابطے کے دس دن کس طرح گزار لئے تھے؟ جانے وہ کس حال میں ہوں گے؟" تصویر ہاتھ میں پکڑے، اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ پس منظر میں جواد احمد کا گانا ابھی بھی گونج رہا تھا۔

او میرے یار!
تو میرا پیار
سدا رہے تو سلامت
تیری میری
یہ دوستی!
یونہی رہے تاقیامت

آنکھوں سے اتر کر گالوں پر بہتی نمی کو اس نے ہاتھوں سے پونچھا اور اگلے ہی لمحہ اس کے دماغ میں مصر جانے کے لئے ویزے کا خیال آگیا۔

☆......☆......☆

"تھینک گاڈ! آپ کو ہوش آگیا۔ ورنہ آپ کے جسم اور چہرے پر موجود اتنی بڑی اور گہری خراشیں ڈال کر، ان میں سے گوشت نکال لیا گیا تھا۔ بہرحال ان خراشوں کی فلنگ ہم نے کردی ہے۔ سفید لباس میں ملبوس وہ کوئی نرس ہی تھی جو دوائیوں کی ٹرے اٹھا کر جارہی تھی۔ "ویسے......" نرس کچھ یاد آجانے پر ایک بار پھر مڑی۔ "آپ کو اتنی خوفناک اور گہری خراشیں ڈالی کس نے تھیں؟"

نرس کے سوال کرنے پر جوزف کے دماغ پر ماضی کی فلم ایک بار پھر چلنے لگی تھی۔ اور اس کا رنگ ایک دم سے پیلا پڑ گیا تھا۔ نرس نے جوزف کو خاموش دیکھ کر لاعلمی سے کندھے اچکائے اور ٹرے اٹھا کر ٹک ٹک کرتی باہر نکل گئی۔

گردن موڑ کر جوزف نے دیوار پر لگا کیلنڈر دیکھا۔ وہ صرف دو دن بے ہوش رہا تھا۔ اور یوں لگ رہا تھا کہ وہ صدیوں بعد کومے سے باہر آیا ہو۔ اس نے بیڈ کے ساتھ اٹیچ بیل بجائی تو ایک خاکروب جھاڑو اٹھائے اندر داخل ہوا۔

"مجھے ایک کال کرنی ہے۔" جوزف اب نیم دراز سا ہو کر بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے صاحب! میں بڑے ڈاکٹر سے پوچھ کر آپ کو موبائل لا کر دیتا ہوں۔" خاکروب نے کہا اور کوئی عربی گانا گنگناتے ہوئے روم سے باہر نکل گیا۔

"سب کچھ بھول جاؤ جوزف، میں آگیا ہوں ناں......اب تم اکیلے نہیں ہو۔" ابراہیم اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے تسلی دیئے جارہا تھا۔

"اس نے آنند کو مار ڈالا ہے ابراہیم، وہ مجھے بھی مار ڈالے گی۔ اس نے کتنے خونخوار انداز میں میرا گوشت نوچا تھا اوہ گاڈ!" اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "دیکھو جوزف! تمہیں ہاسپٹل سے گھر میں اس لئے لایا ہوں کہ تم سب کچھ بھول جاؤ۔"

اگر یونہی پچھلے واقعات یاد کرتے رہے تو کیسے ٹھیک ہو گے؟" ابراہیم نے اس کے کالر پر لگی ڈسٹ جھاڑتے ہوئے کہا۔

"میں یہ سب اتنی آسانی سے نہیں بھول سکتا ابراہیم۔" جوزف کی آواز رندھ گئی۔

"اچھا چل! یہ فش پیزا کھا، خاص طور پر تیرے لئے آرڈر کر کے منگوایا ہے۔" ابراہیم نے اخبار میں لپٹا گرم گرم پیزا جوزف کی جانب بڑھایا اور خود بھی فش پیزے سے انجوائے کرنے لگا مگر یہ انجوائے ایک دم بھک سے اڑ گیا۔ جب اس کی نظر جوزف پر پڑی۔ اخبار میں لپٹا پیزا اس کے ہاتھ سے نیچے گر چکا تھا اور وہ لرزتے ہوئے، حیرت زدہ نظروں سے نیچے گھورے جارہا تھا۔

"وہ...... وہ...... تعویذ......" نیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جوزف، پاگلوں کی سی کیفیت میں، بیڈ کے ایک کونے میں سمٹ سا گیا تھا۔

اشارے کی سمت میں، ابراہیم نے اخبار میں لپٹا فش پیزا اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ مگر اسے کچھ خاص نظر نہ آیا۔ سوائے اخبار میں چھپے ایک اشتہار برائے گمشدہ کے۔

اس پر ایک نوجوان لڑکے کی بڑی سی تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ابراہیم نے نوٹ کیا۔ جوزف اسی تصویر کو دیکھ کر گھبرا رہا تھا۔

"یہ...... یہ تصویر اسی لڑکے کی ہے۔ جس کی لاش ہمیں قبرستان کے کھنڈرے سے ملی تھی اور جسے ہم نے حنوط کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی لاش نے آنند کو مارا ہے۔" جوزف اب سسکنے لگا تھا۔ ان واقعات نے اس کے ذہن پر خاصے گہرے اثرات مرتب کئے تھے۔

"یہ تو پاگل خانے سے فرار شدہ کوئی پاگل ہے۔ یہ اشتہار بھی پاگل خانے والوں کی طرف سے ہے۔ ہوسکتا ہے یہ اس رات پاگل خانے سے فرار ہو کر آرہا تھا، جس رات یہ تم دونوں کو ملا تھا۔" ابراہیم نے معاملے کی تہہ تک پہنچ کر کہا۔

"تو کیا وہ ہم سے بدلہ لے رہا ہے؟ کہ ہم نے اس کی لاش کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟" جوزف اب کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔

"نہیں جوزف! مجھے نہیں لگتا کہ کوئی روح دنیا میں اس طرح سے واپس آسکتی ہے۔ مجھے تو یہ کوئی اور چکر لگتا ہے۔" ابراہیم تشویش زدہ ہو کر بولا۔

"تو پھر......؟" جوزف متوحش ہوا

"ایم اے فلولوجی کر رکھا ہے تم نے، اتنا تو تم جانتے ہو گے کہ مصر کو پراسراریت کی ماں کہا جاتا ہے۔ یہاں بنے اہرام کا احاطہ آج تک جدید جیومیٹری کی سمجھ میں نہیں آسکا ہے۔ زیادہ تر گمان تو یوں کیا جاتا ہے کہ ان اہراموں کی تعمیر میں کسی ہوائی مخلوق کا ہاتھ ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مصالحہ لگی لاش پر بھی کسی ایسی ہی ہوائی مخلوق کی نظر پڑ گئی ہو گی اور وہ اس کے ماتحت ہو گئی ہو گی۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ ان سب سے کیسے چھٹکارا پایا جائے؟" ابراہیم نے جیسے ہی کچھ سوچتے ہوئے جوزف کی طرف دیکھا تو بے اختیار مسکرا اٹھا کیونکہ جوزف تو کب کا نیند کی چادر تان کر سو چکا تھا۔

شام کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دوپہر میں خوب بارش ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے ہری گھاس ابھی تک گیلی تھی۔ ڈرائیووے کا فرش بھی پانی کی تہہ سے شیشے کی مانند چمک رہا تھا۔ ہر طرف ایک اجلا پن نمایاں تھا۔ آج جوزف کی سالگرہ تھی۔ "کیوں ناں جوزف کے لئے کچھ خاص اہتمام کیا جائے؟" ابراہیم کے من میں اچانک سے خیال اٹھا۔ کچن میں جا کر اس نے ایپرن باندھ کر روایتی شیف کے سے انداز میں شروع ہو گیا۔ سب کام وہ انتہائی احتیاط سے کر رہا تھا کیونکہ وہ جوزف کو اس کی سالگرہ کا سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ایک چولہے پر اس نے تیل گرم ہونے کے لئے رکھ دیا اور دوسرے چولہے پر توا چکنا کر کے کباب تلنے شروع کر دیئے۔ پھینٹے ہوئے انڈے میں لتھڑے کباب وہ گرم توے پر ایک ایک کر کے رکھتا گیا۔

چولہے پر گرم ہونے والے تیل کی سطح پر اب بلبلے سے بننے لگے تھے۔ بہت ننھے تقریباً نادیدہ سے بلبلے......اس کے بعد اس نے فریج میں سے جمے ہوئے کچے رولز کی ٹرے اٹھائی اور انہیں تیل میں ڈال کر ڈیپ فرائی کرنے لگا۔ شڑ شڑ کی آوازیں کچن میں بلند ہونے لگی تھیں اور ان گنت بلبلے سفید رول سے علیحدہ ہونے لگے۔ کیبنٹ کھول کر ککیز کا جار نکالا اور انہیں پلیٹ میں رکھا۔ آج وہ اپنے دوست کے لئے برتھ ڈے پارٹی کا اہتمام خود اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتا تھا۔ جوزف آنکھیں موندے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ اسے اپنے اردگرد تیز مصالحہ جات کی مہک محسوس ہوئی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں مگر کمرے میں اس کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ مصالحہ جات کی یہ بو اسے کچھ آشنا سی لگی۔ ابراہیم کی باتوں سے وہ کافی بلند ہمت ہو گیا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لئے کمپیوٹر آن کر لیا

اور گوگل کی ویب سائٹ پر ''دی بیسٹ چرچ ان انگلینڈ'' ٹائپ کر کے بھیج دیا مگر یہ کیا......؟ مانیٹر اسکرین پر تو حنوط شدہ ممیوں کی ویڈیو لسٹ کھل آئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ ''کی بورڈ'' پر اس نے دی بیسٹ چرچ ان انگلینڈ کے الفاظ ٹائپ کئے تھے، پھر یہ کیسے؟ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہوگیا۔

آج وہ نہادھو کر، نیا جوڑا پہن کر چرچ آئی تھی۔ تیز خوشبو کا چھڑکاؤ اس نے اپنے چاروں طرف کر رکھا تھا۔ جوزف نے آج صبح اسے فون پر بتایا تھا کہ وہ شام کو کیک کاٹتے ہوئے اسے ضرور کال کرے گا۔ اور وہ شام تک کا وقت یہیں چرچ میں، اس کے لئے بے پناہ دعائیں کرتے ہوئے گزارنا چاہتی تھی۔ یسوع مسیح کے بڑے سے مجسمے کے چرنوں میں، جوزف کی خیر کی چاہ میں جلایا جانے والا دیا ٹمٹما رہا تھا۔

جوزف ابھی انہی حیرتوں میں کھویا ہوا تھا کہ اسے مانیٹر اسکرین میں سے کوئی محلول نیچے بہتا ہوا دکھائی دیا۔ محلول اسکرین سے بہہ کر، میز پر سے ہوتا ہوا نیچے فرش پر بہہ رہا تھا۔ تیزی سے بہتے ہوئے اس بے رنگ محلول کا رخ جوزف کے بیڈ کی جانب تھا اور وہ بیڈ کے نیچے جا کر اکٹھا ہو رہا تھا۔ جوزف چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا اور محلول کی سمت میں چلتا ہوا بیڈ کے پاس جا رکا۔ یہ محلول آیا کہاں سے تھا؟ اور اتنی تیزی سے بیڈ کے نیچے کیوں جا رہا تھا؟ انہی سوالوں کا جواب ڈھونڈنے کے لئے جوزف نے گھٹنوں کے بل جھک کر بیڈ کے نیچے جھانکا تو اس کی گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔

بیڈ کے نیچے وہی مصالحہ لگی لاش قدیم فراعنہ کی ممیوں کے سے انداز میں، سینے پر ہاتھ باندھے لیٹی ہوئی تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور بھاگنے کیلئے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ اس کا پاؤں کسی چیز نے جکڑ لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو خوف سے اس کی سانس رکنے لگی۔ بیڈ کے نیچے سے مصالحہ لگی لاش کا کا ہاتھ باہر نکلا ہوا تھا۔ جس نے مضبوطی سے اس کی ٹانگ کو جکڑ رکھا تھا۔

جوزف نے آگے بڑھ کر ٹیبل لیمپ اٹھایا اور پوری قوت سے بیڈ سے باہر نکلے ہوئے ہاتھ پر دے مارا۔ لیمپ کے نقش ونگار میں لوہے کا استعمال کیا گیا تھا۔

لیمپ لگتے ہی لاش کے منہ سے کراہ سی نکلی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ لاش سے پیر چھڑاتے ہی وہ اندھا دھند باہر کی جانب بھاگا اور سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف اترنے لگا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ ابراہیم اسے سیڑھیوں کے اختتام پر ہی مل گیا تھا۔

''اب......ابراہیم! وہ لاش پھر آگئی ہے۔''

ابراہیم کی صورت میں اسے جیسے حفاظت کا مسکن مل گیا تھا۔ سیڑھیوں سے اترتے ہی وہ سیدھا ابراہیم سے جا کر لپٹ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

''میں...... میں کہتا تھا ناں...... آنند کے بعد وہ مجھے مارے گی......'' ٹوٹے پھوٹے فقروں میں کہتا جوزف ایک دم چپ ہوگیا۔ اسے اپنے پورے جسم پر نمی کا سا احساس ہوا تھا۔ حیران ہو کر وہ ابراہیم سے الگ ہوا تو اس کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ سامنے ابراہیم کے بجائے وہی حنوط زدہ مصالحہ لگی لاش کھڑی تھی۔ وہ کسی روبوٹ کی مانند پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اور حنوط زدہ ممی، اس کی طرف اپنا رخ کئے آگے ہی آگے بڑھتے جا رہی تھی۔

ادھر دور...... کوسوں دور...... پاکستان کے شہر سرگودھا کے چرچ میں مناجات، میں جوزف کی منگیتر مصروف تھی۔ اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ یسوع مسیح کے قدموں میں رکھا جوزف کی خیر کے لئے ٹمٹماتا دیا، اچانک ہی بجھ گیا۔ روزی، اپنی پھٹی آنکھوں سے دیئے کو دیکھتی رہ گئی۔ اس کی دعاؤں کے لئے اٹھائے گئے ہاتھ، اب بے جان ہو کر نیچے گر چکے تھے۔

☆......☆......☆

''سالگرہ مبارک ہو جوزف!'' روشن کینڈلز سے سجا کیک لے کر ابراہیم جوزف کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں جوزف کو نہ پا کر وہ یونہی کیک ہاتھ میں لئے باہر آ کر اسے آوازیں دینے لگا۔ اسی اثناء میں اس کی نظر نیچے پڑی جہاں ایک تازہ بنی ہوئی ممی، جوزف کی لاش کو ادھیڑنے میں مصروف تھی۔

ابراہیم ایک دم بوکھلا کر پیچھے ہٹا تو اس کا پیر سلپ ہوگیا اور وہ کیک سمیت اوندھے منہ لڑھکتا ہوا سیڑھیوں پر سے نیچے آنے لگا۔ کینڈلز، کیک اور ابراہیم، تینوں ہی مخالف سمتوں میں لڑھکتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے آ رہے تھے۔

ابراہیم عین ممی کے قدموں میں آ گرا۔ جوزف کی لاش کو چھوڑ کر ممی کا دھیان ابراہیم کی طرف ہوا تو وہ ایک دم سنبھل کر کھڑا ہوگیا۔ خوفناک ممی بھی اس کے ساتھ ہی کھڑی ہوگئی تھی۔

''بہت منع کیا تھا ہم نے اس نوجوان کو...... اس کے خوابوں میں آ کر اسے ہمارے ہونے کا یقین دلانا چاہا تھا...... پر یہ نہیں سمجھ پایا...... اس سے پہلے والے نوجوان نے اپنے مہان پاپ کی سزا بھگت لی...... اور اس نوجوان کا (ممی نے جوزف کی بے جان لاش کی طرف اشارہ کیا) پاپ کم تھا...... یہ صرف اس کا ساتھ دے رہا تھا...... ہماری بات نہیں سمجھ پایا یہ...... حنوط کرنے پر صرف ہمارا حق ہے...... یہ صرف ہمارا فن ہے...... اسے تم، اور تمہارے بعد آنے والی اگلی نسلیں حاصل نہیں کر سکتیں۔''

خوفناک انداز میں للکارتے ہوئے ممی اب ابراہیم کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابراہیم ہٹتے ہٹتے پیچھے دیوار سے جا لگا تھا۔ اس کے فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ اور وہ جال میں پھنسے کبوتر کی طرح چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

معاً اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے ''یا سلامُ'' کا ورد شروع کر دیا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ ہر مشکل، مصیبت کی گھڑی میں ''یا سلامُ'' کا ورد کرنے سے مشکل رفو چکر ہو جاتی ہے۔''

ممی کی دھاڑنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں تو ابراہیم نے با آواز بلند کہنا شروع کر دیا۔

''یا سلامُ......یا سلامُ''

''اے ہمیشہ سلامت رہنے والے رب! مجھے سلامتی عطا فرما۔''

وہ چیخ کر ایک ہی ورد بار بار کیے جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے اپنے گرد خاموشی سی محسوس ہوئی تو آنکھیں کھول کر اس نے دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ سوائے جوزف کی کٹی پھٹی لاش کے۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

''جس ذات باری تعالیٰ کے صرف نام میں اتنی برکت ہے۔ اس ذات کو پا لینے والے لوگ تو واقعی دنیا جیت لیتے ہوں گے اور بے شک! اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل کرنے سے اللہ تعالیٰ انسان کا تحفظ کرتا ہے اور تمام دکھ مصیبتوں سے نجات دیتا ہے۔''

ہر دن اپنے ساتھ نئی ہوا لاتا رہا اور سوسن کے رنگدار پھول باسی ہوتے گئے۔

ہرے پتے مرجھا کر پیلے اور بھورے ہوتے گئے۔ آنند کے گھر میں لگے پھولوں کی ٹہنیاں سخت ہو کر اکڑ گئی تھیں۔ پرندے، انسانوں سے عاری اس گھر کا رستہ بھول چکے تھے۔

جوزف اور آنند کی یادگار چیزیں جمع کرتے ہوئے ابراہیم کے ہاتھ جوزف کی ڈائری لگی تو وہ اسے وہیں کھول کر پڑھنے بیٹھ گیا۔ ابھی نصف ڈائری ہی پڑھ پایا تھا کہ شوق اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اٹھا اور سیدھا جا کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کا رخ اہرام مصر کی جانب تھا۔

''یہ سب سے پرانا اہرام ہے سر! یہ ''خوفو'' کہلاتا ہے۔ اس کی تعمیر 2570 قبل مسیح میں مکمل ہوئی تھی۔'' گائیڈ ابراہیم کو تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہا تھا۔

''اور سر! یہ دوسرا اہرام ''خافرئ'' ہے۔ اس کی لمبائی 136 میٹر ہے۔'' گائیڈ کی معلومات قابل تحسین تھیں۔ کچھ دور اور آگے گئے تو گائیڈ، قدرے پست قامت اہرام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''اینڈ دس اہرام از کالڈ ''منقارہ'' اس کی لمبائی 62 میٹر ہے۔ اس کو ڈھانے کی کئی بار کوشش کی گئی ہے۔ مگر یہ اہرام ہر بار ضربوں کو سہہ جاتا ہے۔'' گائیڈ اب

خود بھی منقارہ نامی اہرام کو دیکھ رہا تھا۔

"شاہ مصر! آپ کی مرگ کے لئے بنے مقبرے کی پختگی کو پرکھنے کے لئے اس پر تمام طرح کی ضربات لگائی ہیں۔ طرح طرح کے وار کئے ہیں۔ وہ سب کو سہہ گیا ہے۔ مرگ کے بعد آپ کے دشمن آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔" ڈائری میں لکھی گئی جوزف کی ایک اور سرگوشی ابراہیم کے دماغ میں گونجی۔ وہ کون سی دنیا تھی؟ جو، جوزف کے خوابوں میں آباد تھی۔ کیا اس دنیا کا ہماری اس موجودہ دنیا سے کوئی تعلق، کوئی رابطہ ہے؟" ابراہیم بے چین سا نظر آ رہا تھا۔

"رائل ممی ہاؤس چلیں گے سر؟" گائیڈ نے استفسار کیا۔

"ہوں...... آں......" ابراہیم جیسے چونک سا گیا۔ پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

عجائب خانے میں سب سے پہلے "طوطن خامن" کا مجسمہ تھا۔ جو دونوں ہاتھوں کو سینے پر باندھے کھڑا تھا۔ یہاں داخل ہوتے ہی گائیڈ نے ایک بار پھر بولنا شروع کر دیا۔

رائل ممی ہاؤس میں فراعین مصر، ان کی اولادیں اور کچھ دیگر کی ممیاں ہیں۔ یہاں کا درجہ حرارت 22 ڈگری سینٹی گریڈ پر رکھا جاتا ہے۔ شیشے کے تابوتوں میں رکھی گئی ممیاں نشان عبرت ہیں۔ بعض اس قدر خوفناک ہیں کہ ایک بار ان کو دیکھ لینے کے بعد دوبارہ دیکھنا مشکل ہے۔ یہ دیکھیں سر! (گائیڈ نے تابوت میں رکھی ایک ممی کی طرف اشارہ کیا) ان کے تابوتوں پر تحریروں سے صاف عیاں ہے کہ کچھ فراعین ہڈیوں اور دانتوں کی بیماریوں میں مبتلا تھے کیونکہ ان ممیوں میں دانتوں کی بیماریاں اور ہڈیوں کی کمزوریاں صاف عیاں ہیں۔" گائیڈ آگے بھی کچھ بول رہا تھا مگر ابراہیم ایک بار پھر، ڈائری پر جوزف کے رقم شدہ الفاظ میں کھو گیا تھا۔

"کاش! یہ دانت کا درد کوئی انسان بن کر ہمارے سامنے کھڑا ہوتا، ہم اسے ایک پل میں تہہ و تیغ کر کے رکھ دیتے مگر اب...... ہم مجبور ہیں۔ تم جانتی ہو! ہمارے چاروں طرف سبھی کے دانت خراب ہو رہے ہیں۔ دانتوں اور ہڈیوں کی بیماریاں پھیل رہی ہیں۔"

کیا وہ واقعی فراعین مصر تھے؟ جو، جوزف کے خواب میں آتے تھے۔ کیا وہ واقعی جوزف کو "ممی" بنانے سے واردن کرنا چاہتے تھے؟" ابراہیم کا دماغ پھٹنے کو ہو گیا تھا۔ وہ گائیڈ رکو وہیں چھوڑ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ممی ہاؤس سے باہر نکل آیا۔ جہاں اس کی پجارو کھڑی تھی۔

پاکستان واپسی کا ویزہ اس کے والٹ میں پہلے سے ہی موجود تھا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر جوزف کی ڈائری ادھ کھلی پڑی تھی۔

اس نے باقی رہ جانے والے دو چار صفحات پڑھنے کی غرض سے ڈائری اٹھائی تو ایک صفحے پر خط کشیدہ حروف میں We miss you ibrahim لکھا ہوا تھا۔ جانے یہ الفاظ جوزف نے کن لمحات میں لکھے ہونگے؟ ابراہیم کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر کے ڈائری میں گرنے لگے تھے۔ اس نے ڈائری بند کرنا ہی چاہی تھی کہ اگلے صفحے پر اسے کچھ انجانا سا احساس ہوا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر صفحہ پلٹا تو وہاں نہایت بڑے بڑے حروف میں درج تھا۔

"اور وہ کبھی حنوط نہیں کر سکے۔"

یہ ہینڈ رائٹنگ جوزف کی تو نہیں تھی...... نہ ہی آنند کی...... وہ خود تو یہ نہیں لکھ سکتا تھا...... اور ان تینوں کے علاوہ کسی چوتھے بندے کو اس معاملے کی بھنک تک نہ تھی...... تو پھر یہ کس کا پیغام تھا؟...... شاید...... فراعین مصر کا......

ابراہیم نے کانپ کر ایک جھرجھری سی لی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

شام کے بڑھتے اندھیروں کے ساتھ اہرام مصر، اپنی تمام تر ہولناکیوں سمیت اسے الوداع کہہ رہے تھے۔

خواب

احسان سحر۔میانوالی

دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سیاہ بادل چھاگئے پھر اچانک پلک جھپکتے ہی سفید بادل کا ایک مرغولہ آیا اور پھر تو دونوں رنگ کے بادل جیسے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے اور پھر ایک خونی معرکہ......

دل و دماغ کو فرحت بخشتی اپنی نوعیت کی انوکھی اور پر تاثیر کہانی جو اکثر یاد آئے گی

مصر میں جب سورج نکلتا ہے تو اہرام کے در و دیوار ایسے چمکنے لگتے ہیں جیسے سونے کے بنے ہوں۔ صحرا کا طوفانی جھکڑ جو ہر چیز کو اڑا لے جاتا ہے لیکن اس کے آگے آ کر دم توڑ دیتا ہے۔ مصر کے سورج کی چمک اور حدت ان سے ٹکرا ٹکرا کر ہمت ہار جاتی ہے لیکن اہرام کی سربلندی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مصر کے شہر تھبس کے لوگوں کی مجسمہ سازی اور نقاشی کے چرچے پورے مصر میں پھیلے ہوتے ہیں ان کی نشانیاں تھبس میں جا بجا بکھری ہوئی ہیں۔ فراعنہ کے مجسمے دیوتاؤں کے باپ آمون راع کے سنگی مجسمے بلی کے روپ میں رہنے والی دیوی ایلورس کے مجسمے ایک باکمال شاہکار ہیں۔ شہر تھبس کے بلند و بالا فصیل کے اندر آباد ہے۔ فصیل پر زمانہ حکومت فرعون کے سپاہی ہر وقت تیار رہتے ہیں ان کا کام شہر کی حفاظت اور بیرونی حملہ آوروں کو روکنا

ہے۔ شہر کے لوگ اپنی مصروفیات میں مگن تھے بازار سجے ہوئے تھے اور خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ معبدوں کے چبوترے پر آگ کے کڑاہے روشن تھے اور حکومت وقت فرعون کا بیٹا رعمسس محل کی بالکونی میں کھڑا سورج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ''رات کو مجھے سوتے میں پھر وہی خواب نظر آنے لگا جس سے میں نے ہمیشہ چھٹکارا پانے کی کوشش کی ہے۔ میرے باپ فرعون نے پورے مصر میں سے کاہنوں، طبیبوں اور جادوگروں کو بلوا کر میرا علاج کروایا لیکن وہ کچھ نہ کر سکے۔''

شاید یہ میرے ماضی کی یادیں ہی تھیں جو میرے ذہن سے محو ہوگئی تھیں مگر کچھ دھندلے سے چہرے میرے شعور اور لاشعور میں آنکھ مچولی کھیلتے رہتے لیکن میں کبھی بھی انہیں واضح شکل نہ دے سکا اور پھر کبھی بھی میں نے اپنے ماضی کو کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

فرعون کے بیٹے کو اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچنے میں کیا دلچسپی ہوسکتی ہے جس کے آگے پورا مصر سر جھکاتا ہو اور حسین عورتیں جس پر اپنی زلفوں کا سایہ کرنے میں ہمہ وقت تیار رہتی ہوں بس جو چیز مجھے اپنے ماضی کی طرف کھینچتی تھی وہ تھے میرے عجیب و غریب خواب جو مجھے بڑے عجیب خواب نظر آتے تھے، میں خواب میں ہمیشہ خود کو ایک چھوٹے سے لڑکے کے روپ میں دیکھتا کبھی خود کو تپتے ہوئے صحرا میں کھڑے روتا ہوا پاتا اور کبھی وہ بڑائی کے دیوتا انوبیس کے مجسمے کے سائے میں سہمے میں کھڑا ہوتا، کبھی بڑے بڑے خوفناک ہاتھ میری طرف بڑھتے اور کبھی خود کو عظیم دریائے نیل کے کنارے کھڑا ہوا پاتا، عجیب بے ربط اور بے تکے سے واقعات ہوتے، ان سب میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ تھا ایک شہر جس کے مغرب میں وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا اور جنوب میں نیل کا تیز دھارا بہتا تھا۔

ریت کے پہاڑوں میں گھر، مکانات اور فرعون کا محل یہ بالکل ویسا ہی نقشہ تھا جیسا شہر تھبس تھا انہی خوابوں کی وجہ سے میں اپنے ماضی کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا اور حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ مجھے اپنے ماضی اور اپنے شہر کے متعلق کچھ بھی یاد نہیں تھا نہ ہی میرے باپ فرعون نے مجھے بتایا اور نہ ہی کسی اور شخص نے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بری خبر اور تلخ بات بتانے والے کا کتنا بھیانک انجام ہوسکتا ہے۔ انہیں زندہ دفن کیا جاسکتا ہے اور ان پر آدم خور کیڑے مکوڑے چھوڑے جاسکتے ہیں شاید اسی ڈر کی وجہ سے ہر کوئی خاموش تھا لیکن میرا باپ فرعون مجھے بتانے سے کیونکر گریز کر رہا تھا؟؟

بہت عرصہ گزر گیا میں نے کوئی خواب نہیں دیکھا لیکن ایک رات اچانک میں چیخ مار کر اٹھ بیٹھا اور باوجود کوشش کے میں اپنے آنسو ضبط نہ کر سکا اور محل کی اس خوب صورت خوابگاہ میں اس وقت میرے علاوہ کوئی بھی نہیں تھا اچانک مجھے اپنی گردن اور بازوؤں پر کسی کا لمس محسوس ہوا وہ میرا باپ فرعون تھا جو محبت سے مجھے اپنے گلے لگا رہا تھا۔ میں نے اپنا سر ان کے کندھے پر رکھ دیا اور زار و قطار رونے لگا۔ وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہو کر رہ گئے تھے اور پھر خود ہی بڑبڑانے لگے۔ ''آخر کب تک میرے بیٹے کے سینے پر بوجھ رہے گا۔ اور یہ یونہی پل پل مرتا رہے گا۔''

اچانک میرے باپ نے کاہن رمہوتا کو آواز دی ان کی آواز میں اتنا رعب تھا کہ پورا محل لرز اٹھا پہرے دار تلواریں سنبھالے بھاگے چلے آرہے تھے اور محل بھر کے کاہن فرعون کے قدموں میں بیٹھ گئے، ان سب سے آگے ایک کاہن رمہوتا تھا وہ بولا تو اس کی آواز میں نہایت ہی احترام تھا۔

''زمانہ حکومت فرعون کے بیٹے رعمسس کی دیوتا ابوالہول حفاظت کرے اور روشنی کا دیوتا ہورلیس کل کے فرعون رعمسس کی زندگی منور کردے۔''

یہ دعا مصر کی عظیم دعا تھی۔ میرے آقا آپ کا غلام خدمت کے لئے حاضر ہے اور کاہن جانتا تھا کہ اس کی ذرہ سی لاپرواہی اور الفاظ کی معمولی سی بھی لرزش اسے کہاں سے کہاں پہنچا سکتی تھی۔ اس لئے وہ نہایت محتاط انداز میں بول رہا تھا۔ میرے باپ نے میرے گرد اپنی بانہوں کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہا۔ ''آج میں

بیٹے کو حقیقت بتانے جا رہا ہوں کہ ماضی میں اس کے ساتھ کیا واقعات پیش آچکے ہیں، بھاڑ میں جائیں طبیب اور ان کا علاج۔''

اور پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''بیٹا میں تمہاری شخصیت کو مسخ نہیں ہونے دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ اور مصر کے تمام کاہنوں نے بڑی مشکل سے تمہارے دل سے خوف نکالا ان کا کہنا تھا کہ تمہیں کبھی بھی کچھ نہ بتایا جائے مگر لاعلمی سے بڑا علاج آگاہی ہے آج میں تمہیں سب کچھ بتا دیتا ہوں۔'' پھر وہ ہولے ہولے بولتے رہے۔ اور میں کسی بچے کی مانند اپنے ماضی کی کہانی سنتا رہا۔

اندھیرے سمٹنا شروع ہوگئے تھے سورج ابھی نکلا نہیں تھا مگر اس کی کرنوں نے اندھیرے کی دبیز چادر میں سے جھانکنا شروع کر دیا تھا اور ریت کے ذرے سونے کی طرح چمک رہے تھے یوں لگا جیسے پورا مصر سونے کا بنا ہوا ہو۔ اور اس وقت پورا مصر جاگ گیا تھا اور لوگ دیوتاؤں کی عبادت کر کے ایک اچھے دن کی شروعات کر رہے تھے۔

عورتیں دریائے نیل سے نکال کر لائی جانے والی نہر سے پانی بھرنے جا رہی تھیں ایسے میں ایک آدمی بڑے شہر میں داخل ہوا لمبا تڑنگا اور کسرتی بدن چہرے پر سفر کی تکان کے آثار تک نہ تھے حالانکہ صحرا میں پیدل چل کے آیا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے پاس کسی قسم کا سامان تک نہ تھا۔ وہ محل میں آنا چاہتا تھا لیکن پہرے داروں نے اسے باہر ہی روک لیا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟

اس شخص نے نہایت ہی اطمینان سے جواب دیا کہ وہ شہر لکسر سے آیا ہے اور ایک ماہر نقاش ہے۔

''میں چاہتا ہوں کہ فرعون کے مقبرے کی در و دیوار پر نقاشی کا کام میں خود کروں مجھے عظیم فرعون کے پاس لے چلو۔''

پہرے دار اسے میرے پاس لے آئے میرے پوچھنے پر اس آدمی نے اپنا نام آروت بے بتلایا، خیر میں نے اس کا امتحان لیا، اس نے میرے سامنے ایک پتھر پر نقاشی کی اور اس میں حقیقت کے رنگ بھر دیئے، وہ آدمی مجھے دلچسپ لگا اور میرے ہی حکم پر اسے محل کا ایک کمرہ دے دیا گیا کچھ دنوں تک وہ محل ہی میں رہا پھر اس نے مجھ سے اجازت لے کر مقبرے پر کام شروع کر دیا، وہ جلد ہی شہر والوں کے ساتھ گھل مل گیا تھا۔ وہ ایک نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ ہر ایک کی مدد کرتا اور زیادہ تر خاموش ہی رہتا اگر اس کو کسی سے پیار تھا تو وہ تم تھے۔ اس وقت تمہاری عمر پانچ سال تھی۔ تم کچھ ہی عرصہ میں اس سے اتنے مانوس ہوگئے کہ ہم سے زیادہ وقت آروت بے کے ساتھ گزارتے۔ وہ بھی تمہیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا۔

پھر ایک دن اچانک طوفان آگیا۔ شام نے اپنا دامن سمیٹ لیا تھا اور اندھیرے کی چادر پھیلتی جا رہی تھی مگر موسم بہت ہی خوشگوار تھا۔ شہر کے لوگ آرام و سکون سے سو رہے تھے اور دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی۔ اچانک ہوا میں تیزی آگئی۔ اور ریت کے ذرے اڑ اڑ کر شہر کو دفن کرنے پر تل گئے۔ لوگ جلدی جلدی اپنے کمروں میں گھس گئے۔ طوفان کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔

پھر اچانک وہ شور ختم ہوگیا ہر طرف خوف سا سناٹا چھا گیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ شاید طوفان ختم ہوگیا ہے لیکن ہوائیں اسی طرح چل رہی تھیں مگر شور ختم ہوگیا تھا اور ہر ایک چیز ساکت محسوس ہو رہی تھی ہر شخص سہما ہوا تھا اور ہلکی سی آہٹ پر دل یوں اچھلتا تھا کہ جیسے ابھی پسلیوں کی قید سے آزاد ہو جائے گا۔

پھر عجیب سی ملی جلی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو آوازیں گڈمڈ ہوگئی ہوں۔ ان میں ایک آواز کسی کے بین کرنے کی تھی ایسا لگتا تھا جیسے کسی پر ظلم کیا جا رہا ہو۔ اور رونے والا بڑی اذیت میں ہو، اس آواز میں ایسا کرب تھا کہ دل پھٹا جا رہا تھا۔ اس آواز کے ساتھ ہی نہایت زور دار آوازیں آرہی تھیں کوئی نہایت ہی مکروہ اور کریہہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔

کبھی ایک آواز بلند ہوتی تو کبھی دوسری، دونوں آوازوں کا تاثر ایسا خوفناک تھا کہ دل ہل جاتا تھا۔ کافی دیر تک ایسا ہوتا رہا پھر آوازیں کم ہوگئیں ماؤں کے سینے سے چمٹے بچے ماں کی آغوش سے نیند کی آغوش میں چلے گئے، ماؤں کی دروازوں پر لگی نظریں تھک کر پلکوں کی پناہ میں چلی گئیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے شہر پر نیند کی دیوی مہربان ہوگئی۔ وہ پہلی صبح تھی جب شہر کے لوگ عبادت کے لئے نہیں جاگے، جب شہر جاگا تو سورج گرم تھا۔ تمام لوگ شہر کے چوپال میں جمع ہوگئے۔ ہر آدمی خاموش تھا۔ پھر اس خاموشی کو ایک شخص کی چیخوں نے توڑا۔ رات کو اس کی اونٹنی غائب ہوگئی تھی۔ جبکہ اس کے ساتھ بندھے ہوئے دوسرے جانور موت کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ میں نے شہر بھر کے نجومی اور جادوگروں کو اکٹھا کر کے اس معاملے کی تہہ تک پہنچنے کا حکم دے دیا اور چند فوجی غائب اونٹنی کی تلاش میں روانہ کردیئے اور دوپہر کو جب سورج اپنی حدت سے پورے شہر کو گرم کئے ہوئے تھا فوجی واپس آگئے۔ ان کے چہرے لٹکے ہوئے تھے اور پسینے سے شرابور خوفزدہ دکھائی دیتے تھے ان میں سے ایک فوجی نے بتایا کہ ''انہیں اس اونٹنی کی ہڈیاں شہر سے باہر بکھری ہوئی ملیں، ہڈیوں کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا اور گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔''

یہ خبر سنتے ہی پورا شہر خوف کی زد میں آگیا اور ادھر تہہ خانے میں پجاری جادوگر اس واقعے کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہے تھے۔

شام کو میں اپنے ایوان خاص میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک پجاری اور جادوگر میرے قدموں میں سجدہ ریز ہوگئے۔ وہ سب رو رہے تھے اور فریاد کررہے تھے۔ ''اے ہماری زندگیوں کے مالک ہمارے آقا ہمیں اس بری خبر پر ہمیں معاف کردینا ہم بھی مجبور ہیں اور آپ کے جاہ و جلال سے بھی واقف ہیں۔''

''تم لوگ کھل کر بات کرو۔'' میں نے انہیں اجازت دی پھر ایک جادوگر نے بات شروع کی۔ ''اے

مصری سرزمین پر حکومت کرانے والے عظیم فرعون یہ آپ کی سترہویں خاندان اور فرعون تخ را کے عہد کا ایک واقعہ المناک ہے۔ فرعون تخ را ایک ظالم اور جابر حکمران تھا۔ اس کی دہشت سے پورا مصر خوف کھاتا تھا۔ اس نے اپنے عہد میں دیوتاؤں کو خوش رکھنے کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ فرعون تخ را عورتوں پر مہربان رہنے والا فرعون تھا اور پورے مصر کی حسین عورتیں اس کی داشتہ کا کام کرتی تھیں لیکن اسے کوئی بھی عورت ایسی نہ لگی جسے وہ اپنی ملکہ بنا سکتا لیکن ایک دن فرعون کو مصر کے جادوگر جرمان کی محبوبہ سیتی پسند آگئی وہ بلاشبہ ایک حسین عورت تھی اور نہایت ہی مغرور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے حسن سے بڑے بڑے حکمرانوں کو اپنی زلف کا اسیر کرسکتی ہے لیکن اسے جادوگر جرمان سے گہری محبت تھی۔

فرعون تخ را نے اپنے وزیروں مشیروں کو بیش بہا خزانہ اجناس اور شاہی باغ میں ڈھیروں بیش بہا خزانہ اور پھل دے کر سیتی کے گھر بھیجا اور پیشکش کی کہ فرعون اسے اپنی ملکہ بنانا چاہتا ہے لیکن سیتی نے انکار کردیا اور کہا کہ وہ جادوگر جرمان سے بہت جلد شادی کرنے والی ہے لیکن جادوگر جرمان ان دنوں شہر تھبس سے باہر زیریں مصر میں کچھ دنوں کے لئے کسی اہم کام کے لئے گیا ہوا تھا۔

ادھر فرعون تخ را اپنی ذلت پر پیچ و خم کھا رہا تھا اس نے فیصلہ کرلیا کہ اگر سیتی اس کی نہ ہوئی تو پھر کسی کی بھی نہ ہوسکے گی۔

فرعون نے اپنے فوجی بھیج کر سیتی کو اٹھوالیا اور اسے زندہ ممی بنانے کا حکم صادر کیا۔ ممی بنانے سے قبل اس کے حسن کو مسمار کرنے کی خاطر فرعون نے مصر کے [illegible] تابوت میں ڈال کر دفنا دیا۔

جب جادوگر جرمان واپس آیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کی دنیا اجڑ چکی ہے تو اسے بہت ہی غصہ آیا لیکن وہ جانتا تھا کہ فرعون کو شکست دینا کوئی آسان بات نہیں اس کے لئے جادوگر جرمان نے بڑائی کے دیوتا انوبیس سے ایک وعدہ کیا کہ اگر دیوتا انوبیس اسے کالی طاقتوں سے نوازے گا تو وہ پندرہ پجاریوں سمیت فرعون کی قربانی کا نذرانہ پیش کرے گا۔

دیوتا نے اس کی درخواست قبول کرلی اور اسے کالی طاقتوں سے نوازا تو اس کا بدن سیاہ ہوگیا۔ جرمان نے کچھ عرصے کی مہلت مانگی اور اپنے آپ کو کچھ عرصہ کے لئے سلا دیا اور اپنے جسم پر وقت ساکت کردیا کہ وہ سیتی کی روح کے ساتھ کچھ وقت گزار سکے لیکن اس آفت کو جس گھڑی اٹھنا تھا وہ گھڑی آکر گزر گئی اور کئی سالوں تک سوتا ہی رہا تھا اور اب وہ اٹھا ہے تو اس کے پاس دگنی طاقت ہے اور اب وہ دیوتا انوبیس کو فرعون تخ را کا نذرانہ نہیں دے گا بلکہ اس کی سلطنت کا ہیرا اور آنے والا فرعون رعمسس کی قربانی دے گا کیونکہ اب فرعون تخ را تو رہا نہیں اور اس کے غصے میں مزید اضافہ ہوچکا ہے اس لئے وہ اس خاندان کے آخری چراغ کو گل کردینا چاہتا ہے۔''

میں یہ داستان سن کر پریشان ہوگیا مجھے اپنی زندگی کی فکر نہیں تھی بلکہ تمہاری فکر کھائے جارہی تھی کیونکہ تم ہی اس خاندان کے چشم و چراغ ہو جو صدیوں سے چلی آرہی ہے فراعین کی حکومت کو آگے بڑھا سکتے تھے پھر اچانک ایک رات قیامت ہی ٹوٹ پڑی بلکہ اس رات ایک جانور ہی نہیں بلکہ ایک پجاری بھی غائب ہوگیا تھا۔ جادوگر جرمان نے اپنے وعدے کی ایک کڑی جوڑ دی تھی اور آدھی رات گزر چکی تھی۔ ایک فوجی اشاطرن نے دیکھا کہ ایک پجاری محل سے باہر جارہا تھا اور اشاطرن بھی اس کے پیچھے چل دیا وہ پجاری اسپترا کی طرف جارہا تھا اور پجاری اندر داخل ہوا تو اشاطرن بھی اس کے پیچھے داخل ہوگیا پجاری ایسے چل رہا تھا جیسے وہ نیند میں ہو کچھ دور جا کر پجاری دیوتا انوبیس کے مجسمے کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ پھر اشاطرن کی نگاہ پجاری کے پیروں کی طرف پڑی تو اس کے منہ سے ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی پجاری کی ٹانگوں سے گوشت گر رہا تھا اور خون ہڈیوں سے بہتا ہوا نیچے ریت میں جذب

ہورہا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ پجاری نہایت ہی اطمینان سے کھڑا تھا پھر اشاطرن نے ایک اور خوفناک منظر دیکھا۔

دیوتا کے مجسمے کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے روشن ہوئیں اور اس نے جادوگر جرمان کی قربانی کو قبول کرلیا پھر یکا یک چیزیں ہلنے لگیں جیسے بھونچال آ گیا ہو جس مجسمے کے نیچے پجاری کھڑا تھا اس مجسمے میں سے ایک شعلہ لپکا اور پجاری کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور مجسمے کے اردگرد آگ جلنے لگی پھر مجسمے کے اردگرد اور قدموں میں سیاہ دھواں نکلنا شروع ہوگیا جو بڑھتے بڑھتے ایک ہیولے کی شکل اختیار کرگیا۔

سیاہ دھواں کا مرغولہ اب مجسمے کے اردگرد رقص کررہا تھا اشاطرن یہ سب کچھ برداشت نہ کرسکا اور واپس بھاگ آیا۔ دوسرے دن جب اس واقعے کی خبر شہروالوں کو پتہ چلی تو ہر طرف افراتفری پھیل گئی۔

سارے پجاری جانتے تھے کہ جادوگر جرمان مزید چودہ پجاریوں کو موت کے گھاٹ اتار دے گا اور پھر میرے بیٹے کی باری آئے گی۔ آردت بے کو اس واقعہ کا پتہ چلا لیکن وہ خاموش ہی رہا پھر تین پجاری غائب ہوگئے اور ان کے سڑے ہوئے ڈھانچے استپرا میں ملے اور میں نے مصر سے ایک جادوگر نوسولا کو بلایا اور اسے جادوگر جرمان کو مارنے کے لئے کہا۔ جادوگر نوسولا تیار ہوگیا مگر اس نے مجھے صاف لفظوں میں بتایا کہ مدمقابل بہت زیادہ طاقتور ہے اور عمل ناکام ہونے کی صورت میں کچھ بھی ہوسکتا ہے مگر میرے حکم پر جادوگر نوسولا نے عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا عمل تین دنوں میں مکمل ہونا تھا کبھی جادوگر نوسولا شام کے وقت تہہ خانے میں اور کبھی محراب میں بیٹھ کر عمل کرتا تھا اور اس دوران جادوگر جرمان نے کہرام برپا کردیا تھا پہلی ہی رات چھ پجاری غائب ہوگئے اور ان کی بھی ہڈیاں استپرا سے برآمد ہوئیں کل ملا کر سات پجاری قربانی چڑھائے جاچکے تھے۔

میں نے شہر کے باہر اور اندر پہرا سخت کرادیا مگر افسوس ہماری ہر کوشش ناکام ثابت ہوئی اور عمل کے دوسرے روز مزید پانچ پجاری غائب ہوگئے اور اب ان تین پجاریوں کے بعد تمہاری باری آنی تھی آج عمل کی آخری رات تھی اور تین پجاری غائب ہوگئے۔ ۱۵ پجاری قربان کئے جاچکے تھے۔

صبح ہوتے ہی نوسولا کا عمل مکمل ہوگیا۔ بالآخر نوسولا صحرا میں بیٹھ گیا اس کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے پتھروں کی مالا تھی شہر کے تمام لوگ نوسولا کے گرد اکٹھے ہوگئے عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے غرض ہر آدمی وہاں موجود تھا سوائے آردت کے وہ محل میں اپنے کمرے میں لیٹا رہا تھا نجانے کیوں ہمارے باہر جانے سے پہلے ہم سے اس نے تمہیں لے لیا تھا۔ اور اس کا تم سے پیار ہی اتنا تھا کہ میں نے بغیر جھجک کے تمہیں اس کے حوالے کردیا اور خود باہر آ گیا اور اب تمام لوگ دائرے کی صورت میں کھڑے تھے۔ اب ہم اس لمحے کی طرف آتے ہیں جب بہت سے دلوں کی دھڑکنیں ایک ہوجاتی ہیں وہ بھی ایک ایسا ہی لمحہ تھا ہر شخص کی نظریں نوسولا پر جمی ہوئی تھیں اور نوسولا سر جھکائے کوئی منتر پڑھنے میں مصروف تھا اچانک آسمان پر سیاہ بادل چھانے لگے جو حد نگاہ آسمان کا احاطہ کئے ہوئے تھے جوں جوں وقت گزر رہا تھا سیاہی گہری ہوتی جارہی تھی......

دریائے نیل کے کنارے بولنے والے پرندوں کی آوازیں مدھم ہورہی تھیں جوں جوں خاموشی بڑھتی جارہی تھی ماحول کی پراسراریت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا اس خاموشی نے ہر دل میں اپنا خوف بیٹھا دیا تھا جادوگر نوسولا منتر پڑھنے میں مصروف تھا، لگتا تھا عمل ختم ہونے والا ہے کیونکہ ہوا نے چلنا شروع کردیا تھا۔ درندوں کی غراہٹ چرندوں کی آوازیں کناروں سے ٹکراتی دریائے نیل کی لہریں ہر چیز ہوا کے شور میں شامل ہوگئی۔ جادوگر نوسولا نے آسمان کی طرف دیکھا آسمان صاف ہورہا تھا بادل دیکھتے ہی دیکھتے ٹکرائے ہوا کے شور میں بادلوں کی گرج بھی شامل ہوگئی جادوگر نوسولا کی آواز بلند

ہوتی جارہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ ان دو بادلوں کو آپس میں ملنے سے روکنا چاہ رہا ہو پھر ایک عجیب واقعہ ہوا ایک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور جادوگر نوسولا کو اڑا کر لے گیا۔ جادوگر نوسولا سیاہ مرغولے کی قید میں تھا اور فضا میں بلند چیخیں مار رہا تھا۔ یکایک جادوگر نوسولا سیاہ مرغولے میں غائب ہوگیا۔

ہر طرف خاموشی چھا گئی سیاہ دھواں بھی فضا میں ساکت ہوگیا اور پھر جادوگر نوسولا کا ڈھانچہ سیاہ مرغولے میں سے برآمد ہوا اور سیدھا میرے اوپر آ گرا تو فوجیوں نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا لیکن میں آگے بڑھ کر اس خبیث جادوگر جرمان سے لڑنا چاہتا تھا پھر بادل کے دو ٹکڑے آپس میں ٹکرائے، بجلی چمکی ایک لمحے کے لئے شہر روشنیوں میں نہا گیا اور پھر تاریکی میں ڈوب گیا اور اچانک تیز ہوائیں چلنے لگیں اور سب کچھ جل تھل ہوگیا کیونکہ عمل ناکام ہوچکا تھا۔ فضا میں پراسرار وحشت طاری ہوگئی۔

ہوائیں یوں چیخ رہی تھیں جیسے فضا میں کوڑے برسائے جارہے ہوں اور سارے باغات اجڑ گئے تھے۔ ٹہنیاں، ریت کے ذرے ہر چیز ہوا کے دوش پر اڑی جارہی تھی اور ہوا کا روپ اختیار کرچکی تھیں فضا میں وہ منحوس قہقہے پھر بکھرنے لگے تھے، بچے رونے لگے، عورتیں چیخ رہی تھیں، جن مردوں کے لب خاموش تھے ان کے دھڑکتے دل بول رہے تھے اور جن کے دلوں کی دھڑکن خاموش ہوگئی تھی ان کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں ہر شخص افراتفری کے عالم میں بھاگ رہا تھا میں بھی محل کی طرف بھاگا آسمان سے زمین تک ایک کالی لکیر سی پھیل گئی یوں لگتا تھا جیسے کوئی سیاہ بادل نیچے اتر آیا ہو اور وہ سیاہ دھواں صحرا پر پھیلتا چلا گیا ابھی میں محل سے کچھ دور تھا کہ سیاہ ہیولہ میرے قریب پہنچ گیا تمام لوگوں نے گھروں میں داخل ہوکر دروازے بند کردیئے اور ایسی صورتحال میں آردت ہی وہ پہلا شخص تھا جو مجھے بچانے کی خاطر باہر نکلا تھا اور اس نے ایک جست لگائی اور مجھے کھینچ کر ایک طرف لے گیا اور پھر اچانک تم محل سے باہر نکلے تمہارا رخ اس دھواں کے مرغولے کی طرف تھا ہر لمحے شکل بدلتا ہیولہ اب انسان کے روپ میں نظر آرہا تھا اور لمبے لمبے بازو پھیلا کر تمہیں بلا رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس ہیولے نے تمہیں اپنی آغوش میں لے لیا اور فضا میں بلند ہوکر آپسترا کی طرف جانے لگا۔ تمام فوجی اور میں اس کے پیچھے بھاگے لیکن ریت پر بھاگنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

آردت اچانک اٹھا اور تمہاری طرف بھاگنا شروع کردیا میں نے کسی کو اتنا تیز بھاگتے ہوئے نہیں دیکھا تھا سیاہ مرغولہ تمہیں لے کر آپسترا پہنچ چکا تھا اور آردت بھی تمہارے پیچھے پہنچ چکا تھا جبکہ ہم اس سے تھوڑے فاصلے پر تھے سیاہ دھوئیں نے تمہیں انوبیس مجسمے کے قدموں میں ڈال دیا اور تمہارے سر پر منڈلانے لگا۔

اچانک آردت نے بلا جھجک اس ہیولے پر حملہ کردیا اور اس دھوئیں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا حالانکہ دھوئیں کو پکڑنا ناممکن ہے مگر اس نے اپنی مٹھی ایسے ہی بھینچی ہوئی تھی جیسے اسے پکڑ لیا ہو۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے جیسے وہ کچھ بول رہا ہو لفظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر اس کی آواز بلند ہوتی جارہی تھی یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت زیادہ ہی غصے میں ہو۔ آردت کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا اور رگیں تن گئی تھیں پھر دھوئیں میں سے ایک شعلہ سا لپکا اور آردت نے اپنی مٹھی کھول دی اس کا ہاتھ جل گیا تھا اور اب وہ سیاہ ہیولہ تیزی سے اوپر اٹھا اور دوسرا لمحہ نہایت ہی حیران کن تھا۔ آردت اوپر اچھلا اور دیکھتے ہی دیکھتے سفید رنگ کے دھواں میں تبدیل ہوگیا۔

سفید ہیولہ سیاہ دھواں میں تبدیل ہوگیا اور تم تیزی سے بھاگ کر میرے پاس آ گئے اور وہ دونوں ایک جگہ سے دوسری جگہ بل کھانے لگے۔ وہ جس دیوار سے ٹکراتے وہ دیوار گر جاتی جس ستون کو چھوتے وہ ستون گر جاتا۔ اتنی عجیب لڑائی پہلے کسی نے نہیں دیکھی تھی وہ دونوں بہت دیر تک الجھتے رہے پھر سیاہ ہیولہ سمٹنے لگا اور تھوڑی دیر بعد سیاہ ہیولہ ختم ہوگیا اور پھر اس کی جگہ ایک سیاہ بدن والا آدمی نیچے گرا۔ وہ جادوگر جرمان تھا

اچانک اس کے جسم پر آبلے بننے لگے اور جب وہ آبلہ پھٹتا تو اس میں سے سیاہ دھواں نکلتا تھا پھر جادوگر جرمان کے سیاہ بدن میں سے ایک پرچھائیں نکلی جو چیخ رہی تھی ایسا لگتا تھا جیسے اسے کسی نے دبوچ رکھا ہو۔ جادوگر جرمان کی روح اپنے دیوتا انوبیس کے قدموں میں گئی اور اسی وقت مجسمے کا منہ کھلا اور جرمان کی روح مجسمے کے منہ میں داخل ہوگئی دیوتا انوبیس نے جادوگر جرمان کی روح کو اپنے قبضے میں کرلیا تھا کیونکہ وہ اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا تھا اور پھر وہ سفید دھواں بھی ختم ہوگیا تھا اور آردت زخمی حالت میں نیچے گرا تھا۔

تم بھاگ کے اس کے پاس گئے وہ کافی زخمی ہوچکا تھا۔ آردت نے تمہارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا، اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے اس نے تمہارا ہاتھ بڑے پیار سے دبایا اور کہا۔

''میں تم لوگوں کے درمیان رہنا چاہتا تھا مجھے تمہاری دنیا بہت پسند ہے اس لئے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ انسانوں کی دنیا میں انسان جیسا روپ بدل کر میں تمہارے ساتھ رہوں گا یہی وجہ تھی کہ میں نے جادوگر جرمان کو کبھی روکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس سے مقابلہ کرنے کے لئے مجھے اپنی اصلی حالت میں آنا پڑتا اور ایک دفعہ انسانوں کو اپنا اصلی روپ دکھانے کے بعد تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا یہی وجہ تھی کہ تمہارے پیار میں میرا دل ان پندرہ پجاریوں کی مدد کرنے پر تیار نہیں ہوا مگر جب وہ تمہیں ساتھ لے جانے لگا تو میں برداشت نہ کرسکا میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے لئے تمہاری قربانی نہیں دے سکتا تھا میں تمہاری دنیا میں رہنا چاہتا تھا مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور اب مجھے اپنی دنیا میں واپس جانا پڑے گا میں تمہیں کبھی بھی نہیں بھولوں گا۔

میں جا رہا ہوں۔''

اور پھر وہ دوبارہ سفید ھوئیں میں تبدیل ہوگیا مگر اب اس کی واضح شکل اور خدوخال نظر آرہے تھے پھر وہ ہاتھ ہلاتا ہوا آسمان کی وسعتوں میں کھوگیا۔

اس واقعہ کا تم پر بہت گہرا اثر ہوا۔ تم بہت خوفزدہ ہوگئے۔ تمہارے علاج کے لئے میں نے مصر بھر کے طبیبوں کاہن اور جادوگروں کو بلایا اور تم ٹھیک ہوگئے مگر ان لوگوں نے کہا تم سے اس بات کا ذکر نہ کیا جائے اور نہ اسے دوبارہ لے جایا جائے اور......اور......!

میرے باپ فرعون اور کچھ نہ کہہ سکے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور انہوں نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا میں اٹھا اور ایوان خاص میں آکر بیٹھ گیا میں فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ میرے سینے سے بوجھ ہٹ گیا ہے یا اس میں اضافہ ہوگیا ہے پھر میں نے کہا......

''میرے سینے سے بوجھ ہٹ گیا ہے۔'' اور میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ بھی کتنے عجیب ہیں مجھے اپنے ہی محسن کو بھلانے کے لئے کہہ رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں اپنے محسن کو بھول گیا مگر خوف وڈر میرے ذہن میں رہ گیا اب مجھے اپنے محسن کے بارے میں پتہ چل گیا تو تمام خوف وڈر ختم ہوگیا تھا اور ایک شخص شفیق سا چہرہ میرے ذہن میں رہ گیا۔ اب میں تندرست ہوں اور میرے چہرے پر خوشی جھلکتی ہے میں سیاسی اور سماجی پہلوؤں پر تعلیم حاصل کررہا ہوں کیونکہ مجھے کل مصر پر حکومت کرنی ہے اور مجھے بہت جلد فرعون کا خطاب ملنے والا ہے۔ اور خواب تو مجھے اب بھی آتے ہیں مگر یہ خواب بہت دلکش اور حسین ہوتے ہیں۔ ''میں دریائے نیل کے کنارے کھڑا ہوتا ہوں اور دو ہاتھ میری طرف بڑھ رہے ہوتے ہیں اب وہ ہاتھ برے نہیں ہوتے بلکہ اب میں ان ہاتھوں میں جانے کے لئے بے چین ہوتا ہوں'' ہاتھ کسی اپنے کے ہوتے ہیں، جن میں سے پیار کی مہک آتی ہے، جس کی آغوش میں ٹھنڈی چھاؤں ہیں جس کے تلے انسان اپنی ساری زندگی گزار دے اور میرے کانوں میں آج بھی کبھی کبھی وہ صدا گونجتی ہے......

''تمہارے پیار اور تمہاری چاہت میں، میں نے یہ دنیا چھوڑی ہے۔''

محافظ

صباء رمضان۔ پنڈ دادنخان

قبرستان میں ایک دلدوز چیخ سنائی دی اور پھر تازہ قبر فوراً شق ہوگئی اس کے بعد کسی نادیدہ قوت نے لاش کو قبر سے نکال کر اوپر رکھ دیا۔ مگر یہ کیا وہ مردہ تو زندہ تھا۔

نیکی کبھی بھی رائیگاں نہیں جاتی، پھل ہر حال میں ملتا ہے، ثبوت کہانی میں ہے

موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ اپنے جوبن پر تھی۔ سورج کی تیز حدت سے لوگوں کا حال ابتر ہوا جا رہا تھا۔ چرند پرند اپنے آشیانوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ تپتی مٹی کی کچی سڑک پر سیاہ رنگ کا ایک نحیف کتا زبان باہر نکالے ہانپتا ہوا پانی کی تلاش میں پھر رہا تھا۔

کساء نے آلو کاٹ کر چھلکے باہر پھینکنے کے لئے جونہی دروازہ کھولا تو اسے وہ کتا نظر آیا۔ وہ فوراً اندر گئی اور مٹی کے پیالے میں ٹھنڈا پانی بھر کر لے آئی۔ کتا فٹافٹ پانی پینے لگا جیسے صدیوں کا پیاسا ہو۔

کساء دروازے میں کھڑی اسے پانی پیتے دیکھتی رہی۔ پانی پی کر وہ اٹھا اور دم ہلاتا ہوا ایک سمت میں بھاگ گیا۔

کساء نے بھی دروازہ بند کیا اور اندر آگئی آج اسے کھانا جلدی تیار کرنا تھا کیونکہ اس کے والد نے جلدی

گھر لوٹنا تھا۔ کچن میں جا کر جلدی جلدی اس نے آٹا گوندھا اور توا چولہے پر چڑھا دیا۔ ابھی اس نے پہلی روٹی ہی اتاری تھی کہ ڈور بیل بجی۔ وہ جھنجلاتی ہوئی دروازے پر آئی اور دروازہ کھول دیا۔

"ارے عائشہ تم؟" کساء کی خوشی کے مارے جیسے چیخ نکل گئی کیونکہ اس کی بیسٹ فرینڈ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"میں نے سوچا کہ تم تو یونہی کنوئیں کا مینڈک بنی رہو گی، مجھے تمہاری بہت یاد آ رہی تھی سو میں آ گئی۔" عائشہ نے بڑی سی سیاہ چادر اتاری اور دوپٹہ گلے میں ڈال کر بیٹھ گئی۔ بڑی بڑی چادریں اسے ہمیشہ سے ناپسند تھیں، وہ تو بلکہ دوپٹہ بہت مشکل سے سنبھالتی۔

"وقت ہی نہیں ملتا یار! سارا دن کاموں میں گزر جاتا ہے۔ صبح ساڑھے پانچ بجے کے قریب اٹھتی ہوں، نماز سے فارغ ہو کر ناشتے کے لئے آٹا گوندھتی ہوں پھر بابا کے کپڑے پریس کرتی ہوں۔ اس کے بعد تھوڑا سا کمپیوٹر پر بیٹھ کر فریش ہوتی ہوں۔ اتنے میں ناشتہ بنانے کا ٹائم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ناشتے کی تیاری شروع کر دیتی ہوں۔" عائشہ کے لئے روح افزا کا گلاس بناتے ہوئے کساء بولی۔

"یہ تو ہو گیا ناشتہ! باقی کا دن کیا کرتی ہے یہ حسینہ عالم!" عائشہ کمر پر ہاتھ باندھے کچن کے دروازے پر ہی آ کھڑی ہوئی تھی۔

"اس کے بعد دوپہر کا کھانا، پھر برتن...... اب کیا بتاؤں تمہیں؟" کساء روح افزاء کے گاڑھے شربت میں اب برف کی ڈلیاں ڈال رہی تھی۔

"تم دعا کرو کساء کہ میں میٹرک میں فرسٹ ڈویژن سے پاس ہو جاؤں پھر میں تمہیں تمہاری پسند کا گفٹ دوں گی۔" عائشہ نے ٹھنڈا ٹھار روح افزاء اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ اتنے میں عائشہ کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ اس نے جلدی سے فون اٹھایا تو دوسری طرف اس کی بہن مریم تھی جو اسے جلدی گھر آنے کا کہہ رہی تھی۔

ارے مریم تم...... اتنی سی ہیلپ نہیں کر سکتی تم میری۔ بتایا تو تھا کہ میں کساء سے کافی دنوں بعد آج ملی ہوں۔ تھوڑا ٹائم تو لگے گا ناں۔" عائشہ نے اپنے ماتھے پر آئے بال پیچھے ہٹائے۔ جو اس نے بڑے چاؤ سے کترینہ کیف کی نقل میں کٹوائے تھے۔

"میں تجھے بتا رہی ہوں عائشہ! اگر تو دس منٹ کے اندر اندر گھر واپس نہ آئی تو میں نے تیری ٹانگیں توڑ دینی ہیں، عاصم اور بلال کے لئے چپس بنانی ہے، جلدی گھر آ۔"

مریم نے فون کھٹاک سے بند کر دیا، وہ عائشہ کے یوں روز روز گھومنے کی عادت سے پریشان ہو چکی تھی۔ اتنا تو ننھا اسماعیل باہر جانے کی ضد نہیں کرتا تھا، جتنی کہ عائشہ۔

"کیا ہوا؟" کساء سنک میں شربت کے بھرے برتن کنگھال رہی تھی۔

"ہٹلر دی گریٹ کا فون آ گیا ہے، اب مجھے جانا ہی ہوگا۔" عائشہ روہانسی ہو گئی۔

"اور وہ جو میں نے قیمہ ابالنے کے لئے رکھا ہے کباب کے لئے اس کا کیا کروں؟" کساء عائشہ کے لئے کباب بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔

"وہ تو خود ہی کھا لینا، مجھے جانا ہوگا ورنہ وہ ہٹلر، امی ابو کو بری طرح سے بھڑکا دے گی اور جاتے ہی میری چھترول شروع ہو جائے گی۔" عائشہ سچ مچ ٹینشن میں آ گئی تھی اور چادر اوڑھ کر باہر جانے کی تیاری کرنے لگی۔

"تم بہت خوش قسمت ہو عائشہ، کہ تمہارے پاس بہن جیسا اتنا حسین رشتہ ہے جہاں تکرار کے ساتھ ساتھ بے حد پیار بھی ہوتا ہے۔ مجھ جیسوں کو دیکھو، اکیلی پڑی سڑتی رہتی ہوں، بابا تو صبح کے گئے شام کو واپس آتے ہیں۔" کساء اداس سی ہو گئی۔ وہ بہن کی کمی کو شدت سے محسوس کرتی تھی۔

"ہاں یار! یہ تو ہے، اب دیکھنا، مریم ہی مجھے ابو امی کی ڈانٹ سے بچائے گی بھی۔" عائشہ نے نقاب کیا اور چلی گئی۔

"کساء بیٹا! ہوسکتا ہے آج رات میں لیٹ ہو جاؤں۔ شیخ سنز کا نیو آرڈر آیا ہے۔ وہ ہر حال میں انہیں کل صبح پورا کر کے دینا ہے۔" کساء کے والد "خالد قیوم" بریف کیس سیٹ کرتے ہوئے بولے۔

"پھر بھی بابا! کتنی دیر ہو جائے گی؟" کساء واش بیسن پر کھڑی اپنے ہاتھ دھوتی ہوئی بولی۔

رات کے کوئی تین، ساڑھے تین بج جائیں گے۔" خالد قیوم نے بریف کیس بند کیا۔

"اتنا لیٹ بابا؟ میں اکیلی کیسے رہوں گی؟" کساء ڈر سی گئی۔

"دیکھو بیٹا! کل کو تمہاری شادی ہونی ہے، سسرال تمہارا ملک سے باہر ہے اور اویس کا کام بھی ایسا ہے کہ رات کو دیر سے گھر آیا کرے گا، تب بھی تو تم اکیلی ہی رہو گی ناں؟" خالد قیوم نے کساء کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ جواباً کساء حیران پریشان سی کھڑی رہی۔

شام کے چار بج گئے تھے۔ دوپہر کا سالن بچا پڑا تھا۔ اس اکیلی جان کے لئے کافی تھا۔ لہٰذا رات کا کھانا بنانے کا ارادہ ملتوی کیا اور بالکنی میں آ کر بیٹھ گئی۔ موبائل پر گانے لگا لئے اور ہیڈ فون کانوں میں لگا کر ایزی ہو گئی۔ اسے پتہ ہی نہ چلا کہ کب وہ نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی۔

شفاف اجلے کتابی چہرے پر پڑنے والی ٹپ ٹپ کرتی بوندوں نے بالآخر اسے جگا ہی دیا۔ رات اپنے اوائل دور میں تھی۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر تک سوئی رہی تھی۔ غالباً رات کے نو بج رہے تھے۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی اب زور پکڑ چکی تھی۔ گانے اب بھی ہیڈ فون میں بج رہے تھے۔ اس نے جلدی سے ہیڈ فون اتارا اور گانے بند کئے۔ تیزی سے کمرے میں آ کر کھڑکیاں وغیرہ اچھے طریقے سے بند کیں۔ کیونکہ بارش کے ساتھ ساتھ تیز جھکڑ شروع ہو چکا تھا۔ وہ ایسے موسموں سے شروع سے ہی بہت ڈرتی تھی اور پھر آج تو وہ گھر میں بالکل تنہا تھی۔

چادر سر سے تان کر وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی کہ گلی میں اسے کسی کتے کے کاؤں...... کاؤں...... کی آواز آئی۔ وہ بہت تکلیف میں تھا۔ پہلے تو وہ زبردستی سونے کی کوشش کرتی رہی مگر جب "کاؤں کاؤں" کی آواز مسلسل اس کے کانوں میں پڑتی رہی تو وہ بے چین ہو کر اٹھی۔ دیوار پر لٹکی چھتری اٹھائی اور کھول کر باہر صحن میں آ گئی۔ کتے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ صحن عبور کر کے وہ دروازے تک آئی۔ دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

یہ وہی کتا تھا جسے چند روز قبل اس نے پانی پلایا تھا۔ کسی ظالم نے اینٹ کھینچ کے ماری تھی۔ شاید ٹانگ کے اوپری حصے سے بری طرح خون بہہ رہا تھا۔ چوٹ زیادہ تھی جس کی وجہ سے وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ پوری گلی میں کلبلاتا پھر رہا تھا۔

کساء کو ایکدم اس پر ترس آ گیا۔ اس نے فوراً آگے بڑھ کر کتے کو اٹھایا اور اندر آ گئی۔ کتا بھی اس سے کافی مانوس ہو چکا تھا۔ وہ جلدی سے فرسٹ ایڈ بکس اٹھا لائی اور کتے کی مرہم پٹی کی۔ پٹی کرنے کے بعد اس نے کچن میں جا کر دودھ گرم کیا اور مٹی کے پیالے میں ڈال کر کتے کے سامنے رکھا تو جلدی جلدی اس نے سارا دودھ پی لیا۔ وال کلاک نے رات کے گیارہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ وہ نو بجے سو جانے کی عادی تھی۔ نیند کا ٹائم نکل چکا تھا لہٰذا اب اسے نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔

کتے کو پٹی کرنے کے بعد خاصا آرام ملا تھا۔ وہ اپنے آپ کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ کساء میگزین کے مطالعے میں غرق تھی اور وہ کتا انتہائی کمزور جسامت کے باعث بھی باہر نکل گیا تھا۔

میگزین کے مطالعے سے فارغ ہو کر کساء نے جونہی ادھر ادھر نظر دوڑائی اور ورطہ حیرت میں ڈوب گئی۔ کتے کے یوں اچانک چلے جانے کا اسے واقعی پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے ایک بار پھر سونے کی کوشش کی۔

یکا یک اسے صحن میں کسی کے کودنے کی آواز آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی۔ اس کے کمرے کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور دو نقاب پوش اندر داخل ہوئے۔ وہ غالباً ڈاکو تھے۔ انہوں نے بڑی بڑی

پستولیں سنبھال رکھی تھیں۔
"لڑکی! نکال ایک منٹ میں، جو کچھ گھر میں ہے۔" ان میں سے نسبتاً دراز قد ڈاکو نے آگے بڑھ کر کساء کی کنپٹی پر پستول رکھی۔ جبکہ دوسرا وہیں دروازے میں کھڑا گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔
"مم......مم...... مجھے کچھ نہیں معلوم۔" کساء ہکلائی۔
"یہ کچھ نہیں بتائے گی۔ بہرام تو خود الماریوں کی تلاشی لے۔" اس دراز قد ڈاکو کے دوسرے ساتھی کا نام غالباً بہرام تھا۔
بہرام ڈاکو نے تیزی سے الماریاں کنگھالنا شروع کردیں جن سے دھیرے دھیرے مال برآمد ہونا شروع ہوگیا۔ اس کی شادی کے لئے بنا سونے کا سیٹ، کچھ پرائز بانڈ اور بے تحاشا نقدی۔ ان سب سے بڑھ کر تو وہ ہار تھا۔ جو ہیروں کا بنا ہوا تھا۔ جسے بہرام ہاتھ میں پروئے للچائی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ہیروں کے ہار سے مختلف قسم کی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ یہ ہار اس کی والدہ "انوری آراء" کا تھا۔ جو امریکہ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھیں۔ سال میں ایک بار چھٹی لے کر پاکستان کساء کے پاس ضرور آتیں۔ اور وہ دن کساء کی زندگی کے حسین ترین دن ہوتے جب وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر یا کبھی ان کے کندھے پر سر ٹکائے گھنٹوں ان سے باتوں میں لگی رہتی۔ "انوری آراء" نے کئی مرتبہ کساء کو اپنے ساتھ امریکہ لے جانے کی کوشش کی مگر کساء کے والد نہیں مانتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کو خالص مشرقی ماحول میں پروان چڑھتا دیکھنا چاہتے تھے۔
"نہیں...... یہ ہار تم لوگ نہیں لے کر جاسکتے، یہ میری امی کا ہے، میں اس کو بر گز لے جانے نہیں دوں گی۔" کساء تلملائی۔
"میں تو کہتا ہوں بہرام! جو جو چیزیں ہمیں لے کر جانی ہیں، اس لڑکی سے اجازت نامہ لکھوا لیتے ہیں۔ پھر جن چیزوں کی یہ اجازت دے گی، وہی لے کر چلے جائیں گے۔" دراز قد ڈاکو نے استہزائیہ انداز میں کہا اور دونوں ہنستے ہوئے باہر جانے لگے۔
کساء کے من میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ کسی چیل کی طرح جھپٹی اور ہار ان کے ہاتھوں سے لے کر پوری طاقت سے باہر گلی کی طرف دوڑ لگادی۔
"ابے یہ لڑکی ہے یا چھلاوہ؟" بہرام نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
"جو بھی ہے، بہرحال اس کا پیچھا کرو، ورنہ لاکھوں کی مالیت کا ہار ہاتھ سے جائے گا۔" دراز قد ڈاکو نے کہا اور دونوں کساء کے پیچھے بھاگ کھڑے ہوئے۔
رات کے بارہ بجے کا ٹائم تھا۔ لوگ نیند کی حسین وادیوں میں گم تھے۔ خوف کے مارے کساء کا گلا خشک ہوچکا تھا۔ اس کی آواز تک نہیں نکل پارہی تھی۔ مگر جیسے اس کے جسم میں بجلی سی بھر گئی تھی لہٰذا وہ تیز تیز سانسوں کے ساتھ مسلسل بھاگے جارہی تھی۔
"بہرام! تو اس چھوٹی گلی میں مڑ کر سامنے نکڑ پر آجا۔ تاکہ اس لڑکی کو آگے جاکر پکڑا جاسکے۔ پیچھے سے تو میں آہی رہا ہوں۔" دراز قد ڈاکو نے ہدایت کی۔ اور بہرام نے تیزی سے چھوٹی گلی کا رخ کیا۔
بھاگتے بھاگتے کساء کی سانس بری طرح پھول چکی تھی۔ اس کے پیر بھی شل ہوچکے تھے۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دراز قد ڈاکو اور اس میں تھوڑا سا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ اب وہ مزید ہار کی حفاظت نہیں کرسکتی تھی۔ لہٰذا بے دم سی ہوکر وہ وہیں ڈھے گئی۔ گرتے ہوئے اس کا وجود زمین کی بجائے کسی شے پر لگا تھا۔ وہ کوئی وجود تھا شاید۔ تھکی تھکی آنکھوں کے ساتھ اس نے دیکھا تو سفید پٹی کئے ہوئے یہ وہی نحیف ولاغر کتا تھا۔ جو تھوڑی دیر پہلے اس سے مرہم پٹی کروا آیا تھا اور جسے چند روز قبل اس نے پانی بھی پلایا تھا۔
کتا اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے کبھی پاس پڑی ہوئی نڈھال کساء کو دیکھتا تو کبھی بہت نزدیک پہنچنے والے دراز قد ڈاکو کو...... غالباً وہ معاملہ سمجھ چکا تھا۔
اس سے پہلے کہ ڈاکو کساء تک پہنچتا، کتے نے ایک بھرپور جمپ لیا اور ڈاکو کے سینے پر چھلانگ لگادی۔ ڈاکو اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا اور نیچے گر گیا۔

کتے نے ڈاکو کی شہہ رگ پر دانت گاڑ دیئے اور بھنبھوڑنے لگا۔ ڈاکو کے منہ سے گھٹی گھٹی سی آوازیں نکلنے لگیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے کتے کو پرے کرنے لگا۔ مگر وہ چھوٹا سا کمزور کتا اس کی گردن سے جونک کی طرح چمٹ گیا تھا۔
درخت سے ٹیک لگائے کساء سہمی سہمی سی یہ سارا منظر دیکھ رہی تھی۔ مگر ایکدم کساء کو چوکنا پڑا۔ ڈاکو نے اپنی جان بچانے کی غرض سے اپنی پنڈلی میں اڑسا ہوا خنجر نکالا۔ خنجر کا پھل انتہائی نوکدار اور چمکیلا تھا۔ ڈاکو نے خنجر والا ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کی گردن سے کافی خون بہہ چکا تھا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی مگر جاتے جاتے وہ کساء کے محسن اور اپنے دشمن کتے سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر وہ خنجر کتے کی گردن پر چلانے ہی والا تھا کہ کساء نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر خنجر اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور پے در پے وار، اس کے اوپر شروع کردیئے۔ جب تک کہ اس ڈاکو کی آخری سانس تک نہیں نکل گئی۔ آخر کار ڈاکو بالکل ساکت پڑ گیا۔
خنجر ایک طرف پھینک کر وہ کتے کی طرف متوجہ ہوئی مگر یہ کیا......؟ اس کا محسن ایک بار پھر کہیں غائب ہوچکا تھا۔
وہ ہمت کر کے اٹھی اور اپنے قدم گھر کی جانب بڑھا دیئے۔ وہ گھر سے زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ کچھ ہی منٹ کے فاصلے پر اس کا گھر موجود تھا۔
گھر میں داخل ہوکر اس نے گیٹ بند کیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں آکر اسے اچھی طرح سے لاک کردیا۔ ہیروں کا بیش قیمت ہار ابھی بھی اس کی مٹھی میں قید تھا۔ جسے اس نے بہت حفاظت سے تکیے کے غلاف میں چھپادیا۔
وال کلاک نے رات کے ایک بجے کا اعلان کردیا۔ اب اس سے مزید صبر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے موبائل فون اٹھایا اور اپنے والد کا نمبر ملا کر ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔ خالد قیوم نے ایمرجنسی میں کام ختم کیا اور فوراً گھر آگئے۔ تاہم وہ اس بات پر اپنے رب کے شکر گزار تھے کہ اس سارے معاملے میں ان کی بیٹی بالکل محفوظ رہی تھی۔

☆......☆......☆

"ارے مریم تم؟" کساء دروازہ کھولتے ہی جیسے چلائی۔ عائشہ نہیں آئی کیا؟" اس نے مریم کے پیچھے متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔
"نہیں...... وہ آنٹی حلیمہ کی طرف گئی ہوئی ہے۔ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو سوچا تم سے بھی ملتی چلوں۔ تمہیں تو کبھی یہ توفیق نہیں ہوگی کہ ہم سے ملنے آجاؤ۔" کساء کو گلے لگاتے ہوئے مریم شکوہ کرنے لگی۔
"پچھلی بار عائشہ آئی تھی تو وہ بھی یہی شکوہ کررہی تھی...... خیر تم اپنی سناؤ۔ سنا ہے تمہاری بڑی بہن صباء کی منگنی ہوچکی ہے۔ کیسے ہیں ہمارے جیجا جی؟ اور تم نے مجھے انوائیٹ بھی نہیں کیا۔" کساء مصنوعی خفگی سے بولی۔
"فیملی فنکشن تھا! ورنہ تمہیں ضرور بلاتے۔ اور رہ گئی بات ہمارے جیجا جی کی۔ تو وہ تو بہت نائس ہیں۔ ہمیں اپنے سگے بھائی اور ان میں کوئی فرق نہیں لگتا۔" مریم اپنے بہنوئی کی تعریف میں لگ گئی۔
"اللہ تعالیٰ ان دونوں کو ہمیشہ خوش وخرم رکھے۔" کساء نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"آمین۔" مریم مسکرائی۔
"مریم یار! ذرا ٹی وی آف کرکے آنا۔ میں مٹن کڑاہی دم پر چڑھا کر آرہی ہوں۔" کساء نے مٹن کڑاہی میں چمچ گھماتے ہوئے کہا۔ مریم کے جانے کے بعد کساء نے مٹن میں زیرے کا چھڑکاؤ کیا۔ املی کی کھٹی چٹنی اس میں انڈیلی اور آنچ دھیمی کرنے لگی۔ مٹن کڑاہی دم پر رکھنے کے بعد وہ ابھی کٹنگ بورڈ صاف ہی کررہی تھی کہ اسے اپنے پیچھے دھواں سا اٹھتا محسوس ہوا۔ کچھ جلنے کی بو بھی آرہی تھی۔ اس نے ایکدم پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پیچھے کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا وہم جان کر اس نے سر جھٹکا اور کٹنگ بورڈ صاف کرنے لگی۔ مگر فوراً ہی دھویں اور جلنے کی بو کے ساتھ ساتھ بھڑ بھڑ کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ ساتھ ہی اسے اپنی کمر پر بے حد تپش اور جلن کا احساس بھی ہونے لگا

کٹنگ بورڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا۔
معاً کچن میں داخل ہوتی مریم کے منہ سے ایک دلخراش چیخ برآمد ہوئی۔ کساء کے دوپٹے کے پلو سے لگنے والی آگ اب پھیل کر اس کے کندھوں تک آ گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کساء زمین پر گرتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

"آپ کی دعا رب باری تعالیٰ نے سن لی ہے خالد صاحب۔ کساء کو ہوش آ گیا ہے۔ شی از آل رائٹ ناؤ۔" آپریشن تھیٹر سے آتے ہوئے سبز گاؤن میں ملبوس ڈاکٹر رفیق کساء کے والد کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔
"مگر ڈاکٹر صاحب! میری بیٹی کتنا فی صد جل چکی ہے؟" خالد قیوم کے لہجے میں تفکر پنہاں تھا۔
"میں تو اسے ایک معجزہ ہی کہوں گا۔ ہمارے برن یونٹ کی ہسٹری میں ایسا کیس پہلی بار سامنے آیا ہے۔" ڈاکٹر رفیق نے کہا۔
"جی......؟ میں سمجھا نہیں۔" خالد قیوم کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔
"دیکھیں خالد صاحب! آپ کی بیٹی کی اسکن اس فائر اٹیک سے بالکل محفوظ رہی ہے۔ بس تپش کی وجہ سے چند ہلکے سے لال دھبے ہیں۔ جو ایک دو دن تک چلے جائیں گے۔ حالانکہ جس طرح آگ کی سچویشن مجھے بتائی جا رہی تھی۔ میں کافی زیادہ اسکن کے معاملے میں فکر مند تھا۔ مگر معاملہ برعکس نکلا۔" ڈاکٹر رفیق حیرت سے بول رہے تھے۔
"یہ تو پھر اللہ کا بڑا کرم ہوا ناں۔" خالد قیوم طمانیت سے بولے۔
"ایسے معجزے بار بار نہیں ہوا کرتے خالد صاحب، اپنی بیٹی کا صدقہ وغیرہ دیں اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار رہیں۔" ڈاکٹر رفیق نے کھڑے ہو کر خالد قیوم سے ہاتھ ملایا اور انہیں رخصت کیا۔
دو گھنٹے کے اندر اندر کساء ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آ گئی۔ اس کے والد کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسی کون سی نیکی ہے ان کی؟ کہ جس کا بدلہ انہیں اتنے بڑے انعام کی صورت میں دیا گیا ہے۔
"یہ کون ہے بابا؟" باپ کا سہارا لے کر کساء بیڈ پر بیٹھی ہی تھی کہ ایک اکیس بائیس سال کا لڑکا ہاتھ میں ٹرے پکڑے اندر داخل ہوا۔ جس پر گرین ٹی کے دو بڑے مگ رکھے ہوئے تھے۔
"یہ گل شیر ہے بیٹا! ہمارا باورچی...... آج سے تمہارا کچن جانا بند...... میں نے اسے ہائیر کر لیا ہے۔ بس تم اسے کام کے متعلق ڈائریکشن دیتی رہا کرو۔" خالد قیوم گل شیر کی طرف دیکھتے ہوئے بولے جو بڑے انہماک سے گرین ٹی کا مگ کساء کی جانب بڑھا رہا تھا۔

☆......☆......☆

"مریم! چل اٹھ! میرے لئے چائے کا کپ بنا۔" مریم کے بھائی سجاد نے ٹی وی روم میں جھانک کر کہا۔ جہاں مریم عائشہ کے ساتھ بیٹھی بڑے غور سے ٹی وی پر ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔ دونوں دنیا جہاں سے بے خبر بیٹھی تھیں۔
"چل عائشہ اٹھ! چائے بنا جا کر۔" مریم نے آرڈر جاری کیا۔
"میں کیوں اٹھوں؟ بھائی نے تجھے بولا ہے۔ اور ویسے بھی شام کی چائے کی ڈیوٹی تیری ہے۔" عائشہ میٹرک میں ہونے کے باوجود نرسری کلاس کے بچے کی طرح منہ بسورنے لگی۔
"چل اٹھ، چائے بنا جا کر۔" مریم غصے سے بولی۔ غصے میں اس کا سفید رنگ ایکدم لال ہو جاتا تھا۔ جو عائشہ کے لئے خاصا پر رعب ثابت ہوتا تھا۔
"اب اٹھ بھی جاؤ۔ دونوں میں سے ایک...... کسی دن تم دونوں سجاد بھائی کے ہاتھوں اچھی خاصی چھترول کرواؤ گی۔ آ جائے انشی باجی کا فون۔ تم دونوں کی خوب شکایت کروں گی۔ اتنا تو ماہین کھانے سے نہیں بھاگتی، جتنا تم لوگ کام سے بھاگتی ہو۔" سنگھار میز کے سامنے کھڑی صبا موئسچرائزنگ کرتے ہوئے بولی۔
"میں تو ایک شرط پر کچن میں جاؤں گی کہ مریم کو بھی میرے ساتھ بھیجو۔" عائشہ دل ہی دل میں مریم کو ڈرامہ

دیکھنے سے محروم کر کے اپنا چھوٹا سا انتقام لینا چاہتی تھی۔
"چل! میں بھی ذرا دیکھوں کہ کون سا جن تجھے ڈراتا ہے؟" مریم دھاڑتے ہوئے چل پڑی۔ کچن میں جا کر مریم شیلف پر بیٹھ کر چپس کھانے لگی اور عائشہ نے چائے کا پانی رکھا ہی تھا کہ ان کی کپڑے دھونے والی ملازمہ کریمہ جو لان میں واشنگ مشین لگا رہی تھی۔ اندر آ کر بولی۔
"بی بی جی! آپ کا فون آیا ہے۔"
"کس کا؟"
"کساء کا؟"
"نہیں! میں نے تو اس جن زادی سے بات نہیں کرنی۔ اور میں تو کہتی ہوں عائشہ! تو بھی اس سے دوستی چھوڑ دے۔ بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے یہ۔ مجھے تو آج تک یقین نہیں آتا، جو اس دن میں نے دیکھا تھا۔"
"بی بی جی! مجھے تو بتا دیں۔ کیا کہوں انہیں؟" رسانی سے بولتی مریم کو کریمہ نے ایکدم چپ کروا دیا۔
"کہہ دو کہ میں سو رہی ہوں اور عائشہ ٹیوشن گئی ہوئی ہے۔" مریم نے بہانہ گھڑا۔
"سچ بتاؤں مریم! کبھی کبھی مجھے کساء سے بہت ڈر لگتا ہے۔" عائشہ نے چائے کپ میں ڈالی۔
"تجھے پتہ ہے عائشہ؟ جس دن کساء کو آگ لگی تھی۔ میں اس کو بچانے کے لئے آگے بڑھی تو اس آگ میں مجھے ایک عکس نظر آیا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال کندھوں تک لٹک رہے تھے۔ وہ غالباً کسی مرد کا عکس تھا۔ جو آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے یہ بات کساء کو ابھی تک نہیں بتائی۔" مریم کے چپس ختم ہو گئے تھے اور اب وہ شیلف سے کود کر کولڈ ڈرنک لینے کی غرض سے فریج کی جانب بڑھی تھی۔ اتنے تک عائشہ اپنے بھائی جان کو چائے دے کر واپس آ چکی تھی۔
"اور تجھے یاد ہے مریم؟" اویس کے ساتھ منگنی کے موقع پر کیسے اس نے مہمان عورتوں کو چونکا دیا تھا؟"
"ہاں خواتین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اویس کے لان میں بیٹھی بنی سنوری کساء کوئی آسمانی حور لگ رہی تھی۔ منگنی کی رسم ادا ہو چکی تھی اور اب مٹھائی کھلائی جا رہی تھی۔
اسی اثناء میں ایک بھکارن کمزور سا ننگا بچہ گود میں اٹھائے سب کے سامنے ہاتھ پھیلا رہی تھی۔ مگر سبھی خواتین اپنے زیورات، مہنگے کپڑوں اور تیز میک اپ سے ایک دوسرے کو جلیس کرنے میں مصروف تھیں۔ بھکارن کی طرف کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ جب وہ اسٹیج کے پاس سے گزرنے لگی تو کساء نے اسے پکارا۔
"ذرا سنیے۔" کساء کے پکارنے پر سبھی خواتین اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔ اس نے مہندی لگے ہاتھوں سے اپنا چھوٹا سا پرس کھولا۔ اور سلامی کے دیئے گئے پیسوں میں سے نیلے رنگ کا کڑکڑاتا نوٹ نکال کر بھکارن کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ سبھی خواتین کساء کے اس عمل پر انگشت بدنداں رہ گئیں۔
"ہاں ہاں عائشہ! یاد ہے مجھے۔ بہت عجیب عادتیں ہیں کساء کی۔ اور میں تو وہ عکس بھلا ہی نہیں سکتی، جو اس دن آگ میں دیکھا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے، اس پر کسی کا سایہ ہے۔" مریم نے پیش گوئی کی۔ جس پر عائشہ نے بھی اکتفا میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

"مریم اور عائشہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتی ہیں؟ جب بھی فون کرتی ہوں، گھر پر ہی نہیں ہوتیں۔" لان میں چہل قدمی کرتی ہوئی کساء کے من میں بے شمار سوالات اٹھ رہے تھے۔
معاً اسے گلاب کے خوبصورت گملے میں کچھ مردہ ٹہنیاں نظر آئیں۔ گل شیر سے قینچی منگوا کر وہ وہیں بیٹھ گئی اور مردہ ٹہنیاں الگ کرنے لگی۔ اسی لمحے ان خاردار ٹہنیوں میں سے ایک کانٹا اس کے ہاتھ میں چبھ گیا۔ اور خون کا ایک قطرہ سا نکل آیا۔ ایک سسکی سی اس کے منہ سے نکلی۔
"کیا ہوا بی بی جی؟" پاس ہی پودوں کو پانی دیتے گل شیر نے پائپ پھینکا اور بھاگ کر اس کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر معمولی سے ابھر آنے والے زخم کو پریشان نظروں سے دیکھنے لگا۔
دفعتاً ہی کساء کو یہ احساس ہوا کہ اس کا ہاتھ کسی

اٹھارہ سال کے لڑکے کے ہاتھوں میں نہیں ہیں۔ وہ تو کوئی دوضعیف سے ہاتھ تھے۔ جن کی نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ انگلیوں میں چاندی کے کچھ گھسے ہوئے بے رنگ چھلے تھے اور کلائیوں میں سبز رنگ کے کڑے پہن رکھے تھے۔

کساء نے گھبرا کر ہاتھ پیچھے کیا اور اس کے ہاتھوں کی سیدھ میں اس کے چہرے کی جانب دیکھا۔ مگر وہ تو گل شیر ہی تھا جو معصومیت سے پلکیں جھپکا کر حیرت سے اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

کساء نے گھبرا کر دوبارہ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ مگر اب تو وہ اپنی اصلی حالت میں ہی تھے۔ سو فیصد گل شیر کے اپنے ہاتھ...... وہ ہیجان انگیز کیفیت میں اٹھی اور بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ گل شیر اسے پکارتا رہ گیا۔

دوپہر شام میں ڈھل چکی تھی۔ سرمئی اندھیرے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ سارا دن آوارگی میں گزارنے والی بکریاں اب اپنے مالکان کی سربراہی میں اپنے گھروں کو لوٹ رہی تھیں۔ گھروں کے باہر ننھے بلب اب جل اٹھے تھے۔

وہ جانے کتنی دیر تک سوئی رہی۔ کروٹ بدلی تو یونہی اس کی نظر وال کلاک پر پڑی۔ جہاں شام کے سات بج رہے تھے۔

''اوہ مائی گاڈ! میں اب تک سوتی رہی؟'' وہ گھبرا کر اٹھی۔ سلیپر پہنے اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو گل شیر کو دیکھ کر ٹھٹکی، جو اس کے دروازے کے ساتھ ہی، گھٹنوں میں سر دیئے، سمٹا ہوا بیٹھا تھا۔

''کیا ہوا گل شیر؟'' اس نے جمائی لیتے ہوئے اپنے بالوں کو کیچر میں باندھا۔

اس کے پکارنے پر گل شیر نے اپنا سر اٹھایا۔ وہ بہت غمگین لگ رہا تھا۔ ٹوٹے ہوئے انداز میں وہ اٹھا اور لاؤنج کی طرف چلنے لگا۔

کساء بھی ناسمجھی کے عالم میں اس کے پیچھے چل دی۔ لاؤنج میں کوئی بھی نہیں تھا۔

''کیا ہوا گل شیر؟ بتاتے کیوں نہیں ہو؟'' کساء کو ایکدم غصہ آ گیا۔ مگر جواب میں گل شیر کی خاموشی ہنوز برقرار تھی۔

پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھا اور کوئی نمبر ڈائل کر کے فون کساء کی طرف بڑھا دیا۔ کساء جو پہلے ہی حیران تھی، اب مزید حیرت میں ڈوب گئی۔ تاہم کچھ سوچ کر اس نے ریسیور پکڑ لیا۔

''ہیلو جی کون؟'' وہ الجھن بھری آواز میں بولی۔

''آئی ایم ڈاکٹر رفیق فرام ہمدرد ہاسپٹل۔ آپ کساء خالد بات کر رہی ہیں؟''

دوسری طرف ڈاکٹر رفیق C.L.I پر کساء کا نمبر دیکھ کر پہچان گئے تھے۔ آخر کو وہ ان کے فیملی ڈاکٹر تھے۔

''یس...... آئی ایم...... مگر ڈاکٹر صاحب......؟''

وہ ابھی بھی حیرت و کشمکش میں مبتلا تھی۔

''دیکھیں کساء صاحبہ! شاید آپ نے اپنا ٹی وی آن نہیں کیا ہوا ہے؟ شہر میں بہت بڑا بم بلاسٹ ہو گیا ہے۔ کافی جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ ہمارے ہاسپٹل تک پہنچنے والی چند ڈیڈ باڈیز میں؟'' ڈاکٹر رفیق خاموش سے ہو گئے۔

''آگے بولیں ڈاکٹر صاحب۔'' اس کے ریسیور پکڑے ہاتھ میں کپکپی سی ہونے لگی۔

''یور فادر از ڈیڈ، ان بم بلاسٹ۔'' ڈاکٹر رفیق کے الفاظ کساء پر بجلی بن کر برسے۔ آسمان کی گہرائیوں کی چیر دینے والی چنگھاڑ اس کے منہ سے نکلی اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح زمین پر گر پڑی۔

☆......☆......☆

''خالد کاٹیج'' پر سوگواریت کا عالم طاری تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ آہوں کی آوازیں فضا پر چھائی ہوئی تھیں۔

''ان کا نوکر تھا۔ وہ کہاں ہے؟'' ایک عورت نے آنسو پونچھتے ہوئے دوسری عورت سے پوچھا۔

پتہ نہیں! وہ اچانک کہاں غائب ہو گیا ہے؟''

دوسری عورت نے جواب دیا۔

بین کی آوازوں میں اس وقت شدت آ گئی۔

جب آخری سفر پر لے جانے کے لئے دونوں جنازوں کو اٹھایا جانے لگا...... خالد قیوم اور کساء کے جنازوں کو۔ دونوں باپ بیٹی نے زندگی اور موت کا سفر ایک ساتھ کیا۔

گلی میں ایک ہجوم اکٹھا تھا۔ باپ اور بیٹی کے جنازے، آگے پیچھے جا رہے تھے۔ گلی پار کی تو سیاہ رنگ کا نحیف سا کتا جنازوں کو گردن اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت بے چین دکھائی دے رہا تھا۔ آگے بڑھنے والے لوگ حیرت سے اس کتے کی آنکھوں میں موجود نمی کو دیکھ رہے تھے۔ وہ سخت بے قراری کے عالم میں تھا اور کساء کے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

خالد قیوم اور کساء کی قبریں ساتھ ساتھ ہی بنائی گئی تھیں۔ نماز جنازہ کے بعد انہیں قبروں میں ڈالا گیا۔ فارغ ہو کر سب لوگ قبرستان کے گیٹ سے نکل آئے۔ اس بات سے بے خبر کہ سیاہ کتا کساء کی قبر کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔

شام کی تاریکی بڑھنے لگی اور شہر خموشاں اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔

کساء کو آکسیجن میں دقت کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ مگر سوائے گھٹا ٹوپ اندھیروں کے کچھ نہ تھا۔ وہ دیکھنے سے قاصر تھی۔ اس نے پاگلوں کی طرح ادھر ادھر ہاتھ مارے تو اس کا ہاتھ اوپر رکھے لکڑی کے تختوں سے ٹکرایا۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اس وقت قبر میں تھی اور اس کے جسم پر کفن لپٹا ہوا تھا۔

اس کے بال ابھی گیلے تھے۔

خوف سے اس کی آنکھیں پھٹنے لگیں۔ دفعتاً ہی اسے سانس میں رکاوٹ ہونے لگی اور بری طرح سے اس پر کھانسی کا دورہ پڑنے لگا۔

لاالٰہ الا انت سبحنک انی کنت من الظٰلمین

''یا اللہ! آپ نے قرآن پاک میں کہا ہے کہ اس آیت کریمہ کے ساتھ دعا مانگنے والے کی ہم مدد کریں گے۔ میری مدد کیجئے یا اللہ۔ اگر آپ کو میرا کوئی کام پسند آیا ہے تو میری مدد کیجئے۔'' کساء کا دم گھٹنے لگا تھا۔ کھڑکھڑاتی آواز اور ماند پڑتی سانسوں کے ساتھ وہ مسلسل آیت کریمہ کا ورد کیے جا رہی تھی۔

معاً اسے قبر کے اوپر سے کچھ سرکنے کی آوازیں آنے لگیں۔

رحمت باری تعالیٰ کا نزول شروع ہو گیا تھا۔

قبر کے اوپر ڈالی گئی مٹی تیزی سے سرک رہی تھی۔

ایک زوردار آواز کے ساتھ لکڑی کے تختے ہٹ گئے۔ چاند کی چاندنی چھن چھن کر کساء پر برسنے لگی۔ اس کی اکھڑتی سانسوں کو جیسے قرار سا آ گیا۔ اور اس کا سانس بحال ہونے لگا۔

اور پھر کسی نادیدہ قوت نے اسے قبر میں سے نکال کر اوپر بیٹھا دیا۔

جہاں سیاہ کتا اس کا منتظر تھا۔ جس نے زندگی کے ہر کٹھن موڑ پر اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ دیوانہ وار کتے کی طرف بڑھنے ہی لگی تھی کہ کتے کے گرد سفید دھواں سا اکٹھا ہونا شروع ہو گیا۔ جب دھواں چھٹا تو کساء مبہوت رہ گئی۔

اس کے سامنے ایک نورانی چہرہ بزرگ کھڑے تھے۔ جن کا برسوں قبل انتقال ہو چکا تھا۔ وہ اپنی زندگی میں روز کساء کی گلی میں آتے تھے اور روز ہی وہ انہیں کھانا کھلاتی تھی۔ ویسے بھی یہ کساء کی عادت تھی کہ وہ کسی فقیر کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتی تھی۔

''بابا آپ......!'' سفید کفن میں لپٹی کساء حیرت سے بولی۔

''رب کا شکر ادا کرو بیٹی......! جس کی عطا ہماری خطا سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ جس نے تجھ پر رحم کیا۔ اس کی بارگاہ میں تیری وہ نیکی قبول ہوئی جو تو ہر راہ چلتے سائل پر کرتی تھی۔ تجھے علم ہے بیٹی؟ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے پوچھے گا۔''

''ایک روز میں تیرے گھر کچھ مانگنے آیا تھا، پر تو نے مجھے دھتکار دیا تھا۔''

بندہ حیران ہو کر کہے گا۔ ''اے رب کائنات! آپ تو ارض و سماء کے مالک ہیں۔ میری اوقات آپ کے آگے کچھ بھی نہیں۔ آپ کیونکر میرے گھر کچھ مانگنے آ سکتے ہیں؟''

اس پر رب باری تعالیٰ فرمائے گا۔ ''میرا فلاں بندہ

سائل بن کر تیرے گھر آیا تھا۔ تو نے اسے دھتکار دیا تھا۔ تو نے میرے بندوں کو نہیں بلکہ سمجھ لے کہ مجھے دھتکارا تھا۔"

"کساء کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"جا بیٹی! رب کائنات نے تجھے زندگی دی۔ اس کے احکام کی تعمیل یونہی کرتی رہنا۔ جو رب کائنات کے احکام پر عمل پیرا رہتا ہے تو رب کائنات اس کا محافظ بن جاتا ہے۔ اور اس کی حفاظت کے لئے زمین پر وسیلے بنا دیتا ہے۔" بزرگ کا وجود روشنی کے سفید ہالے میں لپٹا ہوا تھا۔

"تو اس کا مطلب ہے بابا، کہ وہ سیاہ کتا اور گل شیر کے روپ میں آپ ہی تھے۔ کساء کو گل شیر کے ہاتھوں کا اچانک بدلنا اور کتے کی مدد کے مختلف واقعات یاد آنے لگے۔

میری اتنی بساط کہاں بیٹی؟" یہ تو اس رب کی دین ہے کہ اس نے تیری حفاظت کے لئے مجھے وسیلہ بنایا۔

"اب جا...... اپنے گھر لوٹ جا۔" روشنی کے ہالے سے بزرگ کی آواز آرہی تھی۔

اپنے جسم سے لپٹی سفید چادروں کو سنبھالتے ہوئے وہ چلنے لگی تو بابا کی آواز پر اچانک رکی۔

"سن بیٹی! چونکہ آج تجھے میری حقیقت کا علم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب میں کبھی تیرے سامنے نہیں آؤں گا...... اپنے کسی بھی روپ میں نہیں...... مگر ایک بات کا یقین تو ہر وقت رکھنا کہ اوپر آسمانوں پر بیٹھا رب تیرے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور اپنے نیک کاموں کی وجہ سے تو ہر وقت اس کی حفاظت کے حصار میں رہے گی۔"

"اب تو اپنی آنکھیں بند کر لے۔" کساء نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تو اسے لگا کہ وہ ہوا میں تیر رہی ہے، تھوڑی دیر بعد اس کے قدم زمین پر ٹک گئے۔ تو بزرگ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹی اپنی آنکھیں کھول لے۔"

اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ اپنے گھر کے دروازے پر موجود تھی، اور بزرگ غائب تھے۔

"تم لوگ کساء اور اس کے والد کی تعزیت کے لئے نہیں گئے؟" مغرب کی نماز ادا کر کے صباء نے جائے نماز سمیٹتے مریم اور عائشہ سے پوچھا۔

"ان کے گھر اب ہے ہی کون؟ ہم کس سے تعزیت کرنے جائیں؟" عائشہ نے نظریں چرائیں۔

"ارے بھئی! ان کے باقی رشتہ دار تو ہیں ناں۔ ان سے جا کر تعزیت کر آؤ۔" صباء سر پر سلیقے سے بندھا دوپٹہ کھولنے لگی۔

"ہم وہاں نہیں جانا چاہتے صباء۔" مریم نے گفتگو میں مداخلت کی۔

"بٹ وائے؟" صبا کو تشویش ہوئی۔

"وجہ تمہیں پتا ہے صباء۔ ہم نے نہیں جانا ان پراسرار مکینوں کے پراسرار گھر میں۔" عائشہ کشن بیڈ پر رکھ کر مریم کے برابر میں ہی لیٹ گئی تھی۔

"فرسٹ آف آل......! دے آر ڈیڈ ناؤ۔ ان کے متعلق تمہیں عزت سے بات کرنی چاہیے۔ اینڈ سیکنڈ لی کہ وہ تم دونوں کی دوست تھی، بلکہ عائشہ کی تو بیسٹ فرینڈ تھی وہ۔" صباء رسائی سے انہیں سمجھاتے ہوئے بولی۔

"دوست ہی تو تھی۔ کون سا خون کا رشتہ تھا ہمارا اس سے؟" اکتاہٹ کا شکار ہوتے ہوئے مریم نے اٹھ کر کراؤن سے ٹیک لگالی۔

"رشتہ خون کا ہو...... اعتماد کا ہو...... یا پھر دوستی کا...... ہوتا رشتہ ہی ہے۔ اور رشتے کا مفہوم جانتی ہو تم؟ یہ ایک بندھن ہوتا ہے، جس میں انسان آپس میں بندھ جاتے ہیں۔ گو کہ اس کی ڈوریاں بہت نازک ہوتی ہیں۔ جسے ہمیں بدلتے وقت کے ساتھ مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ ہماری ایک دوسرے کے لئے محبت، فکر، توجہ، لگن اور دوستی کے جذبات، رشتوں کے ان نازک ڈوریوں کو مضبوطی اور پائیداری بخشتے ہیں۔" صباء ان دونوں کے پاس بیڈ پر ہی آ کر بیٹھ گئی تھی اور دوبارہ اپنی بات شروع کی۔ "کساء تم دونوں کی دوست تھی۔ پہلے ہی تم نے اسے، اس کی زندگی کے آخری دنوں میں اگنور نیس دی تھی۔ اب ایسا مت کرو۔ کساء کے گھر رشتہ دار رکے ہوئے ہوں گے۔ وہاں جا کر تعزیت کرو۔ واپس آ کر اس کے لئے کچھ ایصال ثواب کرو۔ تم یہ عمل اللہ کی خوشی کے لئے کرو۔ دیکھنا اللہ تم سے کتنا خوش ہوگا۔" پرنور چہرے کے ساتھ ایسی باتیں کرتی صبا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ مریم اور عائشہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھ کر کوئی بات طے کی اور اگلے ہی لمحے وہ اپنے ڈرائیور کے ہمراہ کساء کے گھر کی جانب رواں دواں تھیں۔

وہ گاڑی سے اتر کر گھر میں چلی گئیں۔ پورے گھر کا بغور جائزہ لینے کے بعد وہ دونوں آرام دہ صوفے پر بیٹھ گئیں۔ اسی لمحے ڈور بیل بجی۔ مریم اور عائشہ کو بہت حیرت ہوئی۔

"یہ کون آ گیا اس ٹائم؟" شاید گارڈ کوئی چیز بھول گیا ہے۔" مبالغہ آرائی کرتی مریم نے جا کر دروازہ کھولا تو اس کا رنگ ایکدم اڑ گیا۔

سامنے سفید چادروں میں لپٹی کساء اپنے بال سفید کفن پر پھیلائے کھڑی تھی۔

"مریم میری جان!" پرنم آنکھوں کے ساتھ فرط جذبات سے لبریز ہو کر بازو پھیلائے وہ مریم کو گلے لگانے کے لئے آگے بڑھی مگر مریم تو کب کی بے ہوش ہو کر نیچے گر چکی تھی۔ ابھی وہ نیچے بے ہوش پڑی مریم کو ہی دیکھ رہی تھی کہ اسے گلدان نیچے گرنے کی آواز آئی۔ آواز کی سمت میں جو اس نے گردن موڑ کر دیکھا تو عائشہ کے کپکپاتے ہاتھوں نے ٹیبل کا سہارا لیا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ عائشہ کی طرف بڑھتی، عائشہ بھی چکرا کر نیچے گر پڑی تھی۔

☆......☆......☆

"ہارٹ اٹیک اور انجائنا کی طرح یہ بھی دل کا خاص قسم کا دورہ ہوتا ہے۔ جس کے پڑنے پر وقتی طور پر انسان کے تمام جسمانی نظام مکمل طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں اور لوگ اسے مردہ گمان کرنے لگتے ہیں۔ لیکن کچھ وقت کے بعد اس انسان کو ہوش آجاتا ہے۔ جسمانی نظام کے مفلوج ہونے کا پیریڈ لمبا بھی ہو سکتا ہے اور چھوٹا بھی۔ یہ مریض کی طبی صحت پر منحصر کرتا ہے۔ ویسے کساء آپ جیسی لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ لگتا ہے اللہ کا خاص کرم ہے آپ پر۔ اینی ویز میں چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھیے گا۔" ڈرائنگ روم میں بیٹھے ڈاکٹر رفیق، کساء کے اٹیک کے متعلق بریفنگ دے رہے تھے۔ جبکہ مریم، عائشہ اور کساء بیٹھی انہماک سے سن رہی تھیں۔

"موسم خراب ہو رہا ہے۔ چل مریم گھر چلتے ہیں۔" عائشہ نے چادر اوڑھی۔ مریم اس کی تائید کرتے ہوئے چادر اوڑھنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چھما چھم بارش شروع ہو گئی۔ بجلی کڑکنے لگی اور بارش کے ساتھ ساتھ تیز طوفان نے بھی زور پکڑ لیا۔

"بارش تھم جائے گی تو چلے جانا۔ میں جا کر پکوڑوں کے لئے بیسن گھولتی ہوں۔ کساء کچن میں چلی گئی۔ جبکہ مریم اور عائشہ ٹی وی آن کر کے دیکھنے لگیں۔

"موسم بہت زیادہ خراب ہو گیا تھا۔

تیز گرم گھی میں کساء پکوڑے تل رہی تھی کہ اسے گلی میں آواز آئی۔

"اللہ کے نام پر دے دے بابا۔ جو دے اس کا بھی بھلا۔ جو نہ دے اس کا بھی بھلا......"

کساء نے جلدی سے پیسے نکالے اور پکوڑے ایک پلیٹ میں ڈال کر باہر جانے لگی۔

"تم پاگل ہو گئی ہو کساء؟ گہرے سیاہ رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں تم نے۔ آسمانی بجلی کی کڑک سن رہی ہو تم؟ پتہ بھی ہے یہ کتنا اٹریکٹ ہوتی ہے سیاہ رنگ کی طرف۔" عائشہ نے کساء کو روکنے کی کوشش کی۔ مگر کساء نے مسکراتے ہوئے سیاہ دوپٹہ سر پر رکھا اور تقریباً بھاگتی ہوئی گیٹ کی طرف گئی۔

گرم پکوڑے اور پیسے لے کر فقیر نے اسے بہت دعائیں دیں اور ایک طرف چل دیا۔

اندر کمروں کی طرف لوٹتے ہوئے، تیز بارش اور کڑکتی بجلیوں کی زوردار آوازوں میں اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا جہاں اس کا رب بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کر رہا تھا۔

"بے شک میرا محافظ، عبادت کے لائق ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔" کساء نے سوچا اور اندر کی طرف چل دی۔

بلیک ٹائیگر

ایم الیاس

قسط نمبر 6
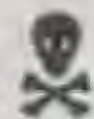
دہشت اور خوف کے افق پر جھلمل کرتی زیر زمین کے عجیب و غریب قانون کے لبادے میں لپٹی ہوئی، ناقابل یقین اور ناقابل فراموش، رگ و پے میں خون کو منجمد کرتی، لرزیدہ لرزیدہ تھرا دینے والی، خوف کا دریا بہاتی، دل میں کسک پیدا کرتی، اپنی نوعیت کی انوکھی اور شاہکار کہانی۔

تجسس اور سسپنس سے بھرپور واقعات جو پڑھنے والوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیں گے

فرخندہ ایک ٹرالی دھکیلتی ہوئی آئی۔ وہ نہ صرف کافی بنا کر لائی تھی بلکہ ابلے ہوئے انڈے، کاجو اور سینڈوچز بھی بنا کر لائی تھی، اس سے اندازہ ہوا کہ فرخندہ بڑی سلیقہ مند اور سگھڑ ہے، اس کے علاوہ مہمان نواز بھی ہے۔

وہ کافی پی رہا تھا کہ عاصم اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی وسیم پیالی تپائی پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"ہیلو عاصم......!" اس نے رسمی انداز سے کہا۔

"وسیم کو دیکھتے ہی وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اگلے لمحے اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

"تم......؟" عاصم کی آواز مرتعش ہو رہی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے کہ تم نے مجھے فوراً ہی پہچان لیا میرے پیارے دوست......؟" وسیم اس کی طرف دیوانہ وار بڑھا۔ "ہم پورے سات برس...... سات دن...... اور سات گھنٹے کے بعد مل رہے ہیں...... یہ حساب تو تمہیں بھی یاد ہوگا؟"

"تم یہاں کیوں آئے ہو...... کس لئے آئے ہو......؟" عاصم خود پر قابو پا کر ہذیانی لہجے میں چیخا۔

"اس لئے آیا ہوں کہ ہم دیرینہ دوست ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "کیا دوستوں سے ملنا نہیں چاہئے...... جب کہ لوگ دشمنوں سے بھی مل لیتے ہیں۔ دشمنی بھلا کر......"

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں......؟" وہ وسیم کو قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا۔ "تم نے کیسے پتا چلا لیا؟"

"ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔" وسیم نے بڑے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "جب کہ تم انسان ہو۔ تمہیں تلاش کرنا کون سا مشکل ہے؟"

"تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا کہ یہاں کس لئے آئے ہو؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"میں یہاں تمہاری تلاش میں آیا تھا...... یہ تم اچھی طرح سے جانتے ہو۔" وسیم نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں اپنے حصے کی رقم سود در سود وصول کرنے آیا ہوں...... پورے سات برسوں کا۔"

"کوئی حصہ نہیں ہے...... کوئی رقم نہیں ہے...... میرے پاس......" وہ بہت زور سے دھاڑا۔ "تمہاری بہتری اس میں ہے کہ جس طرح آئے ہو اسی طرح واپس چلے جاؤ...... ورنہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"ورنہ کیا......؟" وسیم نے بڑے پرسکون لہجے
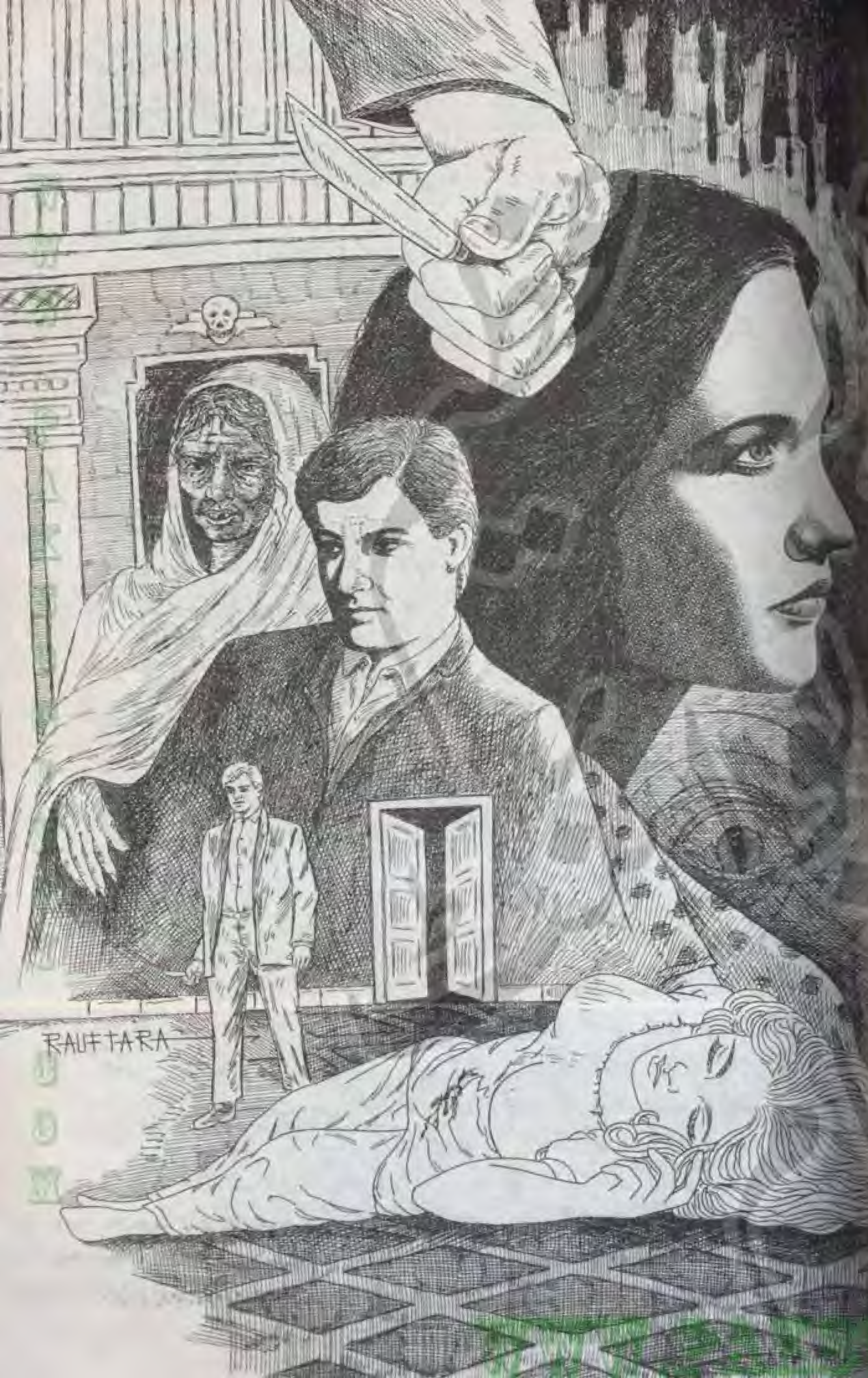
میں کہا۔ ”اپنا جملہ پورا کرو تا کہ میں بھی جان لوں کہ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”تم بدمعاشی پر اتر آئے ہو......؟ میں تمہاری ساری بدمعاشی نکال دوں گا۔“ عاصم نے فضا میں مکا لہرایا۔

”تم نے اپنی پہلی بیوی فردوس کا سات لاکھ کا بیمہ کرایا تھا۔“ وسیم کہنے لگا۔ ”تم نے مجھے اس بات پر تیار کیا کہ میں فردوس کو قتل کردوں تو بیمے کی رقم چودہ لاکھ ٹاکا ملے گی۔ اس میں سے دونوں ففٹی ففٹی کرلیں گے...... فردوس کی جو ڈیڑھ کروڑ ٹاکا کی جائیداد ہے اس میں سے پچیس فیصد دوں گا...... جب میں نے تمہارے کہنے پر فردوس کو قتل کردیا تو تم نے مخبری کرکے میرے خلاف شواہد پیش کرکے مجھے پھنسادیا۔ پھر اپنی مرحومہ بیوی کی ساری دولت سمیٹ کر چٹا گانگ آ گئے اور ایک معصوم اور نیک سیرت عورت سے شادی کرلی اور......“

”بکواس بند کرو۔“ عاصم کرخت لہجے میں بولا۔ ”تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟ تمہاری یہ آرزو پوری نہ ہوگی۔“

”میرے شوہر ایسے نہیں ہیں......“ فرخندہ اپنے شوہر کے پاس جاکر کھڑی ہوئی...... اس کا چہرہ ہلدی کی طرح ہورہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا تھا۔ ”آپ ان پر بہتان نہ لگائیں۔“

”کاش......! آپ کے شوہر نامدار ایسے نہ ہوتے......“ وسیم نے فرخندہ کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کرکے کہا۔ ”آپ کے سرتاج نہ صرف ایک خبیث شخص ہیں بلکہ درندہ صفت بھی ہیں...... آپ درمیان میں نہ بولیں...... بس خاموشی سے ہماری باتیں سنتی جائیں تاکہ اس کا اصلی اور گھناؤنا چہرہ آپ کو نظر آسکے...... اس ذلیل شخص نے اپنے مستقبل کے لئے مجھے بھینٹ چڑھادیا...... اس نے میری زندگی تاریک کردی...... بلکہ میں نہ صرف نیلوفر بلکہ ایک اچھی زندگی سے بھی محروم ہوگیا۔ ایک برا آدمی بن گیا...... ایک قاتل...... اس عورت کا چہرہ میری نظروں میں جب بھی گھومتا ہے تو میرا ضمیر ملامت کرتا ہے کہ میں نے اپنا مستقبل بنانے کے لئے ایک عورت کو قتل کردیا۔ صرف دولت کی خاطر...... بہرکیف آج میں اپنے دولت مند دوست سے حساب بے باق کرنے آیا ہوں...... آج اس کمینے شخص کو حساب دینا ہوگا۔“

”میں کہتی ہوں آپ یہاں سے چلے جائیں......“ فرخندہ نفرت اور غصے سے کانپنے لگی۔ پھر وہ ہیجان زدہ لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ نہیں گئے تو پھر میں پولیس کو فون کرکے بلالوں گی۔“

”آپ مجھے پولیس کی دھمکی نہ دیں۔“ وسیم نے کہا۔ ”اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا...... میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ البتہ آپ کے شوہر بہت بڑی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔“

”میں کہتا ہوں کہ تم یہاں سے جاتے ہو کہ نہیں......؟“ عاصم نے اپنا مکا فضا میں لہرایا۔ ”تم نے ذرا بھی بکواس کی تو تمہارا منہ توڑ دوں گا...... تمہارے سارے دانت باہر آجائیں گے۔“

وسیم کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ تصویریں نکالیں۔ ان پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس نے وہ تصویریں فرخندہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ کل سات عدد تصویریں ہیں...... یہ آئینہ ہیں...... اس میں آپ کو آپ کے شوہر کا اصل چہرہ صاف نظر آجائے گا......“

فرخندہ نے اس کے ہاتھ سے تصویریں لے لیں...... وہ ایک ایک تصویر کو بہ غور دیکھنے لگی۔ عاصم بھی دیکھنے لگا۔ فرخندہ کے چہرے پر ایسی حیرت تھی جیسے اسے یقین نہ آیا ہو...... ادھر عاصم کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ پھر وہ سنبھل کر بڑے زور سے چیخا۔ ”تم نے کمپیوٹر پر جعل سازی کرکے یہ تصویریں بنائی ہیں تاکہ مجھے بلیک میل کرسکو۔ تم ایک جعل ساز شخص ہو۔“

”اس میں کوئی جعل سازی نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”ان تصویروں کو دیکھ کر تمہارا چہرہ فق کیوں ہورہا ہے......؟ یہ تصویریں جعلی ہیں تو......؟ تم کسی تصویر کو بھی جھٹلا نہیں سکتے......؟“

”کمپیوٹر کے دور میں ایسی تصویریں بنانا کچھ مشکل نہیں ہے۔“ عاصم نے کہا۔ ”ہر قسم کی بے ہودہ تصویریں بنائی جاسکتی ہیں۔“

”یہ تم اپنے دل اور ضمیر سے پوچھو کہ یہ جعل سازی ہے یا حقیقت......؟“ وسیم نے کہا۔ ”تم مجھے اور اپنی بیوی کو ان باتوں سے دھوکا دے سکتے ہو۔ لیکن اپنے ضمیر کو نہیں...... ایمان داری سے بتاؤ کہ کیا ان تصویروں کے مناظر تمہاری نظروں میں نہیں گھوم رہے ہیں؟“

”ہاں...... میرے شوہر سچ کہہ رہے ہیں کہ یہ جعل سازی ہے۔“ فرخندہ نے اپنے شوہر کی تائید کرتے ہوئے تصویریں پھاڑ کے فرش پر پھینک دیں۔ ”میرے شوہر ایسے نہیں ہیں۔ اگر یہ ایسے شخص ہوتے تو کیا مجھے ان چھ سات برسوں میں پتا نہیں چل جاتا؟“

”آپ کے یہ مجازی خدا کیا ہیں...... میں بتاتا ہوں۔“ وہ کہنے لگا۔ ”آپ کے سرتاج نے پھر وہی منصوبہ بنایا ہے جو میرے ساتھ مل کر سات برس پہلے بنایا تھا...... وہ منصوبہ ان کی پہلی بیوی کے خلاف تھا۔ اب یہ انہوں نے آپ کے خلاف بنایا ہے...... چمپا کے حسن و شباب کے اسیر ہوکر آپ کو راستے سے ہٹادینا چاہتے ہیں۔ جب کہ آپ اس بدچلن عورت سے کہیں حسین ہیں۔ آپ کی سات لاکھ کی زندگی کی بیمہ پالیسی ہے۔ زیادہ مالیت کی پالیسی نہیں لی کہ کہیں پولیس اور بیمہ کمپنی کو شک نہ ہوجائے۔ آپ کو موت کی نیند سلانے کی صورت میں نہ صرف چودہ لاکھ کی رقم بیمہ پالیسی سے ملے گی اور ساتھ ہی آپ کی سات کروڑ کی کوٹھی بھی مل جائے گی، اس منصوبے کے تحت آپ کو یہاں لایا گیا ہے۔“

عاصم بھونچکا ہوکر رہ گیا۔ وہ دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ اس منصوبے کی وسیم کو ہوا کیسے لگی......؟ یہ تو جیل میں تھا۔ ابھی رہا ہوکر آیا ہے۔ یہ شیطان غیر متوقع طور پر کہاں سے آٹپکا...... فرخندہ کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔

”یہ سچ ہے کہ میری زندگی کا بیمہ کیا گیا ہے تاکہ میری بیٹی کی شادی کے وقت کام آسکے۔“ فرخندہ پھنسی آواز میں بولی۔

”تم یہاں سے جاتے ہو کہ نہیں......؟“ عاصم نے طیش میں آکر کرسی اٹھالی تاکہ اس کے سر پر دے مارے۔

وسیم نے اپنی جیب سے ریوالور نکال کر اس کا رخ عاصم کی طرف کیا تو اس نے خوف زدہ ہوکر کرسی واپس رکھ دی۔ وسیم نے فرخندہ سے کہا۔

”نیک بی بی......! چمپا بھی یہاں ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے اور ساتھ ہی جانو بدمعاش بھی ہے جسے فرشتہ اجل بنا کر لایا گیا ہے۔ تاکہ آپ کو موت کی نیند سلا سکے۔“

”کیا یہ سچ ہے عاصم......؟“ فرخندہ نے گھوم کر کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”یہ سب کچھ جھوٹ ہے......!“ عاصم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے ڈھال بنالیا۔ اس کی آواز بے جان تھی۔ ”یہ ڈھاکا کا خطرناک ترین بدمعاش ہے...... پیشہ ور قاتل ہے۔ دولت مندوں کو خوف زدہ کرکے دولت حاصل کرنا اس کا پیشہ ہے...... یہ بلیک میلر بھی ہے۔“

”میں تم سے رقم وصول کرنے نہیں آیا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”میں اس خودغرض دنیا میں رہنا نہیں چاہتا...... واپس جیل جانا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ جیل کی دنیا اس سے لاکھ درجے اچھی ہے...... میں وہاں قیدیوں کو پڑھاتا تھا۔ استاد بن گیا تھا۔ وہاں میرے بہت سارے شاگرد ہیں۔ انہیں اب پھر جاکر پڑھاؤں گا۔“

”آخر تم چاہتے کیا ہو......؟“ عاصم کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”تمہاری دولت......! میں تمہیں قتل کرنے کے ارادے سے آیا ہوں عاصم......!“ وہ سفاک لہجے میں بولا۔ ”میرے لئے تمہاری موت اب سب سے بڑی دولت ہے۔“

”نہیں...... نہیں......“ فرخندہ پوری طرح اپنے

شوہر کی ڈھال بن گئی۔ "یہ میرا سہاگ ہے...... میری معصوم بچی کا باپ ہے۔" اس نے گھبرا کر بچی کی طرف دیکھا۔ وہ کمرے میں نہیں تھی۔ "کہاں ہے میری بچی......؟" وہ بدحواس ہوگئی۔

"بچی...... آپ کے شوہر کے آنے سے پہلے کھلونے لے کر باہر چلی گئی تھی اور اب وہ ہٹ کے باہر بیٹھ کر کھیل رہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "یہ ایک لحاظ سے بہت ہی اچھا ہوا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ایک معصوم اور ننھی سی جان...... ذلیل ترین اور بے رحم باپ کو اپنی نظروں کے سامنے مرتا دیکھے۔ تڑپ تڑپ کر......"

فرخندہ کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کی حالت ایک مردے سے بھی بدتر ہو رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگی۔

"خدا کے لئے جتنی دولت چاہئے لے لو اور یہاں سے چلے جاؤ۔"

"میں یہاں دولت کے لئے نہیں آیا۔" وسیم کی آنکھوں سے درندگی جھانکنے لگی۔ "میں یہاں انتقام لینے کے لئے آیا ہوں...... میں قسم کھا چکا ہوں...... انتقام کی یہ آگ سات دن سے نہیں...... سات مہینے سے نہیں...... پورے سات برس سے میرے وجود میں بھڑک رہی ہے...... آج میں اس موقع کو کسی قیمت پر ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا...... بہتر ہے کہ آپ ابھی اسی وقت بچی کو لے کر چٹا گانگ چلی جائیں...... اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ "آپ نہیں جانتے کہ ایک عورت کے لئے اس کا سہاگ کتنا عزیز ہوتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں اس لئے کہ میں انسان ہوں...... مگر اس سہاگ سے آپ کا بیوہ ہوجانا بہتر ہے...... اس لئے کہ یہ کمینہ مجھ سے زیادہ سنگ دل شخص ہے...... یہ دولت اور ایک عورت کے لئے آپ کو قتل کردینا چاہتا ہے۔ اس لئے میں اس ناگ کو زندہ رہنے دینا نہیں چاہتا...... اس کا سر کچل دینا چاہتا ہوں۔"

"پھر ایسا کرو مجھے گولی مار دو اور میرے شوہر کو زندہ رہنے دو...... مجھے اپنے شوہر کی جان سب سے زیادہ عزیز ہے۔" وہ بے خوف لہجے میں بولی۔

وسیم نے حیران ہو کر فرخندہ کی صورت دیکھی۔ پھر اس نے عاصم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "عاصم......! کیا میں تمہاری بیوی کی درخواست قبول کرلوں......؟ تمہیں اعتراض تو نہیں؟"

"ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں......؟" وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں......"

"آپ نے دیکھ لیا اپنے شوہر کی خودغرضی...... آخر بلی تھیلے سے باہر آ گئی نا...... کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ زندہ رہے؟"

"چھوڑو ان باتوں کو...... مجھے قتل کردو اور چلے جاؤ...... مجھے قتل کرنے کے بعد تم میرے شوہر کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچاؤ گے...... اور انتقام کا خیال دل سے نکال دو گے۔"

"چلیے...... میں آپ کی بات مان لیتا ہوں...... لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط......؟" فرخندہ نے حیرت سے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

"آپ کو ایک خط لکھنا ہوگا جو پولیس کے نام ہوگا...... خودکشی کرنے کی وجہ شوہر کا ہرجائی پن بتانا ہوگا اور وصیت کریں گی کہ موت کے بعد میرا مکان کسی یتیم خانے کو دے دیا جائے۔" اتنا کہہ کر وسیم نے معنی خیز نظروں سے عاصم کی طرف دیکھا۔

"اس خط سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا......؟"

"ایک تو میں قتل کی سزا سے بچ جاؤں گا...... دوسرا پرسکون اور آزادی کی زندگی گزار سکوں گا۔"

"نہیں...... نہیں...... تم ایسا خط ہرگز مت لکھنا...... یہ تمہیں بے وقوف بنا رہا ہے۔" عاصم نے فوراً کہا۔

"اس خط کی وجہ سے تم چودہ لاکھ کی رقم سے محروم ہوجاؤ گے...... یہ رقم بیمہ کمپنی سے اس لئے تمہیں نہیں

لگے گی تمہاری بیوی نے خودکشی کی ہے۔"

"میرا مطلب یہ نہیں ہے۔" عاصم کی آواز لڑکھڑانے لگی۔

"پھر کیا بات ہے......؟" وسیم مسکرایا۔

عاصم بغلیں جھانکنے لگا۔ فرخندہ کاغذ اور قلم لے کر بیڈروم میں چلی گئی تو عاصم نے آہستگی سے کہا۔

"اگر تم فرخندہ کو قتل کر کے فرار ہوجاؤ اور وہ خط پولیس کو نہ دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ......!"

فرخندہ کو بیڈروم سے باہر آتے دیکھ کر عاصم نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ فرخندہ نے کھانے کی میز پر بیٹھ کر خط لکھا۔ پھر وہ خط لے کر وسیم کے پاس آئی تو اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے وسیم کی طرف خط بڑھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیں...... خط میں نے ٹھیک لکھا ہے نا......؟"

وسیم اس کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھنے لگا۔ اس لمحے وہ ذرا غافل ہوگیا تھا۔ فرخندہ نے ایک دم سے اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔ پھر ایک قدم تیزی سے پیچھے ہٹ کر اسے ریوالور کی زد میں لے لیا۔

"خبردار...... اپنی جگہ سے ہلنا نہیں......" وہ خشونت سے بولی۔

وسیم ایک لمحے کے لئے بھونچکا سا رہ گیا۔ عاصم نے اپنے حق میں بازی پلٹتے دیکھی تو وہ تیزی سے فرخندہ کی طرف بڑھا۔

"شاباش...... شاباش فرخندہ......! تم نے کمال کردیا۔"

"تم بھی اپنی جگہ کھڑے رہو۔" فرخندہ نے اس کی طرف ریوالور کا رخ کرتے ہوئے تیز و تند لہجے میں کہا۔

"میری بات تو سنو......!" عاصم رکا نہیں...... وہ فرخندہ کی طرف بڑھا۔ "یہ ریوالور مجھے دے دو۔ لیکن یہ بدمعاش......"

عاصم کا جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا کہ تھا کہ

دیہاتی

ایک دیہاتی سینما گھر میں فلم دیکھنے کے لیے آیا۔ دیہاتی پان کھا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اسے تھوکنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے پیچھے بیٹھے ہوئے آدمی سے پوچھا: "بھائی تھوکوں کہاں؟" اس نے جواب دیا:

اپنے آگے بیٹھے ہوئے آدمی کی جیب میں تھوک دو۔ دیہاتی نے کہا:

"اگر اسے پتا چل گیا تو؟" اس شخص نے کہا:

"بھائی! قسم دو، تمہیں پتا چلا تھا کیا؟"

(نعمان انصاری۔ کراچی)

ریوالور کی نال نے ایک شعلہ اگل دیا۔ عاصم اپنا سینہ پکڑ کے لڑکھڑانے لگا۔ گولی ٹھیک اس کے سینے پر دل کی جگہ لگی تھی۔ اس کا ہاتھ خون میں تربتر ہوگیا۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ لڑکھڑا کر فرش پر گرا اور دوسرے ہی لمحے اس نے دم توڑ دیا۔ اس کے فرش پر ڈھیر ہوتے ہی فرخندہ نے ریوالور فرش پر پھینک دیا۔ پھر صوفے پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

وسیم لمحے کے لئے دم بخود سا رہ گیا۔ یہ سب اچانک اور غیر متوقع ہوا تھا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسے یہ سب کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگ رہا تھا۔ دوسرے لمحے اس نے آگے بڑھ کر فرش پر سے ریوالور اٹھا لیا اور پھر اسے جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ فرخندہ کے پاس جا کر متحیر زدہ لہجے میں بولا۔

"یہ کیا کیا آپ نے......؟ ایک برے آدمی کو قتل کرنے کے بجائے آپ نے اپنے شوہر کو قتل کردیا۔ اپنا سہاگ اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑ دیا......؟"

"میں نے وہی کچھ کیا جو مجھے کرنا چاہئے

تھا......" فرخندہ سسکیوں کے درمیان بولی۔ "میں جانتی تھی کہ آپ مجھے قتل نہیں کریں گے...... میرے شوہر کو بھی نہیں...... مگر میرا شوہر ہم دونوں کو یقیناً قتل کر دیتا۔"

"مگر آپ تو تھوڑی دیر پہلے اپنے شوہر کی زندگی بچانے کے لئے اپنی جان دینے پر تیار ہو گئی تھیں......؟" وسیم کی حیرانی ابھی پوری طرح دور نہیں ہوئی تھی۔ "آپ نے اپنی زندگی قربان کرنے کے بجائے اپنے ہی ہاتھوں سے نہ صرف اپنا سہاگ بلکہ اس بچی کا سر کا سایہ بھی اجاڑ دیا؟"

"میں نے آخری وقت تک ایک پرانی اور لگی بندھی ڈگر پر چلنے والی عورت کی طرح اپنے شوہر کو شریف آدمی سمجھا تھا۔" وہ اپنی ساڑی کے پلو میں اپنے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے بولی۔ "آپ میرے نزدیک بلیک میلر اور پیشہ ور قاتل تھے...... بیڈ روم سے نکلتے وقت میں نے اپنے شوہر کی گفتگو سنی تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرا شوہر ایک خود غرض...... کینہ پرور اور درندہ صفت انسان ہے...... تب میں نے اپنے شوہر کو قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"آپ نے مجھے اپنا ارمان پورا کرنے نہیں دیا......" اس نے گہری سانس لی۔ "کتنا اچھا ہوتا ایک برا آدمی...... ایک برے آدمی کے ہاتھوں کیفر کردار تک پہنچتا۔"

فرخندہ نے دل گرفتہ لہجے میں کہا۔

"البتہ ساری زندگی اس بات کا دکھ رہے گا کہ میرا شوہر جسے میں نے ساری زندگی اپنا مجازی خدا...... سائبان اور اپنی ذات کا جزو سمجھا تھا کتنا بڑا ریاکار اور منافق تھا۔" اس نے رک کر گہرا سانس لیا۔ "آپ پولیس کو فون کر کے بلا لیں...... میں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں...... وہ کہنے لگا۔ "قانون کے حوالے اپنے آپ کو میں کروں گا۔ آپ قاتل نہیں...... قاتل میں ہوں۔"

"کیا......؟" فرخندہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ دوسرے لمحے وہ چونک کر بولی۔ "قتل کا الزام آپ اپنے سر لے رہے ہیں...... وہ کس لئے......؟"

"اس لئے کہ آپ کی معصوم بچی کو ماں کی سخت ضرورت ہے۔" وسیم نے جواب دیا۔ "یہ بچی اتنی بڑی دنیا میں اپنی ماں اور اس کی ممتا کے بغیر کیسے رہے گی......؟ کہاں جائے گی......؟ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ کی بچی کسی یتیم خانے میں پرورش پائے اور آپ ساری زندگی جیل کاٹیں اور آپ کی ممتا تڑپتی رہے؟"

"مگر وسیم صاحب......؟" فرخندہ پر سکتہ سا چھا گیا۔ وہ ساکت پلکوں اور منجمد آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ "قتل ایک سنگین نوعیت کا جرم ہے...... اس جرم کا ارتکاب میں نے کیا۔ آپ بے گناہ ہیں۔ مجرم میں ہوں جس کی سزا مجھے ملنا ہے...... آپ کو کیوں ناکردہ گناہوں کی سزا ملے؟"

"ہمارے ہاں عام طور پر بے گناہوں ہی کو سزا ملتی ہے...... یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اور پھر اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے...... میرے لئے جیل سے باہر اور جیل کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے...... یوں بھی میں سات برس کی جیل کاٹ کر رہا ہوا ہوں۔ اس لئے میں جیل واپس جانا چاہتا ہوں۔ وہاں کی زندگی سے مانوس بھی ہو چکا ہوں۔"

پھر وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھا۔ ٹیلی فون ڈائریکٹری اٹھا کر اس میں پولیس اسٹیشن کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

فرخندہ بڑی حیرت سے سوچ رہی تھی کہ آدمی کو بدلنے میں دیر نہیں لگتی...... ایک اچھا آدمی کتنا برا آدمی بن گیا...... ایک برا آدمی کتنا اچھا اور عظیم بن گیا...... ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب خود اس کے پاس نہیں تھا۔

☆......☆......☆

اسے جیل دوبارہ آ کر کوئی غم، صدمہ اور افسوس

نہیں ہوا تھا، بلکہ اسے خوشی ہوئی تھی کہ اس کا دشمن اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ اسے اور بھی زیادہ خوشی اس وقت ہوتی جب وہ اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کر دیتا اور ساری گولیاں ایک ایک کر کے اس کے جسم میں اتار دیتا۔ لیکن اسے قتل کرنے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی کیونکہ عاصم کی بیوی نے اپنے ہاتھوں سے بدکردار، ذلیل اور درندہ صفت شوہر کو کیفر کردار تک پہنچا دیا۔ وہ ایک عجیب سا کیف و سرور اور سرشاری محسوس کر رہا تھا جو اس نے اس سے پہلے شاید ہی محسوس کی تھی۔

عجیب سی بات اور اتفاق تھا کہ اسے اس مرتبہ پھر سات برس کی قید کی سزا ہوئی تھی۔ اس نے عدالت میں بیان دیا تھا کہ اس نے نفرت اور غصے اور انتقام میں آ کر خون کیا تھا۔ اب اگر اسے سزائے موت بھی دے دی جائے تو وہ خوشی سے قبول کر لے گا۔

سات مہینے گزرے تھے کہ ایک دن جیل میں بچوں کے وارڈ میں شارٹ سرکٹ سے آگ بھڑک اٹھی۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ جاگ رہا تھا۔ اس نے پہرہ دار سے کہا تھا کہ وہ کوٹھری کا دروازہ کھول دے تاکہ بچوں کو آگ میں جلنے سے بچا سکے۔ پھر وہ کوٹھری کا دروازہ کھلتے ہی کڑی کمان سے نکلے تیر کی مانند لپکا...... اس نے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے آگ سے ہوتا ہوا کوٹھری میں گھس گیا۔ اس نے چشم زدن میں پہلے چھ سات لڑکیوں کو...... پھر سات آٹھ لڑکوں کو...... جن کی عمریں بارہ سے پندرہ برس کی تھیں جلنے سے بچا لیا۔ وہ صرف معمولی طور پر جھلسے تھے۔ جب کہ وہ خاصا جھلس گیا تھا۔ اسپتال میں بیس دن زیر علاج رہا۔ حکومت نے نہ صرف تیس ہزار کا انعام دیا اور اس کے ایثار، جذبے اور خلوص سے متاثر ہو کر اس کی سزا معاف کر کے اسے رہا کر دیا۔ میڈیا نے اس کے کارنامے کو سراہا۔ اسے رقم ایک تقریب میں دی گئی۔

اس کا آبائی گاؤں فرید نگر ضلع چٹا گانگ میں سمندر کے شمال میں واقع تھا۔ جو اسے بے حد پسند تھا۔ پھر اس نے وہاں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ اس گاؤں میں اس کے بچپن کے دوست بھی تھے۔ وہاں کچھ دن رہ کر گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس تیس ہزار کی رقم کے علاوہ سات ہزار کی رقم بھی تھی جو گرفتاری کے وقت اس نے جمع کرائی تھی۔ وہ ایک برس کے اخراجات کے لئے کافی تھی۔ اس گاؤں میں جھیل بھی تھی...... تالاب بھی تھے۔ فضا بڑی رومان پرور تھی اور ماحول بھی خواب ناک تھا۔

☆......☆......☆

رشید نہ چاہتے ہوئے بھی آج چوری چھپے ترنم کو دیکھنے چلا آیا تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اپنی اس خواہش کو رد نہ کر سکا تھا۔ دل جو بڑا ضدی، سرکشی اور بے لگام ہوتا ہے۔ اس سے جیتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی ہار مان لی۔ یہ دل جس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔

جب کہ اسے اس کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر نہ صرف دیکھ سکتا بلکہ نظروں میں جذب کر کے اس سے باتیں بھی کر سکتا تھا۔ جتنی دیر چاہے جب تک من کرے۔ اس کا چہرہ اور نشیب و فراز دل سے آنکھوں میں سے گزار کر من کے نہاں خانوں میں نقش کر لے۔ اسے روکنے اور ٹوکنے سے وہ رہی تھی۔

رات کا وقت اور وہ گھر میں اکیلی تھی...... اس کی آپا...... ابو کے ساتھ کسی شادی میں گئی ہوئی تھی...... اس طرح کسی عورت کو دیکھنا مذموم سی حرکت تھی۔ لیکن وہ اپنی حرکت سے باز نہیں آتا تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ کسی عورت کو اس طرح سے دیکھنا ایک عجیب سی لذت محسوس ہوتی تھی اور سارے جسم میں سنسنی بجلی کی لہروں کی طرح پھیل جاتی تھی۔ وہ ترنم کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا تھا۔ وہ دوپہر کے سناٹے میں تالاب پر روز ہی نہانے جاتی تھی...... اس کے سوا یا اس کی کوئی دو ایک سہیلیوں کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا۔ یہ تالاب گھر کے پیچھے تھا۔ وہاں مردوں کو اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اکیلی ہو یا سہیلیوں کے ساتھ تالاب پر ہوتی تھی یہ سب مل کر آزادی سے نہاتی اور تیرتی تھیں، چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی،

تفریح بھی کرتی تھیں اور خاصا وقت گزارتی تھیں۔
اس کے مکان کے عقبی کمرے میں ایک کھڑکی تھی۔ وہ اس کی ایک جھری سے انہیں دیکھتا تھا۔ اس وقت تک دیکھتا تھا جب تک وہ نہا کر بال اور تن خشک کر کے کپڑے پہن کر چلی نہیں جاتی تھیں۔ اس کا جی نہیں بھرتا بلکہ اس کی جو پیاس بھڑکتی تھی وہ اور تیز ہوجاتی۔ اسے ایسا لگتا کہ وہ کوئی جیسے سنسنی خیز فلم دیکھ رہا ہو۔
اسے اس بات کا کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوتا تھا کہ ترنم نے اس کی چوری پکڑلی تو کیا ہوگا......؟ وہ تالاب پر جو نہاتے دیکھتا تھا اس کی چوری پکڑنا ناممکن نہیں تھا...... لیکن وہ جو کمرے کی کھڑکی سے اسے سوتا اور گہری نیند میں غرق دیکھتا تھا اس کے پکڑے جانے کا احتمال ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ترنم کچھ نہیں کہے گی...... بالکل کبھی برا نہیں منائے گی۔ کیوں کہ وہ جس حالت میں سوتی ہوتی تھی اسے نہ تو اپنا ہوش ہوتا اور نہ ہی لباس کا خیال کرتی تھی۔ وہ بے ترتیب ہوجاتا تھا...... کیوں کہ وہ خود جو بے ترتیبی کی حالت میں پڑی ہوتی۔ وہ سوچتا کہ ترنم چادر سے اپنا تن کیوں نہیں ڈھانپ لیتی......؟ کیا اسے بیدار ہونے پر اپنی یہ حالت دیکھ کر شرمندگی کا احساس نہیں ہوگا۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتی کہ وہ ایک نوجوان لڑکی ہے......؟ شاید کوئی اسے اس حالت میں دیکھ بھی سکتا ہے۔
وہ ایک مہینے پہلے تک ترنم کا پڑوسی تھا۔ اسے اس وجہ سے مکان خالی کرنا پڑا تھا کہ مالک مکان نے نہ صرف کرایہ بلکہ ایڈوانس بھی دگنا کردیا تھا۔ یہ ایک طرح سے زیادتی تھی۔ ابھی تک اس مکان میں کوئی نیا کرایہ دار نہیں آیا تھا اور وہ جانتا تھا کہ مطلوبہ کرایہ اور پیشگی رقم کوئی دینے سے رہا۔ گوکہ مکان خوب صورت تھا اور کارنر پر ہونے سے بڑا بھی لگتا تھا اور تھا بھی...... لوگ مکان دیکھنے تو آتے تھے اور مول تول کر کے چلے جاتے تھے۔ وہ جن چنبیلیوں کی کلیاں توڑ کر ترنم کے سرہانے رکھتا تھا اور اس کے ریشم جیسے بالوں میں سجایا کرتا تھا اب وہ ٹہنیوں پر ہی مرجھا رہی تھیں۔ وہ مکان خالی کرنے کے بعد راتوں کو اسی طرح چھپ کر دیکھنے آتا تھا۔
اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ دیوار پھلانگ کر اندر چلا جائے اور ڈھیر ساری کلیاں توڑ کر لائے اور ترنم پر نچھاور کردے تاکہ ترنم کا وجود مہک اٹھے۔ لیکن ترنم میں جو مہک ہے وہ ان کلیوں میں کہاں۔
ترنم...... اپنی بڑی بہن اور والد کے انتظار میں جاگ رہی تھی جو ابھی تک نہیں لوٹے تھے...... وہ ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ ترنم اور اس کی حرکات و سکنات اور اس کے چہرے اور جسمانی نشیب و فراز کو دیکھ سکتا تھا لیکن ترنم اسے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ بہت دیر بستر پر دراز اور سینے پر کتاب رکھے پڑھتی رہی۔ پھر وہ بستر سے نکلی اور کتاب میز پر رکھ دی۔ اس نے کمرے کی دو تین بتیاں بھی جلالیں۔ سنگار میز کے بڑے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ناقدانہ نظروں سے اپنا چہرہ اور ہر زاویے سے اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ پھر اس نے تمام بتیاں گل کردیں پھر بستر پر دراز ہوگئی۔
پونم کی رات تھی وہ کہتی تھی کہ پونم کی رات بڑی شریر ہوتی ہے۔ جو ہر ماہ اپنی تمام تر لطافتیں اور فرمائشیں لے آتی ہے۔ وہ اس کی...... بات سن کر کہتا...... تمہارا نام ترنم نہیں پونم ہونا چاہئے...... اس نے دل میں سوچ رکھا تھا کہ اگر اس کی شادی ترنم سے ہوجائے گی تو وہ اس کا نام بدل کر پونم رکھ دے گا...... کیوں کہ ترنم...... کسی پونم سے کم نہیں ہے بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ حسین و جمیل ہے۔
پورا چاند...... ترنم کے کمرے کی کھڑکیوں کی سلاخوں سے جھانک رہا تھا...... اس کا انگ انگ اس ڈھلے ہوئے چاند کے دریا میں نہانے لگا...... اس کے تکیے پر بکھرے ریشمی سیاہ بالوں سے جیسے چاندنی برس رہی تھی۔ اس کے سارے جسم میں ایک ٹھنڈک سی آگئی تھی۔ جو دھیرے دھیرے اس کی آتما میں رچنے لگی تھی۔ تھوڑی دیر بستر سے نکل کر ساڑی کا پلو سینے اور شانے پر درست کیا اور کمرے سے نکلی پھر سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر آگئی پھر اس نے چھت پر کھڑے ہو کر

اپنے لمبے سیاہ بال ایک دم سے لہرادیئے...... ترنم کا یہ انداز بڑا سہانا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے چاندنی کا بہتا دریا ایک دم سے منجمد ہوگیا ہو۔
اس نے جو مکان کرایہ پر لیا پڑوس میں زیتون خالہ رہتی تھی۔ وہ انہیں ماں کی طرح سمجھتا...... عزت کرتا اور خدمت کرتا تھا۔ وہ بھی اسے اپنے سگے بیٹے کی طرح سمجھتی تھیں۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ وہ انہیں ترنم کے گھر بیٹے کے لئے بھیج دے۔ ترنم اسے بے حد پسند تو کرتی ہے...... لیکن پسند محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے...... پسند کو محبت کا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس طرح وہ وسیم کو بھی پسند کرتی ہے۔ اگر ترنم نے یہ کہہ کر رشتے سے انکار کردیا کہ وہ نہ صرف وسیم کو پسند کرتی ہے بلکہ اس سے محبت بھی کرتی ہے تو وہ پھر کیا کرے گا؟ محبت کا اظہار کرنے میں کوئی اڑچن نہیں تھی لیکن وہ سوچتا ہی رہا۔ اس نے اظہار محبت نہیں کیا...... محبت کا اظہار کرنے کے لئے جس ہمت اور جرأت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس میں نہیں تھی...... رعب حسن اور تمکنت ایسی تھی کہ حسن کے دریا میں اس کی زبان گنگ ہوجاتی تھی...... جب کہ وہ بڑے سے بڑے اور خطرناک دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتا تھا......
اس کے جو دو ایک بے حد قریبی دوست تھے وہ جانتے تھے کہ ترنم کی محبت کی آگ میں جل رہا ہے لیکن اظہار محبت نہیں کر پارہا ہے۔ لہٰذا اسے طعنے دیئے جاتے مگر وہ سوچتا ہی رہتا تھا، دن گزر رہے تھے، اس نے محسوس کیا کہ ترنم اور اس کے درمیان فاصلے بڑھتے ہی جارہے ہیں اور اس کا وجود بے معنی ہو کر رہ گیا...... آخر کب تک......؟ ترنم نہایت حسین اور پرشباب اور دلکش خدوخال کی لڑکی ہے...... ساری زندگی تو کنواری نہیں رہے گی۔ ابھی اس کے لئے بڑے بڑے گھرانوں کے رشتے آرہے ہیں۔ اس کے باپ نے ان لڑکوں کے متعلق معلومات کی تھی۔ ان لڑکوں کا کردار اچھا نہیں تھا۔ وہ صرف دولت کوٹھی اور کار دیکھ کر شادی کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کیوں کہ یہ آوارہ، بدقماش اور اوباش لڑکے شادی کے دو ایک برس بعد انجانے راستوں پر چل پڑتے تھے۔
البتہ ایک بات ترنم کی سہیلیاں اور وسیم ہی نہیں سبھی جانتے تھے کہ ترنم شادی اگر کرے گی تو صرف وسیم یا رشید سے۔ کسی تیسرے شخص سے نہیں...... ترنم کے والدین ان دونوں کو پسند کرتے اور عزت بھی...... ان کی نظروں میں یہ دونوں ہونہار نوجوان بھی تھے۔
اس نے سوچا کہ اگر زیتون خالہ اس کا رشتہ لے کر ترنم کے باپ کے پاس جاتی ہے اور ترنم کی طرف سے انکار ہوجاتا ہے تو پھر یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ترنم...... وسیم سے محبت کرتی ہے...... اس سے نہیں...... پھر اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں رہے گی کہ وسیم اور ترنم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔
اس نے سوچا کہ ترنم سے اس کی شادی اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ وہ راستے کا پتھر ہٹادے...... وسیم کو قتل کرنا آسان ہے۔ اس لئے کہ وہ یہاں اکیلا رہتا ہے۔ وہ بادی سال جاچکے ہیں۔ وہ صرف ترنم کے لئے یہاں اکیلا رہ گیا۔ ترنم جو اس کا سپنا ہے۔ وہ اسے جیون ساتھی بنا کر باڑی سال لے جانا چاہتا ہے کیوں کہ بادی سال میں باپ کی زمین اور جائیداد بھی ہے...... لیکن وہ ایسا ہرگز نہیں ہونے دے گا۔ صرف ایک گولی موت کے ساتھ وسیم کے سپنے کو بھی لے جائے گی۔ پھر اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ دور ہوجائے گی۔ پھر ترنم اس کی سدا کے لئے ہوجائے گی۔ ترنم کو اسے اپنانے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہوگا......؟
اس نے وسیم کے قتل کا جو منصوبہ بنایا تھا اس کا جائزہ لیا جو اچانک اس کے ذہن میں آیا تھا۔ وہ گھر واپس جاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وسیم گھر میں اکیلا رہتا ہے۔ وہ رات کے وقت پستول میں سائی لینسر نصب کر کے کھڑکی کے راستے وسیم کو ایک نہیں ساری گولیاں مار سکتا ہے۔ قانون اس پر اس وقت ہاتھ ڈالے گا جب کوئی ثبوت...... عینی گواہ کی صورت میں ملے گا یا آلہ قتل جس پر اس کی انگلیوں کے نشانات ثبت ہوں۔ وہ

پستول وسیم کو قتل کرنے کے بعد کسی بھی تالاب میں پھینک دے گا۔ پولیس کو کوئی سراغ نہیں مل سکے گا...... ترنم جب اس کی جیون ساتھی بن جائے گی وہ کبھی بھی بھولے سے بھی نہیں بتائے گا کہ...... ترنم میں نے تمہارے حصول کی خاطر وسیم کو قتل کردیا...... اگر میں ایسا نہ کرتا تو پھر تم وسیم کی ہوجاتیں جو میرے اور میری روح کے لئے کس قدر کرب ناک اور اذیت ناک ہوتا تم تصور بھی نہیں کرسکتیں...... میں یہ جرم کرنے کے لئے مجبور تھا...... اس لئے کہ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہوتی ہے۔ محبت کا جنون بھی ایسا ہوتا ہے......

اگر بالفرض اس نے اپنا جرم ترنم پر ظاہر کردیا تو ترنم کے من میں وسیم بسا ہونے کی صورت میں اس کی محبت نفرت میں بدل جائے گی...... اور وہ اس کے اس عظیم جذبے اور اقدام کی قدر نہیں کرے گی۔

ترنم کے نزدیک یہ بزدلی...... ذلالت، کمینگی اور نامردی ہوگی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ وسیم کو قتل کرنے کی صورت میں ساری دنیا یہی کہے گی کہ وہ وسیم کا قاتل ہے۔ کیوں کہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ وہ بھی ترنم سے محبت کرتا ہے...... یہ قتل اس کے سوا کوئی اور نہیں کرسکتا......؟ سوچتے سوچتے اس کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ وہ اس پر عمل کرنے کے لئے ایک دن کی بھی تاخیر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ اب اس کے لئے ترنم سے دور رہنا سوہان روح تھا۔ ایک دن کی جدائی بھی اس کے لئے سوہان روح تھا۔ ترنم کا سراپا، تناسب اور بجلیاں اسے ماہی بے آب کی طرح تڑپاتی تھیں۔ اور پھر وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ وسیم اس پر سبقت لے جائے اور وہ منہ دیکھتا رہ جائے۔ اس تدبیر پر عمل کرکے کامیابی کی صورت میں ترنم اس کی ہوجائے گی۔ اس طرح سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔ ترنم سدا کے لئے اس کی ہوجائے گی۔ وہ جلد بازی اس لئے بھی کررہا تھا کہ ایک دن کی بھی تاخیر صدی سے کم نہ تھی۔

وسیم کا گھر راستے میں آتا تھا۔ وہ اپنے گھر جانے کے بجائے وسیم کے گھر پہنچ گیا۔ کیوں کہ جو تدبیر اس کے ذہن میں آئی تھی وہ اس پر عمل کرنے کے لئے ایک دن کی بھی تاخیر کیا ایک لمحہ بھی ضائع کرکے پیروں پر کلہاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ خیال بار بار اس کے ذہن میں آکر کسی سانپ کی طرح ڈس رہا تھا۔ اس لئے اس نے وسیم کے مکان کے دروازے پر بڑے زور کی دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا۔ وسیم اس کے سامنے آنکھیں ملتا ہوا کھڑا تھا۔ وہ ناوقت رشید کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''تم......؟ خیریت تو ہے......؟ اس وقت کیسے آنا ہوا......؟ زیتون خالہ تو ٹھیک ہیں نا؟''

وہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے گھر میں تیزی سے گھس گیا۔

''ہاں...... یہ میں ہوں...... میری روح نہیں ہے۔'' رشید نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے کچھ ضروری باتیں کرنے آیا ہوں...... چلو...... اندر چل کر باتیں کرتے ہیں۔''

وسیم اسے اندر لے کر گیا۔ کمرے میں بٹھانے کے بعد پوچھا۔

''کیا یہ باتیں صبح نہیں ہوسکتیں......؟ رات کا ایک بج رہا ہے یہ آرام کا وقت ہے۔''

''نہیں......'' رشید نے جواب دیا۔ ''یہ زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ میں اسے ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ میرے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے۔''

''کس کی زندگی اور موت کا سوال......؟'' وسیم نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ ''کیا کوئی تمہارا جانی دشمن بن گیا ہے......؟ کون ہے وہ......؟''

''ہاں...... یہ میری زندگی اور موت کا سوال ......'' رشید کا لہجہ جارحانہ تھا۔ ''تم میری خوشیوں کے قاتل ہو۔''

''میں کیوں اور کس لئے خوشیوں کا قاتل ہوسکتا ہوں؟'' وسیم نے حیرت سے کہا۔ ''ہم بچپن کے دوست رہے ہیں۔ میں نے کبھی تمہارا برا نہیں چاہا...... تم مجھ پر اتنا بڑا اور سنگین الزام لگارہے ہو...... یہ تم کس بنیاد پر الزام لگارہے ہو۔ مجھے تمہاری اس بات کا یقین نہیں آیا...... کہیں تم خواب کی حالت میں تو نہیں ہو......؟''

''میں نے سنا ہے کہ کچھ دنوں میں تم ترنم کے لئے اپنا رشتہ بھیجنے والے ہو......؟'' رشید نے تیز لہجے میں کہا۔ اس کا لہجہ اور زہریلا ہوگیا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں......! یہ سچ ہے......؟'' وسیم نے اثبات میں سر ہلادیا۔ ''اس میں کیا برائی ہے......؟ حرج ہے......؟ آخر مجھے اپنا گھر بسانا ہے۔ مرد کی زندگی عورت کے بغیر ادھوری ہوتی ہے۔ اس میں ایک خلا ہوتا ہے جسے عورت ہی پر کرسکتی ہے۔ چوں کہ مجھے ترنم بہت پسند ہے۔ اس پسند کو محبت کا نام دے سکتے ہو۔ میرے خیال میں وہ میری ایک اچھی شریک حیات ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں نے اسے اپنانے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''لیکن میں ترنم سے کتنی محبت کرتا ہوں یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو؟ اس کے باوجود تم نے اپنا رشتہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کیا یہ بددیانتی اور بدمعاشی نہیں ہے۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ ہم دونوں ہی اس سے محبت کرتے ہیں۔'' وسیم نے کہا۔ ''آج سے نہیں اس وقت سے جب ترنم نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا...... لیکن وہ ہم سے محبت کرتی ہے یا نہیں...... اتنا ضرور احساس ہے کہ ہم دونوں کو بے حد پسند کرتی ہے۔ ہم دونوں ہی اس کے دوست ہیں۔ ہم سے کھلے دل سے ملتی ہے...... ہم دونوں کے لئے اس میں پندار حسن نہیں ہے۔ ہم غلط فہمی اور خود فریبی میں مبتلا ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس نے دو ایک مرتبہ اشاروں میں کہا تھا کہ اگر وہ شادی کرے گی تو ہم دونوں میں سے کسی ایک سے...... کسی تیسرے شخص سے نہیں...... اب چوں کہ میں یہ محسوس کررہا ہوں اب مجھے اپنا گھر بسا لینا چاہئے تاکہ ویرانے میں چپکے سے کوئی بہار آجائے۔ یہ فیصلہ میں نے کچھ دنوں پہلے ہی کیا ہے۔''

''کیا ترنم تم سے اقرار محبت اور شادی کا وعدہ کرچکی ہے جو تم اپنا رشتہ بھیجنے والے ہو......؟'' رشید نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ یہ بات تھی تو تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں......؟''

''نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔'' وسیم نے کہا۔ ''رشتہ بھیجنے سے انکار سے یہ بات سامنے آجائے گی کہ وہ مجھ سے نہیں تم سے محبت کرتی ہے۔ ایک واضح فیصلہ سامنے آجائے گا۔''

''بالفرض وہ تم سے شادی کرنے سے انکار کردیتی ہے تو کیا کروگے......؟'' رشید نے سوال کیا۔ ''تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟''

''میں مایوس اور دل شکستہ ہوکر اپنے دیش ہی میں رہوں گا لیکن ڈھاکا چلا جاؤں گا۔'' وسیم نے جواب دیا۔ ''وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا اور میری یہ کوشش ہوگی کہ کبھی بھولے سے بھی واپس یہاں نہ آؤں تاکہ زخم ہرا نہ ہوجائے۔ میں کوشش کروں گا کہ زندگی تجرد کی گزار دوں یا پھر کسی اچھی لڑکی جس کا حسین ہونا شرط نہیں...... بلکہ سیدھی سادھی، سلیقہ شعار اور محبت کرنے والی اور وفا شعار ہو شادی کرکے گھر بسالوں...... اسے اتنی محبت دوں گا کہ وہ میری محبت کی اسیر بنے رہے۔ اس طرح بے پناہ مسرتیں اس کی جھولی میں ڈال دوں گا۔

یہ شاعرانہ اور فلسفیانہ باتیں رہنے دو......'' رشید چڑ کر بولا۔ ''اب میری سنو۔ اگر اس نے تم سے شادی کرنا منظور کرلیا تو جانتے ہو کیا ہوگا۔ میرا ردعمل مختلف ہوگا؟'' اس کا آخری جملہ ہذیانی ہوگیا۔

''تم ایک اچھے دوست کی طرح ترنم کے اس فیصلے کو قبول کرلو۔'' وسیم نے کہا۔ ''اس لئے کہ یہ فیصلہ ترنم کا ہوگا۔ ترنم جو بھی فیصلہ کرے ہم پر لازم ہے کہ اس کا پاس کریں۔''

''اگر ترنم نے تم سے شادی کرلی تو جانتے ہو کہ میں یہ شادی کسی قیمت پر نہیں ہونے دوں گا۔'' رشید نے سخت لہجے میں کہا۔

"وہ کس لئے......؟" وسیم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اس لئے کہ یہ شادی میری موت ہوگی......" رشید کا لہجہ زہر آلود تھا۔
"وہ کیوں......؟" وسیم کے چہرے پر گہرا استعجاب چھا گیا۔ "تم کیا کرو گے؟"
"کیوں کہ میں ترنم کے علاوہ کسی اور لڑکی کو جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔" رشید خشونت سے کہنے لگا۔ "پہلے میں نے سوچا تھا کہ ترنم سے تمہارا رشتہ طے ہونے سے پہلے ہی تمہیں راستے سے ہٹا دوں...... لیکن اب کچھ اور سوچا ہے۔"
"کیا سوچا ہے......؟ کیا ترنم سے جا کر کہو گے تم وسیم سے شادی نہیں کرنا کیوں کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں؟"
"نہیں......! میں ایسی حماقت ہرگز نہیں کروں گا۔" رشید نے تکرار کے انداز میں کہا۔ "کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا...... اگر ترنم کے دل میں تمہارے لئے محبت ہے اس کی جڑیں اتنی گہری ہوں گی کہ اس کی جگہ میری محبت نہیں لے سکتی مجھے اس بات کا اندازہ ہے۔"
شاید ایسا نہ ہو...... تمہیں اس بات کا یقین کیوں نہیں کہ تم اس کے دل میں جگہ بنا سکتے ہو...... شاید اظہار محبت کر کے دیکھو...... میری محبت کی جگہ تمہاری محبت لے لے؟"
"اس لئے کہ عورت جس سے پہلی بار محبت کرتی ہے وہی اس کے من اور سپنوں میں بس جاتا ہے...... ترنم کو سدا کے لئے حاصل کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جس کا مجھے برسوں سے انتظار تھا۔"
"وقت......! کیسا وقت......؟ کس وقت کی بات کر رہے ہو تم......؟" وسیم نے متعجب ہو کر پوچھا۔
"وہ وقت جسے میں آخری سانس تک نہیں بھول سکتا...... جتنے چرکے اور زخم ملے ہیں۔" رشید نفرت بھرے لہجے میں کہنے لگا۔ ان کی جلن اور سوزش آج بھی محسوس ہو رہی ہے...... زخم اتنے ہیں کہ میں گن نہیں سکتا...... وقت کا مرہم بھی اسے بھر نہ سکا...... یہ سب کچھ تمہارا کیا دھرا ہے...... تم نے میرے وجود کو چھلنی کر دیا ہے جس میں سے لہو ٹپک رہا ہے۔ میں اسے پیتا آ رہا ہوں۔"
"رشید......" اس نے منجمد نظروں سے دیکھا۔
"یہ سراسر بہتان ہے۔ میں بچپن ہی سے تمہارا دوست رہا ہوں...... دشمن نہیں...... معلوم نہیں کیوں ایسی نفرت انگیز باتیں کر رہے ہو......؟"
"اچھا......! تم وہ تشدد اور ظلم و ستم بھول گئے جو مجھ پر روا رکھتے تھے......؟" رشید بگڑ گیا۔ "لیکن میں اسے کیسے بھول سکتا ہوں...... تم بچپن سے مجھ سے جلتے تھے اور خار بھی کھاتے رہے تھے...... تم بچپن میں ذرا ذرا سی بات پر مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتے تھے اور میں ادھ موا اور بے بس سا ہو جاتا تھا...... جب میں پٹتا تھا تب دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ بڑا ہو کر گن گن کر بدلہ لوں گا...... اس ظلم کا بدلہ ہر قیمت پر لوں گا...... تم سے ایسا خوف ناک لوں گا کہ تمہاری روح بھی کانپ اٹھے گی...... ہرگز ہرگز معاف نہیں کروں گا...... مجھے اس بات پر یقین تھا کہ وہ دن ضرور آئے گا...... کسی نہ کسی دن اور لمحہ ایسا آئے گا کہ اس کا موقع ملے گا...... جو آگ میرے سینے میں بچپن ہی سے آتش فشاں کی طرح دہک رہی ہے اب اسے سرد کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ وسیم......! میں نے تمہارے ہاتھوں جو مار کھائی ہے آج بھی ان زخموں میں ایسی ٹیسیں اٹھتی ہیں کہ میں ماہی بے آب کی طرح تڑپتا ہوں...... میں یہاں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ ہم دونوں میدان جنگ میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسوں کی طرح کھڑے ہوں...... تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آج ہماری آخری ملاقات ہے۔"
وسیم پر کوئی بجلی سی آ گری تھی۔ وہ سناٹے میں آ گیا۔ ساکت و جامد سا ہو کر اس کی باتیں سن رہا تھا۔ جو اس نے کبھی بھی اپنے کسی دوست کی زبانی نہیں سنی تھی۔

اس کی جگہ کوئی اور بدمعاش یا دوست نما دشمن ہوتا تو اس کے دانت کھٹے کر دیتا۔ رشید کے علم میں یہ بات نہیں تھی کہ وہ جیل میں سات برسوں تک جو سزا بھگتی تھی وہ ایک سے ایک خطرناک بدمعاشوں سے بہت کچھ سیکھا اور اس نے ان سے تربیت حاصل کر کے بلیک ٹائیگر کا خطاب حاصل کر چکا ہے۔ اس کے سامنے رشید کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ اب تک دو قتل کر چکا تھا۔ لیکن یہاں آ کر اس نے اپنا ماضی فراموش کر دیا تھا۔ لیکن رشید کی باتوں نے ماضی کو حال بنا دیا تھا۔
رشید اس سے عمر میں صرف ایک برس بڑا تھا۔ سولہ برس کی عمر تک اس میں اور رشید کی جو عمر تھی اس نے جسمانی حالت میں بڑا فرق کیا ہوا تھا۔ رشید چوں کہ بیمار رہتا تھا۔ اس لئے اس کی جسمانی نشو و نما ٹھیک سے نہیں ہو پائی تھی...... جب کہ وہ اس کے مقابلے میں بڑا صحت مند، توانا اور طاقت ور رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ورزش کرتا اور کھیلوں میں حصہ لیتا رہتا تھا۔ لیکن اس کے بعد حالات نے بڑی تیزی سے پلٹا کھانا شروع کیا۔ جب جوانی آئی تو ٹوٹ کر برسنے لگی۔ چوں کہ وہ دراز قد اور مضبوط جسم اور چوڑے چکلے سینے کا مالک تھا۔ اس لئے لڑکیوں کے دل اسے دیکھ کر دھڑکتے تھے۔ وہ ان کا سپنا بنا ہوا تھا۔
لیکن آج صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ رشید اس کے سامنے کسی پہلوان کی طرح خم ٹھونک کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کا قد اور رشید کا قد اب برابر تھا۔ رشید کا قد اس سے بھی نکل گیا تھا۔ اس لئے وہ آج رشید کے سامنے اپنے آپ کو ایک بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ آج رشید چھ فٹ چار انچ کا مضبوط کسرتی بازو کا خوب رو جوان تھا جو امریکی فلموں کے ہیرو کی طرح نظر آتا تھا۔ وہ اپنے آپ ایک بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ بونا ہو۔ اس کے باوجود وہ نہ تو رشید سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی احساس کمتری کا شکار......
"رشید......!" وسیم نے پہلی بار اسے تنقیدی نظروں سے اوپر سے نیچے تک دیکھا جو اس کے سامنے پہاڑ کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ "صاف صاف کہو تم کیا چاہتے ہو......؟ مجھے بڑے زور کی نیند آ رہی ہے اور میں آج بے حد تھکا ہوا بھی ہوں۔"
اسے رشید کو موت کے بجائے دشمن کی حیثیت سے اپنے مد مقابل دیکھ کر دل کو دھچکا سا لگا تھا۔ گہرا صدمہ...... وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا وقت بھی اس کی زندگی میں آ سکتا ہے۔
"وسیم......! میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم میرے اور ترنم کے درمیان دیوار بنے کھڑے ہو......؟" وہ حقارت آمیز لہجے میں کہنے لگا۔ "میں اپنے اور ترنم کے درمیان تمہارے وجود کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتا...... اس وقت میں دو تجویز لے کر آیا ہوں جو تمہارے سامنے رکھتا ہوں...... تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔ میں تمہیں سوچنے کے لئے ایک دن کی مہلت تو دور کی بات ہے ایک گھنٹے کی مہلت دینے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں...... تمہیں ان دونوں میں سے ایک تجویز کا انتخاب کرنا ہے...... پہلی تجویز گو کہ بڑی ذلت آمیز اور ایک طرح سے ناقابل قبول ہے...... لیکن اسے ماننے کے سوا چارہ بھی نہیں، تم سدا کے لئے یہ شہر اور اس ضلع کو چھوڑ دو...... سری لنکا جاؤ...... دنیا کے کسی بھی گاؤں میں جاؤ لیکن یہاں نہیں آؤ گے...... مجھے تمہاری منحوس صورت یہاں نظر نہ آئے...... اگر تم نظر آئے تو تمہارا ایسا حشر کروں گا کہ تم اس عبرتناک انجام کا سوچ بھی نہ سکو گے۔ تمہیں کتے کی موت ماروں گا...... دوسری تجویز آبرومندانہ اور مردانہ ہے...... تم مردوں کی طرح مجھ سے مقابلہ کرو گے...... جو فاتح ہوگا وہ ترنم کا مالک ہوگا...... اس کی روح اور اس کا دل کش جسم فاتح کی ملکیت ہوگا...... وہ صدا کے لئے اس صورت میں اس کی ہو جائے گی۔ جو اس مقابلے میں زندہ بچ جائے گا۔"
وسیم کوئی بے غیرت یا عام قسم کا شخص نہ تھا...... وہ ایک غیرت مند اور پرجوش قسم کا جوان تھا۔ اب یہاں جب پہلے اور آج بھی عزت کی زندگی گزار رہا تھا...... وہ

بچپن میں رشید کی جو پٹائی کرتا تھا اس کی بے ہودہ شرارتوں، حرکتوں اور گندی گندی گالیاں بکنے کی وجہ سے...... نوعمری میں بھی چوری چکاری کرتا تھا...... اس کے منہ سے ایسی ذلت آمیز تجویز سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور رگوں میں لہو ابلنے لگا۔

کیا تم مجھے اتنا حقیر سمجھتے ہو کہ جو ذلیل حرکت کرنے پر تلے ہوئے ہو؟" وسیم نے ہذیانی لہجے میں کہا۔ "کیا میں اتنا بے غیرت اور بزدل ہوں جو تم نے شہر چھوڑ دینے کی تجویز پیش کی...... تم ہرگز ہرگز اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں یہ شہر اور ترنم کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ البتہ مجھے تمہاری دوسری شرط منظور ہے۔"

رشید کا چہرہ ان جانے خیال سے دمک اٹھا اور اس کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک کوندگئی۔ اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اس نیک کام میں دیر نہ کی جائے...... پرسوں صبح سورج طلوع ہونے سے قبل تمہیں رستم...... رضا جزیرہ پر اتار دے گا...... تم اپنے ساتھ صرف ایک چاقو لا سکتے ہو۔ اس کے علاوہ کوئی ہتھیار لے کر نہیں آؤ گے۔ رستم تمہیں اس جزیرے کے مغربی ساحل پر اتار دے گا۔ تم اپنے ساتھ کسی بااعتماد دوست کو لے کر آنا...... میں بھی اپنے ساتھ کسی دوست کو لاؤں گا۔ میں نے رضا جزیرے کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ یہ ویران ہے...... اس لئے بھی کہ یہ ہمیشہ سمندر کے ساحل کے طوفان کی زد میں رہتا ہے اور سیلاب تباہی و بربادی مچا دیتے ہیں۔ اس لئے یہاں انسانی آبادی نہیں ہے اور اس پر جنگل کا دھوکا ہوتا۔ یہاں کوئی آتا بھی نہیں ہے۔ اس کے دوسرے دن وہ دونوں جزیرے پر آ کر زندہ بچ جانے والے کو ساتھ لے جائیں گے...... یہ ہے وہ منصوبہ جو میں نے بنایا ہے۔"

وسیم نے اس منصوبے کے ہر پہلو پر چند لمحوں تک غور کیا اور جائزہ لیا۔ اسے یہ منصوبہ سرے سے ہی پسند نہیں آیا تھا۔ وہ رشید کو بچپن سے جانتا تھا۔ اس کے علم میں یہ بات تھی کہ رشید اس کے مقابلے میں کہیں ماہر اور بہتر شکاری ہے اور پھر اسے چٹا گانگ اور کھلنا کے تمام جنگلات جو سندر بن کے نام سے مشہور ہے اسے ان کے بارے میں بہتر معلومات حاصل ہیں...... اور اب وہ جسمانی طور پر اس سے کہیں طاقت ور ہے اور اس وقت انتقام کے جنون نے اسے اندھا کر دیا ہے۔

وسیم کو رشید پر صرف ایک فوقیت حاصل تھی...... وہ ذہنی جسمانی طور پر رشید سے زیادہ پھرتیلا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ رشید اس وقت زیادہ بے رحم اور سفاک بن جاتا تھا جب اس کے مقابلے میں اس کا حریف کمزور ہو۔

"کیا تم نے اس کی اطلاع ترنم کو دی ہے......؟" وسیم نے تیز اور سرد لہجے میں کہا۔

اسے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ اس کے لہجے میں ذرہ برابر بھی ارتعاش نہیں ہے بلکہ ایک طرح سے اعتماد جھلک رہا ہے۔

"نہیں......" رشید نے نفی میں سر ہلایا اور اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھر آئی۔ "میں اس سے صبح سویرے بات کروں گا...... وہ اس بات پر راضی ہو جائے گی کیوں کہ اس کا باپ اس کی شادی کے لئے فکر مند ہے اور وہ چاہتا ہے کہ جتنا جلد ہو سکے بیٹی کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ ہم دونوں اس کی یکساں پسند ہیں...... لیکن یہ بات اس کے علم میں نہیں لانا ہے کہ ہم دونوں میں سے ایک صرف زندہ بچا ہے...... اس بات کا علم صرف چار آدمیوں کو ہوگا...... تم اور میں...... اور ہم دونوں کے دو دوست...... وہ اس بات کے پابند ہوں گے کہ یہ بات کسی کے بھی علم میں نہیں لائیں گے۔"

"رشید......!" وسیم نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ ایسی لڑائیاں خلاف قانون ہیں...... اگر پولیس کے علم میں آ گیا تو اسے تختہ دار پر لٹکا دیا جائے...... اس ملک کے قوانین کس قدر سخت ہیں کیا تم نہیں جانتے......؟"

"ہاں......! میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتا ہوں کہ کیا قوانین نافذ ہیں؟" رشید نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ "لیکن اس کے بارے میں کسی کو بھی

کچھ معلوم نہ ہو سکے گا...... کیوں کہ محبت کی یہ جنگ ہارنے والا اس دنیا سے گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہو جائے گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ وہ گاؤں چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔ جانے والے نے کسی وجہ سے کسی کو بتایا نہیں کہ وہ کہاں گیا ہے......؟"

"سوائے ترنم کے......؟" وسیم نے کہا۔ "اسے یہ احساس کسی خنجر کی طرح اس کے دل میں پیوست ہو جائے گا کہ وہ ایک قاتل کی بیوی ہے اور پھر ترنم کی ساری زندگی کو جہنم بنا دے گی بشرطیکہ وہ جنگ کے فاتح سے شادی کر کے گھر بسا لے...... کیا یہ زندگی ان دونوں کے لئے اذیت ناک نہیں ہوگی؟"

"جیتنے والا ترنم کو مارنے والے کی موت کی خبر نہیں دے گا بلکہ اسے یہ بتلائے گا کہ ہارنے والا یہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔" رشید اسے بے خیال نظروں سے دیکھنے لگا۔ "یہ بات جیتنے والے کے حق میں سدا بہتر ہوگی...... اس طرح ازدواجی زندگی پر مسرت اور خوش گوار ہوگی...... اسے مرتے دم تک یہ راز سینے میں دفن کر کے رکھنا ہوگا......"

"اور اس طرح اپنی ازدواجی زندگی کی بنیاد ایک جھوٹ پر رکھے...... اور اپنی گھریلو زندگی کا آغاز بھی جھوٹ سے کرے۔" وسیم نے تاسف سے کہا۔ "نہیں رشید......! یہ جھوٹ زیادہ دن نہیں چل سکے گا......؟ میں جتنا تمہارے منصوبے پر غور کر رہا ہوں وہ میری ناگواری میں اضافہ کر رہا ہے۔ یہ منصوبہ مجھے بالکل پسند نہیں ہے...... کیا تمہارے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں ہے......؟ تم اس سے ہٹ کر کیوں نہیں سوچتے......؟ شاید اس سے اور بھی بہتر کوئی راستہ نکل آئے۔" وسیم نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اس کے علاوہ کچھ اور سوچنا نہیں چاہتا۔" رشید نے سرد اور تیز لہجے میں کہا۔ "تم بزدلوں کی طرح باتیں کر رہے ہو؟ میری یہ بات کان کھول کر سن لو...... اگر تم نے مجھ سے مردوں کی طرح مقابلہ نہیں کیا تو پھر میں تمہیں چھپ کر قتل کر دوں گا۔ جو میرے لئے کچھ مشکل نہ ہوگا۔ میں نے اس بات کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اور تم اس معاملے میں اس حد تک سنجیدہ اور جذباتی ہو گئے ہو۔" وسیم نے کہا۔ "آخر میں کس طرح تمہاری اس بات پر یقین کر لوں کہ رضا جزیرے پر کوئی مہلک ہتھیار پہلے ہی سے چھپا کر رکھا نہیں گیا ہے...... مثلاً کوئی ریوالور، بندوق یا خنجر...... اس طرح جنگ میں تمہیں مجھ پر آسانی سے فتح حاصل ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں کہ ترنم کے حصول کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہو......؟"

رشید کا منہ بن گیا۔ جیسے اس کے منہ میں کڑوا بادام آ گیا ہو...... وسیم نے اس کی ذات پر بھروسا نہ کر کے اس کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ دوسرے معنوں میں اس کی تذلیل اور توہین کی تھی۔

"میں نے یہ جزیرہ اس لئے تجویز کیا تھا کہ...... ایک تو قریب ہے اور وہاں پہنچنا آسان بھی ہے۔" رشید بولا۔ "اگر تمہیں یہ جزیرہ پسند نہیں ہے اور تمہیں وہاں کسی بات کا خوف و خدشہ ہے تو دس میل کے اندر اندر بہت سارے جزیرے موجود ہیں تم ان میں سے کوئی سا بھی جزیرہ پسند کر لو مجھے اعتراض نہ ہوگا۔"

"نہیں...... جزیرہ رضا ہی بہتر رہے گا۔" وسیم نے سر ہلا دیا۔ "میں وہاں تم سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

"وسیم......! مجھے خوشی ہے کہ تم نے مردوں کی طرح مقابلہ کرنے پر ترجیح دی...... تمہیں گھات لگا کر چوہوں کی طرح مارنے میں مجھے ذرا بھی لطف نہیں آتا...... مردوں کی شان یہ ہے کہ جواں مردی دکھائیں...... ورنہ عورتوں کی طرح چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جائیں۔"

رشید یہ کہہ کر پلٹ کر گھر سے نکل گیا۔ وسیم دروازے پر آ کر اسے دور تک جاتا دیکھتا رہا۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں نہایت متکبرانہ چال چل رہا تھا جو اس نے موجود قامت حاصل کرنے کے بعد اختیار کی تھی جس میں نہ تو تیزی تھی اور نہ ہی سست روی۔

وسیم کی عمر اٹھائیس برس کی تھی جب رشید اس سے عمر میں ایک برس چھوٹا تھا۔ اس شہر کی ایک کالونی جو پہلے گاؤں تھا اور آج بھی لوگ اسے گاؤں ہی کہتے تھے جس میں مغربی بنگال، مدراس، نیپال اور سری لنکا کے باشندے بھی کوئی پچاس ساٹھ برس سے آباد تھے وہ سب آپس میں ایک قوم اور ایک خاندان کے فرد جیسے بن گئے تھے۔ ان میں قومیت اور ذات پات کی کوئی تفریق نہ رہی تھی...... وہ ترنم...... کے ایک بہت دور کے رشتے کی کزن تھی...... درمیانہ قد، سڈول اور بھرے بھرے جسم کی...... بے حد ہنس مکھ اور بہت ہی حسین و جمیل...... جاگتے میں سپنے دیکھنے والی ترنم جس کی بڑی بڑی خوب صورت اور سیاہ اور جادو بھری آنکھیں تھیں جو دل میں اتر جاتی تھیں۔ وہ واقعی ایک سحر انگیز ترنم تھی۔

وہ دونوں ہی تبسم سے ٹوٹ کر محبت کرتے تھے...... وسیم کو یقین تھا کہ ترنم اس سے محبت کرتی ہے، رشید کی محبت یکطرفہ ہے، وسیم...... رشید کی رگ رگ سے واقف تھا۔ وہ اسے بچپن سے ہی جانتا تھا۔ جب دبلا پتلا سوکھا، رشید اس کے ہاتھوں مار کھا کر روتا ہوا گھر جاتا تھا۔ سولہ برس کی عمر کے بعد رشید نے حیرت انگیز طور پر قد نکالا تھا جس طرح اس کا قد بے تحاشا بڑھا تھا اس طرح اس کا ڈیل ڈول بھی بڑھتا گیا۔ لیکن وہ فطرتاً وحشی تھا۔ وہ وحشیوں کی طرح اپنی فتوحات کا جشن مناتا تھا اور وحشیوں ہی کی طرح اپنی ناکامیوں کو کامیابی میں تبدیلی کرنے کے لئے کمینے پن کی تمام حدود کو پھلانگ جایا کرتا تھا۔ اس کے والدین بے حد غریب تھے۔ اس لئے وہ شہر سے قدرے دور ایک غیر معروف گاؤں میں رہتے تھے۔ جہاں وہ بھیڑ، بکریاں اور مرغیاں پال کر اپنی گزر اوقات کرتے تھے۔ سبزیاں بھی اگایا کرتے تھے۔ اس گاؤں میں رشید ایک لوہار کی دکان پر کام سیکھ رہا تھا۔ اس لوہار کی دکان پر کام ملتے ہی اپنے والدین کے پاس جانا چھوڑ دیا تھا اور ان کی کوئی خبر نہیں لیتا تھا۔ اور خود مزے سے رہ رہا تھا۔ اس لئے اس پر کوئی بوجھ نہیں رہا تھا۔

وہ ترنم کا پڑوسی تھا۔ لیکن اب اس لئے نہ رہا تھا کہ وہ مکان کا کرایہ دیتا نہیں تھا۔ جس کی وجہ سے مالک مکان نے پولیس کے ذریعے سے مکان خالی کروالیا تھا۔ اس لئے وہ اچھی نظروں سے دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس نے لوگوں کو مکان خالی کرنے کی کوئی اور وجہ بتائی تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا تھا۔

رشید...... وسیم کے مقابلے میں گاؤں میں زیادہ مقبول تھا اور پسند بھی کیا جاتا تھا...... لیکن جو لوگ رشید سے زیادہ قریب تھے اور اس سے اچھی طرح واقف تھے وہ اسے بالکل پسند نہیں کرتے تھے اور کوئی بھی ایسے آدمی کو پسند نہیں کرتا جو دوسروں سے نظریں ملا کر بات نہ کرتا ہو...... دوسرے کو یہ احساس ہمیشہ ہوتا جیسے وہ اس سے کچھ چھپا رہا ہو۔

رضا جزیرے کا شمالی اور جنوبی حصہ نہ صرف خوب صورت بلکہ زرخیز بھی تھا...... اس سے قدرے فاصلے پر ایک جزیرہ ہنومان تھا لیکن لوگ اسے رضا ہی کہتے تھے۔ جو سمندر سے گھرا ہوا تھا۔ یہ بحیرہ بنگال میں واقع تھا...... وہاں کبھی کبھی لوگ ہرن اور خرگوش کے شکار کھیلنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ یہ غیر آباد اور بہت کم رقبے پر پھیلا ہوا تھا...... وہ چھوٹا سا جزیرہ جھاڑیوں اور درختوں سے لدا ہوا تھا...... پہلے اسے ہنومان جزیرہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ درختوں کے بیچ ایک دیوتا کا قدیم مجسمہ تھا اور پھر اس کا محل وقوع بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ اکثر طوفانوں کی زد میں رہتا تھا۔ رشید اور وسیم بھی اس جزیرے سے اچھی طرح واقف تھے جیسے انہوں نے اس پر جنم لیا ہو اور وہ نوجوانی ہی سے ہرن کا شکار کرنے کے لئے چوری چھپے کشتی میں بیٹھ کر اس جزیرے پر آجاتے تھے۔ پولیس کی گشتی بوٹ ہرن کا شکار کرنے والوں کو حوالات میں بند کر دیتی تھی اور عدالت بھی سخت سزا دیتی تھی۔ چوں کہ وہ دونوں اس کے چپے چپے سے واقف تھے اس لئے پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ ہرن کا گوشت فائیو اسٹارز والے منہ مانگی قیمت پر خرید لیتے تھے۔ غیر ملکی سیاح ہرن کی کھال کی قیمت ڈالر میں دیتے تھے جس کے

بدلے مقامی کرنسی کے ہزاروں ٹاکا ملتے تھے۔

وسیم گھر آ کر گہری نیند سویا تھا کہ وہ سہ پہر کے وقت ہی بیدار ہوا تھا۔ پھر وہ سو گیا تھا۔ آج اسے خوب نیند آ رہی تھی جو اس کے لئے حیرت کا باعث تھی۔ جب وہ دوبارہ بیدار ہوا تو سورج کے غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی اور وسیم کو دوسری صبح کے کچھ انتظامات بھی کرنے تھے اور اسے ایک قابل اعتماد دوست سے مل کر گفتگو کرنی بھی تھی۔ وہ ہر کسی دوست پر اعتماد بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جسے رشید کو اس جزیرے پر لے جانا تھا۔

وہ جس دوست سے بات کرنا اور اعتماد میں لینا چاہتا تھا وہ ایک ملبوسات کی دکان پر سیلز مین تھا۔ اس نے دکان کے مالک سے اچانک طبیعت خراب ہو جانے کا بہانہ کر کے چھٹی لی اور سیدھا وسیم کے ہاں پہنچا۔ مجید ان چند لوگوں میں سے ایک تھا جو رشید سے اچھی طرح واقف تھے لیکن اسے سخت ناپسند کرتے تھے۔ وسیم نے اسے رشید سے ملاقات کی پوری کہانی سنائی۔ وہ فوراً ہی رشید کو دوسری صبح جزیرے کے ساحل پر چھوڑنے کے لئے تیار ہو گیا۔ جہاں ان دونوں کو ملنا تھا...... اور اس کے بعد شرما کو اسے رضا جزیرے پر لے جانا جہاں رشید منتظر ہوگا۔ شرما بھی ایک معتبر اور ذمے دار شخص تھا۔

وسیم نے اس روز رات کا کھانا جلد ہی کھا لیا۔ پھر وہ اپنا خاندانی ہتھیار تلاش کرنے لگا جو بہت مہلک، تیز اور لمبا تھا جس کا دستہ بے حد مضبوط، عمدہ اور لمبا تھا کہ اسے پھینک کر مارنے میں ذرا سی بھی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وسیم نے اس خنجر کو تلاش کرنے کے بعد اسے پہاڑی پتھر پر خوب رگڑ کر تیز کیا۔ اس کی دھار پر تیل لگا کر رکھ دیا۔ پھر اس نے بازار سے پتلون پر باندھنے والی ایک نئی مضبوط چرمی بیلٹ خرید لی جو دیکھنے میں تو معمولی سادہ لیکن پتلی اور بے حد مضبوط تھی۔

اس نے اس لئے یہ بیلٹ خریدی تھی کہ وقت ضرورت کام دے سکتی تھی۔ وسیم کو اس بات کا احساس تھا کہ یہ جنگ اس کی زندگی کی جنگ ہے اور اس میں دشمن سے شکست کھانے کا مطلب صرف اور صرف موت ہے...... اسے رشید کی طرف سے ذرا بھی رحم، نرمی اور رعایت کی کوئی توقع نہیں تھی...... وہ جانتا تھا کہ رشید نے یہ تجویز ہی اس لئے کی کہ وہ اسے جان سے مار سکے اور ایسا کرتے ہوئے لطف اندوز ہو سکے۔

پھر اس نے گھر آ کر ایک نئی پتلون نکالی اور صبح پہننے کے لئے رکھ دی۔ اس نے اس نئی پتلون کا انتخاب کیا تھا کہ گرد و غبار سے محفوظ رکھ سکے۔ پھر وہ ان تمام تیاریوں سے فارغ ہو کر ترنم کے گھر کی طرف دھڑکتے دل سے چل دیا تھا کہ وہ جو اس کی زندگی اور سندر سپنا تھی۔

وسیم...... ترنم کے گھر کے سامنے رک کر کھڑا ہو گیا۔ ترنم اس وقت اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ دروازے پر کھڑی تھی، اس کی سادگی اور حسن...... اور شباب کے طلسم نے اسے جیسے محبوس کر دیا تھا اور وہ جیسے لمحوں کے لئے دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہو کر خوابوں کی وادی میں پہنچ گیا۔

"وسیم......! اندر آ جاؤ......" ترنم نے قدرے ہٹ کر اور سمٹ کے اپنی مترنم آواز میں اندر آنے کی عوت دی۔ پھر وہ اپنی لانبی سرمگیں پلکیں جھپکا کر بولی۔ "یہ آپ اجنبیوں کی طرح باہر کیوں کھڑے ہیں......؟ کیا کسی نے آپ کو اندر آنے سے روکا ہوا ہے؟" پھر وہ ہنس پڑی۔

شرکت

بوڑھا آدمی دفتر کے منیجر سے: "آپ کے ہاں ایک لڑکا احسن کام کرتا ہے، میں اس کا دادا ہوں کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

منیجر: "مجھے افسوس ہے کہ آپ دیر سے پہنچے، وہ آپ کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے جا چکا ہے۔"

(شہریار-کھپرو)

ترنم کی ماں اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ اس نے اور اس کی بڑی بہن نے اپنا گھر سنبھالا ہوا تھا...... لیکن اس کے والد حیات تھے۔ لیکن گھریلو معاملات میں کوئی دخل نہیں دیتے تھے۔ وسیم نے انہیں بڑے ادب سے سلام کیا اور ان کے پاس بیٹھ کر کچھ دیر تک ان سے رسمی باتیں کرتا رہا۔ وہ کھلے دل اور ذہن کے مالک تھے۔ وہ لڑکیوں کو کسی بات اور آزادی پر ٹوکتے نہیں تھے۔ ترنم اپنی بڑی بہن کے ساتھ مل کر گھر کا کام کر رہی تھی۔ جب ترنم کی بڑی بہن کام کاج سے فارغ ہو کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی تا کہ وہ دونوں اطمینان سے باتیں کر سکیں۔

''کیوں نہ باغ میں چل کر کچھ دیر بیٹھیں......؟'' وسیم نے تجویز پیش کی۔ ''باہر بڑی خوش گوار ہوا چل رہی ہے جس سے موسم بڑا سہانا ہو گیا ہے۔ بلکہ ہوا جسم میں فرحت بن کر اتر رہی ہے......''

دونوں باغ کے ایک گوشے میں بیٹھے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ پونم کی رات میں وسیم نے ترنم کی دل ہی دل میں اس کی جیسے پرستش کی تھی اور مستقبل کے سندر سپنے دیکھے تھے۔ ترنم راتوں میں ترنم کا حسن اور نکھر جاتا تھا۔ وہ اسے آنکھوں کے راستے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں جذب کر لیتا تھا...... ترنم کی موہنی صورت تو وہاں پہلے ہی سے نقش تھی۔ یہ نقش اور گہرا ہو جاتا تھا...... آج پھر پونم کی رات تھی۔

''کیوں نہیں......؟'' ترنم نے اس کی تجویز سن کر اسے تیکھی تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''چلو...... کیا میں نے کبھی انکار کیا ہے جو تم مجھ سے کہہ رہے ہو......؟''

پھر وہ دونوں باغ کے اس گوشے میں آ بیٹھے جو انہیں پسند تھا اور بڑا پر سکون تھا۔ یہاں سے چاندنی رات اور باغ کا نظارہ بڑا دلکش نظر آتا تھا۔ فضا رومانی بن جاتی تھی...... آج اتفاق سے چاند کی پندرہویں شب تھی اور آسمان کے چوڑے چکلے سینے پر روشن ستارے جگ مگ کر رہے تھے...... اس کی نظروں کے سامنے زمین کا جو چاند تھا۔ وہ آسمان کے چاند سے کہیں حسین تھا...... جس کی چاندنی وسیم کی روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کے ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔

ترنم نیچی تراش کے بغیر آستینوں کے اور کھلے گریبان کے سفید بلاؤز میں تھی اور گھا گھرا بھی اس نے سفید ہی پہن رکھا تھا جس میں جسمانی تناسب بھڑک رہے تھے۔ ایسا لباس اس گاؤں میں لڑکیاں اور عورتیں بھی پہنتی تھیں جو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ علاقائی لباس تھا...... دودھیا چاندنی میں اس کا انگ انگ دہل رہا تھا۔ وسیم نے اپنے جذبات پر قابو پایا ہوا تھا۔ ترنم کا سراپا اسے بہکا رہا تھا۔ وہ بہکنے نہیں آیا تھا۔ بہکنے سے اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی کے بھی اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا اور نہ کبھی اس نے ایسا سوچا تھا۔

''ترنم......!'' وہ دل کی بات زبان پر لے آیا جو تنہائی میں اس سے کہنا چاہتا تھا اس نے یہ بات بڑے دھیمے لہجے میں کہی۔ ''کل میں اور رشید رضا جزیرے پر ایک مہم پر جا رہے ہیں۔ کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ وہ مہم کیا ہے......؟ تمہیں اس کی خبر ہو چکی ہو گی......؟ کیوں......؟''

وسیم نے سرگوشی میں یہ بات آہستگی سے اس لئے کہی تھی کہ ترنم کی بڑی بہن ان کی باتیں نہ سن لے۔ اس لئے اسے بے حد محتاط رہنے کی سخت ضرورت تھی۔ یہ راز رکھنا تھا۔

''ہاں...... میں جانتی ہوں وسیم......!'' ترنم نے قدرے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''سچ پوچھو تو مجھے حالات کے اس رخ پر بہت ہی دکھ اور افسوس بھی ہو رہا ہے...... نجانے کیا بات ہے کہ تم رشید کی نظروں میں اس دھرتی پر ناسور ہو...... بدنما داغ ہو...... جس کا صاف ہو جانا ہی بہتر ہے...... وہ تمہاری ایسی درگت بنانا چاہتا ہے کہ تم ساری زندگی کے لئے معذور اور اپاہج ہو جاؤ...... بھیک مانگنے کے قابل نہ رہو...... میرا مخلصانہ مشورہ تو یہ ہے کہ تم چند برسوں کے لئے اس گاؤں کو چھوڑ دو...... کہیں ایسی جگہ روپوش ہو جاؤ کہ اس کی دسترس میں نہ آ سکو...... میرے خیال میں نہ صرف تمہارے بلکہ ہم سب کے حق میں بھی بہتر ہو گا......''

ترنم کی زبان سے یہ الفاظ...... الفاظ نہیں تھے بلکہ زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے جو ایک ایک کر کے اس کے دل میں کسی خلش کے خنجر کی طرح پیوست ہو گئے تھے...... اگر وہ اس کے سینے میں چاقو یا خنجر گھونپ دیتی تو شاید اسے اتنی تکلیف اور صدمہ نہ ہوتا۔

ترنم کے نزدیک یہ فیصلہ کن بات تھی کہ رشید اسے شکست فاش دے دے گا۔ ترنم نے جس غیر جذباتی انداز میں اس کا اظہار کیا تھا...... اس نے وسیم کی روح کو گھائل کر دیا...... اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس کا دل لہولہو ہو گیا۔ ترنم کی اس بات سے اس نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کی یہ خواہش ہے کہ رشید یہ مقابلہ جیت جائے۔ وہ رشید کو فاتح دیکھنا چاہتی ہے۔

ترنم اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اور کتنی آسانی سے اس خواہش کا اظہار کر رہی تھی جیسے اس کا ہار جانا کوئی بات نہ ہو۔ ترنم کو یہ بات معلوم نہ تھی کہ اس مقابلے میں ہار جانے کا مطلب کیا تھا؟

کیا اتنے برسوں سے ترنم اسے اتنی خوب صورتی سے بے وقوف بنا رہی تھی......؟ اس کے جذبات سے اس طرح کھیل رہی تھی جیسے ایک بچہ کھلونے سے کھیلتا ہے...... کیا لطیف جذبات کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ جب دل چاہے انہیں کسی فالتو چیز کی طرح پیروں سے روند دیا جائے......؟ وہ تو برسوں سے یہ سمجھتا چلا آ رہا تھا کہ ترنم بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتی ہے۔ جتنی وہ کرتا ہے...... اور وہ فطری شرم و حیا کی وجہ سے خاموش ہے...... اس لئے اس سے کھل کر اظہار محبت نہیں کیا۔ اس نے سنا تھا کہ عورت محبت کے اظہار میں پہل نہیں کرتی......

وسیم کو اس لمحے ایک شدید ذہنی دھچکا لگا تھا جیسے بجلی کا سنسنا دینے والا جھٹکا ہو...... اور اس کی رگوں میں لہو ابلنے لگا...... اس کے جی میں آیا کہ وہ ترنم کو چیونٹی کی طرح مسل دے...... اس کے پرکشش بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے جس نے اسے اور رشید کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ جو مرد بھی دیکھتا ہے دل تھام لیتا ہے......

لیکن اس میں ایسا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ ترنم اس کی ذات میں گھلی اور رچی ہوئی تھی...... اس کی روح بنی ہوئی تھی...... ترنم کو کوئی تکلیف اور صدمہ پہنچے وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے من کے نہاں خانے میں بسی ہوئی اس شہزادی کی وہ پوجا کرتا آ رہا تھا۔ اسے کیسے بدنما کر سکتا تھا۔

اگر اس کی نیت ترنم کو فتح کرنا اور داغ دار بنانا ہوتا تو وہ کب کا کر چکا ہوتا...... اس کے علم میں یہ بات تھی کہ رشید راتوں کو چھپ چھپ کر ترنم کے پاس جاتا تھا...... اس نے تعاقب کیا تھا۔ رشید کو دیکھا تھا کہ وہ ترنم کے کمرے کی اس کھڑکی کے باہر کھڑے ہو کر ترنم کو گہری نیند کی حالت میں دیکھتا تھا۔ نہ صرف ترنم کا جسم بلکہ اس کا لباس بھی بستر پر بے ترتیبی لئے ہوتا تھا جو ایک ہیجان خیز نظارہ بن جاتا...... جس سے جذبات تند ہو جاتے......

ایک مرتبہ ترنم کے والد اور بڑی بہن بھی گھر پر نہیں تھے، وہ اکیلی تھی۔ ان کا دوسرے دن آنے کا پروگرام تھا۔ ترنم کا گھر میں رات کے وقت اکیلی ہونا سنسنی خیز تھا۔ لیکن اس نے چاہتے ہوئے بھی فائدہ نہیں اٹھایا...... ترنم کو قابو میں کر کے بے بس کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا...... اور پھر اس نے بھی رشید کی طرح چھپ کر دن اور چاندنی راتوں میں تالاب پر اکیلی تیرتی اور سہیلیوں کے ساتھ بھی آزادی سے نہاتے دیکھا تھا...... ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ رشید کا وحشی پن جاگا نہیں تھا اور اس کی فتوحات کا سلسلہ دراز تھا وہ ترنم تک محدود نہ رہا تھا...... اس کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ وہ ترنم کو داغ دار کر دے۔

یہ رشید کی فطرت کا عجیب و غریب پہلو تھا کہ اس نے ترنم کو فتح نہیں کیا تھا جب کہ وہ دن اور راتوں کو ترنم کو چھپ کر دیکھے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ایک نا قابل یقین سی بات تھی۔

''ترنم......! تم رشید سے شادی کرنا چاہتی ہو

تو...... میرا رشید سے مقابلہ کرنے سے کوئی فائدہ اور کچھ حاصل نہیں...... تم اس سے شادی کرلو۔ میں تم دونوں کے راستے سے ہٹ جاتا ہوں...... میری دعا ہے کہ اوپر والا تم دونوں کو سدا سکھی اور خوش رکھے۔ تمہاری ازدواجی زندگی میں محبت کا ترنم گیت بن کر گونجتا رہے۔"

وسیم نے بہ دقت تمام اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں کہا۔ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے حلق میں گولہ سا اٹک گیا تھا۔

"نہیں...... نہیں...... وسیم......! تم میری بات کا مطلب نہیں سمجھے......" ترنم فوراً ہی بول اٹھی۔ پھر وہ سپاٹ سے لہجے میں بولی۔ "یہ مقابلہ ضرور ہونا چاہئے...... تمہیں یہ جنگ لڑنی ہوگی۔"

"میں جب کہ تمہارے اور رشید کے حق میں اس مقابلے سے دستبردار ہوں تو پھر یہ جنگ ضروری کیوں ہے......؟" وسیم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "اور پھر اس خون خرابے سے کیا حاصل......؟ کیا یہ لاحاصل نہیں......؟ وقت کا ضیاع نہیں......؟ ذرا سوچو تو سہی......؟"

"اس لئے کہ میں جانتی ہوں کہ تم یہ جنگ جیت نہیں سکو گے......؟ یہ جنگ اس لئے بھی ضرور ہونا چاہئے تاکہ رشید کو ہمیشہ یہ احساس رہے کہ اس نے لڑ کر مجھے حاصل کیا ہے۔" ترنم کہنے لگے۔ "اس نے میرے حصول کے لئے سخت جدوجہد کی اور میں کسی پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں نہیں آ گری۔"

"لیکن تمہارا یہ فلسفہ میری سمجھ میں قطعی نہیں آیا......؟" وسیم بولا۔ "میں نے ایک طرح سے اس سے مقابلے سے پہلے ہی اپنی شکست تسلیم کرلی کہ وہ اس بات سے ساری زندگی خوش رہے گا کہ اس نے محبت کی بازی اس لئے جیت لی کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔ یہ فاتح بن گیا...... کیوں...... یہی بات ہے نا......؟"

"اصل بات یہ ہے کہ مقابلے میں حاصل کئے ہوئے انعام کی مرد ہمیشہ قدر کرتا ہے۔" ترنم کہنے لگی۔ "جو چیز بغیر محنت کے مل جاتی ہے مردوں کی نظروں میں اس کی وقعت نہیں رہتی وسیم......! اب تم میری بات کا مطلب سمجھ گئے ہوگے کہ میں مقابلہ کیوں اور کس لئے تم دونوں کے درمیان چاہتی ہوں۔"

ترنم کے ایک ایک لفظ میں زہریلے ڈنک چھپے ہوئے تھے۔ اس کا زہر وسیم کے وجود میں سرایت کرتا چلا گیا اور اس کی جلن اسے محسوس ہونے لگی۔

"اگر میں جیت گیا اور رشید کو شکست ہوئی تو کیا تم مجھ سے شادی کرلوگی ترنم......؟"

وسیم نے سوالیہ نظروں سے ترنم کو دیکھا...... ترنم اس کے چہرے پر نظریں مرکوز کئے اس کی دلی کیفیات کو جیسے بھانپنے کی کوشش کررہی تھی۔

"تم وسیم......! تم رشید سے جیت جاؤ گے......؟ نہیں تم اس سے کسی صورت میں جیت نہیں سکتے......؟ یہ ناممکن ہے......" ترنم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "رشید سے جیتنے کا خیال دل کے ہر کونے سے نکال دو...... دیکھو حقیقت پسند بنو...... میری بات مانو...... اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا مت کرو۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر میں تمہارے لئے رشید سے نہیں لڑوں گا......" وسیم نے زہرخند کہا اور پھر وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ سینے میں سانس پھولنے لگی۔

"وہ کس لئے......؟" ترنم کے حسین چہرے پر ایک گہرا استعجاب چھا گیا۔

"اس لئے کہ تم پہلے ہی اس کی ہوچکی ہو...... اور وہ تمہارے من کی گہرائیوں میں اور خوابوں میں بسا ہوا ہے۔" وسیم بولا۔ تو اس کے لہجے میں سارے جہاں کی تلخی بھری ہوئی تھی۔ "اس سے مقابلہ کرکے مجھے کیا حاصل ہوگا...... رشید مجھ سے شدید نفرت کرتا ہے...... اور برسوں سے عداوت رکھتا ہے...... اس لئے اس نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے یہ طریقہ اپنایا ہے...... مجھے اس بات کی کیا ضرورت پڑی کہ میں اس کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھاؤں...... تم بخوشی رشید سے شادی کرکے وہ گھر بسالو جس کا خواب نہ جانے تم کب سے دیکھتی آرہی ہو...... میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ راستے

کا پتھر نہیں بنوں گا۔ اور نہ ہی تم دونوں کی ازدواجی زندگی میں زہر گھولوں گا۔"

"تم......! تم......! مجھے غلط سمجھ رہے ہو وسیم......!" ترنم بھی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اس نے اپنا بلاؤز اور گھاگھرا درست کیا اور ہذیانی لہجے میں کہنے لگی۔

"یہ تم نے کیسے تصور کرلیا کہ تمہارے جیت جانے پر میں تم سے شادی نہیں کروں گی......؟ اس شرط اور مقابلے کے نتیجے میں...... میں فاتح سے شادی کرنے کی پابند ہوں...... یہ مقابلہ ہر صورت میں تم دونوں کے درمیان ہونا چاہئے اور رشید کو یہ مقابلہ جیت کر مجھے حاصل کرنا چاہئے...... کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ تم ہرگز ہرگز یہ مقابلہ جیت نہیں سکتے...... میں ایک بار پھر تم سے کہتی ہوں جو ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ...... تم اس جیت کا خیال دل کے ہر کونے سے نکال کر اس طرح پھینک دو جس طرح جسم پر رینگتے ہوئے زہریلے کیڑے کو جھٹک کر پھینک دیا جاتا ہے۔ جس کا ڈنک بڑا زہریلا ہوتا ہے۔

"ترنم......!" وسیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "ذرا یہ تو بتاؤ کہ آخر تم اتنی بضد کیوں ہو......؟ تم نے اسے اپنی انا کا مسئلہ کیوں بنالیا ہے؟"

"تم جس طرح رشید کے مزاج...... اس کی سوچ اور فطرت سے واقف ہو...... میں اسے اتنا جانتی ہوں کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو اتنا نہیں جانتا ہوگا۔" ترنم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "اس کی نظروں میں ایسی کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں جو اسے بغیر کسی کوشش اور محنت کے مل جائے...... اسے نہیں معلوم اور نہ ہی میں نے اپنی کسی بات سے اسے احساس ہونے دیا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں...... میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتی...... وہ میرے حصول کے لئے تم سے مقابلہ کرے گا اور تمہیں ہرادے گا اور بچپن میں جو تم اسے مارا کرتے تھے وہ اس سے کہیں بری طرح مار کر تم سے انتقام لے گا تاکہ جیتنے اور انعام کی شکل میں مجھے حاصل کرلے...... اس طرح وہ مجھے گوہر نایاب سمجھ کر میری قدر کرسکے گا...... تم مجھ سے محبت کرتے ہو وسیم......! کاش......! تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا...... لیکن میں بے وقوف نہیں ہوں اور لوگ مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں...... میں نے بھولے سے بھی رشید پر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا...... جب کہ صرف ایک بار چند لمحوں کے لئے میں تمہارے سامنے جذباتی ہوگئی...... من مانی کرنے دی۔ آج بھی حیران ہوتی ہوں کہ اس وقت مجھے کیا ہوگیا تھا جو میں خودسپردگی اور بڑے والہانہ انداز اور وارفتگی سے پیش آئی تھی...... اور تم نے پھر کبھی اس کا اعادہ نہیں کیا نا...... شاید تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو خود کو قابو میں نہیں رکھتا...... تم کہتے ہو کہ تمہیں مجھ سے بے پناہ محبت ہے۔ محبت ایثار اور قربانی مانگتی ہے...... اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو تم اس محبت اور میری خوشیوں کے لئے اتنی قربانی نہیں دے سکتے وسیم......؟"

"تم رشید سے محبت کرتی ہو...... اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں...... عام ہی نہیں بلکہ دیوانگی کی حد تک...... اس دیوانگی کی کوئی حد نہیں ترنم......؟"

"تمہاری محبت میں دیوانگی......؟" ترنم نے تکرار کی۔ "میں اس بات کو نہیں مانتی۔"

وسیم اس کی بات سن کر اور سنجیدہ ہوگیا پھر اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا۔

"میں برسات کی وہ رات بھولا ہوں اور نہ بھول سکتا ہوں...... اس روز میں اور رشید تمہارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ مغرب کے بعد اچانک طوفان آ گیا اور موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بجلی کا سارا نظام مفلوج ہوگیا...... اتفاق کی بات تھی کہ گھر میں نہ تو موم بتی تھی نہ لالٹین...... لالٹین کہیں رکھی ہوئی تھی تو تلاش اس لئے نہیں کی جاسکتی تھی اس گھپ اندھیرے میں اس کا ملنا ناممکن تھا۔

تمہارے کمرے میں بھی جذبات کا ایک طوفان

جس کی زد میں آ کر ہم دونوں بہکے اور دور تک ایک تنکے کی طرح چلے گئے۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھ پر اس فیاضی سے مہربان ہو جاؤ گی...... اس کے باوجود بھی تم رشید سے محبت کرتی ہو...... جب ایک عورت کسی پکے پھل کی طرح مرد کی جھولی میں گر جاتی ہے تو وہ اسے اپنا سب کچھ سمجھ لیتی ہے...... میں آج اور اب تک یہ سمجھتا رہا کہ چوں کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو اسی لئے تم نے سارے فاصلے مٹا دیئے اور ہر دیوار گرا دی......

ترنم......! تمہارے حصول کے لئے نہیں بلکہ برسوں سے اس کے سینے میں نفرت اور انتقام کی جو آگ بھڑک رہی ہے اسے بجھانے کے لئے وہ مجھ سے لڑ رہا ہے...... ہم دونوں کے درمیان جو جنگ ہوگی وہ زندگی اور موت کی ہوگی...... یہ جنگ اس وقت تک جاری رہے گی جب تک کوئی ایک جیت نہیں جاتا...... اس جنگ میں صرف ایک آدمی بچے گا...... وہ یا میں...... اس نے مقابلہ کرنے کے لئے شرائط پیش کی تھیں جو میں نے منظور کر لی ہیں...... اب یہی ہوگا میں اسے موت سے ہمکنار کرنے کے بعد اس کا سر کاٹ کر لاؤں گا۔ اور سہاگ کی پہلی رات تمہیں منہ دکھائی تحفے کے طور پر پیش کروں گا۔ آج تک کسی شوہر نے اپنی بیوی کو ایسا شاندار اور نایاب تحفہ منہ دکھائی میں پیش نہیں کیا ہوگا...... اس طرح ہماری پر مسرت اور خوشگوار زندگی کا آغاز ہوگا...... اور پو پھٹنے سے پہلے اس سر کو اپنے گھر کی دہلیز میں قبر چبوترے کی شکل میں بناؤں گا...... تاکہ گھر میں جاتے اور باہر نکلتے وقت اس کی قبر کو روندتا ہوا آیا جا سکے...... یہ قبر اس بات کی ضمانت اور یادگار ہوگی میں نے اس محبت کی جنگ کو جیتا ہے۔"

وسیم اپنی بات ختم کر کے رکا نہیں...... وہ تیزی سے لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے زور سے بولا۔

"ترنم......! تم سے پیر کو ملاقات ہوگی...... تم میرے لئے پھولوں کا ہار تیار رکھنا...... کیوں کہ میں ہر صورت فاتح بن کر لوٹوں گا۔

☆......☆......☆

وسیم رات سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ بستر پر کروٹیں بدلتے ترنم اور بارش کی رات کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کے باوجود ترنم کا رشید سے محبت کرنا ناقابل یقین تھا۔ کیوں کہ وہ اس کی ہو چکی تھی۔ یہ بھی ایک معمہ تھا۔ یہ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ لیکن وہ صرف ایک گھڑی سو سکا۔

پھر صبح چھ بجے جب وہ جزیرے پر پہنچے تو سورج کی کرنیں ہر سو پھوٹ رہی تھیں۔ کشتی روکنے کے بعد اناتچو نے صرف اتنا کہا۔ "میں تمہارے لئے بہترین تمناؤں کی خواہش نہیں کر سکتا......؟" اس کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا...... "لیکن میری بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ رشید اپنا ارادہ بدل دے اور تمہاری زندگی کو ختم نہ کرے...... اس لئے کہ زندگی بڑی قیمتی ہوتی ہے...... یہ انسانی زندگی ہے۔ جانوروں کی نہیں۔"

وسیم کنارے کھڑے اسے اس وقت تک جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا۔ وہ دل میں مسکراتا رہا۔ وہ اناتچو سے کہنا چاہتا تھا کہ...... رشید مجھے جان سے مار دے مجھے اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔ کیوں کہ اصل فاتح تو میں ہوں...... ترنم کو میں نے پا لیا تھا...... تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی...... ایک لمحے سے فائدہ اٹھا لیا تھا۔ اب وہ ایک داغ دار پھل ہے...... جب کبھی یہ بات رشید کے علم میں آئے گی کہ ترنم اس رات اپنی عزت کی حفاظت نہیں کر سکی اور ارادی طور پر اس نے اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ اس میں کسی کا دوش نہیں تھا۔ یہ حادثہ تو نوجوان، جذبات، موسم اور تاریکی کی وجہ سے پیش آیا تھا۔ اس وقت رشید کی حالت ہوگی یہ میری روح دیکھے گی۔

کشتی پر سوار ہونے سے پہلے اناتچو نے معذرت خواہانہ انداز سے جلدی جلدی اس کی تلاشی لی تھی...... اور اسے قمیض اور جوتے اتارنے کے لئے بھی کہا۔ اس نے اناتچو کی ہدایت پر عمل کیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا دوست حمید بھی رشید کے ساتھ یہی کچھ کر رہا ہوگا۔ کیوں کہ ان کے درمیان یہی شرائط طے پائی تھیں۔ پھر وہ دونوں کشتی چلانے لگے۔

رضا جزیرہ ایک مورتی کی شکل میں تھا اس لئے اس کا پہلے نام ہنومان رکھا گیا اور جانے کب تک ہنومان کہا جاتا رہا تھا۔ اس کے آخری سرے پر ہنومان کا مجسمہ بھی تھا۔ فضائی نظارے سے لگتا تھا کہ جیسے دیوتا کا مجسمہ لیٹا ہوا ہے۔ اس کی لمبائی تقریباً دو میل تھی۔ لیکن وہ کہیں سے بھی دو فرلانگ سے زیادہ چوڑا نہیں تھا اور یہ چوڑائی بھی درمیانی حصے میں تھی۔

یہ مختصر سا جزیرہ درختوں اور خار دار جھاڑیوں سے اٹا پڑا تھا۔ وہاں خرگوش اور چھوٹے موٹے جان دار کثیر تعداد میں تھے۔ گرمیوں کے زمانے میں وسیم اپنے دوستوں کے ہمراہ اس جزیرے پر آتا رہتا تھا...... جہاں وہ شکار کرتے اور دن بھر اچھل کود اور فٹ بال کھیلتے رہتے...... وسیم اس جزیرے سے اچھی طرح واقف تھا اور رشید بھی...... اس قسم کی جنگ کے لئے یہ جزیرہ ہر طرح سے مناسب تھا۔

جب وہ جزیرے کے مغربی کنارے پر موجود تھے اس کے دل میں یہی آرزو تھی کہ رشید کو موت کے گھاٹ اتار دے۔ اس کے دل میں ترنم کے پچھلی رات کے الفاظ کی تلخی اب تک موجود تھی۔ اس کے زہریلے الفاظ نے اس کے دل میں ترنم کا جو مقام تھا وہ ختم کر دیا تھا۔ لیکن اس کی حدت اب تک اس کے وجود کو گرم کیے ہوئے تھی۔

اس کے ذہن کے کسی گوشے میں ایک نامعلوم سی حیرت انگیز تلخ خواہش کروٹیں لے رہی تھی کہ وہ ترنم کو اس کا رشید دے دے جس طرح وہ چاہتی ہے جب کہ وہ سرفراز ہو چکا ہے...... وہ ایک بات چھپا گیا تھا کہ اس برسات کی رات گھپ اندھیرے میں ترنم نے اسے رشید کہہ کر مخاطب کیا تھا اور پیش قدمی کی اور مہربان ہو گئی تھی۔ اگر وہ اسے رشید کہہ کر مخاطب نہ کرتی تو شاید اس انجانے راستے پر وہ ترنم کو چلنے نہ دیتا...... رشید کہہ کر مخاطب کرتا ہی قیامت ڈھا گیا تھا...... اس نے ترنم کی سرگوشی میں چپ سادھ لی تھی...... پھر اس نے ترنم کی کسی بات سے انکار اور تعرض نہیں کیا تھا۔ ورنہ وہ ترنم کے وجود پر داغ لگانا نہیں چاہتا تھا۔ اسے بڑا دکھ اور افسوس ہوا تھا کہ ترنم نے رشید کو اپنے من میں بسا رکھا ہے...... اسے نہیں......

وسیم کو اس بات کا یقین تھا کہ چند برسوں کے بعد ترنم جیسی معصوم لڑکی کی زندگی رشید جیسے بھیڑیے اور انسان کے ساتھ جہنم بن جائے گی۔ ترنم کو رات جو اس نے باتیں بتائی تھیں وہی رشید کی نیندیں حرام کرنے کے لئے کافی تھیں...... اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں رشید کی گردن مروڑنے اور فاتح کی حیثیت سے ترنم کے پاس جانے کی خواہش بھی کروٹیں لے رہی تھی...... ترنم نے جس طرح اس کے دل کو اس کی محبت کو اور اس کے جذبات کو پیروں تلے روندا تھا اس کا تقاضا بھی یہی تھا کہ وہ رشید کے خون آلود ہاتھوں سے ترنم کا ہاتھ تھام لے...... ترنم نے اسے جو مار ماری تھی وہ بھی ایسی ہی مار ترنم کے وجود پر مارے۔

وسیم کے نزدیک یہ صورت حال بڑی نازک اور عجیب و غریب تھی اور الجھی ہوئی اور پیچیدہ اور سنگین نوعیت کی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ اگر وہ جنگ جیت بھی جاتا ہے تب بھی ترنم کا دل جیت نہیں سکے گا...... کسی عورت کا جسم جیت لینا اور ملکیت بنا لینا اصل بات نہیں تھی۔ کیوں کہ ترنم کے دل میں بدستور رشید کی محبت کا اثر قائم رہے گا...... یوں وہ محبت کی بازی تو ہار چکا تھا...... ممکن ہے شادی کے بعد ترنم کے دل سے آہستہ آہستہ رشید کی محبت دم توڑنے لگے۔ اور ایک دن رشید کی محبت کی حدت دافع ہو جائے...... لیکن اس دہکتی آگ کو راکھ بننے میں کافی عرصہ لگے گا...... وسیم کو اس بات کا یقین تھا کہ ترنم اپنے وعدے کے مطابق بھی اس سے شادی کر لے گی۔ بشرطیکہ وہ جنگ جیت جائے...... لیکن یہ شادی ترنم کی روح سے نہیں اس کے بدن کی دل کشی اور خوب صورتی سے ہوگی۔ وہ اس جرنیل کی طرح ہوگا جو مفتوحہ علاقے پر قابض ہو جاتا ہے اور اسے تاخت و تاراج کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا ہے۔

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

اے ندیم! آ تجھ کو بتاؤں کہ تنظیم گلستاں کیا ہے؟
رت خزاؤں کی ہے فصل بہاراں کیا ہے؟
بیچ کر عزت ناموس زندہ رہو گے کب تک
کالے سورج، سرخ آندھی میں بے چشم رہو گے کب تک
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

ہماری چاہت کی تجھے نہ کچھ خبر ہوگی
تڑپتے ہوئے یوں ہی یہ شب بسر ہوگی
تیری وفا سے ہے یہ جہاں پھر روشن
تمہاری دید کے لائق نہ یہ نظر ہوگی
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

تجھے اتنا تو میں بتاسکا، تجھے میں کبھی بھی نہ پاسکا
میرے دل کو صبر ہی آ گیا، تیرے عشق میں نہ سماسکا
(عثمان غنی......پشاور)

گردش ایام سے گھبرا رہی ہے زندگی
ٹھوکریں ہر قدم پہ کھا رہی ہے زندگی
آج رنج و غم سہی کل دن خوشی کے آئیں گے
دھیرے دھیرے دل کو یوں بہلا رہی ہے زندگی
(آستر......کراچی)

ہونٹوں سے تیرے ہونٹوں میں گیلا کردوں
تیرے ہونٹوں کو میں اور بھی رسیلہ کردوں
تو اس قدر مزہ دے کہ مزے کی انتہا ہوجائے
تیرے ہونٹوں کو چوم کر خود کو اور بھی جوشیلہ کردوں
(احسان سحر......میانوالی)

دل کی آواز سے نغمے بدل جاتے ہیں
ساتھ نہ دو تو اپنے بدل جاتے ہیں
پلکیں بھی زرہ تسنبھل کر جھپکانہ
کیوں کہ پلکیں جھپکانے سے اکثر سپنے بدل جاتے ہیں
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

تم نے کہا تھا آنکھ بھر کر دیکھ لیا کرو فراز
اب آنکھ تو بھر آئی ہے تم نظر نہیں آتے
(انتخاب: حنا......کراچی)

محبت ہم سفر میری اگر ہوتی تو ممکن تھا
تسلسل زیست کی خاطر نئے کچھ خواب بن لیتے
دیا ہوتا کبھی لفظوں کا پیراہن محبت کو
کبھی کچھ خود کہا ہوتا، کبھی کچھ مجھ سے سن لیتے
(انتخاب: شگفتہ......حیدر آباد)

ہم نے اس کے پیار کو سجدہ کیا طلحہ
میری زندگی میں ایسی عبادت کبھی نہ تھی
(محمد طلحہ رحمانی......ملتان)

تم حیا اور شریعت کے تقاضوں کی بات کرتے ہو
ہم نے ننگے جسموں کو ملبوس حیا دیکھا ہے
ہم نے دیکھے ہیں احرام میں لپٹے کئی ابلیس
ہم نے میخانے میں کئی بار خدا دیکھا ہے
(انتخاب: محمد وارث آصف......واں بھچراں)

ہم نے تو شمع جلائی تھی عشق کا اختتام دیکھنے کے لئے
اسی وقت اک پتنگے نے آکر خود کو جلالیا
(رانا حبیب الرحمٰن......گوجرہ)

قربانی پر تھے جو گوشت کھانے میں مست
وہ اب گرانی معدہ سے مر رہے ہونگے
ہمارے ہاتھ سے قربان ہوئے جو بکرے نوری
اب وہ بہشت کی کھیتی میں چر رہے ہونگے
(غلام نبی نوری......کھڈیاں خاص)

کبھی چاہت کے دن رات بھی اچھے نہیں لگتے
کبھی اچھے تعلقات بھی اچھے نہیں لگتے
کبھی جی چاہتا ہے تیری مٹھی میں دھڑکنے کو
کبھی ہاتھوں میں تیرے ہاتھ بھی اچھے نہیں لگتے
(صدف حسین......کراچی)

چل نا محسن کسی انجان بستی میں چلیں
اس نگر میں تو سبھی ہم سے خفا رہتے ہیں
سنا ہوگا کسی سے تم نے کہ درد کی اک حد ہوتی ہے
ملو ہم سے کہ ہم اکثر اس حد سے پار رہتے ہیں
(نوشین خان......میلسی)

غزل

کبھی نظریں ملانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی نظریں چرانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کسی کی آنکھ کبھی کھلتی ہے تو سونے کی نگری میں
کسی کو گھر بنانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی گھر سے نکلتے ہی آجاتی ہے سامنے منزل
کبھی رستوں کو پانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی صدیوں کی سی راتیں ہمیں پل بھر کی لگتی ہیں
کبھی سورج کو آنے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کوئی سجدے میں گرجاتا ہے تو پالیتا ہے اپنے رب کو
کسی کو لو لگانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
وہ بھی سب چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ جاتے ہیں
جنہیں دنیا کے کمانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
کبھی ایک پل برابر بن کے واجد صدیاں بیت جاتی ہیں
کبھی ایک پل بتانے میں زمانے بیت جاتے ہیں
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

زمانے میں اپنے ہی دوستوں سے غم ملتے رہے
خوشی کے لمحے پھر سے آنسوؤں میں ڈھلتے رہے
ہم نے جس پہ بھی یہاں کیا ہے بھروسہ
لوگ سانپ بن کے پھر سے ہمیں ڈستے رہے
زندگی دھوپ چھاؤں کا سفر ہے پھر بھی
بھری انجمن میں لوگ مل کے بچھڑتے رہے
بڑی مشکلوں سے کسی نے یہ مقام پایا ہے
خوشی کے ساتھ غم بھی ہمیں ملتے رہے
ساتھ اپنے شب کی تنہائی، تیری یاد بھی ہے
وفا کی سوچ میں جشن کے چراغ جلتے رہے
یہاں جشن والوں کا کوئی بھروسہ نہیں جاوید
لوگ اپنا مطلب نکال کر بدلتے رہے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

اپنی آنکھوں کے شرارے تو چھپالے ورنہ
تجھ پہ بے کیف سا الزام بھی آسکتا ہے
گردش وقت نے پوچھا مرے رونے کا سبب
مرے ہونٹوں پہ تیرا نام بھی آسکتا ہے
میرے جذبات کا خون کر کے مکرنے والی! پوچھ لے اپنی
ہی بانہوں سے محبت کیا ہے
شام کے شوخ نظاروں کی قسم کھا کے بتا
میرے دل میں جو جگائی تھی وہ حسرت کیا ہے
جب بھی چھو لیتا ہے ہونٹوں کے کنارے تیرا نام
مجھ کو ماحول میں تنویر نظر آتی ہے
ہر طرف تیری ہی پلکوں کے گھنے سائے میں
مجھ کو دنیا میری جاگیر نظر آتی ہے
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

تو نے ساتھ چھوڑ دیا اس بات کا کوئی غم نہیں
خیالوں میں آجاتے ہو یہ بھی کچھ کم نہیں
ملنا نہ ملنا یہ تو مقدر کے کھیل ہیں
زمانے سے پھر کیسی شکایت جب تیری قسمت میں ہم نہیں
آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو پھر یہ جانا
روتی تھیں جو تیری یاد میں اب وہ آنکھیں پرنم نہیں
تیری چاہت میں، میں نے بہت دکھ اٹھائے ہیں
اس دل پہ اور زخم کھاؤں اتنا مجھ میں دم نہیں
تجھ کو نئی خوشیاں مبارک مجھ کو میری تنہائیاں
ناز تھا جس کی محبت پر مجھے اب وہ میرا صنم نہیں
(انتخاب: شائستہ سحر......راولپنڈی)

آتش عشق سے سینے کو جلایا کیوں تھا
تم نے یہ روگ جوانی میں لگایا کیوں تھا
کیوں لئے پھرتے ہو اب دنیا میں پرنم آنکھیں
پیار اچھا تھا مگر دل میں بسایا کیوں تھا
جب بچھڑ جانا ہی تقدیر میں لکھ رکھا تھا
میرے مولا مجھے اس سے ملایا کیوں تھا
کیسے ممکن ہے ملے ہجر کی راتوں میں سکون
ان کی یادوں کو سر شام جگایا کیوں تھا
جب کہ معلوم تھا رکھتے ہیں غضب کا غصہ
دل کا احوال انہیں جا کے سنایا کیوں تھا

کردیئے بزم میں گم اس نے میرے ہوش و حواس
میں بھی حیراں ہوں کہ میں ہوش میں آیا کیوں تھا
تم کو معلوم ہے کہ شرک ہے تصویر بتاں
اس تصویر کو پھر دل میں سجایا کیوں تھا
بات کرنا جو گوارا نہ تھی اس کو نیر
پھر اشاروں سے مجھے پاس بلایا کیوں تھا
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈو الہ یار)

نہ درد سمٹتا ہے نہ آنکھ برستی ہے
وہ حسن کا کوچہ ہے یہ عشق کی بستی ہے
سیلاب کی بے تابی رخ اپنا ادھر کرلے
اک وادیٔ حیرت ہے...... پانی کو ترستی ہے
آئے ڈال گلابوں کی اک جام غزل گوئی
تیرے دامن ہونٹوں کے شعلوں کو ترستی ہے
زلفوں کو ذرا کھولو ہم دیکھنے آئے ہیں
یہ کون سی ناگن ہے جو ہوش کو ڈستی ہے
بس چاند کو چھپ چھپ کر ہم دیکھتے جاتے ہیں
ہم درد کے ماروں کی یہ حسن پرستی ہے
آنکھوں کے خاور سپنے بجھنے میں نہیں آتے
اک شاخ مہکتی ہے اک شاخ مچلتی ہے
(انتخاب: محمد وارث آصف......واں بھچراں)

تیرے لوٹ آنے کا انتظار کرتا ہوں
دیکھ میں تجھ سے کتنا پیار کرتا ہوں
میں بناتا ہوں کاغذ پہ تیری تصویریں
پھر ان سے باتیں ہزار کرتا ہوں
تیرے دکھ بھی اپنے دکھ میں شمار کرتا ہوں
خلوص نیت سے بس تیرا اعتبار کرتا ہوں
آج بھی سوچتا ہوں تو میری آنکھیں بھیگ جاتی ہیں
دیکھ میں تجھ سے اتنا پیار کرتا ہوں
(غلام نبی نوری......کھڈیاں خاص)

یارب یہ سال سب کی مسرت کا سال ہو
پیغام عیش لائے یہ عشرت کا سال ہو
آنسو کا سال ہو نہ یہ آہوں کا سال ہو
نغمے نئے سنائے، بہاروں کا سال ہو
خوشیوں سے بھرا یہ تمہارا سال ہو
کھلے آنگن میں پھول کہ یہ ڈر کا سال ہو
(سنبل ماہین طہٰ......سرگودھا)

الم نصیب جہاں راہ وفا ہیں ہم
عجیب درد کی لذت سے آشنا ہیں ہم
ہم اہل دل ہیں محبت ہمارا شیوہ ہے
ہیں سب کے بھی سب سے مگر جدا ہیں ہم
ہم ان سے برسر پیکار ہیں جہاں بھی ہیں
جو لوگ کہتے ہیں سجدے کرو خدا ہیں ہم
ہمارے ذہن سے ابھرے ہیں آفتاب کئی
جہاں بھی ظلمت شب ہے سحر نما ہیں ہم
شکستہ حال و تہی دست بے نواہی سہی
ضمیر دہر کی یارو مگر صدا ہیں ہم
ڈبو کے سارے سفینے قریب ساحل کے
ہے ان کو پھر بھی یہ دعویٰ کہ ناخدا ہیں ہم
اداس جی ہے طبیعت بجھی ہوئی امتیاز
کسے بتائیں کہ کس شوخ سے جدا ہیں ہم
(ایس امتیاز احمد......کراچی)

منزل مجھے نصیب سفر در سفر نہیں
کتنے مکاں ہیں میرے لئے ایک گھر نہیں
بدلا ہے کتنی بار مرے دل کا فیصلہ
روکو اسے پکارو کہوں کچھ مگر نہیں
میں کسی کے آگے جا کے رکھوں دل کا مسئلہ
ہمدم نہیں رفیق نہیں چارہ گر نہیں
خود اپنے گھر میں آج بہت اجنبی ہوں
کہتا ہے مجھ سے کوئی کہ یہ تیرا گھر نہیں
وثیقہ کوئی تو ضبط کی حد ہونی چاہئے
دل خون ہوگیا ہے مگر آنکھ تر نہیں
(وثیقہ زمرہ......فیض پور)

ابھی مجھے ایک دشت صدا کی ویرانی سے گزرنا ہے
اک مسافت ابھی ختم ہوئی ہے، اک سفر ابھی کرنا ہے
ڈر جانا ہے دشت و جبل نے تنہائی کی ہیبت سے
آدھی رات کو جب مہتاب نے تاریکی سے ابھرنا ہے
یہ تو ابھی آغاز ہے پہنائے حیرت کا جیسے اس
آنکھ نے اور سنور جانا ہے رنگ نے اور نکھرنا ہے
جیسے زر کی پیلاہٹ سے موج و خون اترتی ہے
زیر زر کے تند نشے نے دیدہ دل میں اترنا ہے
(افشاں رمضان......سرگودھا)

اسے کہا دسمبر جارہا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی
برس اک اور ماضی کا
فضا میں ڈوب جائے گا
اسے کہنا دسمبر کے گزرنے سے ذرا پہلے
محبت کی کہانی کو
کوئی تکمیل دے جائے
اسے کہنا دسمبر کا مہینہ جیسے گزرے گا
کوئی ٹوٹ جائے گا وہ زندہ رہ نہ پائے گا
اسے کہنا دسمبر کے ذرا گزرنے سے پہلے
محبت کو کوئی تعبیر دے جائے
اسے کہنا مقدر کو ہمارے ڈوب جانے سے بچالینا
مجھے اپنا بنالینا
اسے کہنا دسمبر جارہا ہے
دسمبر کے گزرتے ہی
خزاں رسیداں پتوں کی طرح
کوئی بکھر جائے گا
اور وہ زندہ رہ نہ پائے گا
ہاں زندہ رہ نہ پائے گا
(محمد آصف شہزادالہ آبادی......ٹھینگ موڑ قصور)

اس جیون میں خواہشوں کے سوا کچھ بھی نہیں
زندگی میں ناکام حسرتوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میں تجھے یاد کرتی ہوں ہر شب، ہر دن ہر وقت
کیونکہ میرے پاس تیری یاد کے سوا کچھ بھی نہیں
دل میں اب بھی اک کسک سی اٹھتی ہے
اس دل میں تیرے درد کے سوا کچھ بھی نہیں
کبھی ایسا بھی ہوا ہو کہ کسی کی زندگی میں
اک شخص کے سوا کچھ بھی نہیں؟
کبھی کبھی یہ سوچ کے دل ہول اٹھتا ہے
کیا میری زندگی میں دکھ کے سوا کچھ بھی نہیں
اب بھی میرے دل میں اک تشنگی سی باقی ہے
سب کچھ ہوتے ہوئے میرے پاس تیرے سوا کچھ بھی نہیں
(ساجدہ راجا......ہندواں سرگودھا)

بے نام مسافر ہوں بے نام سفر میرا
کس راہ نکل جاؤں کچھ کہہ نہیں سکتا
بے نام میری منزل بے نام ٹھکانہ ہے
کس در پہ میں رک جاؤں کچھ کہہ نہیں سکتا
اس پار تو روشن سے سارا راستہ میرا
اس پار اندھیرا ہو کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
مل جائے گی تاثیر میرے خوابوں کی ایک دن
ہاں پھر خواب بھی بکھر جائیں کچھ کہہ نہیں سکتا
(اذان عزیز......ٹنڈو آدم)

عرش پہ فریاد اور آہ زاری رہی
زمین گناہوں کے بوجھ سے ذرا کھسکی
اک لمحے میں بھونچال یوں آیا......!
معصوم سلامت رہے......توبہ کا وقت میسر تک نہ آیا......!
قافلہ مٹتا گیا...... زخم بڑھتا گیا......
اک کینسر کی مانند......!
علاج ممکن ہے مگر......!
شرط ایمان ضروری ہے اول......!
میرے سپہ سالار کچھ یوں بدلے......!
لوٹا مجھے میرے قافلے والوں کو......!
پاس سے جو گزرے......
سلام کیا اور دانتوں کو باہر نکالا......!
میں بلکتا رہا...... قتل بڑھتے گئے......

ستے داموں خون بکتا رہا......!
کوئی تو محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی آئے......
نور الدین زنگی اور سلطان ٹیپو آئے......!
میری منزل کہاں تھی؟
بھٹکے ہوئے انسان کو راستہ دکھائے......!
مجھے ابھی جینا ہے...... قافلے والوں کیلئے......!
میرا ڈوبتا دامن تھام کر...... کنارے پہ لائے......!
کوئی تو آئے، کوئی تو آئے......!
کوئی تو آئے...... کوئی تو آئے......!
اک پیغام......!
(مدثر بخاری......شہر سلطان)

کیا سوچتے رہتے ہو سدا رات گئے تک
کس قرض کو کرتے ہو ادا رات گئے تک
تھک ہار کے آبیٹھے ہیں دہلیز پہ تیری
دیدار کا محسن ہے گدا رات گئے تک
یہ کون ہے جو یوسف سا حسین ڈھونڈ رہا ہے
یعقوب کوئی محو ندا رات گئے تک
شمع تیری آمد کے جولاتی تھی سر شام
ہوتے رہے پروانے فدا رات گئے تک
کچھ عالم تنہائی میں اشکوں نے دیا ساتھ
آنکھیں رہیں سیلاب زدہ رات گئے تک
محسن کو شب وصال جام ملا بامشکل
ہو پائیں نہ پھر دونوں جدا رات گئے تک
صلیب شاخ پہ رقصاں گلاب دیکھے ہیں
شرار حسن میں جلتے شباب دیکھے ہیں
ہماری سوچ پہ کوئی نا ہوسکا حادی
کہ ہم نے صرف تیرے ہی خواب دیکھے ہیں
(نوشین خان......کوٹ مظفر میلسی)

ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
ملے اگر فرصت تو پڑھ لینا
کہ زندگی کا سب کچھ تیرے نام لکھ رہا ہوں

بہار کا موسم ہے آیا ہوا
ہر ایک پھول تیرے نام لکھ رہا ہوں
شب تنہائی میں آتی ہے تیری یاد بہت
ہر ایک یاد کا انداز تیرے نام لکھ رہا ہوں
چاند کی چاندنی، پھول کی خوشبو
شبنم کی بوندیں تیرے نام لکھ رہا ہوں
چہچہاتے ہوئے بلبل کے نغمے
ایک آس کے ساتھ تیرے نام لکھ رہا ہوں
ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
ڈوبتے سورج کی کرنوں کا
دن بھر وفا کا انداز لکھ رہا ہوں
جلتے ہوئے شمع پر قربان ہوا پروانہ
پروانہ کی زندگی کا حال لکھ رہا ہوں
اتنے پیار سے پالے تھے باغباں نے پھول
ستم خزاں کی روداد لکھ رہا ہوں
کس قدر پیار سے دیکھتا تھا حسن اس کو
نگاہ یار کی نفرت کا انداز لکھ رہا ہوں
ایک غزل لکھ رہا ہوں
تیرے نام لکھ رہا ہوں
(محمود الحسن......چارسدہ)

اب عرض بھی کریں کیا حکم ہے ہمارے لئے
میں سر قلم نذرانہ کروں یا جان دے دوں
تحفہ عشق ہوگا گر جناب قبول کریں
سینہ چاک کرکے دل اپنا جو پیش کروں
محبت ہے عشق ہے پیار آئے فقط تم پہ
خیال غلطاں مت لانا خواہش جسم جو کروں
جلوہ حسن دیدار خود بھی کرادیا کریں
وگرنہ لب جاں آئے تختہ موت چڑھا کروں
درد زیست کیا کروں بہتر ہے موت اچھی
گھٹ گھٹ کر جو تم سے جدا تڑپا کروں
عرض کچھ نہیں بس عشق ہے آپ سے ورنہ
گلی گلی کوچہ کوچہ مجنوں بنے جلا کروں
(محمد عثمان علی......میاں چنوں)
☆☆

زمانے بھر سے نفرت ہوگئی ہے
ہمیں تم سے محبت ہوگئی ہے
وگرنہ کون تھا دنیا میں اپنا
تری چشم عنایت ہوگئی ہے
زمانے سے فقیر رہگذر کی
سنا ہے کہ عداوت ہوگئی ہے
وہ کچھ کہتے ہوئے گھبرا رہے ہیں
یعنی مجھ سے شکایت ہوگئی ہے
مجھے جب سے غم فرقت ملا ہے
خفا اس دن سے قسمت ہوگئی ہے
تری الفت میں کیا رسوائے ہوئے
زمانے بھر میں شہرت ہوگئی ہے
کچھ ایسے زخم دل رانا ملے ہیں
چھپانے کی سی عادت ہوگئی ہے
(قدیر رانا......راولپنڈی)

چین دل کو ایک پل نہیں ملتا
کیوں ترا نعم البدل نہیں ملتا
تک رہا ہوں مدتوں سے راستے
صبر کا بھی اب تو پھل نہیں ملتا
فیصلے ہوتے رہے ہیں بارہا
فیصلہ کوئی اٹل نہیں ملتا
صحن گلشن میں کبھی کھلتا ہوا
آرزو کا کنول نہیں ملتا
کرتا ہوں محسوس سانسوں میں جسے
کیا سبب ہے آج کل نہیں ملتا
یوں تو ملتے ہیں ہزاروں لوگ پر
شخص کوئی باعمل نہیں ملتا
جب دکھائی وہ نہیں دیتا مجھے
پھر کوئی رنگ غزل نہیں ملتا
(رانا حنیف عاطر......جھڈو)

کہیں عشق کی دیکھی ابتدا
کہیں عشق کی دیکھی انتہا
کہیں عشق سولی پہ چڑھ گیا
کہیں عشق کا نیزے پہ "سر" گیا
کہیں عشق سجدے میں گرگیا
کہیں عشق سجدے سے پھر گیا
کہیں عشق در سہ وفا بنا
کہیں عشق "حسن وفا" بنا
کہیں عشق نے سانپ سے ڈسوادیا
کہیں عشق نے نماز کو قضا کیا
کہیں عشق صفت خدا بنا
کہیں عشق "سفر خدا" بنا
کہیں عشق کا طور پر دیدار ہے
اور کہیں عشق ذبح کو تیار ہے
کہیں عشق نے بہکادیا
کہیں عشق نے شاہ مصر بنادیا
کہیں عشق آنکھوں کا نور ہے
کہیں عشق کوہ نور ہے
کہیں عشق "تو ہی تو" ہوا
کہیں عشق "اللہ ھو" ہوا
(احسان سحر......میانوالی)

انہونی باتیں مت کرو
انجانی باتیں مت کرو
تم ساتھ اگر چل سکتے ہو
اور راستہ بدل سکتے ہو
پیار نبھانا جانتے ہو
مجھ کو اپنا مانتے ہو
اگر، گر کو چھوڑ، دوں!
ادھر، ادھر پھر مت دیکھو
پیار اگر مجھ سے ہے تو!
پھر ساتھ میرے چل سکتے ہو
کیوں مڑ، مڑ کر تم دیکھتے ہو
کیوں ڈر، کر مجھ کو تکتے ہو
یہ پیار نہیں آساں ایسا
یہ آگ کے دریا جیسا ہے
اس آگ میں کود سکتے ہو
پھر ہاتھ میرا تھام سکتے ہو
تم ساتھ میرے چل سکتے ہو
تم ساتھ میرے چل سکتے ہو
(عثمان غنی......پشاور)

یوں تو اک شہنشاہ کا قتل ہوا
درحقیقت اک گواہ کا قتل ہوا
پھر سے ابلیس نے شرارت کی
پھر کسی بے گناہ کا قتل ہوا
کوئی منزل پہ کیسے پہنچا؟
ہر طرف سیدھی راہ کا قتل ہوا
علم کے دیپ کیسے روشن ہوں؟
جابجا درس گاہ کا قتل ہوا
جب سے عالی پناہ کا قتل ہوا
(عاصمہ رمضان......پنڈدادنخان)

ایسے ہی نہ در کو کھٹکھٹایا کرو
آپ کا گھر ہے آیا جایا کرو
دور کیا بھاگنا فقیروں سے
بیٹھ کر نیکیاں کمایا کرو
راہی راہوں کو بھول جاتے ہیں
دھیرے دھیرے مسکرایا کرو
سب بلاؤں کو ٹال دیتا ہے
پیار کا گیت گنگنایا کرو
گھر میں آسیب آنکلا ہے
مجھ کو تنہا نہ چھوڑ جایا کرو
ملنا جلنا بہت ضروری ہے
جس طرح پھول مسکراتا ہے
پھول کی طرح مسکرایا کرو

دل کی حالت عجیب ہوتی ہے واجد
یوں نہ واجد کو یاد آیا کرو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

آج کا کام کل پر نہ ڈال
جو کچھ لکھنا ہے تجھے لکھ ڈال
ادھر ادھر کی جھوٹی باتیں
ذرا ذرا سی جیتی ماتیں
جانے پھر کب موت آجائے
دل کی دل میں ہی نہ رہ جائے
(عروج ماہین طہٰ......سرگودھا)

غموں کی دھار پر رکھا ہوا ہے
مجھے انگار پر رکھا ہوا ہے
میری الجھن بڑھا رکھی ہے تم نے
لب انکار پر رکھا ہوا ہے
بھروسا میں نے اپنے جیتنے کا
ہمیشہ ہار پر رکھا ہوا ہے
نظر آتا ہے مجھ کو سر یہ میرا
تیری تلوار پر رکھا ہوا ہے
ہمیسہ ہار ہی ہوتی ہے اپنی
کہ سب سالار پر رکھا ہوا ہے
مقابل چاند کے میں نے بھی اب کے
دیا دیوار پر رکھا ہوا ہے
اجالا چار سو واجد پھیلا ہوا ہے
دل کیا دار پر رکھا ہوا ہے
(انتخاب: ناہم عابد......کراچی)

محبت چیز ایسی ہے
کبھی ہوتی ہے اپنوں سے
کبھی ہوتی ہے سپنوں سے
کبھی انجان راہوں سے
کبھی گمنام ناموں سے
محبت چیز ایسی ہے
کبھی ہوتی ہے پھولوں سے
کبھی بچپن کے جھولوں سے
کبھی بے اختیاری میں
کبھی پکے اصولوں سے
محبت اک محبت ہے
محبت اک صداقت ہے
محبت اک عبادت ہے
محبت چیز ایسی ہے
دکھوں میں روں دیتی ہے
درد انمول دیتی ہے
زہر بھی گھول دیتی ہے
محبت چیز ایسی ہے
(لاہوتی عمار......آھدی موڑ دولتالہ)

جس کو بھول کے سکھ نہ پایا
یار اس ہرجائی کی آئی
میرے گھر برپا ہے ماتم
اس کے گھر گونجی شنائی
اس کا مداوا کون کرے گا
عشق میں ایسی چوٹ ہے کھائی
پاگل کہلاتا ہے عاشق
عشق کا حاصل ہے رسوائی
میں نے گھر کو چھوڑ دیا ہے
کیا کہتی ہوگی ماں جائی
اس کا ذکر قمر نے چھیڑا
آج کیوں آنکھ تیری بھر آئی
(انتخاب: سونیا اکرام......ملتان)

کچھ بھی باقی بچا نہیں سنانے کو
مہرباں آئے تھے پھر منانے کو
تجھ سے کس نے کہا پلٹ آنے کو
رہ گئیں دل میں پھر یادیں ستانے کو
دل تو جل کے راکھ ہو چکا
اور کیا رہ گیا بتا جلانے کو
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

اب کبھی فرصت ملے تو آنا وہاں
جہاں ہماری یادوں کی گٹھری
پڑے پڑے بوسیدہ ہو چکی ہے
جہاں دریا، آزاد پرندے
وہ یادوں کا سماں
پھر سے یاد کریں ہم زیدی
اب تک کیا کھویا، کیا پایا؟
کس نگری سے گزرے
کس آنچل میں سوئے
پھر سے یاد کریں ہم زیدی
پھر سے یاد ہم کریں ہم زیدی
(حافظ محمد زید زیدی......میاں چنوں)

تیری پیاری پیاری آنکھیں
سارے جگ سے نیاری آنکھیں
جب دیکھا محسوس ہوا ہے
سب سے خوب تمہاری آنکھیں
پھولوں کا گلدستہ ہیں یہ
خوشبو سی دلداری آنکھیں
تاروں جیسی چمکیں ہر دم
روشن دیپک، خماری آنکھیں
تیری آنکھوں جیسی کب ہیں
ہم نے لاکھ سنواری آنکھیں
قاتل جیسے نین تمہارے
جیسے تیز کٹاری، آنکھیں
دے ہے، دعائیں خانم کا دل
غم سے ہوں یہ عاری آنکھیں
(فریدہ خانم......لاہور)

☆☆

عبرت انگیز

عدنان علی۔کراچی

خوفناک اور خونی درندوں کے جھرمٹ میں زندگی گزارنے والا ایسا تھا کہ کوئی دوسرا اس کے مدمقابل نہ تھا، اسے اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ تھا لیکن جب وقت نے پلٹا کھایا تو اس کی موت ایک گیدڑ سے بھی بدتر ہوئی۔

لرزیدہ لرزیدہ ناقابل فراموش اچھوتی انوکھی خوفناک اور حیرت انگیز تحیر انگیز روداد

شکاریات کے موضوع پر یوں تو آپ نے بہت سی کہانیاں اور قصے پڑھے ہوں گے، لیکن یہ اپنی نوعیت کا منفرد اور انوکھا واقعہ ہے، جو میں یہاں بیان کر رہا ہوں، جنگلات جہاں اونچے اونچے درختوں کا ایسا سلسلہ ہوتا ہے، جس میں سے سورج کی کرنیں بھی نہیں گزر سکتیں دوسرے یہ کہ یہاں حشرات الارض، کیڑے مکوڑوں کے علاوہ دیوپیکر درندوں کا راج بھی ہوتا ہے، اگر شکاری کے لئے شکار کی بہتات ہوتی ہے تو جان لیوا حادثات بھی اس کے منتظر ہوتے ہیں، لیکن شکار کے رسیا اپنے شوق کی تکمیل کے لئے یہاں آتے رہتے ہیں اور اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔

یہاں میں اس شخص کا واقعہ بیان کر رہا ہوں جو میری طرح ایک شکاری تھا فرق تھا تو یہ کہ میں ایک لائسنس یافتہ اور قانون پسند شکاری تھا، جب کہ وہ ایک

قانون شکن شکاری تھا، قانوناً شکار کی پابندی کے باوجود وہ اپنی من مانی کارروائیاں جاری رکھے ہوئے تھا، یہ واقعہ تقسیم ہند سے پہلے کا ہے۔

ہندوستان پر تاج برطانیہ کی حکمرانی تھی، شکاری زندگی میں یہ واقعہ انوکھا بھی ہے اور عبرتناک بھی، ہاں تو اس قانون شکن شکاری کا نام تانوائے تھا، دریائے پاچان کی دوسری جانب سیام کے گھنے جنگلوں میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں تانوائے نے جنم لیا، وہ غیر قانونی حرکات کا ارتکاب کرنے کے باوجود اتنی زیادہ خوبیوں اور صفات کا مالک تھا کہ میں نے اپنی طویل شکاری زندگی میں ایسے لوگ کم ہی دیکھے ہیں جو جوانمردی، جفاکشی، مستقل مزاجی، اور جنگلی زندگی کے تجربے میں اس کے ہم عصر یا ہم پلہ ہوں، ان تمام اوصاف کے ساتھ ہی اس کی گھمبیر شخصیت اور چٹان جیسا مضبوط جسم، اسے سیام کے جنگلوں میں کسی بھی ممتاز قبیلے کی سرداری دے سکتے تھے، لیکن اسے تخریبی انداز اور مجرمانہ زندگی زیادہ پسند تھی، جو اسے راس نہ آسکی، اور آخرکار وہ ایک قانون شکن انسان ہی کی حیثیت سے اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔

چند روز پیشتر ہی مجھے اس کے گاؤں کا علم ہوا، جہاں تانوائے پیدا ہوا تھا، سیام کے دور افتادہ جنگلوں میں اس کا گاؤں چند کچے مکانوں اور جھونپڑوں پر مشتمل تھا، یہ گاؤں بنکاک جانے والی سڑک سے کچھ ہٹ کر واقع تھا، میں نے گاؤں پہنچ کر اس کے ساتھیوں سے ملاقات کی، دوران گفتگو مجھے معلوم ہوا کہ وہ بچپن ہی سے نڈر، غیر معمولی اور دلیر شخص تھا، اوائل جوانی میں ہی گاؤں اور دور دور قریب کے علاقے میں کوئی اس کے مقابلے کا شکاری نہ تھا، اسے کسی طرح یہ بات معلوم ہو گئی کہ گینڈے کے شکار میں بڑی دولت اور دریائے پاچان کے پار برطانوی ہند کا علاقہ اس شکار کے لئے نہایت موزوں اور مفید ہے۔

”تانوائے نے گاؤں بھر سے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا، اور دولت کی خاطر دریا پار چلا گیا۔ جہاں سے پھر کبھی بھی اس کی واپسی نہ ہوسکی، میری ملاقات اس کے بوڑھے اور کمزور باپ سے بھی ہوئی جو اپنے جواں سال بیٹے کے انتظار میں زندگی کے دن گزار رہا تھا، اور کسی بھی صورت میں اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اس کا بیٹا اس دنیا میں نہیں رہا، اور سچ تو یہ تھا کہ میری اپنی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ اسے حقیقت حال سے آگاہ کرتا، تاہم بوڑھے باپ کی شکل دیکھ کر میرے سامنے ایک بار پھر تانوائے کی صورت ابھر آئی، اور میں ان دنوں کی یاد میں کھو کر رہ گیا، جب میری ملاقات تانوائے سے ہوئی تھی۔

کئی برس گزرے میں ان دنوں ملایا میں دریائے پاچا اور خلیج مالیون کے سنگم پر مقیم تھا، میرے پاس دو نر ہاتھیوں اور ایک گینڈے کے شکار کا لائسنس تھا، برطانوی ہند میں یہ گینڈا نایاب تھا، نیپال کی ترائی کے علاوہ جنوبی آسام ہی وہ واحد علاقہ ہے جہاں گینڈا پایا جاتا ہے، اور یہاں بھی اس کی نسل قانون شکن شکاریوں کے ہاتھوں ختم ہوتی جارہی ہے حالانکہ یہ جنگل بے حد گھنے ہیں شکاریوں کی کسی جماعت کو باقاعدہ طور پر اس جنگل کی گہرائیاں کھوجنے کی جرات نہیں ہوتی، اس کے باوجود جنگلوں کے باشندے جو بغیر لائسنس چھپ کر بندوقوں سے شکار کھیلتے اور ان کا زیادہ تر نشانہ یہی نایاب گینڈا بنتا، اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے وکٹوریہ پوائنٹ کے جنگلاتی محکمے نے نئے قوانین وضع کئے اور ممنوعہ علاقوں کے گرد و نواح میں آتشیں ہتھیاروں پر سخت پابندی عائد کردی، ہر گاؤں کے مکھیا کو بندوق رکھنے کی اجازت تھی، اس کے علاوہ ہر بندوق خلاف قانون تھی، خصوصی جنگلاتی محافظ بھرتی کئے گئے جو ہر وقت شکاریوں کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے، اس کے ساتھ ہی ہر قانون شکن شکاری کی گرفتاری کے لئے بڑے بڑے انعامات کا اعلان کیا گیا تھا۔

ان قانون شکن شکاریوں میں تانوائے کا نام سر فہرست تھا۔ لیکن محکمہ جنگلات کی ان ساری احتیاطی تدابیر کے باوجود جب میں گینڈے کی تلاش میں نکلا

تو مجھے جابجا تانوائے کی موجودگی کے نشانات ملتے، اگرچہ دریائے پاچان کے اس طرف اسے کسی نے دیکھا نہ تھا، لیکن مجھے اپنے اطراف میں اس کی موجودگی کا بھرپور احساس ہوتا تھا، کئی بار مجھے درختوں پر اس کی کلہاڑی کی کاٹ نظر آئی، چار متوازی لائینوں سے کٹی ہوئی دو عمودی لائنیں، یعنی چار شکاری جن میں سے دو بندوقیں رکھتے تھے آخر اس کی قانون شکن سرگرمیوں کا منہ بولتا ثبوت بھی ایک روز ہمیں مل گیا، ہم کئی دنوں سے ایک کے بعد ایک دلدلی خطے کی نگرانی کر رہے تھے اور ہمیں چند مقامات پر گینڈے کی موجودگی کے نشانات بھی ملے تھے، مجھے اپنی کامیابی کے امکانات زیادہ روشن نظر آنے لگے تھے، لیکن ایک روز میری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔

اس روز میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ جنگل میں دور تک گھس گیا، کیونکہ گینڈے کے پیروں کے نشانات اس جنگل سے جانے کی گواہی دیتے تھے، گرمی کی شدت کے باعث جنگل جہنم زار کا نقشہ پیش کر رہا تھا اور ہم پسینے سے شرابور جسموں کو دلدلی راستوں پر گھسیٹتے اس امید پر آگے بڑھے جارہے تھے کہ جلد یا بدیر ہماری ان تکلیفوں کا انعام ہمیں مل جائے گا، اور اچانک وہ ہمیں مل بھی گیا لیکن ایسی حالت میں جو ہمارے وہم و گمان میں بھی نہ تھی، ہم بے حد گھنے درختوں کے ایک جھنڈ کو پار کر کے نسبتاً کھلے دلدلی قطعے میں جا نکلے تھے اور وہاں ہماری نظروں کے عین سامنے ایک گینڈے کا پنجر پڑا تھا، قریب ہی راکھ کا ایک بڑا سا ڈھیر تھا جو ابھی تک سلگ رہا تھا، اور ساتھ ہی ایک بڑے سے مٹی کے برتن کے ٹکڑے اس امر کی گواہی دے رہے تھے کہ گینڈے کے گوشت کا ایک ایک اونس ابال کر اس سے خون اور اس کا آخری قطرہ بھی نچوڑا جا چکا ہے، یہی چیزیں ایک گینڈے کی اصل قیمت ہوا کرتی ہیں، دور افتادہ رنگونی میں رہنے والے چینی اس رس کو خرید لیتے ہیں، ان کا اعتقاد ہے کہ گینڈے کے گوشت کا ہر ذرہ اور خون کا ہر قطرہ مردانگی کی پوشیدہ قوتیں رکھتا ہے اور ناتواں انسانوں کے لئے آب حیات ثابت ہوتا ہے، ان جاہلانہ خیالات کے پیش نظر گینڈے کے جسم کا کوئی حصہ ضائع نہیں کیا جاتا، حتیٰ کہ پیشاب اور فضلہ بھی رنگون بھیج دیا جاتا ہے، جہاں اسے طرح طرح کے مقویات بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے۔

کوئی بھی دولت مند چینی صرف ڈھانچے کے لئے ایک ہزار رقم دے سکتا ہے اور تقریباً اتنی ہی قیمت گینڈے کے سینگ کی مل جاتی ہے جسے پیس کر مختلف مقوی ادویات بنانے میں استعمال کیا جاتا ہے، یہی وہ وجوہات ہیں جنہوں نے گینڈے کے پیشہ ور شکاریوں کے لئے بے حد کشش پیدا کردی تھی، اور سیام کے جنگلوں میں بڑھتی ہوئی لاقانونیت کا اصل سبب بھی یہی تھا، اس واقعہ کے بعد کئی روز گزر گئے روزانہ ہی میں مقامی شکاریوں کے ساتھ جنگل کے گھنے اور دشوار گزار حصوں میں مصیبتیں اٹھاتا، لیکن گوہر مقصود سے اتنا ہی دور تھا کہ جتنا کہ پہلے روز تھا، یہاں تک کہ میری چھٹیاں ختم ہونے میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا اور مجھے رفتہ رفتہ یقین ہونے لگا کہ کوئی بھی مقامی شکاری صلاحیت کے حوالے سے تانوائے کا ہم عصر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا، یوں بھی بھی شکاری اس سے خوفزدہ رہتے تھے، اور بعض دفعہ تو اس علاقے میں بھی جانے سے انکار کر دیتے جہاں انہیں تانوائے کی موجودگی کا شک ہوتا، بلاشبہ تانوائے اس جنگل کا بے تاج بادشاہ تھا۔

ایسے ہی مایوس کن خیالات میں گم ایک روز مالیون کے بازار میں کچھ خرید و فروخت کر رہا تھا جب ایک واقف کار چینی کو باتوں باتوں میں میری پریشانی کا علم ہوا، بوڑھے چینی نے مجھے مشورہ دیا جو میرے ذہن میں پہلے ہی موجود تھا، اس نے کہا کہ میں تانوائے سے دوستی کرلوں صرف ایسی صورت میں اسے پکڑ سکتا ہوں، میں نے بوڑھے چینی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے مشورے پر پھر غور کرنے کا وعدہ کیا، اس روز شام کو سوچتے سوچتے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میرے لئے صرف یہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ کسی طرح تانوائے سے مل کر اس سے

دوستی کرلوں، اور دوستی کے پردے میں اسے پکڑلوں، رات کی سیاہ چادر نے ماحول پراپنے پر پھیلا دیئے تھے، میں سوچوں کے تانے بانے میں الجھا ہوا تھا، چھٹیوں کے ختم ہونے میں چند دن ہی رہ گئے تھے میں سوچتا ہوا نہ جانے کب نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

صبح ہوتے ہی میں نے کائی لون کو بلا بھیجا، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے تانوائے کا ایجنٹ ہونے کا فخر حاصل ہے، وہ آیا تو ہم کافی دیر تک باتیں کرتے رہے، اور آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ اگر تانوائے گینڈے کو ڈھونڈنے میں میری مدد کرے تو میں مقامی محکمہ جنگلات میں اپنے اثر ورسوخ سے کام لیتے ہوئے ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کروں گا کہ اسے اس کی بندوق کا لائسنس مل جائے، اور شکار کھیلنے کا اجازت نامہ بھی، مقامی افسروں سے میرے گہرے دوستانہ مراسم تھے اور مجھے اپنی کامیابی کا یقین تھا لیکن میں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ بالفرض اگر افسران محکمہ اسے کسی صورت معاف کرنے پر رضا مند نہ ہوئے تو میں جلد از جلد کوشش کروں گا کہ میرے اور تانوائے کے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلے حائل ہو جائیں، تب اور صرف تب ہی اسے میرے وعدوں کی ناپائیداری کا احساس ہوگا، اور اس وقت میں کم از کم ایک ہزار میل دور پہنچ چکا ہوں گا، میں مانتا ہوں کہ سوچنے کا یہ طریقہ قانون اور اخلاق کی نظر میں قابل گرفت ہے، لیکن میرا واسطہ ایک مشہور زمانہ مجرم شکاری سے پڑنے والا تھا، اور میں نے اس کے ہتھکنڈے اسی پر آزمانے کا فیصلہ کرلیا تھا، اسی روز آدھی رات کے بعد میں کائی لون کے ہمراہ مالیون کے بازار سے گزر رہا تھا، تمام دکانیں بند تھیں کائنات کا ہر ذرہ خواب خرگوش میں گم تھا، لیکن جنگل کی زندگی جاگ رہی تھی اور رات کے شکاری اپنی اپنی جدو جہد میں مصروف پیکار تھے۔

ہم دریا کے کنارے پہنچ چکے تھے، اور دور دور دریا میں چپوؤں کی شپاشپ سنائی دے رہی تھی پھر دریا کی چھوٹی چھوٹی لہروں نے ہمارے اجنبی ملاقاتی کی آمد کا اعلان کیا، چند لمحوں بعد اندھیرے سے ایک بڑی کشتی پانی کی سطح پر نمودار ہوئی اور ہمارے قریب ہی کنارے پر آ لگی، ایک سیاہ فام تنومند شخص کشتی سے اترا، اس نے ہمیں بغور دیکھا یہ تانوائے تھا، اس کے عقب میں چار جوان سیاہ فام بندوقیں سنبھالے کھڑے تھے، میں اپنے کپڑوں میں ایک کولٹ بقول چھپا رہا تھا، ابھی میں تانوائے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا، تانوائے اور کائی لون کے درمیان ایک ناقابل فہم سی زبان میں باتیں ہو رہی تھیں، لیکن فضا میں شدید بے اعتباری اور کھچاؤ محسوس کیا جاسکتا تھا، تانوائے کا ایک ساتھی کشتی کی رسی کو یوں تھامے کھڑا تھا، جیسے پلک جھپکنے میں فرار پر آمادہ ہو، اچھی خاصی دیر گزر گئی۔

گفتگو میں آہستہ آہستہ ٹھہراؤ سا آ گیا۔ میں اس اثناء میں محض ایک خاموش تماشائی کی مانند کھڑا رہا، حتیٰ کہ تانوائے کچھ کہتے ہوئے مڑا اور بڑھ کر کشتی میں بیٹھ گیا، اس کے چاروں باڈی گارڈ بھی فوراً کشتی میں چلے گئے۔ اور چند لمحوں میں کشتی دریا کی لہروں پر لپٹی ہوئی اندھیرے کی چادر میں تحلیل ہوگئی اور پھر رفتہ رفتہ چپوؤں کی آواز بھی جنگل کے سناٹے میں گم ہوگئی، ان کے جانے کے بعد کائی لون نے مجھے بتایا کہ۔ ”اگر تانوائے نے میرے وعدوں کو قابل توجہ سمجھا وہ کل کسی وقت ہمیں اس کی اطلاع کردی جائے گی، اور فوراً ہی ہم گینڈے کی تلاش میں روانہ ہو جائیں گے، یہ سن کر میں نے اطمینان کا سانس لیا، اور مسرور دل کے ساتھ کائی لون کے ہمراہ اپنے ٹھکانے کی طرف واپس چلا آیا۔

اگلے دن دوپہر کے وقت ہمیں تانوائے کی رضا مندی کی اطلاع مل گئی، اس نے ہمیں کم از کم دو دن کے راشن اور دیگر ضروری اشیاء کے ساتھ دس میل دور ٹین کی ایک ویران کان پر پہنچنے کو کہا تھا، اس نے میری شرائط مان لی تھیں، میں نے سوچا اب میرا واسطہ سیام کے خطرناک ترین قانون شکن شکاری سے پڑنے والا تھا، اور وہ یقیناً میرے ہمراہ کسی غیر شخص کی موجودگی پسند نہیں کرے گا، اس لئے میں نے صرف اپنے مسلمان اردلی

ساجد کو ساتھ لے لیا، اور ایک فوجی تھیلے میں ایک کیتلی اور ٹین کے دو پیالوں کے علاوہ جتنا کھانے پینے کا سامان آ سکتا تھا ٹھونس لیا، میں نے ایک ٹارچ بھی رکھ لی اور دوسرے تھیلے میں ایک کمبل اور بہت سے کارتوس ڈال کر ساجد کے حوالے کر دیا، اس سامان کے علاوہ ہمارے پاس دو رائفلیں بھی تھیں ایک 318 رائفل نسبتاً ہلکے شکار کے لئے اور ایک 470 دو نالی جو صرف ہاتھی اور گینڈے کے شکار کے لئے تھے، اپنی جیب میں میں نے پستول بھی رکھ لیا تھا۔

ہم لوگ سرعت کے ساتھ تانوائے کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے، وہ حسب وعدہ اپنے ایک مسلح ساتھی کے ہمراہ وہاں موجود تھا، سورج کی روشنی میں میں نے اس کا اصل حلیہ دیکھا کمر سے لپٹے کپڑے کے علاوہ وہ سر سے پاؤں تک برہنہ تھا، اس کا جسم کسی سیاہ چٹان سے تراشا ہوا دکھائی دیتا تھا، گلے میں کارتوسوں کی پٹی لٹکی ہوئی تھی، اس کے ساتھ ہی پہلو میں بارود سے بھرا ہوا بیگ بھی نظر آرہا تھا، شکل کے اعتبار سے تانوائے قدرے بدشکل تھا، اس کے سپاٹ چہرے پر پتھر جیسا کردار پن نمایاں تھا وہ بہت زیادہ خاموش طبع انسان تھا، جتنے دن میں اس کے ساتھ رہا اس نے بمشکل تو، دس الفاظ بولے ہوں گے لیکن اس کے ہر حرکت میں وقار اور خود اعتمادی جھلکتی تھی، جنگل میں اس کی نقل و حرکت کی قابلیت دیکھ کر معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اسی جنگل کی مخلوق ہو، اس نے ہمارے پھولے ہوئے سفری تھیلوں پر ناپسندیدگی سے بھرپور ایک نگاہ ڈالی اور اپنے ساتھی کو چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے ٹین کی کان کے اوپر چڑھائی پر چل پڑا، ہم دونوں بھی اس کے عقب میں چل دیئے، لیکن بہت جلد معلوم ہو گیا کہ اس چڑھائی پر چڑھنا ہمارے لئے اتنا آسان نہ تھا، جس آسانی سے تانوائے چڑھ رہا تھا، ڈھلان بے حد خطرناک تھی، جب کہ پاؤں پھسانے کے لئے کوئی قابل ذکر جگہ نہ ملتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ تانوائے اور اس کا ساتھی کافی آگے نکل گئے، ہم نے بھی ہمت نہ ہاری اور تیزی سے ان کے پیچھے چلتے رہے

یوں گھنٹہ بھر کی شدید محنت کے بعد ایک جھونپڑی کے پاس پہنچ گئے۔

تانوائے کسی چٹان کی طرف جھونپڑی کے نزدیک کھڑا تھا، اس نے اشارے سے ہمیں بتایا کہ ہم چاہیں تو آرام کر سکتے ہیں، کیونکہ وہ گینڈے کے قدموں کے نشانات کی تلاش میں اپنے آدمیوں کو بھیج رہا ہے، ہم نے اپنے سفری تھیلے اتار پھینکے اور اطمینان سے اطراف کا جائزہ لیا، کوئی ایک ہزار فٹ نشیب میں وسیع و عریض گھنا جنگل پھیلا ہوا تھا، جس کی گہرائیوں تک پہنچنے کی جرأت کسی سفید فام کو نہ ہوئی تھی اور اسی جنگل کی ڈھکی چھپی گہرائیوں میں تانوائے گینڈے کے شکار میں میری مدد کرنے والا تھا، جھونپڑی میں چند خشک لکڑیاں جلا کر ہم نے چائے بنائی اور پی کر کچھ دیر آرام کرنے کے لئے لیٹ گئے لیکن کان جنگل کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے جس میں طرح طرح کے جانوروں کی ملی جلی آوازوں کے ساتھ مختلف جنگلی پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔

اچانک ان تمام آوازوں سے کہیں زیادہ تیز آوازیں سنائی دینے لگیں، ہم نے جنگلی بانسوں کے ٹوٹنے کا تڑاخہ سنا اور ساتھ ہی کسی دیو ہیکل ہاتھی کی چنگھاڑوں سے جنگل گونج اٹھا، آواز صرف چند بار سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی، اس اثنا میں سورج کی تیزی سے مغربی افق کی جانب جھکتا چلا جا رہا تھا، تقریباً ایک گھنٹے کے بعد تانوائے کے کھوجی واپس آئے، انہیں کوئی تازہ نشانات نہ مل سکے تھے اور خالص جنگلی طریقے کے مطابق انہوں نے آتے ہی تانوائے کے آگے اپنی خالی ہتھیلیاں پھیلا دیں، یہ ناکامی کا کھلا ہوا اعتراف تھا، تانوائے نے جواب میں ہمیشہ کی طرح خاموشی اختیار کی، لیکن ترجمان کے ذریعے ہمیں کھوجیوں کی ناکامی کے بارے میں بتایا اور پوچھا کہ اگر میں چاہوں تو آج ہاتھیوں کا شکار کھیل سکتا ہوں، کیونکہ نیچے وادی میں چند ہاتھیوں کی موجودگی کے نشانات ملے ہیں، میرے پاس چونکہ دو ہاتھیوں کے شکار کا لائسنس تھا، اس لئے میں

نے رضامندی ظاہر کردی، فوراً ہی ہم دونوں تانوائے اور اس کی پانچ ساتھیوں کے ہمراہ قدرے آسان راستے سے پہاڑی سے نیچے اترے اور جنگل میں داخل ہوگئے۔

فلک بوس درخت آسمان سے باتیں کررہے تھے، پھر ہمیں ہاتھیوں کے نشانات تو جلد ہی مل گئے لیکن ہم ہاتھیوں کے غول پر گولی چلانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے، اس لئے ہم غول سے بچھڑے کسی اکیلے ہاتھی کے قدموں کے نشانات کی تلاش میں پھرتے رہے، ہمیں ناکامی نہیں ہوئی، جلد ہی ہمیں ایک بڑے ہاتھی کے قدموں کے نشانات مل گئے، جو گروہ سے الگ ہوگیا تھا، ہم فوراً انہی نشانات پر چل پڑے، سورج غروب ہوگیا تھا، اور تاریکی بڑھتی جارہی تھی، ہم نے جنگل میں دور بانس ٹوٹنے کی آواز سنی، تانوائے کسی سانپ کی طرح رینگ کر جھاڑیوں میں چلا گیا۔ ہم نے بھی اس کی تقلید کی۔

تاریکی کی وجہ سے تانوائے محض ایک سایہ نظر آرہا تھا، گھنی جھاڑیوں کے ایک طویل سلسلے سے گزرنے کے بعد وہ اچانک رک گیا، میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر دیکھا ہم سے پندرہ اٹھارہ گز کے فاصلے پر ہمارا شکار کھڑا تھا، آبنوس کی طرح سیاہ، اس کا جسم عام ہاتھیوں سے کہیں زیادہ بڑا تھا، اور اس کے دانت اتنا بڑا ہونے کے باوجود زمین کی سطح کو چھورہے تھے، اتنے بڑے دانت دیکھ کر میرا دل جیسے اچھل کر حلق میں آگیا، گہرے اندھیرے کی وجہ سے ہاتھی پر فائر کرنے سے کامیابی کے امکانات مخدوش تھے، چنانچہ ہم ناکام لوٹ آئے، جھونپڑی میں پہنچنے کے بعد جلد روانہ ہونے کا پروگرام بنانے کے بعد فرش پر کمبل بچھا کر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

اگلے روز صبح ہم سورج نکلنے سے پہلے روانہ ہو گئے اور جب تک آفتاب نے اپنی شکل دکھائی ہم پچھلی رات والے نشانات تک پہنچ چکے تھے، اس جگہ جہاں نے ہم نے پچھلی رات ہاتھی کو کھڑے دیکھا تھا معلوم ہوا کہ ہاتھی تھوڑی دیر رکنے کے بعد آگے روانہ ہوگیا تھا، اور اس مرتبہ اس کے پیروں کے نشانات کچھ ایسے گھنے بانس کے جھنڈ اور خاردار جھاڑیوں سے گذر رہے تھے جو بہت ہی دشوار گزار تھا، لیکن تانوائے نے اپنی شکاری قابلیت سے کام لیتے ہوئے قدرے کم گھنے جنگل میں ایک لمبا چکر لگانے کے بعد تقریباً دو میل پرے ہمیں انہیں نشانات پر لا ڈالا اس طرح ہم نے وہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کرلیا جو ہاتھی نے رات بھر میں طے کیا تھا اب نشانات خاصے واضح ہوتے جارہے تھے، تازہ ٹوٹے ہوئے بانس اور ہاتھی کی لید جابجا ہماری رہنمائی کررہے تھے ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے کچھ دیر بعد اچانک دور فاصلے پر بانسوں کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔ تانوائے نے اپنے آدمیوں کو وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا، اور ہم دونوں نہایت خاموشی سے اس طرف بڑھے جدھر سے آواز سنائی دی تھی، جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے گزرنے کے بعد ہم بانسوں کے ایک قطع میں جا پہنچے، اس قطع کی دوسری جانب جھاڑیوں کی آڑ میں ہاتھی کھڑا تھا، اس کا پہاڑ جیسا وجود اونچی اونچی جھاڑیوں کے پیچھے پوری طرح پوشیدہ تھا صرف اس کے بڑے بڑے کان اور سونڈ کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا وہ خاموشی سے کھڑا اپنے پنکھوں جیسے کان ہلا رہا تھا، ہم اس انتظار میں وہیں جھاریوں کی آڑ میں چھپے رہے کہ وہ کچھ حرکت کرے اور اس کے جسم کا کوئی نازک حصہ سامنے آئے تو ہم اس پر فائر کریں ہمارا فاصلہ اس سے زیادہ سے زیادہ چھ سات گز تھا، جھاڑیوں کی آڑ سے اس کا ایک کیچڑ میں لت پت دانت نظر آرہا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ تانوائے میرے قریب نہیں ہے، میں نے دیکھا وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا ایک درخت کی چوٹی کو دیکھ رہا تھا، پر میری طرف مڑا اور اشارے سے مجھے بتایا کہ جلد ہی ہوا کا رخ تبدیل ہوجائے گا لہٰذا مجھے فائر کرنے میں دیر نہیں کرنی چاہئے، اس نے اپنے شانے سے بارود سے بھرا بیگ اتار لیا اور بندوق بھرنے لگا، ہوا کی تبدیلی کو میں بھی

محسوس کرنے لگا تھا، بہت جلد ہاتھی ہماری موجودگی محسوس کر کے یا تو ہم پر حملہ کردیتا یا پھر راہ فرار اختیار کرتا، میں نے فیصلہ کیا کہ اچانک ہی جھاڑیوں سے نکل کر اس پر فائر کردوں ہاتھی موٹی عقل کا ہوتا ہے اس سے کسی فوری ردعمل کو توقع نہیں کی جاسکتی، لیکن میں اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ اگر میرا یہ فائر کارگر اور مہلک ثابت نہ ہوا تو چند ہی ثانیوں میں ہاتھی میرے اوپر ہوگا اور مجھے اپنے بچاؤ کا بالکل بھی موقع نہ مل سکے گا، موت کے اتنے نزدیک ہوکر سب نے کبھی گولی نہ چلائی تھی، صورتحال گھمبیر ہوچلی تھی۔

جونہی میں جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا، یکلخت ہاتھی بھی مڑا اور مجھ سے دور ہٹنے کے لئے پاؤں اٹھایا، میں نے اس کے دماغ کا نشانہ لے کر بندوق کی دونوں نالیاں خالی کرڈالیں۔ گولیاں لگتے ہی ہاتھی درد و کرب سے اتنے زور سے چنگھاڑا کہ زمین لرزنے لگی اور پھر اچانک ہی دھم سے گرا، جیسے کسی ریل کے انجن نے پوری قوت سے اسے ٹکر ماری ہو، اچانک میں نے اپنے عقب سے فائر کی آواز سنی یہ تانوائے کی ایل ایم کی آواز تھی میں نے وہیں رک کر بندوق کا بریچ کھولا، تاکہ تازہ کارتوس ڈال سکوں، لیکن ہاتھی اچانک ہی تیزی سے اٹھا اور طوفان کی سی تیزی سے بانس کے گھنے جنگل میں گھستا چلا گیا، میں نے فوراً ہی بندوق میں کارتوس ڈالے پھر ہم دونوں ہاتھی کے تعاقب میں دوڑ پڑے، ہمارا خیال تھا کہ یہ بھاگ دوڑ مختصر سی ہوگی۔ تانوائے چند ہی منٹوں میں مجھ سے کئی سو گز آگے نکل گیا، میں گرے ہوئے درختوں سے بچتا بچاتا پسینے میں شرابور اس کے پیچھے دوڑتا رہا، لیکن ہاتھی کی حرکت کی آوازیں دور سے دور تر ہوتی چلی گئیں اور آخرکار جنگل کے سناٹے میں گم ہوگئیں، اب مزید چلنا دوڑنا بیکار تھا میں زمین پر بیٹھ گیا تاکہ جب تک میرے ساتھی پہنچیں میں کچھ ستالوں۔

پھر میری نگاہ تانوائے پر پڑی، اس نے مجھے اشارے سے بتایا کہ ہاتھی بری طرح زخمی ہوچکا ہے اور

تھوڑی دیر ستا کر ہم دوبارہ اس کا تعاقب کریں گے، ہمارے باقی ساتھی بھی کچھ ہی دیر بعد وہاں پہنچ گئے، میرے کہنے پر ساجد نے وہیں چند خشک لکڑیاں جلا کر چائے بنائی، چائے پیتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ شاید میرا نشانہ خطا گیا تھا، ورنہ طاقتور جانور بھی 470 رائفل کی دو گولیاں لگنے کے بعد اتنی جلدی ہوش میں نہیں آ سکتا، شاید گولی محض ہاتھی کی کھال کھرچتی گزر گئی ہو، اس اثناء میں تانوائے اپنے ایک ساتھی کو ہاتھی کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا، پھر ہم سب اس کے تعاقب میں چل پڑے گرمی بے پناہ تھی، راستے میں جا بجا خون دیکھ کر میرے شبہات زائل ہوتے جا رہے تھے ہاتھی کا زخم کھال کا زخم نہ تھا، کیونکہ کھال کے زخم سے اتنی مقدار میں خون نہیں نکل سکتا تھا۔

اندازاً دو میل ہم ان نشانات پر چلتے رہے، پھر تانوائے نے ہمیں رکنے کا اشارہ کیا اور خود جھاڑیوں میں گم ہو گیا، قریباً ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا اور ہمیں بتایا کہ ہاتھی اس کے اندازے کے مطابق زیادہ دور نہیں گیا ہے، ہم اس کی رہنمائی میں ایک دلدلی وادی میں داخل ہوئے، یہاں نرم زمین پر جا بجا ہاتھی کے قدموں کے نشانات تھے جن سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ ان راستوں پر بہت سے ہاتھی گزر چکے ہیں۔ ہم کسی بھی طرح یہ اندازہ نہیں لگا سکتے تھے کہ ہم اپنے شکار کا تعاقب کر رہے ہیں کسی انجانے ہاتھی کے تعاقب میں دوڑ رہے ہیں یہ بات تو صرف تانوائے ہی بتا سکتا تھا کیونکہ اس کا تجربہ ہم سے کہیں زیادہ تھا اور وہ خود بھی جنگل کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔

ہمیں زخمی ہاتھی کے تعاقب میں چلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے ہمارا تھکان سے برا حال تھا لیکن ہاتھی کے بڑے بڑے سفید دانتوں کے لالچ نے تھکن محسوس نہ ہونے دی، اچانک بغیر کسی گرج چمک کے بارش شروع ہو گئی، چند ہی منٹوں میں ہمارے کپڑے بھیگ کر جسموں سے چمٹ گئے، رات گزارنے کے لئے کسی مناسب جگہ کی تلاش شروع ہوئی، تھوڑی سی کوشش کے بعد ہم نے پانی کے ایک بڑے سے گڑھے کے قریب جہاں کا قطعہ زمین قدرے صاف تھا اپنا ڈیرا جما لیا اور ہم سب فوراً ہی لیٹ گئے کہ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

ذرا سی دیر کمر سیدھی کرنے کے بعد تانوائے نے اسی گڑھے سے جس میں پانی بھرا ہوا تھا چند مچھلیاں پکڑ لیں اس کے ساتھیوں نے فوراً آگ جلا کر چاول ابال لئے اور مچھلیوں کو بھی آگ پر بھون ڈالا، ہم نے بھی اپنا راشن کا تھیلا کھولا اور سب نے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا چائے بنائی گئی اور ایک ایک پیالی پی کر زمین پر دراز ہو گئے، تانوائے کے ساتھیوں کا جلایا ہوا آگ کا الاؤ دھیرے دھیرے مدھم پڑتا جا رہا تھا، تانوائے کے تمام ساتھی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے جب کہ تانوائے ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، اس کے سینے کے مسلسل زیر و بم سے ظاہر تھا کہ وہ بھی اونگھ رہا ہے، میں نے ساجد کو آنکھیں کھلی رکھنے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی الاؤ میں لکڑیاں ڈالنے کے لئے بھی کہا کہ وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد آگ میں لکڑیاں ڈالتا رہے اور خود سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد میں بھی خواب خرگوش میں تھا۔ دن نکلنے سے دو گھنٹے پہلے ساجد نے مجھے بیدار کیا میں اٹھا تو ساجد نے سونے کی تیاری شروع کر دی۔

صبح کی سپیدی نے انگڑائی لی تاریکی چھٹنے لگی جب میری آنکھ ساجد کے جگانے پر کھلی، میرے کپڑے رات بھر میں جسم کی حرارت سے خشک ہو چکے تھے، تانوائے کے ساتھی جنگل میں کھانے کے لئے پھل ڈھونڈنے گئے تھے لیکن انہیں جنگلی بیروں کے علاوہ کچھ اور نہ مل سکا، وہی کھا کر ہم آگے چلنے کے لئے تیار ہو گئے تانوائے دن نکلنے سے قبل ہی اپنا ایک آدمی ہاتھی کے تعاقب میں روانہ کر چکا تھا، ہم بھی تعاقب میں چل پڑے اور تانوائے کے اگلے ساتھی سے جا ملے، تانوائے نے ان سے کچھ باتیں کیں پھر ہماری طرف گھوم کر ہاتھوں کی خالی ہتھیلیاں پھیلا دیں، میرا دل ایک لمحے کے لئے اچھل کر حلق میں آ گیا، اور پھر جیسے سینے کی

گہرائیوں میں ڈوب گیا، تانوائے کے اس اشارے کا مطلب یہ تھا کہ ہاتھی کے تازہ ترین قدموں کے نشانات نہ مل سکے تھے اور اب اس کی تلاش میں مزید آگے بڑھنا بیکار تھا۔ پھر اس نے ہوا میں ہاتھ ہلا کر ہمیں بتایا کہ ہمارے لئے وہ ہاتھی گویا ہوا میں تحلیل ہو چکا تھا، اور اب اس کی تلاش فضول تھی، میں نے اسے مزید کوشش پر آمادہ کرنے کی بہت سعی کی، لیکن اس نے اشاروں سے واضح کر دیا کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ ہاتھی کے تعاقب میں مزید وقت ضائع نہیں کر سکتا، خواہ اسے اپنی بندوق کا لائسنس ملے یا نہ ملے، آخر کار کافی کوشش کے بعد جب وہ اپنے ارادے سے ٹس سے مس نہ ہوا تو پژمردہ دل کے ساتھ ہم نے واپسی اختیار کی، تانوائے اور اس کے ساتھی ٹین کی کان تک ہمارے ساتھ آئے، جہاں سے میں نے اور ساجد نے مالیون کی راہ لی، سورج غروب ہونے سے پیشتر ہی ہم مالیون پہنچ گئے تھے، میری خاموشی اور اداسی ساجد بھی محسوس کر رہا تھا لیکن وہ بیچارہ اس سلسلے میں کیا کر سکتا تھا۔

مالیون میں تمام رات اور اگلے روز تک میں نے آرام کیا، بھاگ دوڑ کی تھکان اتاری اور شام کو میں پھر کائی لون سے ملا تا کہ تانوائے سے دوبارہ ملاقات کا بندوبست ہو سکے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ۔ ”تانوائے کل شام ہی واپس چلا گیا تھا۔“

”لیکن اسے تو گینڈے کی تلاش میں میری مدد کرنا تھی۔“ میں احتجاجاً بولا۔ جس کے جواب میں کائی لون محض شانے جھٹک کر رہ گیا اور پھر وہ بے لفظوں سے بولا۔

”بہتر ہے آپ کچھ دن انتظار کر لیں، شاید وہ ایک دو روز میں واپس آ جائے۔“

لیکن اب میرے پاس انتظار کے لئے وقت نہیں تھا، مجھے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا، اور ایسے موقع پر تانوائے کا بغیر اطلاع دیئے چلا جانا مجھے اچھا نہ لگا، یہ معاہدے کی سراسر خلاف ورزی تھی میرے دل میں اس کے خلاف غم و غصہ کا ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا، میرا پرانا ساتھی دلبر سنگھ ابھی مالیون میں ہی تھا۔ اس نے تانوائے کے ساتھ میری گٹھ جوڑ کو اپنی شکاری قابلیت کی توہین سمجھا تھا، اور جب میں اس کے گھر اس سے ملنے گیا تو اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار تھے لیکن جب میں نے اسے یقین دلایا کہ میرا تانوائے کے ساتھ اتحاد محض چند غلط قسم کے لوگوں کے مشورے سے عمل میں آیا تھا، اور اس حوالے سے میں اس سے معذرت خواہ تھا تو اس کے چہرے پر رونق اور مسکراہٹ ابھر آئی اس نے گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ہاتھوں پر تھپکی دی۔

دلبر سنگھ ایک دراز قد اور مضبوط جسم کا سکھ گورکھا تھا، فوج میں بھی رہ چکا تھا، تنک مزاج تھا، اس لئے زیادہ عرصے فوج میں نہ رہ سکا، ڈسچارج ہونے کے بعد اس نے سیام آ کر ٹین کی کان میں ملازمت کر لی تھی، لیکن ٹین کی کان جب ختم ہونے کے بعد بند کر دی گئی تو دلبر سنگھ پھر بے کار ہو گیا، اس نے اپنے وطن جانے کے بجائے مالیون کے اطراف میں شکاری گائیڈ کی حیثیت سے بڑے بڑے شکاریوں کی ملازمت کرنا شروع کر دی، میرا اس سے کئی دفعہ سابقہ پڑ چکا تھا۔ بہت بہادر انسان تھا، دو بار شیر کے پنجوں سے بچ نکلا تھا، جس کے نشانات جا بجا اس کے جسم پر موجود تھے، اور سب سے واضح نشان اس کے بائیں گال پر تھا جہاں سے شیر کے پنجے نے اس کا بہت سا گوشت ادھیڑ ڈالا تھا، ان جنگلوں کا چپہ چپہ اس کا جانا پہچانا تھا، اس سے پہلے میں اس کے شکاری تجربے سے محض اس لئے فائدہ نہ اٹھا سکا تھا کہ وہ کسی یورپین شکاری کے ساتھ چلا گیا تھا، میں نے اسے یقین دلایا کہ اب کبھی اس کے علاوہ کسی کو شکاری گائیڈ نہ رکھوں گا تو وہ بہت خوش ہوا، اور میرے آئندہ پروگرام میں دلچسپی لینے لگا میرا خیال تھا کہ سب سے پہلے اس زخمی ہاتھی کو تلاش کیا جائے، ویسے بھی مجھے کچھ شک سا پڑ رہا تھا۔ کہ تانوائے نے اس ہاتھی کے معاملے میں میرے ساتھ کسی چالاکی کا مظاہرہ کیا تھا۔ لازماً وہ اس زخمی ہاتھی کو اپنے لئے رکھنا چاہتا تھا۔ ورنہ وہ تعاقب سے باز نہ آتا، مجھے اس وقت

پر اتنا غصہ آرہا تھا کہ میں جلد از جلد اسے بلا لائسنس بندوقوں سمیت پکڑ کر قانون کے حوالے کر دینا چاہتا تھا۔ لیکن میرے پاس صرف تین دن تھے اس کے بعد بہر حال مجھے واپس جانا تھا۔

ایک مرتبہ پھر شکار کی تیاری کی جانے لگی سفری تھیلے خوراک سے بھرے اور دلبر سنگھ کے چار مقامی کھوجیوں کو بھی ساتھ لے لیا گیا۔ اگلے دن صبح سویرے ہم روانہ ہو گئے اور بلار کے اس مقام تک پہنچے جہاں تانوائے نے ہاتھی کے تعاقب میں جانے سے انکار کر دیا تھا، دلبر سنگھ اور اس کے ساتھیوں نے بہت جلد ہاتھی کے قدموں کے نشانات ڈھونڈ نکالے، میں جانتا تھا کہ ہاتھی بری طرح زخمی ہے اور زیادہ دور نہیں جا سکتا اس لئے ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم سات آٹھ میل کے علاقے کے اطراف ایک فرضی دائرہ کھینچ لیتے ہیں اگر ہاتھی کے قدموں کے نشانات اس خیالی دائرے سے باہر نکل گئے اور ہمیں اس کی موجودگی کا کوئی تازہ نشان نہ ملا، تو ہم اس کی تلاش میں مزید وقت ضائع نہیں کریں گے، لیکن خلاف امید ہمیں بہت جلد اپنی کوششوں میں کامیابی ہوئی، ہاتھی کے قدموں کے نشانات دو میل کے دائرے میں گردش کرتے نظر آئے اس کا یہی مطلب تھا کہ وہ اسی علاقے میں کہیں چھپا ہوا ہے، اور اپنے زخموں کے ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے، اس کے ساتھ ہی مجھے تانوائے کی عیاری کا بھی یقین آ گیا، مجھے شروع ہے سے اس کے خلوص نیت پر شک تھا، اس نے مجھے بھی ایک بے وقوف سا شکاری سمجھ لیا تھا جسے وہ جنگل میں اپنی مرضی کے مطابق نچا سکتا تھا، یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا غصہ تیز ہوتا چلا گیا، اگر اس نے مجھے دھوکہ نہ دیا ہوتا تو میں لازماً مقامی حکام سے اس کے تعلقات بہتر بنانے کی ہر ممکن کوشس کرتا، لیکن اس کی عیاری اور دھوکہ بازی نے ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا تھا۔

ہمارا یہ مختصر سا کانوائے فوراً ہی ان واضح نشانات کی جانب چل پڑا، شبنم کی اوس سے بھیگی ہوئی جھاڑیوں اور درختوں سے دورج کی حرارت کے باعث بھاپ سی اٹھ رہی تھی ہر طرف خاموشی اور ہو کا عالم طاری تھا، چلنے کے دوران ہم سب کی یہی کوشش تھی کہ کم سے کم آواز پیدا ہو، کیونکہ کسی بھی وقت ہمارا سامنا زخمی ہاتھی سے ہو سکتا تھا، ہم سب خاموشی لیکن تیزی کے ساتھ چلتے جا رہے تھے جب اچانک ہی دور جنگل میں کسی حرکت کی آواز سنی، ہم سب اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے، آواز چونکہ تیزی سے ہماری جانب چلی آ رہی تھی، اس لئے میں نے اشارے سے اپنے ساتھیوں کو جھاڑیوں کی آڑ میں چھپنے کے لئے کہا اور خود بھی درختوں کی آڑ میں چھپ گیا۔

چند ہی لمحوں بعد درختوں کے جھنڈ سے دوڑتا ہوا ایک نیم برہنہ جنگلی نکلا، میں نے پہلی ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا، وہ تانوائے کا ایک ساتھی تھا، اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور وہ دوڑتا ہوا ہماری جانب آ رہا تھا، ہمیں اس سے تانوائے کے بارے میں مفید معلومات مل سکتی تھیں۔ جونہی وہ میرے نزدیک سے گزرا میں نے تیزی سے ٹانگ بڑھا کر اسے ایک آڑنگا مار دیا اس کے گرتے ہی جھپٹ کر اس کی بندوق پر قبضہ کر لیا، میرے ساتھی اس کے گرد جمع ہو گئے میں نے اسے دلبر سنگھ کے حوالے کر دیا، پھر ہم نے اس سے کچھ سوالات پوچھے لیکن ایسے طریقوں سے کہ بہت جلد اس نے ہار مان لی، اور بہت سی تلخ حقیقت بتانے لگا۔

میرا خیال بالکل درست ثابت ہوا، تانوائے نے شروع ہی سے وہ ہاتھی، اپنے لئے منتخب کر لیا تھا کیونکہ اس جنگل میں آج تک ایسا ہاتھی دیکھنے میں نہ آیا تھا، تانوائے کے ساتھ گھومتے پھرتے محض اتفاق سے وہ ہاتھی ہماری نگاہ میں آ گیا تھا، تانوائے اس وقت مجھے فائر کرنے سے تو باز نہ رکھ سکا لیکن اتفاق سے میرا نشانہ یا تو خطا گیا یا ہاتھی ہی کچھ سخت ہڈی کا نکلا، اس لئے مجھے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اس کے بعد تعاقب کے دوران تانوائے روانگی سے پہلے اپنے ساتھی کو اس لئے آگے بھیج دیا کرتا تھا کہ وہ ہاتھی کو ایک جگہ نہ ٹھہرنے دے، اور ہمیشہ اسے حرکت میں ہی رکھے، تا کہ وہ میری پہنچ سے دور رہے۔ ہاتھی ہماری دوڑ دھوپ کے دوران ہمیشہ ہم سے ایک ڈیڑھ میل آگے زخم سے بوکھلایا ہوا پھر رہا تھا، اس بارش والی رات ہاتھی ہم سے کوئی چار سو گز کے فاصلے پر تھا، جہاں سے سورج نکلنے سے پہلے ہی تانوائے کے ایک ساتھی نے اسے اٹھا دیا اور بھاگتا ہوا بہت دور لے گیا، جس مقام پر تانوائے نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا ہاتھی وہاں سے بمشکل دو سو گز کے فاصلے پر تھا، مجھے اور ساجد کو ٹین کی کان کی پاس چھوڑ کر تانوائے اور اس کے ساتھی فوراً واپس ہوئے اور دو ہی گھنٹوں میں ہاتھی کو مار گرایا، اور اب تانوائے اس کے کئی پونڈ وزنی ہاتھی دانت کو نزدیک منڈی میں بڑی سے بڑی قیمت پر فروخت کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔

اس کے مقید ساتھی نے ہمیں تانوائے تک لے جانے کا وعدہ بھی کر لیا، میں نے اس کے دونوں ہاتھ رسی کی مدد سے مضبوطی کے ساتھ پشت پر باندھے اور اسے آگے آگے چلنے کا اشارہ کیا، ساتھ اس کے منہ میں رومال بھی ٹھونس دیا تا کہ شور نہ مچا سکے، اب اس کے پیچھے چلتے ہوئے ہم گھنے جنگل میں گھستے چلے گئے، اور آخر کار ہم نے جنگل کے سناٹے کو توڑتی ہوئی ایک آواز سنی، کوئی شخص اپنی کلہاڑی کسی ٹھوس چیز پر مار رہا تھا، سیام کے کسی بھی گاؤں میں ایسی آوازیں روزمرہ کے معمول میں شامل تھیں، لیکن یہاں جنگل کی ان چھوٹی گہرائیوں میں اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا، وہ تھا تانوائے اور اس کے ساتھیوں کی وہاں پر موجوگی، ہم اپنے شکار کے نزدیک پہنچ چکے تھے، اور مجھے اس امر میں ذرہ بھر بھی شک نہیں تھا کہ تانوائے بغیر مزاحمت کے کبھی بھی قابو میں نہیں آئے گا، میں نے دلبر سنگھ سے کہا۔ کہ "وہ قیدی سے تانوائے کے ساتھیوں کی مقدار معلوم کرے، پتہ چلا کہ تانوائے سمیت اس وقت وہاں چار آدمی موجود ہیں اور ان سب کے پاس بندوقیں ہیں، تانوائے کے تین ساتھیوں سے تو مجھے زیادہ خطرہ نہ تھا، لیکن تانوائے کی بات اور تھی، وہ ایک مشہور زمانہ مجرم تھا اور جنگل کی زندگی کا عادی تھا یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس کا کوئی حل میرے پاس نہ تھا، میں نے دلبر سنگھ کے چاروں ساتھیوں کو قیدی سمیت وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا، پھر ساجد اور دلبر سنگھ کو لے کر گربہ پاؤں چلتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔

میں نے دلبر سنگھ کی رائفل اپنے ہاتھوں میں لے لی، ساجد پہلے ہی رائفل سے مسلح تھا، دلبر سنگھ کو تانوائے کے قریب پہنچ کر ترجمان کا کام سرانجام دینا تھا، میرا ارادہ تانوائے کو دھوکے سے گرفتار کرنے کا تھا، اس لئے میں نے جنگل میں ایک لمبا چکر کاٹ کر تانوائے کی پشت پر پہنچنے کا فیصلہ کیا اور کلہاڑی کی آواز سے تقریباً پچاس فٹ دور رہتے ہوئے ہم نے نیم دائرے کی شکل میں چکر کاٹا اور پھر آواز کی طرف نہایت خاموشی سے بڑھنے لگے اور آخر کار جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے پہنچ کر رک گئے، یہاں سے تانوائے اور اس کے ساتھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

تانوائے رائفل تھامے کھڑا اپنے ساتھیوں کو سیامی زبان میں ہدایت دے رہا تھا، جبکہ اس کے تینوں ساتھی کلہاڑیاں لئے مرے ہوئے ہاتھی کو چیر پھاڑ نے میں مشغول تھے، اور ایک دانت کی جڑ والی ہڈی ان کی ضربوں سے کافی حد تک کٹ چکی تھی، ان تینوں کی بندوقیں ان کے نزدیک ہی زمین پر پڑی تھیں، تانوائے کی آنکھیں اپنے سامنے پھیلے گھنے اور تاریک جنگل کا بار بار جائزہ لے رہی تھیں، شاید اس کی چھٹی حس اسے خطرے کا احساس دلا رہی تھی ویسے بھی اس کی قوت شامہ جنگل کے مخصوص ماحول سے آشنا تھی تاہم خطرے کی سمت کے بارے میں وہ کوئی اندازہ نہیں لگا پا رہا تھا، ہم اس وقت عین اس کے عقب میں تھے، تھوڑی دیر تک ہم تینوں اسی جھاڑیوں کی آڑ میں دبکے رہے، تانوائے نے دریائے پاچان کے دونوں کناروں پر خوف و دہشت کی ایک بادشاہت قائم کی ہوئی تھی، اور بڑے بڑے جیالے اس کا نام سن کر کانپنے لگتے تھے، میں نے دلبر سنگھ کی ہمت بندھانے کے لئے اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی اور سرگوشی میں اسے کہا۔

"تانوائے سے کہو، کہ وہ اور اس کے ساتھی اپنی بندوقیں زمین پر ڈال دیں، کیونکہ وہ اور اس کے ساتھی اس وقت ہماری رائفلوں کی زد پر ہیں۔"

ایک ساعت کی ہچکچاہٹ کے بعد دلبر سنگھ چند قدم بڑھ کر جھاڑیوں کی آڑ سے نکلا اور با آواز بلند سیامی زبان میں تانوائے اور اس کے ساتھیوں کو للکارا، تانوائے اور اس کے ساتھی اس طرح جم کر رہ گئے جیسے پتھر کے مجسموں میں تبدیل ہو گئے ہوں، لیکن ان کا یہ سکوت محض چند ثانیوں کے لئے تھا، جونہی ہم دونوں بڑھ کر دلبر سنگھ کے قریب پہنچے، تانوائے کے ساتھیوں نے برق رفتاری سے لپک کر اپنی بندوقیں اٹھالیں اور ایک سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں تانوائے اور اس کے تینوں ساتھی بندوقوں سمیت گھنے درختوں میں پناہ لے چکے تھے، دراصل مہذب دنیا کا باسی ہونے کے باعث مجھے آتشی اسلحے کے جادو پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں نے وہی جادو تانوائے پر بھی ٹھونسنے کی کوشش کی نتیجہ وہی ہوا جو ایک شیر کو بندوق دکھا کر ہینڈز اپ کہنے سے ہوتا ہے۔

تانوائے اور اس کے ساتھی ہمارے سامنے مورچہ بند ہو چکے تھے، اگلے ہی لمحے جنگل کی خاموشی ایک دھماکے سے گونج اٹھی، بندوق کی گولی میرے قریب سے سرسراتی ہوئی گزر گئی، یہ گویا میری للکار کا جواب تھا، اب میرے لئے اپنے بقایا ساتھیوں کو بلا لینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، اس لئے میں نے ساجد کو سرگوشی میں ہدایت دی کہ وہ اپنے چاروں ساتھیوں سمیت تانوائے کی پشت میں پہنچنے کی کوشش کرے، لیکن ساتھ ہی اسے سختی سے ہدایت کردی کہ انہیں اپنے ذاتی تحفظ کے لئے رائفل چلانا بھی پڑی تو انہیں کسی بھی صورت میں تانوائے اور اس کے ساتھیوں پر مہلک فائر کرنے کی اجازت نہیں، محض انہیں زخمی کرنے کے لئے ٹانگوں پر فائر کر سکتے ہیں۔

ساجد نہایت خاموشی سے جھاڑیوں میں رینگ گیا، ہم دونوں جھاڑیوں کی آڑ میں دبکے آنے والے واقعات کا انتظار کرتے رہے، تانوائے کے مزاج اور فطرت کو بھی اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد مجھے اس کے بھاگ نکلنے کا خدشہ نہیں تھا، ایسے موقعوں پر بھاگ نکلنے کے بعد وہ کبھی اپنے ساتھیوں کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہتا، ہم سے بمشکل تیس قدم دور ہاتھی کا مردہ جسم پڑا تھا، اور اس سے چند ہی فٹ دور تانوائے اور اس کے ساتھی گھنی جھاڑیوں میں پوشیدہ تھے، اسی حالت میں تقریباً دس بارہ منٹ گزر گئے، لیکن دونوں جانب کے فریقین بدستور گھات لگائے بیٹھے رہے، پھر اچانک دوسری جانب سے لگاتار دو گولیوں کی آواز سنائی دی، لیکن یہ فائر ہم پر نہیں بلکہ ساجد اور اس کے ساتھیوں پر کئے گئے تھے، جواب میں جنگل میں کچھ دور سے ایک فائر ہوا، آواز ساجد کے رائفل کی تھی، فائر کے ساتھ ہی تانوائے کا ایک ساتھی ایک غراہٹ انگیز چیخ کے ساتھ جھاڑیوں سے باہر آ گرا، اس کے باقی کے دو ساتھی پلک جھپکتے اسے تنہا چھوڑ کر فرار ہو گئے، غالباً وہ اس غلط فہمی کے باعث کہ دوسری جانب سے بھی انہیں جدید ہتھیاروں سے لیس حملہ آوروں نے گھیر لیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ توڑے دار بندوقوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن آفرین ہے تانوائے پر اپنے ساتھیوں کو فرار ہوتے دیکھ کر وہ جھاڑیوں کی آڑ سے ہٹ گیا اور اپنی رائفل تھامے اٹھ کھڑا ہوا، بہت ہی بے جگر انسان تھا۔

میں سمجھا کہ اس کی بندوق خالی ہو چکی ہے، یہ میری بہر ہی خطرناک غلطی تھی، جس کی مجھے فوراً ہی سزا بھی مل گئی، رائفل کی نالی جھکائے میں اس کی طرف بڑھا، دلبر سنگھ میرے پیچھے تھا، لیکن اس کے چلنے کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی زخمی درندے کے نزدیک جا رہا ہو، میری نظریں بھی بدستور تانوائے پر جمی ہوئی تھیں لیکن کاش میں نے اس کے چہرے سے اس کے ارادے پڑھ لئے ہوتے وہ اس جنگل کا بے تاج بادشاہ تھا، اور ہم اس کی بادشاہت میں دخل انداز ہو رہے تھے، ساتھ ہی اسے قانون اور انصاف کی زنجیروں میں جکڑنے کے درپے تھے، اس نے وہی کیا جو بادشاہ میدان جنگ میں

ـت سے قبل کرتے ہیں۔

شکست کو فتح میں بدلنے کی آخری جدوجہد، ہم بمشکل اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھے جب بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اس نے حرکت کی اور بندوق اٹھا کر ہم پر فائر کر دیا، فائر گو مجھ پر کیا گیا تھا لیکن میں تیزی سے ایک طرف جھک گیا، اور ساتھ ہی چیخ کر دلبر سنگھ کو بھی خبر دار کیا، لیکن میری یہ چیخ بعد از وقت ثابت ہوئی، گولی دلبر سنگھ کے چہرے پر لگی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر گر گیا۔ ـر کرنے کے فوراً بعد تانوائے چیتے کی سی پھرتی سے ـنگ کر گھنے جنگل میں پہنچ گیا، جوش وغضب سے کانپتے ہوئے میں نے جنگل میں تحلیل ہوتے اس کے سائے کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا، اس نے ایک جھٹکا سا لیا اور لڑکھڑا کر جھکا لیکن پھر سنبھل کر ایک نظر سر گھما کر مجھ پر ڈالی اور تیزی سے چلتا ہوا جنگل میں روپوش ہو گیا۔

بلاشبہ تانوائے زخمی ہوا تھا اور بہت زیادہ دور نہیں جا سکتا تھا، اس لئے میں دلبر سنگھ کی جانب متوجہ ہوا، وہ میرے قدموں میں بے جان پڑا تھا، اس کا چہرہ اڑ چکا تھا، میں نے سیٹی بجا کر اپنے ساتھیوں کو بلایا اور ساجد کی مدد سے اس کی لاش اٹھا کر ایک درخت کے سائے میں ڈال دی، لاش کے چہرے پر میں نے رومال ڈال دیا، دلبر سنگھ کے بے رحمانہ قتل پر میں فرط غضب سے کانپ رہا تھا، اس نے میری خدمت کرتے ہوئے جان دی تھی، اور اس کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچانا میرا فرض تھا، میں نے اپنے تین ساتھیوں کو وہیں چھوڑا اور ساجد اور ایک ہوشیار کھوجی کو لے کر فوراً ہی تانوائے کے تعاقب میں چل پڑا۔ ہاتھی کی لاش سے دوسری جانب چند قدم دور زمین پر خون کی کافی مقدار نظر آئی، قریب ہی تانوائے اور اس کے ساتھیوں کی بندوقیں بھی پڑی تھیں، نشانہ لیتے وقت میں نے اس بات کا دھیان رکھا تھا کہ گولی تانوائے کی ٹانگ پر ہی لگے تاکہ ہم اسے زندہ گرفتار کر سکیں، معلوم ہوتا تھا کہ میرا نشانہ خطا نہ گیا تھا، زمین پر چند خون آلود پنجوں کی بھی نشان تھے، جن سے خون کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا، ہم تینوں تانوائے کے تعاقب میں چل پڑے۔

آخر کار چلتے چلتے ہم بانسوں کے جنگل تک جا پہنچے، یہاں ہمارے سینوں تک اونچی گھاس تھی، حدِ نگاہ تک پھیلے گھنے جنگل میں ہمارا کھوجی نہایت تیزی سے قدموں کے نشانات پر دوڑا چلا جا رہا تھا، کہیں کہیں زمین پر بھی خون کی کچھ مقدار نظر آ جاتی یا پھر گھاس ہی خون کی سرخی میں رنگی ہوتی، رفتہ رفتہ خون کی مقدار میں اضافہ ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ ایک جگہ زمین پر اگی گھاس چھوٹی چھوٹی اس طرح دبی ہوئی تھی جیسے کسی بھاری جسم کا وزن کچھ دیر کے لئے وہاں پڑا رہا ہو، مسلی ہوئی گھاس خون سے سرخ ہو رہی تھی، کھوجی نے مجھے اشارے سے بتایا کہ اگر تانوائے کو اپنے زخم پر دھیان دینے کا موقع مل گیا تو ہم اسے کبھی نہ پکڑ سکیں گے' وہ جنگل کی گہرائیوں میں گم ہو جائے گا، ہم نے اپنی رفتار تیز کر دی، اب اردگرد کا جنگل میرا دیکھا بھالا سا لگ رہا تھا، ہم دیوانہ وار دوڑے چلے جا رہے تھے، کھوجی ہمارے آگے آگے زمین کو سونگھتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ سورج اپنا اختتامی سفر طے کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ ہم ٹین کی کان کی طرف واپس جا رہے تھے، تانوائے دریائے پاچان تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے خیال میں وہ دریا پار کر کے سیام کی سرحد میں داخل ہونا چاہتا تھا، جہاں کوئی اس کا بال بیکا بھی نہ کر سکتا تھا، وہ پناہ لینا چاہتا تھا، لیکن آزادی کی آخری جدوجہد میں وہ دلدلی علاقے کی طرف چل پڑا تھا، وہ یہاں کی دلدلوں کے ایک ایک انچ کے حصے سے واقف تھا، اور اس کا خیال ہوگا کہ اس کے تعاقب کے دوران لاعلمی میں ہم کسی دلدل کی تہہ میں پہنچ جائیں گی لیکن میرے ساتھ جو کھوجی تھا وہ بانگی چانگ نامی گاؤں کا مکھیا تھا اور وہ اس جنگل سے خوب اچھی طرح واقف تھا اور خود بھی بہترین کھوجی تھا۔

یکلخت دور درختوں میں ایک سایہ سا لہرایا اور تیزی سے نگاہوں سے اوجھل ہو گیا، یہ تانوائے کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا، ہم نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر

دی، اور درختوں سے بچتے بچاتے ٹھوکریں کھاتے اپنے شکار کے نزدیک تر ہوتے چلے گئے، ہوا میں اب ایک نمکین سی نمی محسوس ہونے لگی تھی ہم سمندر سے زیادہ دور نہ تھے، قریب ہی دریائے پاچان اور خلیج مالیون کا سنگم تھا، ہم اب تک تانوائے سے اندازاً سو گز دور تھے۔ اس نے بھی ہمارے قدموں کی چاپ اور آہٹ سن لی تھی، کیونکہ فوراً ہی اس نے سر گھما کر ہمیں دیکھا، اس کے چہرے پر دور دور تک خوف کا شائبہ تک نہ تھا، غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی الوداعی کرنیں دریا کی سطح سے منعکس ہو کر درختوں سے چھن چھن کر چمک رہی تھیں، میں نے اس روشنی میں غور سے تانوائے کو دیکھا، وہ کمر کے گرد لپٹا کپڑا اتار کر کہیں پھینک چکا تھا اور اس وقت مادر زاد برہنہ تھا، لیکن اس کے شانے پر کارتوس کی پٹی اب بھی موجود تھی اور اس کی دائیں ٹانگ گھٹنے سے نیچے خشک ہوتے ہوئے خون میں لتھڑی ہوئی تھی، ایک ساعت کے لئے میرے دل میں رحم کی ہلکی سی کرن چمکی، لیکن فوراً ہی میں نے تصور میں دلبر سنگھ کا اڑا ہوا چہرہ دیکھا، تانوائے میرے ایک ساتھی کا قاتل تھا، اسے قانون کے حوالے کرنا مجھ پر لازم ہو گیا تھا اور یہ میرا فرض بھی تھا۔

سورج کے سفر کا اختتام ہو چکا تھا تاریکی پھیلتی جا رہی تھی تانوائے اب دریا کے دلدلی کنارے پر دوڑ رہا تھا، دریا تک پہنچنے کے لئے اسے ابھی تیس چالیس فٹ کا فاصلہ طے کرنا تھا، اچانک وہ اس طرح رکا جیسے زمین نے اس کے پاؤں جکڑ لئے ہوں، میرے ساتھی کھوجی نے ہانپتے ہوئے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور اکھڑی اکھڑی سی آواز میں بولا اب تانوائے کا تعاقب کرنے کی ضرورت نہیں صاحب وہ دوسرے کنارے تک نہ پہنچ پائے گا، ہم ابھی دلدلی سطح سے ساٹھ ستر فٹ دور تھے میں نے رک کر حیران نظروں سے کھوجی کی طرف دیکھا، لیکن اس نے نہایت اطمینان سے تانوائے کی طرف اشارہ کر دیا، اور اس بار میں نے نظر ڈالی تو تانوائے گھٹنوں تک زمین میں دھنسا ہوا آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن اس کی رفتار چیونٹی سے بھی کم تھی، اس کی بعد مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ تانوائے ایک ریتیلی دلدل میں پھنس چکا ہے، جو رفتہ رفتہ اسے تہہ کی طرف کھینچ رہی ہے، وہ جس قدر دلدل سے نکلنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی دھنستا چلا جا رہا تھا، میں نے اس کی مدد کے لئے آگے بڑھنا چاہا، لیکن ساجد نے نہایت مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا اور بولا۔

”ہم اب اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتے صاحب ہمارے پہنچنے تک وہ دلدل میں گم ہو چکا ہوگا، ہمارے پاس کوئی رسی بھی نہیں ہے اگر تانوائے کی مدد کرنا ممکن ہوتا تو وہ صرف ایک مضبوط رسی ہو سکتی تھی اور اس خوفناک جنگل میں رسی کا کیا کام۔“

ساجد غلط نہیں کہہ رہا تھا، اس دوران تانوائے ناف تک دلدل میں دھنس چکا تھا، اور جب تک ہم اس کے قریب پہنچے وہ سینے تک دلدل میں اتر چکا تھا، اب اسے بغیر رسی کے ریتلی دلدل سے باہر نکالنا ممکن نہ تھا، ہم بے بسی سے وہیں کھڑے تانوائے کو دلدل سے زور آزمائی کرتا دیکھتے رہے، ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح تانوائے تیزی سے دلدل میں دھنستا چلا گیا، آخری جدوجہد کے طور پر اس نے ایک بار زور لگا کر دلدل سے نکلنا چاہا، لیکن دلدل نے مزید تیزی سے اسے نیچے کی طرف کھینچا، پہلی مرتبہ تانوائے کے چہرے پر خوف اور مایوسی کے آثار نمودار ہوئے اور اس کے حلق سے ایک طویل چیخ نکلی...... لیکن...... یہ چیخ آخری ثابت ہوئی وہ دلدل کی بھیانک گہرائیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو گیا، اس کا سر ڈوبتے ہی دلدل برابر ہو گئی، اس کی سطح پر پانی کے بلبلے پھوٹنے لگے آہستہ آہستہ دلدل کی سطح پر آخری بلبلا بھی پھٹ گیا، تانوائے کا وجود دلدل میں یوں غائب ہو گیا جیسے وہ تھا ہی نہیں، رات کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور ہم سب افسردہ کھڑے دلدل کو گھور رہے تھے۔

موت کے رنگ

اقصیٰ رباب۔ فیصل آباد

وقت مقررہ پر اس نے اپنے شوہر کا پرتپاک استقبال کیا، گھٹا ٹوپ اندھیری رات میں اپنے قاتلوں سے خونی بدلہ لے لیا مگر یہ کیا جب پوسٹ مارٹم رپورٹ آئی تو حیران کن تھی کیونکہ ایک ماہ پہلے وہ انتقال کر چکی تھی۔

اندھا اعتماد کرنے والے اکثر پیچیدہ مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک سبق آموز لرزیدہ کہانی

سائرہ نے کافی کے کپ میز پر رکھے اور پلٹنے ہی لگی تھی کہ کامران کی آواز آئی۔ ”سائرہ تھوڑے سینڈوچ بھی بنا لو۔“ سائرہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سے کچن کی طرف چل دی۔

تینوں دوستوں کی ڈرائنگ روم سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کامران، عمران اور علی تینوں بچپن کے دوست تھے۔ سات ماہ پہلے کامران کی شادی سائرہ سے ہوئی تھی۔ باقی دونوں دوست ابھی غیر شادی شدہ تھے۔

عمران اور علی دونوں ایک پرائیویٹ ادارے میں ملازمت کرتے تھے جبکہ کامران کا اپنا بزنس تھا۔ جو کافی وسعت اختیار کر چکا تھا۔ اس سلسلے میں کامران کو اکثر ملک سے باہر بھی جانا پڑتا تھا۔ دولت کے باوجود وہ اپنے دوستوں سے ویسے ہی بے تکلف تھا۔ دولت اور

زمانے کے چلن سے انجان کامران میں صرف خلوص اور محبت تھی۔ اس کے دوست ہر ہفتے اس کے پاس آجاتے اور سنڈے کو انجوائے کرنے کے چکر میں دیر تک کامران کے پاس بیٹھے رہتے۔

سائرہ کو بھی اندازہ تھا کہ کامران کو اپنے یہ دونوں دوست کتنے عزیز ہیں۔ اوران کے ساتھ کامران کی خوشی سائرہ کو عزیز تھی۔ ایسے میں رات دیر تک اسے ان تینوں دوستوں کی کھانے کی فرمائشیں بھی پوری کرنی پڑتیں۔

سائرہ کو پتا تھا سینڈوچ آخری فرمائش نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اسے کچھ اور بھی بنانے کی فرمائش مل جائے گی۔ اسے کامران کے دوست عمران کی باتیں بالکل پسند نہیں تھیں وہ ایسے گپیں ہانکتا جیسے پوری دنیا اس کی مٹھی میں ہے اور وہ جب چاہے کچھ بھی کرسکتا ہے۔

مگر وہ عمران کی باتوں پر کوئی نکتہ چینی کرنے سے پرہیز ہی کرتی۔ کیونکہ اسے ہر وفا شعار بیوی کی طرح اپنی کسی بھی مرضی سے زیادہ اپنے شوہر کی خوشی عزیز تھی۔ ہمارے معاشرے کی زیادہ تر بیویوں کی طرح۔ شادی کے بعد جن کی اپنی کوئی مرضی اور رائے بالکل ختم ہوجاتی ہے اور وہ یوں خود کو شوہر کی مرضی کے آئینے میں ڈھالتی ہیں کہ نہ پھر اپنے ذہن سے سوچتی ہیں اور نہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہیں۔

اسی وفا شعاری میں وہ عمران اور علی کی ہر بات اور ہر انداز سے چھلکتا احساس کمتری بھی نہ دیکھ پائی کہ کیسے وہ گھر کی ہر چیز للچائی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ کافی دیر سے اس کے لئے کھانے کی اور فرمائش نہیں آئی تھی۔ لہٰذا وہ سکون محسوس کررہی تھی۔

کامران نے ایک دم سے چونک کر علی اور عمران کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم لوگوں کو کل گھر لازمی آنا ہے، شام چھ بجے۔“

دونوں حیران ہوئے اور بھنویں اچکا کر سوال کیا کہ ”خیریت؟“

”یار تم دونوں کو بتانا بھول گیا کہ کل ایک بہت اہم بات ہے۔ بات کا پتا تو کل ہی چلے گا۔ آج میں نہیں بتاؤں گا۔“

دونوں نے شانے اچکا دیئے۔ ”جیسے تمہاری مرضی۔ ٹھیک ہے، ہم دونوں آجائیں گے۔“

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور علی نے عمران کی آنکھوں میں اشارہ کردیا کہ اب چلنا چاہئے۔ عمران نے کامران سے اجازت طلب نظروں سے دیکھا تو کامران مسکرا کر کھڑا ہوگیا۔

تینوں آگے پیچھے گیٹ تک آئے۔ کامران نے حسب معمول عمران اور علی کو گلے لگا کر رخصت کیا۔

اگلے دن عمران اور علی وقت پر پہنچ گئے۔ اس دن خلاف معمول کامران نے سائرہ کو فوراً چائے بنانے کا نہیں کہا۔ کوئی بریانی کی فرمائش نہیں بلکہ کامران نے اسے روم میں رہنے کو کہا اور منع کیا کہ وہ روم سے نہ نکلے۔

سائرہ حیران رہ گئی ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔ وہ اپنے آپ سے ہزار بار سوال کرچکی تھی کہ کیوں؟ کس لئے اسے کامران نے کہا؟ کبھی کوئی سوال اس کے دل میں سر اٹھاتا تو کبھی کوئی۔ جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ اس نے اپنا بیڈروم بڑی محنت سے سجایا تھا۔ ڈارک بلیو کلر کا دبیز کلین۔ لائٹ بلیو کلر کے پردے، صوفے، اینڈ بیڈشیٹ سفید کلر کا دیواروں کا پینٹ، مگر آج یہی بیڈروم اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ ٹی وی لگایا۔ کوئی چینل اچھا نہ لگا تو وہ بھی بند کردیا۔ وہ لگاتار بیڈ روم میں چل پھر رہی تھی۔ بیٹھنے کو اس کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ جب کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو بے ساختہ آنکھ سے آنسو نکل آئے۔

اسی وقت کامران کمرے میں داخل ہوا۔ اپنی ہر وقت ہنستی مسکراتی بیوی کو یوں دیکھ کر اس کا دل تڑپ اٹھا اور نیچے گرنے والے آنسو کو کسی قیمتی موتی کی طرح انگلی پر سنبھالا۔ سائرہ ایک دم سے چونک گئی وہ کامران کو کمرے میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکی تھی۔

کامران اس کی کیفیت سمجھ چکا تھا۔ اس لئے سائرہ سے بغیر کوئی بات کئے بیڈ کے نیچے جھک گیا اور ایک ڈبہ اٹھا کر بیڈ پر رکھ دیا۔ سائرہ نے حیرت سے پہلے بیڈ پر پڑے ڈبے اور پھر کامران کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کہ یہ کیا ہے؟

کامران نے مسکراتے ہوئے دیکھا اور بولا۔ ”جلدی سے یہ میرا گفٹ کھولو اور یہ ڈریس پہن کر نیچے آجاؤ۔ ہم تینوں انتظار کررہے ہیں۔ جلدی زیادہ دیر مت کرنا۔“ اور بغیر سائرہ کی طرف دیکھے روم سے چلا گیا۔

سائرہ نے ناسمجھی کے انداز میں ڈبہ کھولا تو خوب صورت سفید کلر کی فراک جس پر موتیا کلر کے موتیوں کا خوب صورت اور نفیس کام تھا۔ سائرہ کچھ دیر تو ڈریس میں کھوگئی اور جب کامران کی بات یاد آئی تو جلدی سے تیار ہونے لگی۔

جب سائرہ سیڑھیوں سے اتر رہی تھی تو کامران دم بخود سائرہ کو دیکھ رہا تھا جیسے سائرہ کا ہر قدم سیڑھیوں کے بجائے کامران کے دل پر پڑ رہا ہو۔ علی اور عمران، کامران کی بے خودی دیکھ کر بے ساختہ مسکرا دیئے۔ ان کی ہنسی کی آواز کامران کو ہوش کی دنیا میں واپس لائی اور بے ساختگی کا وہ سحر ٹوٹ گیا۔

کامران کے ہونٹوں پر اپنے دوستوں کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ پھیل گئی جس میں خجالت نمایاں تھی۔

سائرہ حیران رہ گئی کیونکہ نیچے ایک بڑا سا کیک جلتی موم بتی کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔

ہر طرف گلاب کے سرخ پھول دیواروں پر چسپاں تھے۔ سفید پینٹ کی دیواروں پر سرخ پھول بہت دیدہ زیب لگ رہے تھے۔ جب سائرہ کیک کے سامنے پہنچی تو اوپر سے گلاب کی پتیاں اس پر گرنے لگیں۔ سائرہ نے محبت بھری نظروں سے کامران کی طرف دیکھا اور کیک کاٹنے کے لئے چھری اٹھائی تھی کہ کامران فوراً بولا۔ ”اتنے خوب صورت ڈریس پر کوئی جیولری نہیں۔“

سائرہ نے ایک دم سے گردن پر ہاتھ رکھا اور تھوڑی دیر بعد کامران سے مخاطب ہوئی۔

"آپ نے خود ہی تو جلدی کا کہا۔ دھیان ہی نہیں رہا۔ جیولری کا۔ ویسے بھی اتنے خوب صورت ڈریس پر جیولری نہ بھی پہنی جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"بھئی تمہیں نہ ضرورت لگتی ہو مجھے تو لگتی ہے۔" یہ کہہ کر کامران ڈرائنگ روم میں ایک کونے کی طرف بڑھا اور بلو کلر کا جیولری کا بکس لے کر اس کی طرف بڑھا۔ "یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔"

سائرہ نے ڈبہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ خوبصورت وائٹ ڈائمنڈ سیٹ آنکھوں کو خیرہ کررہا تھا۔ سائرہ تو جیسے سکتے میں رہ گئی۔ کامران نے ہار اٹھا کر گلے میں پہنادیا۔ جب کامران نے ہار پہنادیا تو دونوں تالیاں بجانے لگے۔

علی نے تھوڑی شرمندگی سے کہا۔ "بھابھی! اگر کامران آپ کی سالگرہ کا بتاتا تو ہم بھی گفٹ لے کر آتے۔ مگر کامران نے تو ہمیں بتایا ہی نہیں۔"

کامران نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم لوگ آئے، یہی گفٹ کم ہے کیا۔"

عمران نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم گفٹ لے بھی آتے تو کامران کے گفٹ کے آگے ہمارا گفٹ کچھ بھی نہیں ہوتا۔" عمران کی بات پر کامران اور سائرہ مسکرادیئے مگر عمران کی بات میں چھپی آنچ کی تپش سے دونوں انجان رہے۔

☆......☆......☆

دو ماہ بعد کامران کو ایران جانا تھا۔ اس نے عمران اور علی کو آگاہ کردیا کہ وہ ایک ماہ بعد لوٹے گا۔ سائرہ اس کے جانے سے بہت اداس ہورہی تھی۔ اس کا دل جیسے بجھا جارہا تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو سنبھالا اور مسکراتے ہوئے کامران کو رخصت کیا۔ ایک تو اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی دوسرا اسے لگ رہا تھا وہ اپنا ضبط نہ کھو بیٹھے۔ اس نے کامران کو گھر کے دروازے سے الوداع کہا۔ بار بار آنکھوں میں آنے والی نمی کو روکتی رہی۔ مگر گیٹ بند کرتے ہی وہ جیسے اپنا ضبط کھو بیٹھی اور سسک اٹھی۔

کافی آنسو بہانے کے بعد دماغ نے دل کو سمجھانے کا فریضہ ادا کرنا شروع کردیا اور کچھ دیر بعد ہی مگر اس کے دل کو اپنے دماغ کی بات سمجھ آ ہی گئی کہ بس ایک ماہ کی تو بات ہے جلدی گزر جائے گا یہ سوچ کر وہ خود کو پاگل کہہ کر مسکرادی تو جیسے بارش کے بعد قوس قزح نظر آ گئی ہو۔

اس نے سوچا کہ وہ کچھ دن اپنے گھر والوں کے ساتھ گزار لے۔ جب کامران کا فون آیا تو اس نے کامران سے بھی اس بات کا اظہار کیا۔ مگر کامران کو یہ فکر تھی کہ وہ اکیلی کیسے جائے گی۔ اس نے کامران کی فکر یہ کہہ کر دور کردی کہ کوئی آجائے گا لینے۔ کامران نے خوشی سے اجازت دے دی اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ اس کے واپس آنے سے پہلے لوٹ آئے لازمی۔ سائرہ نے اسے یقین دلایا کہ اس کے واپس آنے سے تین چار دن پہلے ہی وہ گھر پہنچ جائے گی۔

☆☆☆

سائرہ کا وقت اپنے والدین کے ساتھ بہت اچھا گزرا۔ حسب وعدہ وہ کامران کے واپسی سے دو دن پہلے ہی گھر لوٹ آئی۔

رات کو انجانے احساس کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ گھر میں کوئی ہے۔ جلد ہی اس کا وہم یقین کا لبادہ پہنے اس کے سامنے تھا۔ اس نے اپنا چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ اس نے سائرہ سے کہا۔ "آواز مت نکالنا۔ ورنہ تمہیں مارنے میں مجھے دیر نہیں لگے گی۔ الماری کی چابیاں نکالو۔"

سائرہ نے گھبرا کر چابیاں اس کے حوالے کردیں۔ مگر آواز اسے جانی پہچانی لگی۔

اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ "علی بھائی! آپ؟"

اور یہ سن کر علی بوکھلا گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سائرہ اس کی آواز پہچان لے گی۔ اگر ایک علی تھا تو شک کی گنجائش ہی نہ تھی کہ دوسرا عمران ہوگا۔

علی نے عمران کو آنکھوں میں اشارہ کیا کہ اب؟

عمران نے اپنا ہاتھ گردن کے پاس لے جا کر سے رائٹ سے لیفٹ حرکت دی۔ علی کی آنکھیں تھوڑی پھیل گئیں۔

عمران نے علی کے ہاتھ سے چاقو پکڑا اور سائرہ کے پیٹ میں اتار دیا۔ یہ سب اتنا حیران کن تھا کہ سائرہ وہ چیخ بھی نہ پائی۔

علی حیران ہوکر عمران سے بولا۔ "یہ کیا کردیا؟ ہمارے پلان میں یہ تو نہیں تھا۔"

"اس نے ہمیں پہچان لیا۔ یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے؟ مجبوری تھی۔" عمران نے دھیمی آواز سے جواب دیا۔

"چلو جلدی سے اس کو اسپتال لے کر چلیں۔" علی نے جلدی سے کہا۔

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ اسے اسپتال لے کر جانے کا مطلب ہے خود جیل میں جانا۔"

عمران نے علی کو ناصحانہ انداز میں جواب دیا۔

بیڈ شیٹ سائرہ کے خون سے رنگتی جارہی تھی۔ اس کی آنکھوں کا کرب ناقابل دید تھا۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔

سائرہ کی حالت دیکھ کر علی کا دل بھی تڑپ گیا۔

عمران الماری سے جیولری اور کرنسی نکالنے لگا۔ زیور اور کرنسی اس کے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ سب سمیٹ کر وہ علی کی طرف متوجہ ہوا۔ عمران کے جانے پر علی سکتے سے باہر آیا اس کی کانپتی آواز میں عمران سے کہا۔ "عمران دیکھو...... دیکھو...... سائرہ مرگئی ہے......" اس کی انگلی سائرہ کی طرف اٹھی تھی۔

عمران نے ایک نظر سائرہ کی طرف دیکھا اور علی کو تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ مگر علی کی حالت دیکھتے ہوئے اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ دونوں اپنے ایک کمرے کے چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں آگئے جو وہ دونوں شیئر کرتے تھے۔ عمران نے احتیاط سے زیور اور کرنسی کو الماری کے خفیہ خانے میں چھپادیا۔

تھوڑی دیر بعد علی پھر عمران سے مخاطب ہوا۔ "یار بھابھی!...... تم جانتے ہو کامران ان سے کتنا پیار کرتا ہے۔ اس پر کیا بیتے گی۔ ہم اسپتال تو لے کر جاسکتے تھے نا۔ اور اب ڈیڈ باڈی بھی وہیں چھوڑ آئے۔ اتنا عرصہ ہم نے اس گھر میں کھایا ہے۔"

عمران جیسے پھٹ پڑا۔ "علی پلیز!...... اب خاموش۔ تمہیں کیا لگتا ہے مجھے دکھ نہیں ہوا۔ مگر مجبوری میں کرنا پڑا سب، اب بس چپ۔ ایک لفظ اور مت کہنا اور خود کو سنبھالو۔ پلیز!...... ابھی تو کل کامران نے آنا ہے۔ ہمیں اسے بھی Face کرنا ہے کہ اسے ہم پر کوئی شک نہ ہو۔"

علی نے حیرت سے عمران کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا کامران ہم پر شک کرسکتا ہے؟"

"یار کامران نا بھی کرے، پولیس تو کرسکتی ہے نا۔ ہم سب سے زیادہ اس کے قریب ہیں اور اس کے گھر ہر وقت آنا جانا۔ پھر ہماری مالی حالت۔ جب یہ معلوم ہوگا کہ ہمیں ملازمت سے بھی نکال دیا گیا تو پولیس کا پہلا شک ہم پر ہی ہوگا۔" عمران نے درشت لہجے میں علی کو جواب دیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر نظر چرانے لگے۔ پہلا جرم اور وہ بھی چوری کے ساتھ قتل۔ دونوں کا ضمیر بے سکون تھا۔ وہ پیشہ ور مجرم نہیں تھے کہ بے سکونی سے اپنے کیئے پر اتراتے پھریں۔ اندر کہیں انسانیت سسک رہی تھی۔ جسے مجبوری کی لوریاں سنا کر سلانے کی کوشش جاری تھی اور دونوں یقیناً کچھ دن بعد اس کوشش میں کامیاب ہوئے۔ ہمیشہ انسانیت کو شیطانیت سلانے میں کامیاب ہی رہی ہے۔ تو آج ناکامی کیسے ہوئی......؟

اگلے دن کامران وطن واپس لوٹ آیا وہ سائرہ سے ملنے کو بے چین تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ

کر گھر پہنچ جائے اسے معلوم تھا کہ سائرہ اس کے انتظار میں گیٹ کے پاس کھڑی ہوگی۔ اس کے بیل کے ساتھ ہی تیزی سے گیٹ کھولے گی اور خوب صورت مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری ہوگی۔ سائرہ کے تصور نے ہی اسے سرشار کردیا تھا۔

دونوں دوست شام میں کامران سے ملنے آئے۔ کامران نے اسی گرمجوشی سے دونوں کو خوش آمدید کہا۔ دونوں حیران رہ گئے۔ پھر کامران اٹھا کہ ''میں سائرہ کو کھانے پینے کا کہہ دوں۔'' یہ کہہ کر کامران اوپر چلا گیا۔

دونوں دوستوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ عمران نے دکھ سے علی کو کہا۔ ''لگتا ہے اس کے ذہن پر اثر ہوگیا ہے۔ بیوی کی موت برداشت نہیں کرسکا۔''

''دونوں نے تاسف سے ایک دوسرے کو دیکھا اور وہاں سے فوراً اٹھ آئے۔ دونوں کا احساس جرم بہت بڑھ گیا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ شاید دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لئے کچھ تھا ہی نہیں۔

☆☆☆

کافی دن گزر گئے ان دونوں سے پولیس نے کوئی رابطہ نہ کیا۔ بالآخر دونوں تجسس سے مجبور ہوکر کامران کے گھر آگئے۔ کامران نے خوشی سے دونوں کو خوش آمدید کہا اور اس دن بغیر بتائے گھر سے چلے جانے کی شکایت کی اور وہیں سے سائرہ کو اونچی آواز میں پکارا۔ دونوں نے دکھ سے اپنے دوست کی طرف دیکھا۔ مگر کچھ دیر بعد ہی دونوں کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ دونوں کو لگا زمین ان کے پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہے۔

سائرہ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آرہی تھی۔ دونوں کو لگا کہ دونوں کوئی خواب دیکھ رہے ہیں۔

سائرہ نے دونوں سے ان کا حال پوچھا۔ سائرہ کے ہونٹوں پر عجیب سی زہریلی مسکراہٹ تھی۔ دونوں کا دل ڈوبنے لگا۔ دونوں کامران کے رکنے کا اصرار نظر انداز کرتے باہر کی طرف لپکے۔ کامران کو ان کے اس انداز کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ سائرہ نے حیرت سے کامران کی طرف دیکھا۔ کامران نے ناسمجھی کے انداز میں شانے اچکا دیئے۔

☆☆☆

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا بھیانک منظر دونوں اپنے کمرے میں حیرت سے بت بنے بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے پوچھنا چاہتے تھے کہ کیسے؟ سائرہ زندہ کیسے؟ اگر کوئی بروقت اسے بچانے کی کوشش بھی کرتا تب بھی وہ اسپتال ہوتی۔ مگر اسے تو ہلکی سی چوٹ بھی نہیں آئی۔ ان سوالوں کے دونوں کے پاس کوئی جواب نہیں تھے۔ تین چار گھنٹے تک ان کے کمرے میں یہی جان لیوا خاموشی تھی اور وہ دونوں جو اپنے ان سوالوں کی دلدل میں ڈوبتے جارہے تھے اور انہیں اس گرداب سے نکالنے والا کوئی نہیں تھا۔

☆☆☆

آج جمعرات کا دن تھا۔ تاریکی مزید بڑھ چکی تھی۔ ایک دم سے موسم نے انگڑائی لی اور گہرے بادل چھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد ہی بجلی کے کڑکڑانے کے ساتھ بارش برسنے لگی۔ دونوں دوست سو رہے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ کھڑکی سے برستی بارش اور بجلی کی چمک نے دونوں کو حیران کردیا کیونکہ ان کو سوئے ابھی بس گھنٹہ ہوا تھا اور گھنٹہ پہلے تک تو بارش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بارش تو دور کی بات آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا تک نہیں تھا۔

دونوں ابھی موسم کی اس تبدیلی پر حیران ہو رہے تھے کہ دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں متوجہ کرلیا۔ دونوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا کہ رات کے 12 بجے کون ہوسکتا ہے۔

عمران نے دروازے کے پاس پہنچ کر آواز دی۔

''کون؟'' مگر اسی وقت بجلی کڑکی اور اس کی آواز بجلی کی آواز میں معدوم ہوکر رہ گئی۔ اتنے میں پھر سے دستک ہوئی۔ عمران حیران رہ گیا کہ اس کے ہاتھ لگائے بغیر لاک خود بخود کھل گیا اور دروازہ بھی خود ہی آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ عمران حیرت سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور جب دروازہ کھلا تو وہاں سائرہ کھڑی تھی۔

دونوں ایک ساتھ خوفزدہ ہوکر بول اٹھے۔

''سائرہ بھابھی آپ یہاں وہ بھی اس وقت۔'' تبھی بجلی چمکی اور اس بجلی میں اب انہیں سامنے کھڑی سائرہ کی جگہ ہڈیوں کا ایک بوسیدہ ڈھانچہ نظر آیا۔ دونوں کے حلق سے خوفناک چیخ نکلی۔ اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

رات کے ایک بجے اچانک کامران کی آنکھ کھلی تو سائرہ باہر سے کمرے میں آرہی تھی۔ کامران نے سائرہ سے کہا۔ ''سائرہ تم باہر کب گئی اور کیوں گئی تھی؟ خیریت؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

سائرہ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے بیڈ پر لیٹ گئی۔ کامران حیرت سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو وہ بالکل سرد تھا۔ کامران جلدی سے ڈاکٹر کو فون کرنے لگا۔

ڈاکٹر کامران سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس لئے تھوڑی دیر بعد ہی کامران کے گھر موجود تھا۔ کامران جب ڈاکٹر کو لے کر کمرے میں پہنچا تو بیڈ روم کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔

بیڈ شیٹ پر خون تھا۔ مگر تازہ نہیں لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے سائرہ کی آنکھوں میں ٹارچ ماری اور تاسف سے بولا۔ ''مسٹر کامران، یور وائف از ڈیڈ۔''

کامران وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اسے جیسے کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ اس کی حالت کے پیش نظر ڈاکٹر نے خود ہی پوسٹ مارٹم کے لئے لاش اسپتال پہنچادی۔ کامران بھی ناسمجھی کی کیفیت میں اسپتال میں تھا۔ کچھ دیر بعد وہاں عمران اور علی کی لاش بھی پہنچ گئی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ حیران کن تھی۔ سائرہ کی ڈیتھ ایک ماہ پہلے ہوچکی تھی۔ حیران کن بات یہ تھی کہ ایک ماہ پہلے ڈیتھ کے باوجود اس کا جسم ٹھیک تھا۔ صرف پیٹ کا زخم اور جما ہوا خون بتا رہے تھے کہ ایک ماہ گزر چکا ہے اور کامران اور علی کا جس چاقو سے قتل ہوا اسی چاقو سے اسی انداز سے سائرہ کو زخمی کیا گیا۔ حیرت انگیز طور پر تینوں کو زخم بھی پیٹ میں ایک ہی جگہ آئے۔ ایک انچ کا بھی فرق نہیں تھا۔

کامران دم بخود تھا۔ اس نے رات والی بات پولیس کو بتادی تھی کہ جیسے سائرہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ پولیس کو عمران اور علی کے کمرے سے سائرہ کی چوری کی ہوئی جیولری بھی مل گئی تھی۔ مگر پولیس کچھ نہ سمجھ سکی کہ یہ سارا معاملہ کیا ہے؟

پوسٹ مارٹم رپورٹ کچھ اور کہہ رہی تھی۔ حقائق اس کے الٹ تھے۔ روایتی انداز اپناتے ہوئے پولیس کا سارا شک کامران پر تھا اور پولیس کی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح قتل کا معاملہ کامران پر ڈال دیا جائے۔ ویسے بھی سچ کہا ہے؟ اس سے ہماری پولیس کو کوئی لینا دینا نہیں۔ پولیس کو حقائق جاننے سے زیادہ غرض اس بات پر رہتی ہے کہ بس کسی طرح الزام کسی پر عائد کردیں تاکہ انہیں محنت نہ کرنی پڑے۔ مجرم ڈھونڈنے میں، مگر پوسٹ مارٹم رپورٹ جو وقت سائرہ کے قتل کا بتا رہی تھی اس وقت کامران پاکستان میں نہیں تھا۔ ورنہ پولیس کا سارا مسئلہ حل ہوجاتا۔ قسمت نے کامران کو بچالیا۔

مگر کامران خود حیران تھا۔ اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ رہا تھا۔ سائرہ تو اس کے ساتھ تھی۔ پھر ایک ماہ پہلے اس کا قتل کیسے؟

اور اب اس کے دونوں دوست مارے گئے۔

کامران جیسے جیسے سوچتا اس کا ذہن ماؤف ہونے لگتا۔

کسی کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں تھا۔ سب کے پاس اگر کچھ تھا تو وہ تھے مفروضے اور قیاس اور وہ مفروضے ''کیا؟'' کیوں؟ کیسے؟ کس لئے؟'' سب پر پورا نہیں اتر رہے تھے...... ہم میں سے اکثر لوگوں کو اپنی زندگی میں بہت سے سوالوں کے جواب نہیں ملتے۔ یہی حقیقت ہے۔

گمشدہ مسافر

شرجیل تصور۔لاہور

اندھیری رات کا خوفناک سناٹا ہر سو مسلط تھا، چند دوست بے یار و مددگار آگے ھی آگے بڑھتے جارہے تھے، آگے بڑھنے میں ان کی مرضی نہیں تھی کیونکہ وہ کسی نادیدہ قوت کے حصار میں جکڑ چکے تھے۔

قدم قدم پر جسم وجاں اور رگ و پے میں خوف کی لہر دوڑاتی لرزا دینے والی کہانی

جب ہماری کار نے بالاکوٹ سے دریائے کنہار کا پل عبور کیا تو مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ کوئی غیر مرئی شے ہمارے ساتھ ساتھ سفر کررہی ہے۔ وہ چیز سرتاپا سیاہ تھی اور شاید بالوں بھری بھی......

ہماری کار کاغان ویلی کے راستے کی طرف مڑ گئی۔ پل عبور کرتے ہوئے مجھے یوں لگا تھا جیسے کوئی چیز ہماری کار کے ساتھ ساتھ اس کے اوپر اڑ رہی ہے۔ اس چیز کو میں نے کھڑکی سے باہر اوپر کی طرف دیکھی تھی۔ بس ایک ثانیے کے لیے، میں دوبارہ ونڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگا تھا جب مجھے واہمہ ہوا۔ میں نے فوراً گردن گھما کر کھڑکی سے باہر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس سفر کے دوران دوبار پہلے بھی میرا اس طرح کے واہموں سے سابقہ پڑچکا تھا۔ پہلا واہمہ تب پیش آیا جب ہم لوگ ایبٹ آباد میں نواں شہر کے علاقے میں اپنے ایک شاعر دوست پرویز ساجد کے پاس تھے۔ جس نے ہماری شب باشی کا انتظام ایک کمیونٹی ہال میں کیا تھا۔ اس کمیونٹی ہال کو سارے محلے والے مل کر چلاتے تھے۔ اس کمیونٹی ہال میں محلے والے اپنی تقریبات مناتے تھے ساتھ ہی ساتھ خوشی اور غم کے مواقع پر بھی اس ہال کو استعمال کیا جاتا تھا۔

باہر کے دروازے سے گزر کر سامنے کھلا احاطہ تھا اس کے بائیں جانب ہال تھا۔ ہمارا اسی ہال میں سونے کا انتظام تھا۔ ہال میں بستر اور چارپائیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ایک طرف چٹائی پر بیٹھے لوگ رات دیر تک تاش کھیلتے رہے۔ ڈیڑھ دو بجے کے قریب وہ لوگ وہاں سے اٹھ گئے تب ہمارا میزبان بھی اپنے گھر چلا گیا۔ ہم کل پانچ آدمی تھے جو کاغان کی سیاحت کے لیے لاہور سے نکلے تھے۔ ہم پانچوں دوستوں کی عمریں 25 سے 30 کے درمیان تھیں۔ میرا نام مستقیم ہے جب کہ میرے دیگر دوستوں کے نام یہ ہیں۔ نوید، عرفان، فیاض اور الیاس۔

ہم پانچوں سونے کے لئے لیٹ گئے، ہال کی فاضل ٹیوب لائٹس بند کر دی گئیں تھیں، واحد ایک دودھیا روشنی کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی ہال کے لیے ناکافی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سبھی سوچکے تھے۔ میں بھی تقریباً سویا ہی ہوا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر مغلیہ چادر لے رکھی تھی۔ کروٹ بدلنے کی غرض سے چادر میرے منہ سے ذرا سی سرکی تو میں نے دیکھا کہ کوئی وجود ہمارے سامان کے پاس کھڑا ہے، وہ سیاہ ہیولا میرے سفری بیگ کے اوپر جھک رہا تھا، میرے دیکھتے ہی اچانک وہ غائب ہو
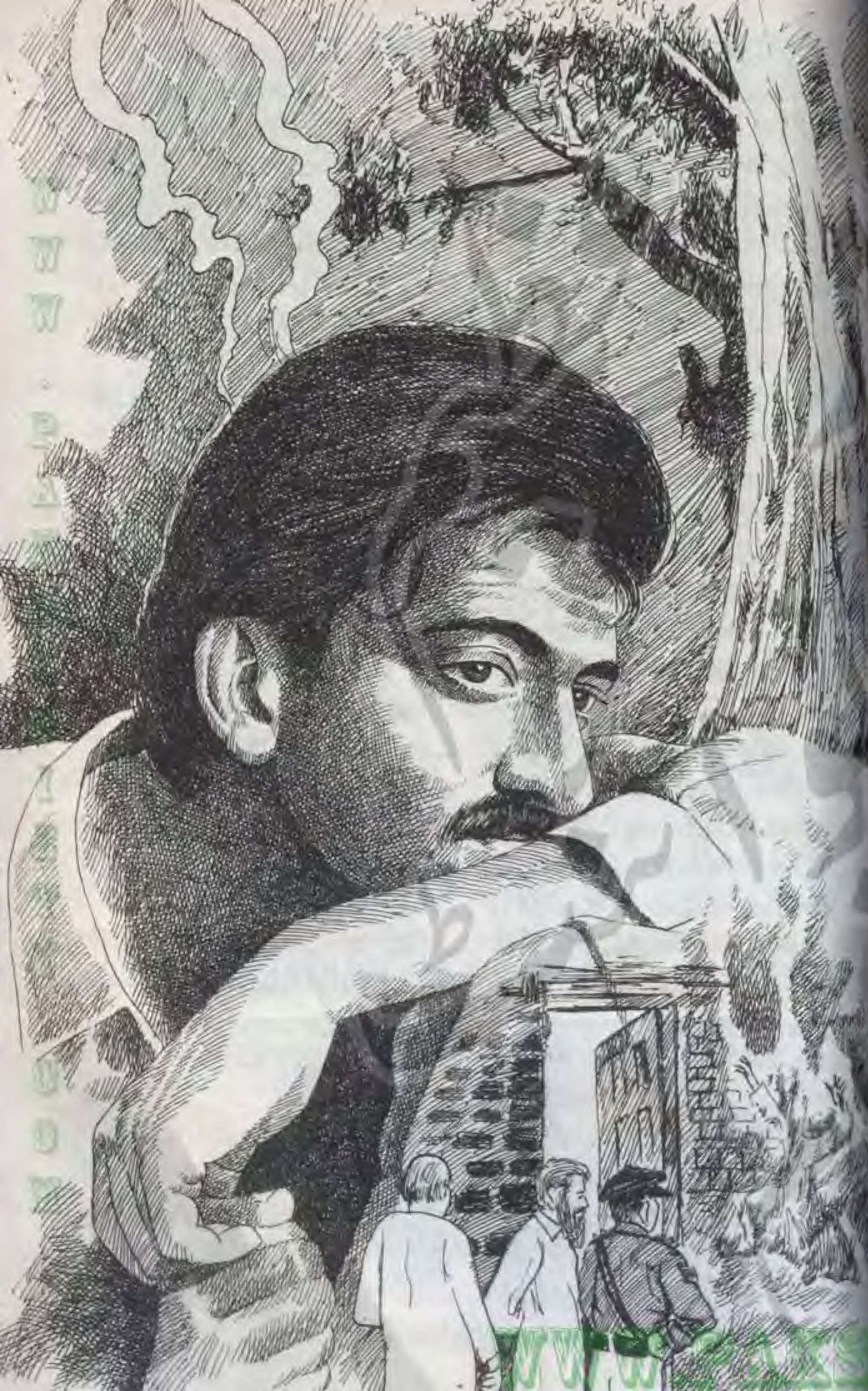
گیا، میں نے اسے اپنا واہمہ سمجھا اور آیۃ الکرسی پڑھ کر خود پر پھونک ماری اور پھر سے سوگیا۔

اگلے دن ہم اپنے دوست شاعر پرویز ساجد سے اجازت لے کر نکل پڑے۔ ہماری اگلی منزل مانسہرہ تھا جو ایبٹ آباد سے تقریباً 16 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہمیں اپنے دوست جان عالم کے پاس ٹھہرنا تھا جو ایک اسکول ٹیچر تھے۔ ان کی رہائش کشمیر روڈ پر تھی اور وہیں سے وہ ایک سہ ماہی ادبی پرچہ نکالتے تھے۔

جب ہم جان عالم کے پاس پہنچے تو انہوں نے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کشمیر روڈ پر ہی واقع ایک ہوٹل جس کا نام بھی شہر کے نام پر تھا یعنی مانسرہ ہوٹل میں کیا۔

ہم لوگ دن بھر مانسہرہ کی سیاحت کرتے رہے اور ساتھ ہی جان عالم کی ادبی معلومات سے بھی شغف ہوتا رہا، رات کو کھانا کھا لینے کے بعد دس بجے کے قریب ہم لوگ اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچے، ہمارے کمرے کے ساتھ بالکنی بھی تھی جس سے باہر کشمیر روڈ کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

دن بھر کی سیاحت کے باعث سبھی تھکے ہوئے تھے اس لیے تھوڑی دیر گپیں ہانکنے کے بعد سبھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ کمرے کی لائٹس گل تھیں البتہ کشمیر روڈ پر جلنے والی لائٹوں کی مدھم سی روشنیاں کھڑکی کے شیشوں سے کمرے کے اندر پہنچ رہی تھیں۔ جس سے کمرے کا ماحول خواب ناک سا بن گیا تھا۔ کمرے کے خواب ناک ماحول میں کوئی خواب دیکھتے دیکھتے آدھی رات کے قریب اچانک میری آنکھ کھلی، میں نے دیکھا کوئی وجود بالکنی میں کھڑا ہماری کھڑکی کے شیشوں سے کمرے کے اندر جھانک رہا ہے۔ پھر اچانک ہی وہ غائب ہوگیا۔

ایک بار پھر میں نے اسے اپنا واہمہ ہی تصور کیا مگر میں دیر تک خیالوں میں گم رہا پھر میں نے آیۃ الکرسی پڑھ کر کمرے میں پھونک ماری اور سوگیا۔

☆......☆......☆

آج تیسرا دن تھا اور تیسری بار یہ واہمہ میرے ساتھ گزر چکا تھا مگر اب میں نے یہ یقین کر لیا تھا کہ اس میں کچھ حقیقت ضرور ہے، میں نے اس بات کا ذکر اپنے دوستوں سے نہیں کیا ورنہ وہ یقیناً مجھے فاتر العقل ہی گردانتے اس لیے میں نے چپ رہنا ہی بہتر سمجھا۔

ایبٹ آباد کے بعد سے ناران تک کا سارا راستہ تقریباً ایک سا ہی ہوتا چلا جاتا ہے۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑ تو دوسری طرف گہری کھائیاں ہیں۔ کبھی دونوں طرف پہاڑ تو کبھی دونوں طرف کھائیاں.....

ایبٹ آباد اور مانسہرہ کے راستے میں آنے والے پہاڑ زیادہ بلند نہیں اور کھائیاں زیادہ گہری نہیں البتہ بالاکوٹ سے آگے پہاڑ اور کھائیاں دونوں ہی انتہاؤں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ بالاکوٹ سے پہلے ہی مانسہرہ سے آتے ہوئے دریائے کنہار سڑک کے ساتھ مل جاتا ہے۔ پھر یہ تمام سفر ناران تک سڑک کے ساتھ ساتھ ہی چلتا ہے۔ کبھی تو یہ دریا ہزاروں فٹ گہرے نشیب میں چلا جاتا ہے اور کبھی سڑک کے بالکل متوازی آ جاتا ہے۔

سفر کے دوران صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایک طرف تو سڑک کے پہاڑ اور دوسری طرف نشیب میں بہتا ہوا دریائے کنہار، اس سے آگے یا تو تھوڑی بہت لوگوں کی آبادی ہوتی ہے یا پھر آبادی کی جگہ کو بھی حذف کرتے دیو قامت پہاڑ..... جن کی چوٹیوں کے سروں تک لوگوں نے اپنے آشیانے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ (آٹھ اکتوبر 2005ء سے پہلے صورت حال اور تھی اب جو آشیانے نظر آتے ہیں وہ زیادہ تر زلزلہ پروف ہیں ان میں ہلکی جستی چادریں اور لکڑی استعمال ہوتی ہے۔)

اب ہماری منزل کھوائی کا علاقہ تھا۔ یہ بالاکوٹ سے 22 کلو میٹر کی دوری پر ہے سطح سمندر سے اس کی بلندی 4828 فٹ ہے۔

کھوائی تک کے سفر میں مزید کوئی انوکھا واقعہ پیش نہ آیا۔ یہاں رک کر ہم لوگ کچھ دیر ستائے، کچھ تصویریں بنائیں اور ایک بار پھر رخت سفر کے لئے تیار ہو گئے، کھوائی کے علاقے میں کاغان ویلی کے راستے سے ہٹ کر ایک الگ سڑک اوپر کی طرف جاتی ہے۔ یہ

سڑک اوپر شوگراں اور پھر مزید اوپر سری اور پائے کے علاقے تک جاتی ہے۔ شوگراں کی سطح سمندر سے بلندی 7800 فٹ ہے جب کہ سری کی بلندی 8500 اور پائے کی 9000 فٹ ہے۔

اب ہمیں شوگراں جانا تھا۔ کھوائی سے اس کا فاصلہ 8 کلو میٹر ہے۔ اس کی عمودی چڑھائی نہایت خطرناک ہے۔ پکی سڑک بعض جگہوں پر ٹوٹی پھوٹی تھی۔ سڑک کے ایک طرف پہاڑ اور لمبے، لمبے دیودار اور چیڑ کے سبز گھنے اور سایہ دار درخت ہیں جب کہ دوسری طرف عمیق گہرائی اور گہرے گہرے کھڈ ہیں۔ تمام راستے ہمیں گاڑی کو پہلے گیئر میں لے جانا پڑا۔ (اس طرح واپسی پر بھی پہلے گیئر میں ہی اترنا، بہتر ہوتا ہے ورنہ کوئی بھی خطرناک حادثہ پیش آ سکتا ہے۔)

اللہ اللہ کر کے ہم شوگراں کے حسین اور پرفضا مقام پر پہنچ گئے۔ شوگراں میں جھونپڑی نما ریسٹورنٹ اور ریسٹ ہاؤس یہاں کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ پائن پارک ہوٹل اینڈ ریسٹورنٹ بھی نہایت خوبصورت ہیں۔

ہم لوگ پارک کے گرین لان پر لیٹ گئے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئے اس کے تھوڑی دیر بعد تصویریں بنانے کا عمل آیا۔ جب ہم واپس چلنے لگے تو پہلے تو اچانک بادل آئے پھر تیز بارش ہونے لگی۔ جو خاصی دیر تک ہوتی رہی۔ بارش کے اختتام پر موسم صاف اور معتدل ہوگیا۔ دھنک اپنے سات دلفریب رنگوں میں نمودار ہوگئی تھی۔

شوگراں دیکھنے کے بعد ہمارا ارادہ اوپر سری اور پائے تک جانے کا تھا۔ شوگراں سے آگے سڑک کچی ہے۔ بارش کے باعث اس پر پھسلن بھی ہوگئی تھی، ہم نے کوئی رسک لیے بغیر واپسی کا قصد کیا۔

اب ہمیں کہیں اور رکے بغیر سیدھے ناران ہی پہنچنا تھا۔ کھوائی سے کاغان کا فاصلہ 40 کلو میٹر ہے جب کہ اس کے آگے ناران کا راستہ 22 کلو میٹر ہے۔ ہم سہ پہر کے وقت ناران پہنچ گئے ہم نے فرنٹیئر ہوٹل میں بالکونی والا ایک کمرہ بک کیا جس میں دو بیڈ تھے۔ ایک بیڈ دو افراد کے لئے جب کہ دوسرا تین افراد کے لئے تھا۔ ہم نے کھانا اسی ہوٹل سے کھایا، کھانے کے بعد کچھ دیر ستاتے رہے، اس کے بعد ناران کی سیاحت کے لئے نکل پڑے، ناران اپنی سرنگوں اور غاروں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ ہم نے وہ غار بھی دیکھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال نے دیو سے بچنے کے لیے اس میں پناہ لی تھی۔

ہم نے یہاں پر بھی کچھ تصویریں اتاریں اور شام کے قریب واپس آ گئے۔

باقی وقت ہم نے تاش کھیلتے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے گزارا، کیبل کے چند چینل ہی تھے جو یہاں بامشکل آ رہے تھے اور موبائل کمپنیوں میں صرف ایک ہی کمپنی کی سم کے سگنل آ رہے تھے۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سونے کے لئے لیٹ گئے۔

☆......☆......☆

اگلی صبح چمکیلی اور خوش گوار تھی۔ کھڑکی سے باہر پہاڑوں کا منظر نہایت دل کش نظر آ رہا تھا۔

سبھی دوست ابھی تک سو رہے تھے، میں نے باری باری سب کو اٹھا دیا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد ہم لوگوں نے ناشتہ بنوا لیا۔ آج ہمارا ارادا سیف الملوک جھیل کی سیاحت کا تھا، ناشتے کے بعد ہم لوگ نکل کھڑے ہوئے۔

ضروریات کا سامان رکھنے کے لئے ہر کسی کے پاس اپنا اپنا بیگ تھا البتہ میرے پاس جو بیگ تھا اس میں سب کی ضروریات کی مشترکہ چیزیں تھیں۔ میں نے اپنے کپڑے وغیرہ فیاض کے بیگ میں رکھے ہوئے تھے۔ وہ واحد اسٹیل کیمرہ جس سے ہم لوگ تصویریں بنا رہے تھے وہ بھی میرے ہی بیگ میں رکھا تھا۔ ہوٹل سے نکلتے وقت باقی سب لوگوں نے تو اپنے بیگ وہیں ہوٹل

میں چھوڑ دیے جب کہ ضروریات کی وجہ سے مجھے اپنا بیگ اٹھانا پڑا۔

باہمی مشاورت کے بعد ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کار کو ہوٹل پر ہی چھوڑ دیں اور کرایہ پر جیپ حاصل کر کے جھیل تک جائیں۔ وجہ یہ تھی کہ جھیل کا راستہ کچا اور نہایت خطرناک ہے۔ ایک طرف پہاڑ تو دوسری طرف نہایت گہری کھائیاں ہیں، اس کے علاوہ راستے میں 2 گلیشیئر بھی ہیں۔ اس کے لیے ڈرائیونگ کے لئے بے پناہ مہارت کی ضرورت تھی جو شاید ہم میں نہیں تھی۔

ہم نے جیپ والے سے کرایہ طے کیا اور جیپ میں سوار ہو گئے۔ نوید، فیاض اور الیاس جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھ گئے جب کہ میں اور عرفان ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ عرفان سیٹ پر ڈرائیور کی طرف تھا یعنی درمیان میں، میں کھڑکی کی طرف تھا۔

نہایت دلدوز اور دلکش مناظر سے دوچار کراتی ہوئی جیپ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی ٹیڑھے میڑھے راستے پر اوپر ہی اوپر کی طرف بڑھنے لگی، بعض جگہوں پر ایسی صورت حال سامنے آتی کہ میرے اوسان خطا ہو جاتے اور مجھے پوری طرح یقین آ جاتا کہ خوبصورتی ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم لوگ جھیل سیف الملوک پر تھے، جھیل پر پہنچ کر پتا نہیں کیوں اچانک مجھے اس غیر مرئی وجود کا خیال آیا جسے میں دو تین بار دیکھ چکا تھا، میں نے خیال کو فوراً ہی ذہن سے جھٹک دیا کیونکہ میں ماحول سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔

جھیل پر محکمہ جنگلات والوں کا ایک کاٹیج ہے۔ اس کے علاوہ چند ہوٹل ہیں مہنگی قیمت پر ارزاں چیزیں بیچتے ہیں۔ جھیل پر جوس، کولڈ ڈرنک، اور مختلف اسنیک وغیرہ مل جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جھیل پر شہزادہ سیف الملوک اور پری بدیع الجمال کی کہانی سنانے والے داستان گو بھی مل جاتے ہیں جو جھوٹ سچ اور گھسی پٹی کہانی کو یوں سنانے کی کوشش کرتے ہیں جیسے یہ سب ان کی آنکھوں دیکھا حال ہو۔

فیاض اور میں جھیل کے کنارے بیٹھ گئے جب کہ نوید، الیاس اور عرفان کشتی میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرنے لگے۔

جب ان کی کشتی پانی کے دوش پر چلتی تھوڑی دور گئی تو اچانک میری آنکھوں کے سامنے جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہی غیر مرئی شے ہوا میں ان کے سروں پر اڑتی ہوئی نظر آئی میرا دماغ گھوم گیا، یہ شے یہاں بھی پہنچ گئی۔ فیاض نے چونک کر میری طرف دیکھا کہ مجھے کیا ہوا ہے۔ میں سخت غصے میں تھا۔ وہ شے ہوا میں تھوڑی دیر تک نظر آئی۔ پھر میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

میں چیخنا چلانا چاہتا تھا اس شے کو پکارنا چاہتا تھا کہ میرے سامنے آؤ آخر میں تمہیں دیکھوں تو تم ہو کیا...... اور کیا چاہتے ہو؟ مگر میں نے بہت مشکل سے خود پر قابو پایا کہ آیا کہیں لوگ مجھے پاگل ہی نہ سمجھنے لگیں۔

جیپ کا ڈرائیور بھی ہمارے قریب آ گیا تھا۔ اس کو دیکھ کر میں مزید سنبھل گیا۔ فیاض نے میری طرف چونک کر دیکھا مگر اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ فیاض کی دوسری طرف ڈرائیور بیٹھ گیا۔ فیاض اس سے علاقہ کے بارے میں معلومات لینے لگا۔

ڈرائیور جس کا نام شفیق تھا ہمیں بتانے لگا کہ صوبہ سرحد نے 2003ء سے سیف الملوک اور اس سے ملحقہ علاقے کو وائلڈ لائف نیشنل پارک قرار دیا ہے۔ سیف الملوک پارک کا رقبہ 12026 ایکڑ ہے۔ سیف الملوک جھیل کے ساتھ ملحقہ پہاڑ جس کا نام ملکہ پربت ہے اس کی بلندی 17390 فٹ ہے اور اسے آج تک کوئی سر نہیں کر سکا۔ ملکہ پربت کی ساتھ والی پہاڑی کے دوسری طرف لالہ زار کا علاقہ ہے۔

ڈرائیور کی معلومات افزا باتوں میں محو ہو کر میں اس غیر مرئی شے کو تقریباً بالکل ہی بھول چکا تھا، مجھے اس کی دوبارہ یاد تب آئی جب نوید، الیاس اور عرفان کشتی کی سیر کے بعد واپس آئے اور عرفان نے مجھ سے کیمرے کے بارے میں دریافت کیا۔

میں نے اسے بتایا کہ کیمرا بیگ میں رکھا ہے۔ وہ بیگ تک گیا اور اسے کھول کر چیک کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد اس نے آواز لگائی کہ کیمرا بیگ میں موجود نہیں ہے۔

میں حیران ہوا۔ کل شام جب ہم لوگ ناران کے غاروں اور سرنگوں سے ہو کر واپس آئے تھے تو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیمرا بیگ کے اندر رکھا تھا۔ بعد میں میرے سامنے اس بیگ کو کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔

سارے باری باری کیمرے کی بابت ایک دوسرے سے استفسار کرنے لگے۔ طویل بحث کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ بیگ کو کسی نے بھی نہیں چھیڑا تھا اور ہوٹل کے کمرے میں ہمارے علاوہ کوئی اور موجود نہیں تھا یعنی کیمرا بیگ ہی میں تھا اور بیگ کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ مجھے شرمندگی ہونے لگی کہ کیمرا آخر گیا کہاں......؟

عرفان مجھ سے بحث کرنے لگا کیونکہ کیمرا اس کا تھا۔

پھر اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا مجھے یاد آیا کہ میں نے اس غیر مرئی شے کو اپنے بیگ کے اوپر جھکتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو کیا وہ غیر مرئی شے میرے بیگ سے کیمرا نکال کر لے گئی تھی؟ میں یہ بات اگر اپنے دوستوں سے کہتا بھی تو وہ میری بات کا یقین نہ کرتے۔ اس لیے میں خاموش رہا، عرفان کے مجھ سے پہلے کچھ اختلافات تھے اب اسے کھل کر میرے خلاف بولنے کا موقع مل رہا تھا۔

عرفان مجھ سے الجھ رہا تھا کہ تبھی مجھے ہوا میں کچھ اڑتا ہوا نظر آیا، وہ وہی غیر مرئی شے تھی جسے صرف میں دیکھ سکتا تھا، اس کی اصل ہیبت کیا تھی یہ تو مجھے پتا نہیں چلتا تھا البتہ وہ مجھے ایک کالے ہیولے کی صورت میں نظر آتا تھا۔

وہ ہیولا ملکہ پربت کی طرف جھیل کے کنارے کنارے اڑتا ہوا جا رہا تھا۔ میں اپنے دوستوں کی تفریح غارت نہیں کرنا چاہتا تھا مجھے اندازہ تھا کہ کیمرے کے بغیر ہم اپنے قیمتی لمحات کو قید نہیں کر سکتے اور کیمرا یقیناً اس غیر مرئی شے کے پاس تھا اور میں ہر حال میں کیمرے کو واپس لانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں نے بلا ارادہ اس غیر مرئی شے کے پیچھے دوڑ لگانی شروع کر دی۔ میں جھیل سیف الملوک کے کنارے کے ساتھ ساتھ ملکہ پربت کی طرف دوڑ رہا تھا جدھر وہ شے جا رہی تھی۔

میرے دوستوں نے میرے پیچھے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میں ان کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت کیسی ہوگی۔ وہ میرے اچانک دوڑنے سے یک لخت پریشان ہو گئے ہوں گے، ان کے خیال میں یا تو میرا دماغ چل گیا تھا یا پھر میں نے عرفان کی باتوں کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا تھا۔ ان میں سے شاید کسی نے عرفان کو سرزنش بھی کی ہو مگر مجھے نہیں پتا...... مجھے اپنے تعاقب میں ان کی مسلسل روکنے کی آوازیں آ رہی تھیں پھر شاید انہوں نے بھی میرے پیچھے دوڑنا شروع کر دیا۔

جھیل سیف الملوک پر ایسے افراد با آسانی مل جاتے ہیں جو اجرتاً سیاحوں کو اپنے ٹٹو پر بیٹھا کر آنسو جھیل تک لے جاتے ہیں۔ آنسو جھیل کی طرف جانے کا راستہ جھیل سیف الملوک کی دوسری طرف جا کر نکلتا ہے۔ وہ غیر مرئی شے جھیل کی دوسری طرف جا رہی تھی اس لیے میں نے یہ اندازہ کر لیا کہ وہ یقیناً جھیل آنسو کی طرف جا رہی تھی۔ حالانکہ آنسو جھیل کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات نہیں تھی کہ اس کا راستہ کہاں سے نکلتا ہے اور کتنی مسافت کا ہے۔

میں تھک گیا تھا اور میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی مگر میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ آج میں اس شے کو نہیں چھوڑوں گا کیونکہ وہ ابھی تک میری نظروں سے اوجھل نہیں ہوئی تھی اور اس کی وجہ سے دوسروں میں میری سبکی بھی ہوئی تھی اس لیے میں اپنے ارادے میں پکا تھا۔ حالانکہ وہ سراسر غلط تھا۔ آج میں اس لمحے کے بارے میں سوچتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ میں نے کتنی بڑی غلطی کی تھی اور ایک کتنی بڑی افتاد کو دعوت دے ڈالی تھی۔

میرے دوست میرے پیچھے تھے، میں تھک گیا

تھا مگر شاید وہ نہیں تھکے تھے اور حق دوستی ادا کر رہے تھے اس لیے میرے اور ان کے درمیان فاصلہ لحہ بہ لحہ کم سے کم تر ہوتا جارہا تھا۔

جھیل سیف الملوک کے طلسماتی پانی کو پیچھے چھوڑ کر میں ایک انجانے راستے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میری رفتار قدرے کم ہو چکی تھی مگر میں رک نہیں رہا تھا۔ راستے میں آنے والے چھوٹے بڑے پتھر جو بری طرح مزاحم تھے وہ بھی میرے ارادے کو متزلزل نہیں کر پارہے تھے، شاید مجھ پر کوئی جنون سوار تھا اور اسی جنون کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ اس ہیولے نے مجھے ذہنی عارضے میں مبتلا رکھا ہوا تھا، اوپر سے میرے دوستوں میں میری سبکی بھی کروادی تھی۔ شاید اس چیز نے مجھے جنون میں مبتلا کر دیا تھا۔

میرے دوڑنے کی رفتار اب چلنے سے مشابہہ تھی اور میری سانس اکھڑ کر میرے قابو سے بالکل باہر ہو چکی تھی۔ غیر مرئی شے بھی کوئی زیادہ تیزی سے نہیں اڑ رہی تھی شاید اس نے بھی خود ہی مجھے اپنے پیچھے لگا رکھا تھا ورنہ اس کے لئے میری آنکھ سے اوجھل ہونا کوئی زیادہ بڑی بات نہیں تھی۔ میرے دوست اب میرے خاصے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں ایک گھاٹی اتر رہا تھا کہ میں اچانک پھسلا اور دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میری کہنی اور گھٹنے چھل گئے۔ میں تکلیف سے کراہ اٹھا۔ اب مجھے یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ میں آنسو جھیل کی طرف جانے والے راستے پر نہیں ہوں بلکہ میں کسی اور ہی راستے کی طرف نکل آیا تھا۔

میرے دوست گھاٹی کے سرے پر پہنچ گئے تھے اور میں ان سے 40یا50 میٹر کی دوری پر گھاٹی سے نیچے پڑا تھا۔ اپنی چوٹوں کا خیال کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے میرے ذہن میں آیا کہ بہت ہو چکا اب یہ تماشہ...... مجھے اپنے دوستوں سے مزید تھوڑی سی سبکی برداشت کر کے واپس لوٹ جانا چاہیے۔ اسی لمحے مجھے وہ ہیولا ایک موڑ سے اوجھل ہوتا ہوا نظر آیا۔ ایک بار پھر میرے دماغ میں اس جنون نے سر اٹھا لیا۔ ایک بار پھر سے میں بلا ارادہ اٹھ کر اس کے پیچھے بھاگنے لگا۔ اوپر سے نوید نے مجھے آواز دی مگر میں نے اس کی آواز پر کان نہ دھرے اور اسی موڑ سے مڑ گیا جہاں سے تھوڑی دیر پہلے غیر مرئی شے مڑی تھی۔

اب کی بار مجھے وہ غیر مرئی شی نظر نہ آئی۔ تھوڑی دور آگے مجھے ایک اور موڑ نظر آیا تو میں بھاگ کر اس موڑ سے مڑ گیا۔ آگے سرخ چٹانوں کے بیچوں بیچ ایک راستہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں اب کی بار میرا دل نہیں مانا کہ میں آگے بڑھوں پر پھر بھی شاید کچھ ایسا تھا جس نے مجھے آگے بڑھنے پر مجبور کر دیا۔ میں آگے بڑھ رہا تھا۔ راستے میں کئی موڑ آئے اور ایک جگہ سے کئی کئی راستے نکل رہے تھے میں ایک دو موڑ مڑ بھی گیا تب مجھے صحیح طور پر اندازہ ہوا کہ میں بے سمت ہو چکا ہوں اور یرے راستے کا کوئی تعین نہیں۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اوپر سے میرے دوستوں نے مجھے آلیا۔ وہ سب مجھے ہونقوں کی طرح دیکھ رہے تھے۔ ان کی سانسیں بھی اکھڑی ہوئی تھیں ان کے بدن تھکاوٹ سے چور تھے اور چاہنے کے باوجود ان کے لبوں پر میرے لیے کوئی بات نہیں تھی۔ شاید تھکاوٹ یا حیرت کے باعث وہ کوئی بات کر نہیں پارہے تھے۔

ہم سبھی ادھر، اُدھر بیٹھ گئے۔ جب سب کے حواس بحال ہوئے تو باز پرس کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں نے شروع سے آخر تک ساری باتیں ان کو بتا دیں اور ساتھ میں یہ بھی بتا دیا کہ عرفان کا کیمرا ابھی اسی غیر مرئی شے کے پاس ہے۔

میری باتوں کا کسی کو یقین تو نہیں آرہا تھا مگر میرے پیچھے انہوں نے جتنی بھی دوڑ لگائی تھی اس کے پیش نظر انہیں میری باتیں کسی حد تک سچ نظر آرہی تھیں۔ سب نے مجھے تھوڑا بہت ڈانٹا بھی۔ میری غلطی تھی اس لیے میں برداشت کر رہا تھا آخر تھوڑی دیر کے بعد واپس جانے کا فیصلہ ہوا اور ہم سب اٹھ کر واپسی کے راستے پر ہو لیے۔

اس وقت ہماری حیرت اور پریشانی کی انتہا نہ

رہی جب ہمیں اس بات کا پتا لگا کہ ہم لوگ راستہ بھٹک چکے ہیں۔ جس راستے سے ہم آئے تھے اس پر واپس جانے کی بجائے ہم کہیں کے کہیں نکل رہے تھے۔ کوئی راستہ مڑنے کے بعد اچانک کوئی چٹان ہمارا راستہ روکے کھڑی ہوتی یا کوئی ہزاروں فٹ گہری کھائی منہ کھولے ہمارے استقبال کے لیے موجود ہوتی۔

حیرت اور پریشانی کے علاوہ میرا اب شرمندگی سے بھی برا حال تھا کیونکہ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہو رہا تھا اگر میں اس غیر مرئی شے کے پیچھے بھاگنے کی بے وقوفی نہ کرتا تو اس وقت ہم لوگ اس حال میں نہ ہوتے۔

ہم لوگ پہاڑوں پر جس جگہ پہنچ چکے تھے وہاں کوئی انسان بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ چرند، پرند تھے! مگر وہ ہمیں واپسی کا راستہ نہیں بتا سکتے تھے۔ سو اس لیے ہمیں اپنی مدد آپ کرنا تھی۔

ہمارے ہر طرف ویرانہ ہی ویرانہ تھا سوائے اونچے، اونچے پہاڑوں کے ہمیں اور کچھ نظر نہ آرہا تھا اوپر سے خورشید عالم تاب کی تیز دھوپ ہماری کھوپڑیوں کو سہلا رہی تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ اگر راستہ نہ ملے تو کم از کم ہمیں کوئی مقامی بستی ہی مل جائے جس سے ہم راستے کی بابت پوچھ سکیں۔

دوپہر، سہ پہر میں ڈھلنے لگی تھی۔ پہاڑ اپنے دراز سایوں کے پر پھیلانے لگے تھے۔ پہاڑوں کے انہیں سایوں کی وجہ سے ان علاقوں میں شام بھی جلدی اتر آتی ہے اس لیے ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا تھا ورنہ ہم رات کو اندھیروں میں یہاں بھٹک سکتے تھے۔

واپسی کے راستے کے لئے ہماری تلاش مسلسل جاری تھی۔ پہاڑوں کے سائے اب ہمیں اپنے دامن میں لینے لگے تھے۔ کچھ دیر پہلے سورج کی جو دھوپ ہمیں چبھن کا احساس دلا رہی تھی۔ اب ہم اس دھوپ کے بھی متلاشی تھے۔ پہاڑوں کے سائے جیسے ہی ہمیں اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے ویسے ہی ہمارے بدن میں مقامی ہوا سے یخ بستہ سی پھریریاں اٹھنے لگی تھیں۔ یہ چیز ہماری پریشانی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ صبح فرنٹیر ہوٹل سے نکلتے وقت ہم لوگ اپنے ساتھ کوئی مناسب گرم کپڑے بھی نہیں لائے تھے کیونکہ جھیل پر ہمارا شب باشی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

واپسی کے راستے کی ہماری کوشش مسلسل جاری تھی۔ سردی سے اب ہم لوگوں کے جسم کانپنے لگے تھے، تھکاوٹ اور پریشانی کے علاوہ اب ہم لوگوں کو بھوک بھی لگ رہی تھی جس سے سب کے مزاج چڑچڑے ہو رہے تھے۔ جو بھی بولتا وہ مجھ پر ہی غصہ نکالتا، کیونکہ یہ ساری غلطی میری تھی، اور میری ہی وجہ سے میرے دوستوں کو بھی اس ناگہانی افتاد کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

کیونکہ یہ افتاد اب ہم پر پوری طرح پڑ چکی تھی اس لیے سب اسے خاموشی سے برداشت بھی کرنے لگے تھے۔ ابھی تک ہم نے سب کچھ کیا تھا سوائے خدا کو یاد کرنے کے...... خدا کو سب یاد کرنے لگے تھے کہ اب وہی کوئی سبیل نکال دے۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ سہ پہر بھی دبے قدموں شام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں تیر رہی تھیں۔

نوید نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا اور گویا ہوا۔

”کشتی والے نے ہمیں بتایا تھا کہ اب کے بار جو بادل بارش لائیں گے وہ بارش نہیں ہوگی بلکہ برف باری ہوگی اور یہ برف باری کبھی بھی ہو سکتی ہے۔“

نوید کی اس بات نے ہمیں مزید پریشان کر دیا۔ گویا برف باری کبھی بھی ہو سکتی تھی۔

ہم لوگ حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے نیچے کی طرف اترنے کی کوشش کر رہے تھے اگر ہم لوگ کہیں سے بھی سڑک پر اتر جاتے یا کسی وادی میں پہنچ جاتے تو آگے ہوٹل تک پہنچنا ہمارے لیے کوئی زیادہ بڑا مسئلہ نہ رہتا۔ مگر ہماری یہ کوشش زیادہ بارآور ثابت نہیں ہو پارہی تھی۔

اب تقریباً شام کا اندھیرا، پھیل چکا تھا۔ پریشانی، تھکن اور بھوک سے ہم سب کا برا حال تھا ہم لوگ ایک دوسرے کا لٹکا ہوا چہرہ دیکھ رہے تھے اور ایک

دوسرے کی ڈھارس بھی بندھا رہے تھے۔ اچانک بادلوں نے آپس میں ملنا شروع کردیا۔ جو بادل تھوڑی دیر پہلے ٹکڑیوں کی صورت میں تیرتے ہوئے تیزی سے گزر رہے تھے وہ اب آپس میں بغل گیر ہونے لگے تھے۔ ہم نے راستے کی تلاش میں مزید تیزی دکھانا شروع کردی مگر ابھی بامشکل بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ بادلوں کے باعث ہر طرف اندھیرا چھا گیا اور پھر وہ وقت بھی آگیا جب بادل برف کی صورت میں برسنے لگے۔

اب ہماری حالت نہایت دگرگوں تھی۔ ہمارے پاس نہ تو گرم کپڑے تھے اور نہ ہی برف سے بچاؤ کے لیے...... کوئی سائبان اور نہ ہی کوئی تدبیر......

ہمارے پاس واحد وہ بیگ تھا جسے میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب ہمیں سارے کام چھوڑ کر صرف اور صرف کسی سائبان کی تلاش تھی تاکہ برف سے بچا جا سکے۔

اس معاملے میں ہماری کوشش صرف اسی حد تک کامیاب رہی کہ ہمیں ایک اونچے پہاڑ کے نیچے بنا ایک چھجا سا میسر آگیا۔ جس کی پناہ میں ہم برف باری سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

پہاڑ کا چھجا 30 فٹ قطر کا رہا ہوگا۔ برف باری شروع ہوئی تو ہوا تھم گئی ہم ایک دوسرے کے ساتھ جڑ گئے۔ اپنی آگے کی پریشانی کو فی الحال بھول کر برف باری کا نظارہ کرنے لگے۔

برف باری مسلسل ہوتی رہی۔ رفتہ، رفتہ بالکل اندھیرا چھا گیا۔ میں اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ ان کے قیاس میں شاید بالکل بھی نہ ہوگا کہ ہم لوگ کیسی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ مجھے اپنا بیڈ روم بری طرح یاد آنے لگا جہاں میں آرام کرتا تھا اور کہاں میں اس وقت برف باری سے چھپنے کے لئے ایک پہاڑ کے شیڈ کے نیچے دبا پڑا ہوں۔ پھر مجھے یہ بھی یاد آنے لگا کہ یہ افتاد میری اپنی وجہ سے آئی تھی، میں پچھتانے لگا کہ میں اس انجانی مخلوق کے پیچھے بھاگا ہی کیوں تھا...... میری وجہ سے میرے دوست بھی اس مصیبت میں پھنسے تھے۔ اب میرے خیالات کی ڈگر اس نہج پر چل رہی تھی کہ آخر وہ مخلوق مجھے نظر ہی کیوں آتی تھی اور وہ مجھ سی چاہتی کیا تھی......؟ اور پھر اس طرح مجھے اپنے پیچھے لگانے کا اس کا مقصد کیا تھا......؟

میں بہت کچھ سوچتا رہا مگر کچھ بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ برف باری چار گھنٹے تک جاری رہی۔ اس دوران ہر کوئی اپنی اپنی سوچوں میں غلطاں رہا۔

برف باری تھمی تو ماحول بالکل ساکت ہو کر رہ گیا۔ ہوا تو پہلے بھی تھمی ہوئی تھی مگر اب تو جیسے کسی بھی چیز کی ذرا سی جنبش بھی نہ تھی۔ اگر برف باری کے بعد ہوا چلے تو مطلوبہ علاقے میں سخت سردی ہوتی ہے اور اگر ہوا تھمی ہو تو برف باری کے بعد ماحول میں ہلکی سی گرمی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہاں بھی ہوا تھمی ہوئی تھی۔ اس لیے ہلکی سی گرمائش تھی۔ مجھے یہ فکر بھی تھی کہ اگر ہوا چلنے لگی تو ہمارا سردی سے کیا حال ہوگا۔ کیونکہ ہمارے پاس تو گرم کپڑے بھی نہیں تھے۔

ہمارے سامنے بھی برف کا ایک چھوٹا سا ڈھیر لگ چکا تھا۔ ہم لوگ اب غالباً ایک چھوٹے سے غار میں تھے جس کا منہ برف نے ڈھک دیا تھا مگر اس میں قباحت یہ تھی کہ برف سے اوپر کا حصہ کھلا تھا اور اگر جب ہوا چلتی تو اس اوپر کے خلا سے اندر آ سکتی تھی۔ اس صورت میں اس جگہ پر ہماری قلفی جمنا لازمی امر تھا۔

شاید ہم سب لوگ اپنے اپنے طور پر کسی کو کچھ بتائے بغیر خدا سے دعا کر رہے تھے کہ ہم اس افتاد سے نکل سکیں، اور شاید ہم لوگ اپنے اپنے گناہوں کو یاد کر کے خدا سے معافی کے بھی خواستگار ہو رہے تھے۔ کیونکہ میں اس وقت یہی عمل کر رہا تھا تو ظاہر ہے میرے دوست بھی میرے والی سچویشن میں تھے تو وہ بھی دعا کر رہے ہوں گے۔

دعائیں اور مناجات کرتے کرتے رات کا کافی حصہ بیت گیا، ہم لوگ ایک دوسرے کے اوپر لدے اونگھ رہے تھے، پھر شاید ماحول کی اور ایک دوسرے کی جسموں کی گرمی پا کر ہم لوگ پوری طرح سو گئے، رات کا تین

ساڑھے تین بجے کا عمل رہا ہوگا، رات کا وہ لمحہ ہمارے لیے بڑا ہی کربناک ثابت ہوا۔ اچانک تیز ہوا چلنے لگی جس سے ماحول میں شدید خنکی در آئی۔

پہلے تو ہم لوگوں کی نیند اچاٹ ہوئی پھر شدید سردی سے ہم لوگوں کے دانت بجنے لگے۔ ہم لوگ خاصی دیر تک برداشت کرتے رہے جب سردی ہماری ہڈیوں کے گودے میں اترنے لگی تو ہماری برداشت سے باہر ہو گئی، اور ہم ایک دوسرے سے بری طرح چمٹ گئے مگر یہ تدبیر بھی زیادہ کارگر ثابت نہ ہوئی مجھے پہلی بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ پہاڑوں کی سردی بڑی غضب کی ہوتی ہے۔

وقت کیسا بے رحم بھی ہو آخر گزر جاتا ہے وہ وقت بھی کیسے گزرتا رہا کچھ پتا نہیں لیکن صبح کاذب ہوئی پھر صبح صادق کے بعد دن کا اجالا پھیل گیا۔ سردی کے علاوہ بھوک سے بھی ہمارا برا حال تھا، ہمارے پیٹ اندر کو دھنس کر پسلیوں سے جڑنے لگے تھے۔ بہر حال ہم نے سامنے کی برف کو ہٹایا اور باہر نکل آئے۔ باہر ہمیں مزید سردی کا احساس ہوا۔ میری زندگی میں یہ شدید خواہش رہی تھی کہ میں برف باری کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں مگر اسی صورت میں دیکھوں گا یا دیکھنے کے بعد ایسی دگرگوں حالت ہوگی، اس کا مجھے کبھی بھی ادراک نہ رہا تھا۔

کل ہی کی طرح آج بھی ہماری پہلی کوشس یہی تھی کہ سب سے پہلے راستہ تلاش کیا جائے۔ سو ہم اس کوشش میں آگے بڑھنے لگے۔ برف نرم تھی۔ ہمارے پیر اس کے اندر دھنسے جا رہے تھے۔ ہمیں نہ تو برف کے اوپر چلنے کا کوئی تجربہ تھا اور نہ ہمارے پاس ایسے جوتے تھے جو اس معاملے میں ہمارے معاون و مددگار، ثابت ہوتے۔

میں دیکھ رہا تھا کہ میرے دوستوں کے چہروں پر شدید کرب کے آثار تھے۔ وہ بدستِ مجبوری آگے بڑھ رہے تھے۔ فیاض، اپنی باتوں سے مجھے کوسنے لگا، نوید، نے اسے ڈانٹ کر چپ کروادیا۔

کسی نہ کسی طور پر ہم لوگ آگے بڑھتے رہے۔ جب تھک جاتے تو بیٹھ جاتے اور ذرا ستانے کے بعد پھر چلنے لگتے۔ نقاہت نے ہمارا برحال کر دیا تھا مگر آگے ہی آگے بڑھتے رہنے کے سوا ہمارے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔ تقریباً دن کے گیارہ بجے کے قریب ہم لوگ نڈھال ہو کر گر پڑے۔ اب شاید کسی میں بھی اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اٹھ سکے ہم لوگ پون گھنٹہ ایسے ہی پڑے رہے اور خود کو قضا کے لائق حق بجانب مقصود کرنے لگے، مگر شاید ہماری قضا کا وقت ابھی دور تھا۔ سب سے پہلے الیاس نے ہمت کی اور اٹھ بیٹھا وہ ٹہلنے کی حالت میں اِدھر، اُدھر پھرنے لگا پھر اچانک کسی چیز پر اس کی نظر پری اور وہ چونکا۔ اس نے جلدی سے ہم سب کو پاس بلایا۔ ہم لوگ وہیں پر رہے صرف نوید بادل نخواستہ اٹھ کر اس طرف چلا گیا۔ وہ بھی ادھر کچھ دیکھ کر چونکا پھر وہ بھی الیاس کے ساتھ مل کر ہمیں بلانے لگا۔ اب کی بار تجسس کے تحت ہمارا اُٹھ جانا لازمی امر تھا۔ ہم تینوں بھی اس طرف چلے گئے۔ وہ سفید روئی کے گالوں میں برف کے بوجھ سے ڈھکا کوئی مقامی کاٹیج تھا۔ جو ہمیں کچھ دوری پر نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ہماری ہمت ایک بار پھر سے بندھ گئی۔ حیات نو خیز ساعتیں ہمیں چند قدموں کی دوری پر نظر آنے لگیں۔ ہم سب نے مل کر "یاہو" کا نعرہ لگایا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد ہم لوگ اس بات پر غور کرنے لگے کے کاٹیج تک پہنچا کیسے جائے......؟ کیونکہ کاٹیج نشیب میں تھا اور وہاں تک جانے کا ہمیں کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا پھر بڑی جدوجہد کے بعد ہمیں ایک تنگ سا۔ یہ راستہ ایک پہاڑ کے ساتھ ساتھ پگ ڈنڈی نما انداز میں دوسری طرف جا رہا تھا۔ اس پر بھی برف پڑی تھی اور ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا کہ ہم اس پر چلتے ہوئے دوسری طرف پہنچیں۔ برف چونکہ ابھی نرم تھی اس لیے اس پر چلنا ابھی آسان تھا اگر یہ برف جمی ہوئی تو اس پر ہمارے پاؤں پھسلنے کا زیادہ احتمال ہوتا۔ تب شاید ہم لوگ اس پر سفر کرنے کا خطرہ مول بھی نہ لیتے۔

اب کی بار بھی سب سے پہلے کمر ہمت الیاس نے ہی باندھی۔ شاید وہ فطری طور پر بھی ہم سب سے

بہادر تھا۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا دوسری طرف جانے لگا۔ اس کے پیچھے نوید آگے بڑھا، نوید کے پیچھے عرفان اس کے پیچھے میں اور میرے پیچھے فیاض تھا۔

یہ چند قدم کا سفر نہایت دشوار تھا، ہمارے ایک طرف پہاڑ تو دوسری طرف گہری کھائی تھی ہم پہاڑ کی دراڑوں میں انگلیاں پھنسا کر اور باہر کو نکلی چھوٹی چھوٹی نکرو کو پکڑ کر آگے بڑھ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں کثرت سے اسم الٰہی کا بھی ورد کر رہا تھا کہ یہ مشکل ٹل جائے اور پھر میں نے دیکھا کہ الیاس صحیح سلامت دوسری طرف پہنچ گیا اس کے بعد باری باری ہم لوگ بھی دوسری طرف پہنچ گئے۔

سب نے بلند آواز میں خدا کا شکر ادا کیا اور کاٹیج کی طرف چل پڑے۔

ناران وغیرہ میں جب برف باری کا آغاز ہوتا ہے تو مقامی لوگ اپنے بال بچوں، عورتوں، مال مویشیوں، کتے، مرغیاں اور رہنے کا دیگر سامان و اسباب ساتھ لے کر بالاکوٹ اور مانسہرہ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جہاں یہ برف باری کا موسم گزارتے ہیں اور برف پگھلنے کے آغاز کے ساتھ ہی یہ لوگ واپس اپنے گھروں کو لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب پتا نہیں اس کاٹیج نما مکان میں مقامی لوگ رہ رہے تھے یا نقل مکانی کر چکے تھے۔

شاید ہماری قسمت ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ جب ہم لوگ کاٹیج کے سامنے پہنچے تو ہم نے اس کے دروازے کو مقفل پایا۔ مقامی لوگ یقیناً یہاں سے جا چکے تھے۔ ہم نے اچھی طرح جائزہ لینے اور مطمئن ہونے کے بعد تالہ توڑ دیا اور اندر چلے گئے۔ میں نے ایک ہی نظر میں سارے کاٹیج کا جائزہ لیا۔ اس کے سامنے کے رخ پر دو کمرے تھے باہر کے گیٹ کے ساتھ ہی ایک چھوٹی سی انیکسی تھی۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا کچن، بائیں طرف باتھ روم کے ساتھ چوبی سیڑھیاں تھیں جو گھوم کر اوپر گیلری پر جا رہی تھیں۔

کاٹیج میں داخل ہوتے ہی ہمارا سردی کا احساس کم ہو گیا تھا، اب ہمیں سب سے پہلے کھانے کی تھی۔ پتا نہیں یہاں کے مقیم خورد و نوش کا کچھ سامان وغیرہ یہاں چھوڑ کر گئے بھی یا نہیں...... خیر ہماری کوشش بار آور ثابت ہوئی کچن میں ہمیں آٹے سے بھرا ایک چھوٹا ڈرم پانچ کلو اور گھی سے بھرا آدھا ڈبہ۔ کچھ دالیں، اور دیگر مصالحہ جات وغیرہ مل گئے۔ اس کے بعد کھانا تیار کرنا ہمارے لیے زیادہ مسئلہ ثابت نہ ہوا۔ عرفان نے اوپر گیلری پر چڑھ کر اسٹاک شدہ ایندھن کی لکڑی اتار لی اور کمرے کے آتش دان کو دہکا دیا جس سے حرارت پیدا ہونے لگی۔ حرارت پاتے ہی ہمارے سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے جسم اپنی اصل حالت میں آنے لگے۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگوں پر نیند کا غلبہ چھانے لگا۔ تھوڑی تلاش کے بعد ہمیں ایک بڑے ٹرنک سے چند گرم کپڑے بھی مل گئے۔ ہم نے ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھا اور بے فکر ہو کر سو گئے۔

جب میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا چھا چکا تھا۔ آتش دان کی آگ بجھ چکی تھی اور اس میں راکھ کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے سلاخ سے راکھ باہر نکالی اور پاس پڑی چند لکڑیاں آتش دان میں ڈال دیں اس کے بعد میں نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا رات کے نو بج چکے تھے۔ میرے سبھی دوست ابھی تک بے فکر سو رہے تھے۔ میں نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا میرا ارادہ تھا کہ میں دوبارہ سو جاؤں مگر تبھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شیشے کی کھڑکی سے باہر کھلے آسمان تلے کوئی تارا ٹوٹ کر گرا ہو۔ عام حالات ہوتے تو شاید میں اس چیز کو بالکل نظر انداز کر دیتا مگر چونکہ ہم لوگ پہلے ہی مصیبت میں تھے اوپر سے میں ایک غیر مرئی مخلوق کو بار بار دیکھ چکا تھا اس لیے میرا چونکنا لازمی امر تھا۔

ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر فوراً کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دیوار کی آڑ میں ہو گیا۔ مجھے محض چند ساعتیں ہی انتظار کرنا پڑا پھر میں نے اس موذی کو دیکھ لیا جس کی وجہ سے ہم پر یہ مصیبت نازل ہوئی تھی۔ مگر اب کی بار وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اسی کی طرح کا ایک اور ہیولا بھی تھا۔ وہ دونوں چلتے ہوئے کھڑکی کی طرف آ رہے تھے۔

پہلے تو وہ کھڑکی کی طرف آئے پھر رخ بدل کر اس طرف جانے لگے جدھر مین دروازہ تھا میں فوراً اپنی جگہ سے سرکا اور بھاگ کر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر گیلری پر چڑھ گیا۔

گیلری پر باہر کی طرف ایک چھوٹا روشن دان تھا جس پر شیڈ پڑا تھا۔ یہ شیڈ اس مقصد کے تحت تھا کہ اگر روشنی کی ضرورت ہو تو شیڈ کو اٹھا دیا جائے اگر سردی سے محفوظ رہنا ہو تو شیڈ کو گرا دیا جائے۔ اس وقت بھی شیڈ گرا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے اوپر اٹھا دیا کہ آیا اس کے آہنی قبضے آواز پیدا نہ کریں۔

اب میں باہر جھانک سکتا تھا۔ وہ دونوں مین دوروازے کے پاس آ گئے تھے۔

وہ دونوں دروازے کے عین سامنے آ کر رک گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے اندازا لگایا کہ ان میں سے ایک آواز نسوانی تھی۔

''چوک! کیا تمہیں پکا یقین ہے کہ وہ لڑکا یہیں پر ہے؟'' نسوانی آواز نے پوچھا۔

''ہاں میں اس پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔'' چوک نے جواب دیا۔

نسوانی آواز نے پھر سے سوال کیا۔ ''تمہیں پہلی بار پتا کیسے چلا کہ وہ تمہیں دیکھ سکتا ہے؟'' چوک ہنسا۔

''ہاں...... یہ...... تو...... بہت آسان تھا۔ میں روزانہ ہزاروں لوگوں کے سامنے سے گزرتا ہوں پیکی! جو کوئی مجھے دیکھ کر چونکتا ہے میں جان جاتا ہوں کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے یہ تیسرا شخص ہے جس نے مجھے دیکھا ہے۔ پہلا شخص فیصل آباد کا تھا دوسرا نارووال کا یہ مجھے ایبٹ آباد میں ملا تھا۔''

''اب تم اس کے ساتھ کیا کرو گے؟'' نسوانی آواز نے پھر سے پوچھا جس کا نام غالباً پیکی تھا۔

''ابھی کچھ نہیں، صرف انتظار۔'' چوک نے جواب دیا۔ ''یہ لوگ چوہے دان میں پھنس چکے ہیں۔ چاروں طرف برف باری سے راستے بند ہو چکے ہیں یہ یہاں سے نہیں نکل سکتے۔''

چوک نے اتنا کہہ کر بات ختم کی۔ ''چلو اب چلیں یہاں سے......''

''مگر میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔'' پیکی نے اصرار کیا۔ میں حیران ہوا کہ یہ پیکی مجھے دیکھنا چاہتی تھی پتا نہیں کیوں؟ اور پتا نہیں یہ اصل معاملہ کیا تھا......؟

چوک نے اسے ڈانٹ دیا۔ ''نہیں تم اسے ابھی نہیں دیکھ سکتی۔ ابھی ہمیں چلنا ہے۔'' چوک نے مضبوط لہجے میں کہا۔

پیکی بے بس نظر آنے لگی، اس نے جھلاہٹ میں ہاتھ جھٹکے اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔

ان دونوں نے وہیں سے اچھال بھری اور ہوا میں اڑتے ہوئے اوپر کی طرف جانے لگے۔ ان کی باتیں سن کر مجھے چکر سے آنے لگے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں لہرا کر گرتا۔ میں فوراً نیچے بیٹھ گیا، خدا جانے یہ کیا معاملہ تھا اور ہم لوگ کس مصیبت میں پھنس گئے تھے، یہ سوال بھی بار بار میرے ذہن میں چبھ رہا تھا کہ چوک میرے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا......؟

میں خاصی دیر گیلری کے اوپر ہی بیٹھا رہا پھر لرزتے قدموں کے ساتھ احتیاط سے نیچے اتر آیا۔ میرے دل میں آ رہا تھا کہ میں اپنے دوستوں کو جگا کر سارا کچھ ان کے گوش گزار کر دوں مگر پھر میں نے انہیں تنگ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

میں بستر پر لیٹ گیا۔ اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں خاصی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا مگر سب بے سود رہا۔ رات کے باقی حصے میں مزید کوئی واقعہ پیش نہ آیا صرف نوید بستر سے اٹھا اور باتھ روم تک گیا۔ باقی رات معمول کی طرح گزر گئی۔

☆......☆......☆

اگلے دن ہم سب لوگ فریش تھے۔ ایک بار پھر سے کھانا بنانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ عرفان اور الیاس اس

کام میں ماہر تھے۔ وہ اس کام میں لگ گئے۔ میں دائیں طرف والے کمرے میں گیا وہاں مجھے ڈاؤلینس کا ایک ریفریجریٹر بھی نظر آیا، اس سے مجھے اندازہ ہوا کے کاٹیج کے مالک متمول لوگ تھے۔ جن کے پاس گرمیوں کے استعمال کے لیے ایسی چیزیں بھی موجود تھیں مجھے باہر پڑا جنریٹر بھی نظر آ گیا جس سے یہاں بجلی کے مسئلے کو کسی حد تک ختم کیا جاتا تھا۔

میں نے ریفریجریٹر کے خانوں کو کھول کر چیک کیا۔ فریزر میں کچھ بھی نہیں تھا البتہ ریفریجریٹر کے نچلے حصے کرسپر (سبزی رکھنے کا خانہ) میں کچھ سبزیاں موجود تھیں۔ میں نے وہ نکال کر عرفان کے حوالے کی تا کہ وہ انہیں بنا سکے۔

کھانا کھا چکنے کے بعد ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچا جائے۔ باہر تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی جس سے آنکھیں چندیا سکتی تھیں۔ ہمارے پاس سیاہ عینک تھیں ہم انہیں پہن کر باہر نکل آئے۔

اس کاٹیج کے علاوہ دور دور تک ہمیں کوئی اور کاٹیج یا گھر نظر نہ آیا۔ غالباً اس کاٹیج کو کسی شوقین مزاج نے الگ تھلگ جگہ پر بنایا تھا۔ دھوپ کی ہلکی چھبن اور سفید برف کا نظارہ بڑا ہی غضب خیز تھا۔ اگر ہم اسی افتاد میں مبتلا نہ ہوتے تو یقیناً اس ماحول سے بڑا لطف اٹھاتے مگر ہمیں تو جلد از جلد یہاں سے نکلنے کا راستہ تلاش کرنا تھا۔

تلاش بسیار کے بعد ہمیں ایک راستہ مل گیا مگر افسوس وہ برف سے بند ہو چکا تھا اگر ہم اس کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تو یقیناً نقصان اٹھاتے یا سیدھے موت کے منہ میں پہنچ جاتے۔

ہم نے اس راستے کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر ہمیں کوئی اور راستہ نہ مل سکا۔ لے دے کے ہمارے سامنے باہر نکلنے کا صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ بھی برف سے بند پڑا تھا۔ میں نے دوستوں کو کسی بھی طرح یہاں سے نکل چلنے کا مشورہ دیا کیونکہ میں رات کو چوک اور پیکی کی گفتگو سن چکا تھا اور میرے خیال میں مزید کوئی افتاد وقوع پذیر ہونے کو متوقع تھی۔ چوک کے بقول ہم لوگ چوہے دان میں پھنس چکے تھے۔

نوید اور فیاض نے میری بات مان لی جب کہ عرفان بحث کرنے لگا۔ اس کے خیال میں یہ سیدھا سیدھا خودکشی کرنے کے مترادف تھا الیاس نے بھی عرفان کا ساتھ دیا بعد میں فیاض ان کا ساتھ دینے لگا۔ اس نے کہا کہ ہم کوئی کوہ پیما نہیں کہ ایسی کوشش کریں۔

نوید اب بھی میرا ساتھ دے رہا تھا۔ فیاض کی بات کا جواب اس نے دیا۔

"ہم لوگ اس وقت موت کے چنگل میں ہیں اور جب کوئی انسان موت کے چنگل میں پھنستا ہے تو اسے سب کچھ بننا پڑتا ہے۔ مہم جو بھی، کوہ پیما بھی، تیراک بھی، اور صحرا نوورد بھی...... اگر ہم لوگ اس وقت یہ سوچتے رہے کہ ہم لوگ کوہ پیما نہیں اور اس راستے کو عبور نہیں کر سکتے تو ہم لوگ یہیں پھنس کر رہ جائیں گے۔ اگر مزید برف باری ہو گئی تو یہ کاٹیج ہمارا مدفن ثابت ہو گا۔" نوید نے کاٹیج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عرفان پھر سے بحث کرنے لگا۔ "نہیں تم دیکھ نہیں رہے کہ تیز دھوپ نکلی ہوئی ہے اور مزید برف باری کا کوئی امکان نہیں۔ ہو سکتا ہے اس دھوپ سے برف پگھل جائے اور ہمیں یہاں سے نکلنے کا موقع مل جائے۔" عرفان کی بات کاہلی کو سو بہانے والی بات تھی۔

نوید نے کہا۔ "ایسا ہو سکتا ہے مگر ایسا ہو گا نہیں کیونکہ اب یہ برف گرمیوں سے پہلے نہیں پگھلے گی البتہ برف باری ہونے کا چانس ضرور موجود ہے اس لیے ہمیں کوئی رسک نہیں لینا چاہیے۔"

عرفان کسی بھی بات کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ شاید اس پر بزدلی غلبہ پا چکی تھی یا پھر وہ کاٹیج کے اندر کے پر سکون ماحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ الیاس اور فیاض بھی اس کا بھرپور ساتھ دے رہے تھے۔ میرا قیاس تھا کہ مقامی آبادی یا ناران کی مین سڑک یہاں سے زیادہ دور نہ ہو گی کیونکہ لوگ کاٹیج وغیرہ کو زیادہ دوری پر نہیں بناتے

کہ انہیں اشیاء خورد و نوش اور دیگر لوازمات کی حصول یابی میں زیادہ دشواری درپیش ہو۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی کہ وہ مان جائیں۔ مگر وہ اپنی بات پر ڈٹے رہے۔ مجھے چوک کی طرف سے آنے والی افتاد کی فکر تھی مگر یہ لوگ کسی بھی طرح میری بات ماننے کو تیار نہیں تھے۔

اب ہمارے پاس صرف یہی ایک راستہ تھا کہ واپس جا کر کاٹیج میں بیٹھا جائے اور برف پگھلنے کا انتظار کیا جو کہ قطعی غیر مناسب فیصلہ تھا مگر میرے پاس اس بات کو ماننے کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔

جب ہم لوگ واپس آ کر کاٹیج میں بیٹھ گئے تو میں نے اب تک پیش آنے والی ساری حقیقت اپنے دوستوں کے گوش گزار کر دی۔ سب نے میری بات غور سے سنی مگر کسی نے بھی میری بات کا یقین نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے میری بات کو مذاق میں اڑا دیا اور مجھے فاترالعقل سمجھ لیا۔ ان کے خیال میں اس افتاد سے میرا دماغ چل گیا تھا اور میں بہکی بہکی سی باتیں کرنے لگا تھا۔

نوید نے مجھے ذہن کو پر سکون رکھنے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

میں نے تحمل مزاجی سے ان کے قہقہوں اور مشورں کو براشت کر لیا کیونکہ میرے پاس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ثبوت نہیں تھا اس لیے میں چپ ہو گیا۔

باقی کے دن میں ہمارے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ تھا۔ بس آپس میں گپیں ہانکتے رہے۔ صرف ہم پانچوں میں سے میں تھا جو ضرورت سے زیادہ پریشان تھا کیونکہ مجھے آنے والے وقت کے بارے میں تھوڑا بہت ادراک تھا جب کہ ان چاروں کو محض برف پگھلنے کا انتظار تھا۔ جو کہ میری دانست کے قریب سراسر بے وقوفی تھی۔

دوپہر کے قریب میں ایک بار پھر باہر نکل گیا۔ اس امید پر کہ شاید میں کوئی اور راستہ تلاش کر سکوں مگر میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ میں کاٹیج کو نظروں سے اوجھل نہ کروں تا کہ ایسا نہ ہو کہ کاٹیج اور دوستوں، دونوں کو گنوا بیٹھوں، پھر مجھے چوک اور پیکی کا خیال آ گیا۔ آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی کریں اس لیے مجھے اکیلے رہنا مناسب نہ لگا میں فوراً کاٹیج کی طرف لوٹ آیا۔

میں واپس آیا تو کاٹیج میں سوگوار سا ماحول تھا۔ یار دوست اپنے گھر والوں کو یاد کر کے بہت اداس ہو رہے تھے۔ مجھے بھی اپنے گھر والوں کی یاد آنے لگی مگر میں زیادہ رنج و غم میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا کیونکہ اس عمل سے سوائے اپنے آپ کو آزار دینے کے علاوہ کچھ اور حاصل نہ ہوتا میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ کس طرح یہاں سے نکل کر ناران تک پہنچا جائے۔

اس معاملے میں مجھے کوئی بھی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اس طرف سے خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور چوک اور پیکی کی طرف لے آیا کہ یہ دونوں کیا چیز تھے اور کون سی مخلوق سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے مجھے شک تھا کہ وہ غیر مرئی مخلوق جس کا نام بعد میں مجھے چوک معلوم ہوا تھا کا تعلق جنات سے تھا۔ مگر چوک اور پیکی کی باتیں سن لینے کے بعد اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ یقیناً ان دونوں کا تعلق کسی اور مخلوق سے تھا۔ وہ دونوں یقیناً کسی اور سیارے سے آئے تھے تبھی تو وہ اچھال بھر کر اوپر کی طرف چلے گئے تھے۔

یہ خیال مجھے اب بھی پریشان کر رہا تھا کہ وہ دونوں اب مجھ سے کیا چاہتے ہیں اور یہ کہ مجھ سے پہلے جو دو انسانوں نے چوک کو دیکھا تھا، ان کا کیا بنا، یا چوک نے ان کے ساتھ کیا سلوک کیا......؟

سہ پہر کے قریب ایک بار پھر کھانا بنانے کا پروگرام بنا، اشیاء خورد و نوش بہت تھوڑی رہ گئی تھیں اس لیے ہمیں احتیاط سے کام لینا تھا۔ یہ سہ پہر کا کھانا ایک طرح سے رات کا کھانا بھی ہوتا۔

ایک بار پھر میں نے فریج سے سبزیاں نکالیں اور انہیں چھری سے چھیلنے لگا۔

کھانا کھانے کے دوران میں نے انہیں ایک بار

پھر یہاں سے نکل چلنے کا مشورہ دیا۔ عرفان نے مجھے سختی سے ڈانٹ دیا۔ مجھے غصہ تو بہت آیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کے ناک پر ایک زوردار مکا جڑ دوں مگر میں اس خواہش سے صرف اس لیے باز رہا کہ یہ سب میری وجہ سے اس مصیبت میں پھنسے تھے اور میں کوئی الٹی سیدھی حرکت کر کے مزید کوئی بکھیڑا کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے میں برداشت کر گیا۔

اشیائے خورد و نوش کے ساتھ ساتھ جلانے کا ایندھن بھی ختم ہونے کے درپے تھا۔ میری فکر بڑھتی جا رہی تھی مگر کوئی بھی میری بات سننے کو یا ماننے کو تیار نہ تھا۔ پر میرے پاس سوائے صبر کرنے کہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ یہ بات بھی مجھے واضح نظر آ رہی تھی کہ بعد میں ہم لوگوں کو جو صبر کرنا ہوگا وہ بہت ہی زیادہ صبر آزما ہوگا۔

وقت فضولیات میں گزرتا رہا۔ ہمارے کرنے کو کوئی کام نہیں تھا۔ صرف یادیں تھیں اور جو باتیں تھیں ان کو ہم بار بار دہرا چکے تھے اس لیے یہ سب بھی اب بور اور بوجھل لگنے لگی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد رات کے اندھیرے نے اپنے پر پھیلا لیے۔ فیاض نے مشورہ دیا کہ ہمیں جلد سو جانا چاہیے تاکہ ہمیں پاپی پیٹ کی ضرورت کم سے کم ہو اس طرح راشن پانی کو زیادہ دیر تک چلایا جا سکتا تھا۔

تجویز معقول تھی۔ سب کو پسند آئی اس لیے سب جلدی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ میری بات اور تھی اور مجھے معلوم تھا کہ مجھے نیند مشکل ہی سے آئے گی تاہم میں بھی ان کے ساتھ ہی لیٹ گیا۔

مجھے اس بات کا انتظار تھا کہ آج بھی چوک اور پنکی یہاں آئیں گے یا نہیں...... وہ تو نہیں آئے البتہ رات ساڑھے نو دس بجے کے قریب بادل آ گئے اور موسم کی دوسری برف باری شروع ہوگئی۔

اس پریشانی سے میں نے اپنا سر پیٹ لیا، مجھے اتنا غصہ چڑھا کہ میرا دل چاہا کہ میں جوتے مار مار کر عرفان کو اٹھا دوں اور اسے دکھا دوں کہ اب ہم پر یہ افتاد دوبارہ آن پڑی ہے۔ مگر میں نے خود پر قابو رکھا اور خاموش بیٹھا کھڑکی سے باہر برف باری کو دیکھتا رہا جو ہمارے لیے مزید مشکلات کو کھڑی کرنے کے لئے برس رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں لیٹ گیا۔ اس کے بعد کب میری آنکھ لگ گئی مجھے پتہ ہی نہ چلا۔

رات کے کسی پہر سردی سے اچانک میری آنکھ کھلی۔ باہر برف باری رک چکی تھی البتہ سیٹیاں بجاتی تیز ہوا چل رہی تھی۔ آتش دان بھی سرد ہو رہا تھا۔ میں نے راکھ ہٹا کر نئی لکڑیاں ڈالیں اور ہر بات سے بے فکر ہو کر پھر سے سونے کے لئے لیٹ گیا۔

☆......☆......☆

رات بیت چکی تھی۔ صبح کے وقت مجھے نیند سے عرفان نے جگایا تھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی ہویدا تھی غالباً یہ پریشانی برف باری کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی۔ میرے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ آ گئی۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

عرفان نے منہ پھیر لیا۔ کسی نے بھی میری بات کا جواب نہ دیا۔ سب کے پریشانی سے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ اب میں صحیح طور پر کہہ سکتا تھا کہ یہ کاٹیج واقعی ہمارا مدفن بن گیا تھا۔

میں نے مزید کوئی جلی کٹی پھینکنا مناسب نہ سمجھا میرے خیال میں میری معنی خیز مسکراہٹ ہی کافی تھی۔ میں بستر سے نیچے اتر گیا۔ کاٹیج سے باہر برف کے ڈھیر لگ چکے تھے۔ کاٹیج کا باہر کا دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا اس لیے آسانی سے کھل گیا۔ دروازے کے باہر بھی برف کا ڈھیر لگا تھا۔ میں نے اور نوید نے بیلچے کی مدد سے سامنے کی برف ہٹا دی۔ سردی میں اب یک لخت بہت زیادہ اضافہ ہو چکا تھا، اندر واپس آ کر مجھ پر یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہمارے پاس بامشکل دو وقت کا کھانا بنانے کا راشن بچا ہے اور ایسی ہی قریب الختم مقدار ایندھن کی بھی تھی۔

باہمی مشاورت سے ہم نے یہ طے پایا کہ ایک وقت کے کھانے کا صرف آدھا حصہ تیار کیا جائے اور سارا دن صرف اسی سے گزارا کیا جائے اور اس طرح

ایندھن کو بھی حتیٰ الامکان کم سے کم جلایا جائے۔

کھانا کھایا جا چکا تھا۔ مگر بھوک کسی کی بھی نہیں مٹی تھی۔ ہم نے ضرورت سے بہت کم کھانا کھایا تھا ہمارے پاس پانی کی آخری مقدار بھی ختم ہو گئی تھی۔ جو یہاں کے مکینوں نے کسی چشمے وغیرہ سے بھر کر جمع کیا تھا۔ پانی کے معاملے میں اب ہمارے پاس یہی حل تھا کہ ہم باہر سے برف لے آئیں اور اسے پگھلا لیں۔ فیاض نے اس معاملے میں ذرا دیر نہ کی اور کانسی کے دو بڑے برتنوں میں برف بھر لایا۔ ایندھن جلانے سے اجتناب کیا جائے کیونکہ دن کے وقت کسی بھی طرح گزارا کیا جا سکتا ہے البتہ رات کو اس کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔

پریشانی سے ہر کوئی چپ سا ہو کر رہ گیا تھا کوئی بھی کسی سے بات نہیں کر رہا تھا۔ سب کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب اندر سے ٹوٹ رہے ہیں۔ ہر انسان کے اندر بھی ایک انسان ہوتا ہے اس انسان کو قائم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ یہ انسان جب تک اندر سے قائم رہتا ہے باہر کا انسان کسی بھی بڑی سے بڑی مصیبت کا سامنا کر سکتا ہے اور بڑی تکلیف کو جھیل سکتا ہے مگر جب اندر کا انسان ہار مان لیتا ہے تو باہر کا انسان ریزہ ریزہ ہو کر رہ جاتا ہے پھر اسے منہ کی ایک ہلکی سے پھونک سے بھی ہوا میں بکھیرا جا سکتا ہے۔ جو حالات ہمیں درپیش تھے صل میں ایسے ہی کڑے حالات میں اندر کے انسان کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ ہم سب ایک طرح سے امتحان میں تھے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا یا میرے دوستوں کا اندر کا انسان ہار جائے اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ میں حتی المقدور کوشش کروں گا کہ کسی بھی طرح اپنے دوستوں کا حوصلہ بڑھائے رکھوں۔ میں نے جس سے بھی بات کرنے کی کوشش کی اسی نے مجھے جھڑک دیا۔ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ میں فی الحال چپ رہوں اور وقت کا انتظار کروں۔

میں کاٹیج سے باہر نکل آیا، باہر ہلکی سی دھند چھائی تھی۔ دھوپ کا نام و نشان نہیں تھا اور سردی بہت زیادہ تھی، میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس راستے کی طرف چل پڑا جہاں سے ہم باہر نکل سکتے تھے۔

میں راستے کے دہانے پر کھڑا ہو کر کتنی ہی دیر اسے گھورتا رہا۔

راستہ تقریباً چالیس پینتالیس فٹ آگے جا کر بائیں طرف مڑ رہا تھا یعنی پہاڑ کے ساتھ ساتھ جب کہ دائیں طرف نشیب تھا۔ راستے اور پہاڑ کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا تھا۔ اگر میں کسی طرح راستے پر دس فٹ تک آگے چلا جاؤں تو پہاڑ کی نسبتاً کم بلند باہر کو نکلی ہوئی ایک نکڑ پر چڑھ سکتا ہوں۔ اگر میں کسی طرح اس نکڑ پر چڑھ جاؤں تو میں آگے کے راستے کا جائزہ لے سکتا ہوں کہ راستہ نشیب میں کہاں تک جاتا ہے اور راستے میں کیا کیا دشواریاں پیش آ سکتی ہیں۔

یہ کام خطرناک تھا بہر حال میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اسے کروں گا۔ دوستوں کی مدد وغیرہ لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا وہ تو پہلے ہی میری بات سننے کو تیار نہیں تھے۔

ابھی میں نے پہلا ہی پاؤں رکھا تھا کہ وہ پہلے تو برف کے کچھ اندر تک دھنسا پھر مجھے پاؤں کے نیچے سے کسی پتھر کے سرکنے کا احساس ہوا۔ میری روح تک فنا ہو گئی مگر میں اگلے ہی لمحے سنبھل گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں مگر میں بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا اس لیے مجھے ہمت کرنا تھی۔ آگے بڑھتے مزید قدموں کے ساتھ مزید مشکلات پیش آتی رہیں۔ مجھے زیادہ یہی ڈر تھا کہ کہیں میں سرک کر نشیب کی طرف نہ بڑھ جاؤں۔ ایسی صورت میں موت کی گہری کھائی منہ کھولے میرے استقبال کے لیے تیار ہوتی۔

جیسے تیسے میں کونے تک پہنچ گیا اب اس پر چڑھنے کا مسئلہ تھا۔ میں جس جگہ پر بھی ہاتھ ڈالتا نیچے سے برف نکل جاتی۔ اس نکڑ پر چڑھنا مجھے سیدھا سیدھا مرنے کے مترادف نظر آ رہا تھا۔ مگر مجھے ہر صورت میں چڑھنا تھا کیونکہ مجھے اپنے دوستوں کے بے بس چہرے اور ان پر چھائی وحشت اور چڑچڑاپن یاد آ رہا تھا ساتھ ہی

مجھے اپنے گھر والوں کی بھی یاد آرہی تھی۔ جب سے ہم اس مصیبت میں پھنسے تھے میری ان سے بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ بھی یقیناً میرے سیل فون پر رابطہ کرتے ہوں گے مگر ہمارے موبائلوں کی بیٹریاں ڈاؤن ہو چکی تھیں۔ اس لیے رابطہ ممکن نہیں تھا۔ رابطہ نہ ہونے پر یقیناً وہ پریشان بھی ہوں گے اور ان کے ذہن میں یہ خیال بھی آتا ہوگا کہ آیا میں کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا...... تصور ہی تصور میں مجھے اپنے گھر والوں کے چہروں پر میرے لیے فکر اور یاس نظر آنے لگی جس نے ایک بار پھر سے میری ہمت بندھا دی اور میں نکڑ پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

پتا نہیں میں نے کہاں کہاں اور کیسے کیسے ہاتھ پھنسائے اور پاؤں جمائے اور آخرکار نکڑ پر چڑھ گیا۔ میری سانسیں بری طرح اکھڑ گئی تھیں جسے بحال کرنے میں مجھے کچھ وقت لگا۔ میں نے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ راستے کے بارے میں جاننے کے لئے مجھے انتہائی نکڑ پر جانے کی ضرورت تھی۔ اس میں ڈھیر سارا خطرہ تھا۔ میں پھسل کر درے پر اور درے سے نشیب میں پہنچ سکتا تھا۔ بہر حال میں تھوڑا تھوڑا سرک کر نکڑ کے سرے پر پہنچ گیا۔ اب نشیب کی طرف جاتا راستہ میری نظر میں تھا۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی ہم ناران کی مین شاہراہ سے زیادہ دور نہیں تھے وہ مجھے واضح نظر آرہی تھی۔

جس جگہ میں کھڑا تھا اور جہاں نیچے سے راستہ بائیں طرف مڑتا تھا وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر سے چیڑ کے اکادکا درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔ یہ چیڑ کے درخت ہمیں نیچے اترنے میں مدد دے سکتے تھے۔

میں بہت خوش تھا۔ میں تیزی سے مگر احتیاط کے ساتھ نیچے اترا، تاکہ اپنے دوستوں کو جا کر یہ خوش خبری سنا سکوں، اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میرے دوستوں نے میری بات پر ذرا بھی توجہ نہ دی بلکہ الٹا مجھے ڈانٹ دیا کہ میں الاپ شلاپ نہ بکوں۔

میں انہیں بہترا سمجھاتا رہا اور انہیں بتایا کہ بامشکل 80یا90 فٹ کا پل صراط ہے جو ہمیں پار کرنا ہے اس کے بعد باقی راستہ زیادہ مشکل نہیں۔ اگر ہم یہیں پڑے رہے اور ہم نے ہمت نہ کی تو بے بسی کی موت ہماری منتظر ہے۔

میرا بولنا فضول رہا۔ میں شاید نقار خانے میں طوطی بجا رہا تھا۔ آخر بول بول کر میں خود ہی چپ کر گیا۔ میں نے اپنے دل میں اپنے دوستوں کے لیے شدید نفرت محسوس کی۔

یار دوست سردی سے بچنے کے لئے جمع شدہ ایندھن بے دریغ استعمال کرتے رہے۔

سہ پہر کے قریب انہوں نے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا۔ انہوں نے مشترکہ رائے سے یہ فیصلہ کیا کہ بچا کچھا جو بھی کھانا ہے اس سے ایک بار تو تسلی بخش طریقے سے پیٹ بھرا جائے باقی بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں تین اور تیرہ والے ہندسوں سے باہر آچکا تھا۔ میرا بولنا یا انہیں سمجھانا فضول تھا اس لیے میں چپ رہا۔ انہیں اگر کوئی چیز سمجھا سکتی تھی تو وہ صرف اور صرف حالات کی سختی تھی۔

کھانا تیار ہو چکا تو سب نے تسلی بخش طریقے سے کھایا۔ میں نے بھی کم نہیں کیا کیونکہ مجھے پتا تھا یہ اس کاٹیج میں ہمارا آخری کھانا ہے۔

ہمارے پاس جو ایندھن تھا وہ بھی بامشکل آج رات ہی چلنا تھا۔ میں نے خود کو کلی طور پر حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ میں وقت گزاری کے لیے گھر والوں کو یاد کر رہا تھا تاکہ ان کی وجہ سے میرا حوصلہ برقرار رہے۔ ساتھ میں خدا کو یاد کر رہا تھا تاکہ وہ ہمیں اس مشکل سے نکال دے۔

لاہور سے نکلنے کے بعد ہم نے پہلی رات ایبٹ آباد میں گزاری تھی۔ اب تک ہم لوگ 6 راتیں گزار چکے تھے آج اس کاٹیج میں ہماری تیسری رات تھی۔

رات ڈھلی تو سب سونے کے لئے لیٹ گئے۔ ایندھن کا آخری حصہ اپنے آخری سفر پہ تھا۔ میں چوک اور چیکی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئے۔ رات آہستہ آہستہ سرکتی رہی۔

☆......☆......☆

اگلے دن میری حتی الامکان کوشش تھی کہ میں اپنے دوستوں سے دور رہوں کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ خوراک اور ایندھن نہ ہونے کی وجہ سے ان کے مزاج چڑچڑے ہو جائیں گے اور پھر دوپہر کے قریب یہی ہوا۔ نوید اور فیاض آپس میں کسی بات پر الجھ پڑے۔ تکرار صرف باتوں اور گالیوں کی حد تک رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ یہ تکرار کپڑے پھاڑنے اور ایک دوسرے کو زخمی کرنے کی حد تک بھی جا سکتی تھی اور مجھے اس چیز کا اندازہ تھا کہ ایسا بھی ہوگا۔

یہ دن بھوک پیاس سے نڈھال ہوتے اور رات سردی سے کانپتے کانپتے گزرا۔

چوک اور چیکی اس رات بھی نہیں آئے۔

☆......☆......☆

پیٹ میں کچھ نہ ہو تو آنکھوں میں بھی کچھ نہیں رہتا اوپر سے اگر موسم کی سختی بھی وبال جان بنی ہو تو ایسے میں نیند آنا محال ہے۔ رات کو شاید ہی کوئی تھوڑی دیر کے لئے سویا ہو باقی رات جاگتے گزر گئی تھی۔

سب سے پہلے الیاس نے یہ بات کہی۔ "اگر ہم لوگ یہیں پڑے رہے تو یقیناً مر جائیں گے۔ اس لیے ہمیں اپنی بقا کے لئے کچھ تو کرنا ہوگا؟"

"یہاں سے نکلنے کی کوشش۔ کیونکہ یہاں اس کاٹیج میں موت تو ویسے ہی ہمارا مقدر بننے والی ہے اس لیے کیوں نا ایک کوشش کر لی جائے...... یا تو یہاں سے نکل جائیں گے یا پھر...... مرنا تو ہمیں ہے ہی۔ یا تو اس کاٹیج میں یا پھر کسی گہری کھائی میں گر کر۔"

سب اس بات پر غور کرنے لگے کے ہمیں واقعی یہاں سے نکلنے کی ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ وہ ایک دوسرے سے مشورے بھی کر رہے تھے۔ میں اس گفتگو سے بالکل لاتعلق رہا۔ مجھے ابھی بھی ان پر غصہ تھا۔ جب یہ لوگ توانائی سے بھرپور تھے تب کوئی کوشش کرنے کو تیار نہیں تھے۔ لیکن جب کہ بھوک سے نڈھال ہیں تو یہ کوشش کرنا چاہتے تھے۔

سب اٹھ کر ایک بار پھر اس راستے پر پہنچ گئے۔ جو ہمیں یہاں سے باہر نکال سکتا تھا۔

ہمارے جسم کی طاقت اتنی کم پڑ گئی تھی کہ وہاں تک پہنچنا ہی ہمارے لیے محال ہو گیا تھا۔

وہاں ایک اور صدمہ میرے استقبال کے لئے موجود تھا۔ میرے سب دوست جو کاٹیج اور راستے میں بلند و بانگ دعوئی کر رہے تھے، یہاں آ کر ان کی ہمت دم توڑ گئی۔ وحشت ناک موت انہیں اپنے سامنے رقص کرتی ہوئی نظر آنے لگی۔ کسی نے بھی اس راستے پر ایک انچ بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی۔ اب کی بار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں ان پر برس پڑا۔ میں انہیں بزدلی کے طعنے دینے کے علاوہ صلواتیں بھی سنا رہا تھا، اس مصیبت میں پھنسنے کے بعد سے لے کر اب تک وہ بھی مجھے برداشت کیے ہوئے تھے، اب کی بار ان سے بھی نہ رہا گیا۔

وہ بھی مجھ پر برس پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے مجھے دھنک کر رکھ دیا، میرا نیچے کا ہونٹ پھٹ گیا ور ناک سے خون نکلنے لگا اس کے علاوہ سر پر بھی ایک دو گومڑ نمودار ہو گئے۔

مجھ پر ہاتھ چلانے کے بعد وہ سب نڈھال ہو گئے تھے۔ ان کی سانسیں چڑھ گئی تھیں اور وہ گرنے کے قریب لگ رہے تھے، مجھے تھوڑی دیر دیکھتے رہنے کے بعد وہ سب کاٹیج میں واپس چلے گئے، میں وہیں پر اکڑوں بیٹھ کر اپنے زخموں کا جائزہ لینے لگا۔ میں اتنا زیادہ غصے میں تھا کہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی بھی طرح اکیلا ہی یہاں سے نکل جاؤں۔ شاید میں یہ بے وقوفانہ حرکت کر بھی بیٹھتا مگر اس وقت تیز ہوا چلنے لگی۔ جو میرے بدن کو نشتروں کی طرح چھیدنے لگی۔ یخ بستہ ہوا میری برداشت سے باہر ہوئی تو مجھے مجبوراً کاٹیج میں واپس جانا پڑا۔

وہ سب سردی سے کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے جڑے بیٹھے تھے، کسی نے بھی مجھ سے کوئی بات نہ کی نہ تو اپنی شرمندگی کا اظہار کیا اور نہ کسی نے میرے زخموں کا

جائزہ لینے کی کوشش کی بلکہ وہ سب ابھی بھی مجھے خون خوار نظروں سے گھور رہے تھے۔

میں نے کسی سے کوئی بات نہ کی اور ایک طرف ہو کر اکیلا ہی بیٹھ گیا، ایک پرانا سا کپڑا میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اس سے اپنے چہرے کا خون صاف کیا اور اپنے دوستوں کی بے رخی اور اپنی بے بسی پر رونے لگا۔

جب میرے آنسو تھمے تو مجھے اس چیز کا احساس ہوا کہ سردی بہت زیادہ ہے اور میرا جسم کا کانپ رہا ہے۔

میں خاصی دیر کانپتا رہا۔ سردی سے بچنے کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر ایک خیال میرے ذہن میں آیا اور میں چونک گیا۔ اگر اس کمرے کو چھوڑ کر جہاں ہم بیٹھے تھے، دوسرے کمرے اور باہر کی کھڑکیوں کی لکڑی اکھاڑ لی جائے تو ہم لوگ آگ جلا کر کسی حد تک سردی سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

یہ خیال ذہن میں آتے ہی میں نے ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کی اور فوراً اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا کاٹیج میں کوئی کلہاڑی وغیرہ تو نہیں تھی البتہ ایک دو بھاری اوزار موجود تھے جن کی مدد سے میں نے ایک کھڑکی کی لکڑی اکھاڑ دی اور اسے کمرے میں لا کر جلا دی۔ آگ کی حرارت پاتے ہی ہمارے کملائے ہوئے جسم اپنی اصلی حالت میں واپس آنے لگے۔ میرے دوست مجھ سے خوش ہو گئے مگر کچھ دیر پہلے کی اپنی حرکت پر کسی نے بھی معذرت نہ کی۔ کچھ دیر پہلے یہ لوگ نیم بے ہوش سے پڑے تھے اب انہیں ہوش آ گیا تو یہ اپنی بھوک کا رونا بھی رونے لگے، تقریباً گھنٹے بھر کے بعد ایک اور برا واقعہ ہوا۔ عرفان کو کسی کونے کھدرے ایک پرانی کتاب مل گئی۔ وہ اس کا ایک ایک صفحہ پھاڑ کر رغبت سے کھانے لگا، دوسروں سے یہ برداشت نہ ہوا انہوں نے عرفان کے ہاتھوں سے وہ کتاب چھیننے کی کوشش کی۔ نتیجے میں سب آپس میں لڑ پڑے۔

میں ان چاروں سے دور بیٹھا انسانیت کی تذلیل ہوتے دیکھتا رہا، چاروں کو شدید چوٹیں آئی تھیں۔ شام کے قریب ایک بار پھر وہ چاروں آپس میں لڑے۔ وجہ یہ تھی کہ دوسری کھڑکیوں کی لکڑی اتار کر لایا جائے اور وہ سبھی ایک دوسرے کو لانے کے لیے کہہ رہے تھے یہ لڑائی بند نہ ہوئی اگر میں خود جا کر لکڑیاں اکھاڑ نہ لاتا......

یوں تو مجھے مصمم یقین ہو چکا تھا کہ یہ کاٹیج اب ہمارا مدفن بن کر رہے گا مگر پھر بھی میں یہ بازی ہارنا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کم از کم ایک بار تو میں اپنے گھر والوں سے ملوں میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ کل جو بھی ہوگا، میں ہر حال میں یہاں سے نکلوں گا۔ ہم لوگ تو ویسے بھی رفتہ رفتہ اس کاٹیج میں مر رہے تھے میں چاہتا تھا کہ کیوں نا میں کوشش کرتے ہوئے مروں شاید میں کامیاب ہو جاؤں جس سے ہمارے زندہ بچ جانے کی کوئی سبیل ہو جائے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھا اور پورے کاٹیج کا طائرانہ نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ میں کسی بھی ایسی چیز کو تلاش کرنا چاہتا تھا جو کل اس پل صراط نما راستے کو عبور کرتے ہوئے میرے کام آ سکے۔

تلاش بسیار کے بعد مجھے کاٹیج میں ایک خفیہ خانہ مل گیا۔ یہ نیچے کی طرف تھا۔ اس کے اوپر اشیاء رکھ کر بڑی مہارت سے اسے چھپایا گیا تھا۔ اس خفیہ خانے سے مجھے ایک لمبا سا رسا برف میں استعمال ہونے والے بوٹوں کا ایک جوڑا، درمیانے سائز کی ایک ہتھوڑی اور کافی ساری کیلیں مل گئیں۔ یہ کوہ پیماؤں کے استعمال میں آنے والی چیزیں تھیں اور شاید کل میرے بھی استعمال میں آنے والی تھیں میں نے وہ چیزیں وہیں رہنے دیں اور خفیہ خانے کو پھر سے چھپا دیا۔

رات کو تیسری اور آخری کھڑکی کی لکڑیوں کو بھی جلا دیا اب صرف ایک کھڑکی بچی تھی جو اس کمرے میں تھی جہاں ہم بیٹھے تھے۔ اگر اس کو بھی کام میں لایا جاتا تو بے رحم یخ بستہ ہوا کمرے کے اندر آنے میں ذرا بھی دیر نہ لگاتی، یہ کمرے والی کھڑکی اب میرے اختیار میں نہیں تھی۔ یار دوست چاہتے تو اسے توڑ سکتے تھے، اگر وہ ایسا کرتے تو میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

آدھی رات کا وقت تھا یار دوست آگ کی تپش پا

کر سونے کے نام پر بے ہوش پڑے تھے اگر آگ نہ جلتی تو شاید کوئی بھی آج رات سو نہ پاتا۔ میں بھی غنودگی ہی میں تھا کہ اچانک کسی خطرے سے میری آنکھ کھل گئی۔ پہلے ہی لمحے میرے ذہن میں جو خیال آیا وہ دو نام تھے چوک اور پیکی......!

میں فوراً اپنی جگہ سے اٹھ بیٹھا شاید فیصلے کی گھڑی آن پہنچی تھی۔

پہلے ہی کی طرح میں اس بار بھی گیلری پر چڑھ گیا مگر چڑھنے سے پہلے میں نے آتش دان کی راکھ کریدنے والا راڈ ہاتھ میں لے لیا۔ پہلے ہی کی طرح وہ مین دروازے کے سامنے آ کر رک گئے۔

"یہ لوگ بھوک، تھکن اور سردی سے نڈھال ہو چکے ہیں۔" چوک نے چہک کر کہا اور خوشی سے "ہا...... ہا......ہا" کے قہقہے لگانے لگا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی شخص کسی جنگ کو لڑے بغیر پہلے ہی سے جیت چکا ہو۔

"کیا تم اس کو بھی ان دونوں کی طرح ملکہ کے پاس لے کر جاؤ گے؟" پیکی نے سوال کیا۔

"وہ دونوں نہیں گئے تھے ان میں سے صرف ایک گیا تھا فیصل آباد والا...... نارووال والا تو میری شکل دیکھ کر ہی مر گیا تھا۔"

"اور فیصل آباد والا کب مرا؟" پیکی نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ چند روز ملکہ کے پاس رہا تھا پھر اس کے بھی حواس جاتے رہے، ایک دن حرکت قلب بند ہونے سے وہ بھی مر گیا۔" چوک نے پیکی کو بتایا۔

پیکی نے پوچھا۔ "تو تمہارا کیا خیال ہے یہ شخص ملکہ کے پاس رہ پائے گا؟"

چوک نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں امید تو ہے کیونکہ یہ شخص مجھے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے تو ایک طرح سے مجھ پر حملے کی غرض سے میرا پیچھا کیا تھا۔"

"تو کیا تم ایسے بہادر شخص کو اپنے ساتھ لے جا پاؤ گے۔ وہ تمہارا مقابلہ کرے گا۔"

چوک نے کہا۔ "نہیں! میں نے پہلے ہی تم سے کہا تھا کہ وہ لوگ بھوک، تھکن، سردی سے نڈھال ہو چکے ہیں ایسے میں بہادری رفو چکر ہو جاتی ہے۔"

پیکی شاید اس کی بات سے مطمئن ہو گئی۔ ان میں مزید کوئی بات نہ ہوئی۔

وہ مین دروازہ کھولنے کے لئے آگے بڑھے۔

ہر چند کہ ہم لوگ موت کے چنگل میں تھے اور اس کاٹیج ہی کو اپنی موت اور اپنا مدفن تصور کیے بیٹھے تھے مگر اس کے علاوہ اپنے دوستوں سے قطع نظر مجھے اس خطرے کا بھی احساس تھا جو ہمیں چوک اور پیکی کی طرف سے آ سکتا تھا۔ اس لیے میں کسی بھی طرح کی غفلت کے بغیر باہر کے دروازے کو بند رکھا کرتا تھا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چوک نے ایک جھٹکے سے دروازے کو کھول دیا۔ اس سے چوک کی طاقت اور اس کی خطرناکی کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ اس نے پیکی سے کہا تھا کہ میں اسے دیکھ کر خوفزدہ نہیں ہوتا۔ مگر سچ میں اس وقت خوف زدہ تھا۔ ہم لوگ پہلے ہی نڈھال تھے اوپر سے یہ شیطان مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اپنی ملکہ کے پاس......شاید اس کی ملکہ کے لیے انسان کوئی کھلونے تھے اور وہ ان کھلونوں کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ میرا انتخاب اس لیے ہوا تھا کہ میں ان موذیوں کو دیکھ سکتا تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے اس شیطان کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ مجھے ہر صورت میں زندہ رہنا تھا اور کسی بھی صورت میں اپنے گھر واپس پہنچنا تھا۔ میرے تمام گھر والوں کی صورتیں ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے لہرانے لگیں۔ کوئی عجیب سا جذبہ میرے اندر عود آیا۔ مجھے چوک سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ وجہ سے ہم اس مصیبت میں پھنسے تھے اور اب یہ مجھے اپنے ساتھ بھی لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا چاہے کچھ بھی ہو جائے۔

دروازے کو کھول کر وہ دونوں اندر آ گئے تھے۔ وہ سیدھے اس کمرے کی طرف بڑھے جدھر یار دوست مدہوشی کی حالت میں پڑے تھے۔

یہی وہ گھڑی تھی جسے فیصلے کی گھڑی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے اپنی تمام تر قوتوں کو مجتمع کیا اور سنبھل کر سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔

وہ اس بات سے قطع بے خبر تھے کہ میں ان کے پیچھے ہوں۔ چوک نے ایک سرچ لائٹ جلائی جس سے پورا کمرا روشن ہوگیا۔ یار دوست بڑ بڑا کر اٹھ بیٹھے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسی روشنی ہے مگر دوسرے ہی لمحے سرچ لائٹ آف ہوگئی۔ یار دوستوں کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا ہوگا کیونکہ وہ چوک اور پیگی کو نہیں دیکھ سکتے تھے اس لیے اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔

وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ اس وقت چوک کی آواز ابھری جسے یار دوستوں کی سماعت نہیں سن سکتی تھی۔

"وہ اس کمرے میں نہیں ہے۔"

جب وہ یہ کہہ رہا تھا میں اس کے عین پیچھے پہنچ چکا تھا۔ شاید وہ دوسرے کمرے میں مجھے دیکھنے کے لیے دونوں ابھی پلٹے ہی تھے کہ میں نے پوری قوت سے ہاتھ میں پکڑا ہوا راڈ گھما دیا۔

آہنی راڈ سیدھا چوک کے منہ پر پڑا تھا۔ وہ ہلکا سا ہوا میں اڑ کر کمرے کے اندر جا گرا۔ پیگی کے منہ سے خوف ناک چیخ ابھری اور وہ چوک کی طرف لپکی مگر اس وقت میرا ہاتھ ایک بار پھر گھوما اور راڈ پیگی کی بائیں ران پر پڑا۔ اب کی بار اس کے منہ سے جو چیخ نکلی وہ اپنے درد کے لئے تھی۔ وہ بھی کمرے کے فرش پر گر پڑی۔ میں نے چوک کی طرف دیکھا وہ اپنے داہنے ہاتھ میں کسی ہتھیار کو سیدھا کر رہا تھا غالباً مجھ پر حملہ کرنے کے لئے مگر میں نے اس سے زیادہ پھرتی دکھائی اور راڈ ایک بار پھر گھما دیا۔

آہنی راڈ اس کی کلائی پر اندر کی طرف لگا اور ہتھیار دور جا گرا۔ چوک کے منہ سے ڈکرانے کی سی آواز نکلی۔ میں نے اسی پر بس نہیں کیا، مجھے اس موذی پر شدید غصہ تھا۔ ہر چند کہ تھوڑی دیر پہلے چوک نے جس طرح باہر کے دروازے کو کھولا تھا اس سے مجھے اس کی طاقت کا اندازہ بھی ہوگیا تھا مگر اس وقت وہ مفلوج تھا اور میں فاتح بنا ہوا تھا۔ پے در پے میں راڈ کو کئی بار گھماتا رہا۔ چوک کے منہ سے کربناک چیخیں نکلتی رہیں۔ پیگی نے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی، وہ بس دور ہی سے "نہیں...... نہیں......" چیختی رہی۔ یار دوست جو چوک اور پیگی کو نہ تو دیکھ سکتے تھے اور نہ ان کی آوازیں سن سکتے تھے۔ وہ مجھے کوئی جنونی گردان رہے تھے اور حواس باختگی کے عالم میں مجھے پاگلوں کی طرح راڈ چلاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی شاید انہیں مجھ سے اپنی جان کا خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔

راڈ چلاتے یک دم مجھے نقاہت کا احساس ہوا اور میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا میں نے محسوس کیا تو پتا چلا کہ چوک جاں بحق ہو چکا ہے اس کے ساتھ ہی میرا جنون بھی جیسے دم توڑ گیا اب شاید مجھ میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ میں اپنی جگہ سے ہل سکوں۔ میرا دھیان پیگی کی طرف گیا۔ اوہ ران پر راڈ کی ضرب لگنے کے بعد جہاں گری تھی ابھی تک وہیں پڑی تھی۔ اگر وہ ذرا کوشش کرتی تو دروازے سے نکل کر باہر بھاگ سکتی تھی مگر شاید وہ میرا جنون دیکھ کر مجھ سے بڑی طرح خوفزدہ ہو چکی تھی۔ ایسے میں اس میں کچھ بھی کرنے کی کیا ہمت رہتی......

نوید نے ذرا ہمت کی اور اٹھ کر میرے قریب آ گیا۔

"تم ٹھیک تو ہو......"

میں نے ایک گہری آہ بھری۔ "ہاں میں ٹھیک ہوں۔"

اب دوسرے بھی ہمت کر کے قریب آ گئے۔ میں نے انہیں ساری بات بتا دی۔ یقین کے طور پر وہ چوک کے جسم کو چھو کر دیکھ سکتے تھے۔ جب میں نے انہیں پیگی کی موجودگی کا بتایا تو وہ تھوڑا ڈر گئے۔ میں نے انہیں کہا۔ "گھبراؤ نہیں، میں اسے دیکھ رہا ہوں اور وہ اس وقت زخمی ہے۔" میری بات سے انہیں حوصلہ ہوا۔

اسی اثناء میں پیگی کے حواس بحال ہو چکے تھے وہ مجھ پر چیخنے چلانے لگی کہ میں اسے چھوڑ دوں اسے نہ ماروں۔

میں نے اسے چپ رہنے کا کہا اور اسے بتایا کہ میں نے ابھی اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا اس لیے وہ مجھے تنگ نہ کرے آیا میرا دماغ نہ خراب ہو جائے اور اسے بھی نہ مار دوں۔

میری بات سن کر وہ بالکل چپ ہوگئی۔

چانک ہی میری نظر چوک کے چہرے پر پڑی۔ مجھے اس کا چہرا ٹوٹا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں آگے بڑھا اور اسے چھوا۔ تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اصلی چہرہ نہیں بلکہ خول تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ خول کے اندر سے جو چہرہ نظر آیا وہ نہایت بھیانک تھا۔ چہرہ کیا تھا بالوں سے بھرا کوئی گچھا سا تھا۔ آنکھوں کے نام پر دو گڑھے تھے۔ ناک کی جگہ پر جیسے دو سنڈیاں تھیں، ہونٹ، بھینسوں جیسے تھے اور اس کے کان گدھے کے کان جیسے ایسے مگر چھوٹے تھے، اتنی بھیانک صورت دیکھ کر مجھے سخت کراہیت ہوئی۔ میں نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

میرا دھیان پیگی ی طرف گیا۔ اس کی شکل بھی یقیناً ایسی ہی تھی اور اس نے بھی منہ پر خول چڑھا رکھا تھا۔

مجھ سے رہا نہ گیا میں نے پوچھ لیا۔ "کیا تمہاری شکل بھی ایسی ہے؟"

اس نے مجھض اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے اپنے دوستوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہ ڈرے ہوئے تو تھے مگر ساتھ ہی وہ مجھ سے اپنے سابقہ رویے کی وجہ سے شرمندہ بھی نظر آ رہے تھے۔

میں ایک بار پھر اپنی سوچوں میں غلطاں ہونا شروع ہو گیا۔ بے شک ہمیں چوک اور پیگی جیسی مصیبت سے نجات مل چکی تھی مگر پھر بھی ہم ابھی تک موت کے چنگل میں ہی تھے اور وہ چنگل تھا یہ کاٹیج جو ہمارا مدفن بنتا جا رہا تھا۔

میری مایوسی بڑھتی چلی جا رہی تھی کہ یک لخت میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور تاریک ویرانوں میں کسی جھماکے سے روشنی بھر گئی۔ میں فوراً پیگی کی طرف متوجہ ہوا اور اسے مخاطب کیا۔

"تم نے میری وحشت دیکھی ہے نا پیگی!...... تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں مار دوں گا یا چھوڑ دوں گا......"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ وہ الٹا چیخنے چلانے لگی۔ "مجھے چھوڑ دو مجھے جانے دو...... مجھے معاف کر دو! سارا قصور چوک کا تھا۔ وہی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ میرا اس سارے معاملے سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں بس چوک سے محبت کرتی تھی یہی میرا گناہ ہے۔"

میں اس پر دھاڑا۔ "بکواس بند کرو اور مجھے بس اتنا بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے میں تمہیں چوک کی طرح مار دوں گا یا چھوڑ دوں گا؟"

"تم مجھے مار دو گے ظالم انسان" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ "تم مجھے مار دو گے...... تم مجھے مار دو گے......"

میرے دوست حیرت سے میری باتیں سن رہے تھے کہ اب میں کیا کر رہا ہوں۔

"تمہاری جان بخشی ہو سکتی ہے اس کا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ مگر اس کے لیے تمہیں میری دو باتیں ماننا ہوں گی۔" میں نے کہا۔

پیگی کو میری بات سن کر شاید یقین نہیں کہ اس کی جان بخشی کی بھی کوئی صورت نکل سکتی ہے، اس نے جلدی سے کہا۔ "مجھے منظور ہے تم بتاؤ اپنی باتیں......"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ تم نے نکلنے میں ہماری مدد کرنا ہوگی اور دوسری بات تم آزادی پانے کے بعد نہ تو مجھے کوئی نقصان پہنچاؤ گی اور نہ اپنے جیسے اور بندوں کو میرے بارے میں بتاؤ گی۔"

"جان سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مجھے تمہاری دونوں باتیں منظور ہیں اور میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ جیسے تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔" پیگی نے اپنی منظوری ظاہر کر دی۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے اب تمہیں صبح تک انتظار کرنا ہوگا۔ ہم لوگ صبح کو یہاں سے نکلیں گے اور اگر تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے تو ہمیں دے دو......"

اس نے اپنی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ نکالا، وہ

چنے تھے۔

"انسانوں کی زمین پر ہمیں صرف یہی ایک چیز پسند ہے۔ اگر تم کھانا چاہو تو لے لو......" پنکی نے چنے میری طرف بڑھائے جو زیادہ تعداد میں نہیں تھے، میں نے لے لیے...... دل چاہا کہ کھالوں مگر جب مجھے چوک اور پنکی کی بھیانک صورتوں کا احساس ہوا تو دل عجیب ہو گیا اور میں نے چکھے بغیر چنے دوستوں کی طرف بڑھا دیے۔ جنہیں وہ پاگلوں کی طرح کھانے لگے، میں نے پنکی سے کہا اگر تمہارے پاس مزید چنے ہیں تو دے دو...... اس نے نفی میں گردن ہلادی۔

رات دھیرے دھیرے کٹتی رہی آخر صبح کا اجالا پھیل گیا۔

☆......☆......☆

پنکی جہاں گری پڑی تھی اس نے وہیں پڑے پڑے رات گزاری تھی۔ یار دوستوں میں چنے کھا لینے سے کچھ توانائی تو ضرور آئی تھی مگر اس کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی بھوک کے آگے صبر کا جو بند بندھا تھا وہ ٹوٹ گیا وہ آپس میں لپٹ کر پاگلوں کی طرح رونے لگے۔

شاید اس پاگل پن میں ان کے اندر کے انسان پھر سے باہر آتے وہ آپس میں الجھتے یا پھر مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے مگر انہوں نے میرا جنون دیکھ لیا تھا اس لیے انہوں نے کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کی سوائے آپس میں مل کر بلیوں جیسی آوازیں نکال کر رونے کے......

سارا منصوبہ میں پہلے سے مرتب کر چکا تھا مجھے بس اتنا کرنا پڑا کہ میں اٹھا اور اس پر عمل شروع کر دیا۔

سب سے پہلے میں اس خفیہ خانے تک پہنچا اور اس میں سے کوہ پیماؤں والے بوٹ نکال کر پہن لیے اس کے بعد میں نے دیگر ضروریات کی چیزیں بھی سنبھال لیں جن میں لمبا رسا بھی شامل تھا۔ ہتھوڑی اور کیلوں وغیرہ کو میں نے ایک بیگ میں ڈال لیا۔ جب میں پوری طرح تیار ہو چکا تو میں نے پنکی سے چلنے کو کہا۔

اس نے اپنی ٹانگ کی تکلیف کا اظہار کیا کہ وہ چلنے سے معذور ہے۔

میں نے کہا۔ "کوئی بات نہیں تم اڑ تو سکتی ہو۔"

وہ لنگڑاتی ہوئی دروازے سے باہر تک آ گئی۔ میں نے اس کی اس ٹانگ جو زخمی تھی رسا باندھ دیا۔ رسا پیر سے ذرا اوپر باندھا تھا۔ اس نے کہا۔ "اس کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے کہا۔ "تاکہ تم بھاگ نہ جاؤ......"

وہ زمین سے تقریباً ڈیڑھ فٹ تک اوپر اٹھ گئی اور میرے ساتھ ساتھ درے کی طرف چلنے لگی۔

جاتے وقت میں نے دوستوں کی طرف دیکھ کر محض الوداعی ہاتھ ہلایا۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں...... میں ان فاتر العقول کو کچھ سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ان میں سے کسی نے میرے ساتھ جانے پر اصرار بھی نہ کیا۔

میں اور پنکی راستے کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اب پنکی کو جو کرنا تھا میں اسے سمجھانے لگا۔

ایک بیلٹ کی مدد سے میں نے رسے کو دوسری طرف سے اپنی کمر سے باندھ لیا تھا۔ پنکی کو یہ کرنا تھا کہ وہ آگے بڑھتی رہے اور کیلیں ٹھونکتی رہے بعد ازاں مجھے رسے اور کیلوں کی مدد سے تھوڑا تھوڑا کر کے آگے بڑھنا تھا۔

میری یہ پالیسی کامیاب رہی میں خود کو کالیج کے مدفن سے آزاد ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ میرے قدم دھیرے دھیرے مگر آگے ہی آگے بڑھ رہے تھے آخر ہم درے کا موڑ مڑ گئے۔ پنکی آگے آگے کیلیں لگا رہی تھی۔ وہ اپنی ٹانگ کو ڈھیلا رکھتے ہوئے بقایا رسے کو کیلوں سے باندھ دیتی جس کی مدد سے میں آگے بڑھتا۔

اب چیڑ کے اکا دکا درختوں کا سلسلہ میرے سامنے تھا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو ان سے کوئی مدد لینے کی کوشش کرتا مگر چونکہ اب پنکی میرے ساتھ تھی اس لیے مجھے ایسی کوئی ضرورت پیش نہ آ رہی تھی البتہ جسم میں توانائی نہ ہونے کی وجہ سے نقاہت کا اثر مجھ پر بڑھتا جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑنے لگے تھے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں ابھی ہچکولا کھاؤں گا

اور پھر اگلے ہی لمحے خلاء میں جھول جاؤں گا، مجھے ہر ممکن طریقے سے ایسی صورت حال سے بچنا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ میرا دماغ تاریکی کی طرف جا رہا تھا۔ نقاہت کی نیند مجھ پر اپنے پنجے گاڑ رہی تھی۔ جب صورت حال زیادہ خراب ہوتی ہوئی نظر آئی تو میں پنکی کو آواز دے کر تھوڑی دیر کے لئے ستانے کے لئے بیٹھ جاتا۔ تھوڑی دیر بعد اٹھتا اور پھر سے سفر کا آغاز کر دیتا۔ ناران کی مین شاہراہ جو زیادہ دور نہیں تھی اب مجھے میلوں دور لگنے لگی تھی۔ شاید اگر پنکی اس سفر میں میرے ساتھ نہ ہوتی تو میں ہمت ہار جاتا۔

پتا نہیں یہ سفر کس طرح طے ہوا تھا...... مجھے بس اتنا یاد ہے کہ آگے جا کر راستہ نسبتاً آسان ہو گیا تھا۔ میرے قدموں نے جب ناران کی سڑک کو چھوا تو میں خوشی سے نہال ہو گیا۔ مجھے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ میں زندہ بچ گیا ہوں۔ سڑک پر کچھ دیر کے سفر کے بعد مجھے ایک مقامی شخص مل گیا۔ میری حالت دیکھ کر وہ خود ہی میرے قریب آ گیا تھا۔

میں نے اسے مختصر لفظوں میں اتنا بتا دیا کہ ہم لوگ راستہ بھٹک گئے تھے۔ میرے یار دوست ابھی بھی کالیج میں پھنسے ہیں میں کسی طرح نکل آیا ہوں۔

اس شخص کا نام نور محمد تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ اس کی بیوی فوت ہو چکی تھی صرف اس کی ایک چودہ سال کی بچی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے قہوہ تیار کیا اور مجھے پیش کرتے ہوئے کہا۔ "اس سے تمہاری سردی کا اثر زائل ہو جائے گا۔"

اس نے اپنی بچی کو ہدایت کی کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلائے کیونکہ میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں اس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا اور مجھے پیٹ سے بندھے رسے کو کھول دینے کو کہا۔

میں نے کہا۔ "نہیں ابھی مجھے اس کی ضرورت ہے۔" اس پر پنکی نے مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔

نور محمد گھر سے باہر چلا گیا اور اس کی بیٹی میرے لیے کھانا تیار کرنے لگی۔

نور محمد جب تک پلٹا تب تک میں پیٹ بھر کھانا کھا چکا تھا۔ نور محمد کے ساتھ تین آدمی بھی تھے۔ نور محمد نے خود ہی جا کر تھانے اور محکمہ فاریسٹ میں ہمارے گم ہونے کی اطلاع دی تھی۔ نور محمد کے ساتھ آنے والوں میں سے ایک فاریسٹ آفیسر تھا۔ ایک سب انسپکٹر اور ایک کانسٹیبل تھا۔

سب انسپکٹر نے مجھے مختصر بتایا کہ "جس ہوٹل میں ہم لوگ ٹھہرے تھے اس ہوٹل والے اور جس جیپ میں ہم لوگ جھیل سیف الملوک تک گئے تھے اس کے ڈرائیور نے آپ لوگوں کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروا دی تھی۔ ہم لوگوں نے برف باری کے باوجود ہر ممکن کوشش سے آپ لوگوں کو تلاش کیا تھا مگر ہم لوگ تلاش نہ کر پائے تھے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔

میں نے کہا۔ "جانتے ہیں آپ لوگ ہمیں تلاش کیوں نہیں کر پائے......"

سب کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔

"اس لیے کہ ہم لوگ دوسری طرف سے ناران کی سڑک کے بالکل قریب آ چکے تھے۔ جب کہ آپ لوگ ہمیں جھیل کی طرف ہی تلاش کرتے رہے۔"

فاریسٹ آفیسر نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ "میرے خیال میں اب آپ کو اس رسے کو کھول دینا چاہیے کیونکہ اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔" اس نے رسے کی طرف اشارہ کیا۔

میں ایک بار پھر ہنسا اور پنکی کی طرف دیکھنے لگا۔ "ہاں واقعی اس کی اب ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کمر سے رسے کو کھول دیا گویا ایک طرح سے پنکی کو آزاد کر دیا۔

سب انسپکٹر مجھ سے لوکیشن کو پوری طرح سمجھا اور جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ وہ تینوں باہر جانے لگے تو میں نے مختصر کہا۔ "میرے دوستوں کی حالت بہت خراب ہے، نقاہت کے باعث ان سے چلا نہ جائے گا۔"

"بے فکر رہو ہم ان کے لئے ہیلی کاپٹر کا انتظام کر رہے ہیں۔" فاریسٹ آفیسر نے کہا اور تینوں باہر نکل

گئے۔ نور محمد بھی تھوڑی دور تک ان کے ساتھ چلا گیا۔
نور محمد کی بیٹی میرے پاس ہی تھی۔ میں نے پیکی کو مخاطب کیا۔ ”تم بھی جا سکتی ہو مگر یاد رکھو میرے دوستوں کو کوئی نقصان نہ پہنچانا کیونکہ میں تمہاری جان بخشی کر رہا ہوں۔ اپنا وعدہ نبھا رہا ہوں اس لیے تم بھی اپنا وعدہ نبھانا۔“

اس نے شکریہ ادا کیا اور جانے لگی تو میں نے کہا۔ ”ہیلی کاپٹر کے وہاں پہنچنے سے پہلے چوک کی لاش کو اٹھا لینا۔“

”میں اپنے وعدے کی پکی ہوں۔ میں تمہارے دوستوں کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤں گی کیونکہ تم نے جو کیا وہ تمہاری مجبوری تھی اگر تم ایسا نہ کرتے تو ہم لوگ تمہیں اپنے ساتھ لے جاتے جہاں تم ملکہ کے کھلونے بن جاتے، اگر تم مرتے نہ بھی تو بھی تم اپنی دنیا سے ضرور بچھڑ جاتے۔“

وہ جانے کے لیے آگے بڑھی۔ ”میں چوک کی لاش کو بھی اٹھا لوں گی۔“

نور محمد کی بیٹی حیرت سے مجھے اکیلے ہی باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور شاید مجھے پاگل سمجھ رہی تھی۔ پیکی باہر نکلنے سے پہلے اچانک ایک کنستر سے ٹکرا گئی جس سے کمرے میں شور پیدا ہوا۔ نور محمد کی بیٹی تب بری طرح چونکی۔ اسے احساس ہوا کہ ہم دونوں کے علاوہ کمرے میں کوئی اور بھی تھا۔

انتظامیہ میرے دوستوں کو ہیلی کاپٹر میں بیٹھا کر میرے پاس لے آئی تھی۔ اس کے بعد مجھے بھی ہیلی کاپٹر میں بیٹھایا گیا اور ہمیں بالاکوٹ لے جا کر ایک اچھے سے ہاسپٹل میں داخل کروا دیا گیا۔ جہاں ہماری ٹریٹمنٹ کی گئی۔ چند رپورٹروں نے آ کر ہماری تصویریں بھی اتاریں ہماری گم شدگی اور بازیابی کی خبریں لگ گئیں، ہم نے اپنے گھر والوں کو فون کر کے بتا دیا کہ ہم لوگ خیریت سے ہیں اور ایک دو دن میں واپس گھر آ رہے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اخبار میں بھی ہمارے متعلق خبر پڑھ لی۔

ہماری کار بھی کسی طریقے سے بالاکوٹ تک پہنچا دی گئی، ہمیں ڈیڑھ دن تک ہاسپٹل میں رکنا پڑا اس کے بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ عرفان کا اسٹل کیمرہ بھی فرنٹیئر ہوٹل سے مل گیا تھا۔ ہم لوگ اپنی کار ہی میں لاہور کی طرف پلٹے۔

ایک رائٹر دوست میری آپ بیتی لکھنا چاہتا ہے، اس کے خیال میں میں کسی ہیرو جیسا ہوں جو خود بھی اس مصیبت سے نکل گیا اور اپنے دوستوں کو بھی نکال لیا، میں نے اسے تفصیلاً ساری کہانی سنا دی، اسے چوک اور پیکی کے کرداروں سے اختلاف ہے، اس کے خیال میں اس مشکل گھڑی میں میرا دماغ چل گیا تھا جس کی وجہ سے ذہنی طور پر میں نے ایسے کردار تراش لیے تھے۔

پتا نہیں اب میں اپنے رائٹر دوست کو کیسے اپنی بات کا یقین دلاؤں کہ چوک اور پیکی کو صرف میں دیکھ سکتا تھا میرے دوست نہیں، وہ دوست جنہوں نے میرے ساتھ زیادتی کی تھی مگر میں نے انہیں معاف کر دیا کیونکہ وہ اس مصیبت میں بھی میری وجہ ہی سے پھنسے تھے۔ اور ایسی مصیبتوں میں کبھی کبھی اندر کا انسان باہر آ جاتا ہے۔

یہ اندر کا انسان یا تو بہت اچھا ہوتا ہے یا پھر بہت برا!

تین دنوں کے بعد میں اپنے گھر کے گرم کمرے میں اپنی فیملی کے درمیان بیٹھا تھا۔ میری ماں میری بلائیں لے رہی تھی اور اباجی میرا ماتھا چوم رہے تھے۔ دیگر بہن بھائیوں کے علاوہ میری منگیتر عالیہ بھی میرے پاس تھی۔ قسمت نے وفا کی تھی کہ میں ایک بار پھر اپنے گھر والوں اور اپنی خوشیوں کے درمیان لوٹ آیا تھا۔

گرم کمرے کے اس ماحول سے اچانک میرے خیالات اس سرد کاٹیج کی طرف چلے گئے جس کی کھڑکیوں کو توڑ کر ان کی لکڑی سے ہمیں آگ جلانی پڑی تھی۔